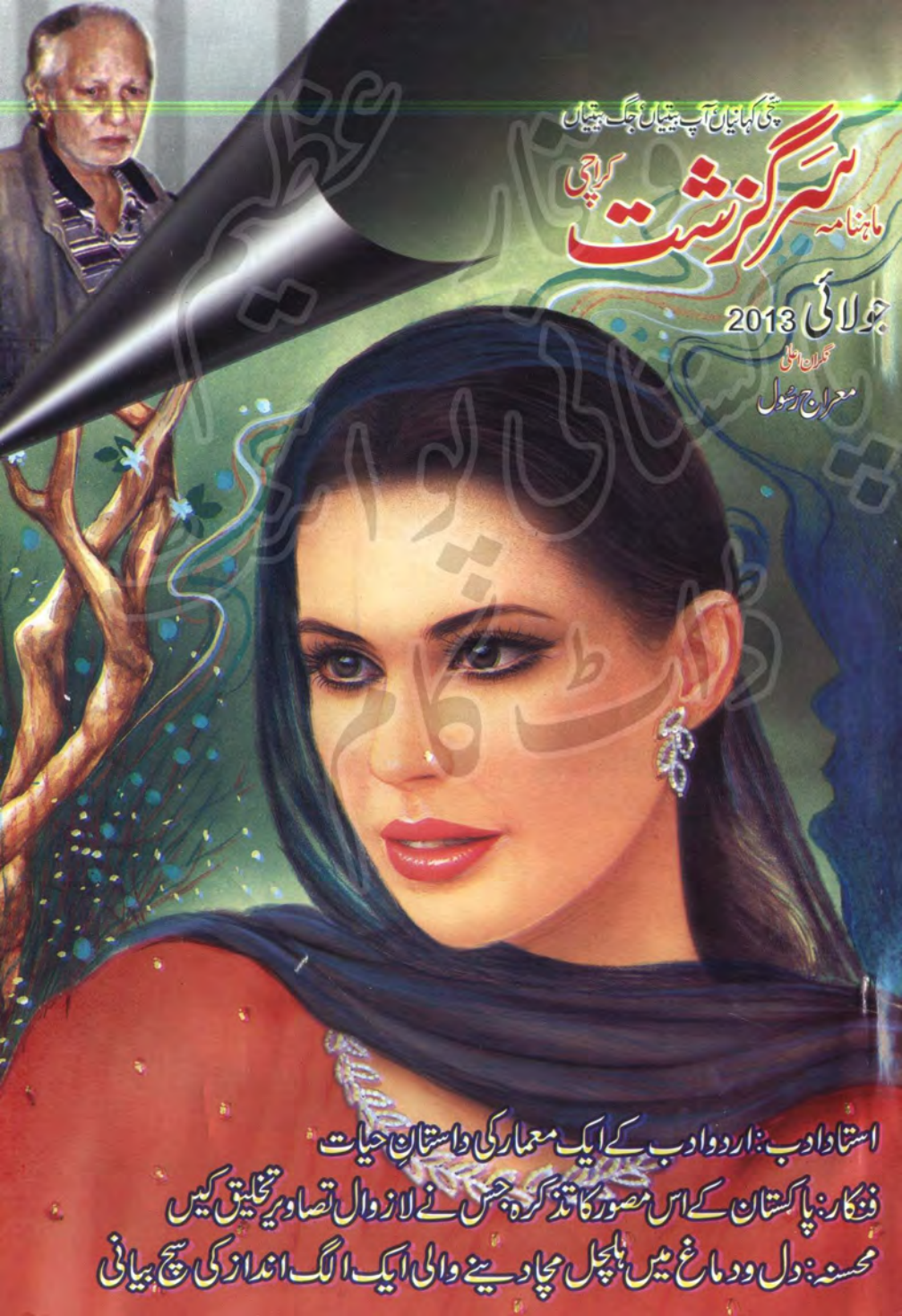




پنجمی کہانیاں آپ بیٹیاں جگ بیٹیاں

سنگرزِ نشتِ کراچی

جولائی 2013

ممدان علی
میراج رضوی

استادِ ادب: اردو ادب کے ایک معمار کی داستانِ حیات
فکر: پاکستان کے اس مصور کا تذکرہ جس نے لازوال تصاویر تخلیق کیں
محسنہ: دل و دماغ میں ہلچل مچا دینے والی ایک الگ انداز کی سچ بیانی

سرگزشت

جواں مرد

ادارہ 15

ایک صفحہ میں مکمل، مختصر، مختصر
ایک نادر روزگار کا تعارف

گفت و شنید

شہر خیال

مدیر اعلیٰ 16

آپ کی باتیں آپ کے خیال آپ
کے مشورے اور آپ کے سوال

شخصیت

استاد ادب

ڈاکٹر ساجد امجد 24

پنجاب کے ایک بہت
بڑے قلم کار کا احوال و زیست

تذکرہ شکاری

مہاشکارِ کاری

اقبال احمد 145

صغیر کے اس شکاری کا
ڈچو آؤم خود کا دشمن کہلایا

جرم و سزا

وارداتِ خونچکاں

نسرین عثمانی 157

قاتلوں نے اے مارنے
میں کوئی کٹر نہیں چھوڑی تھی

معاشرت

سراب

کاشفِ زبیر 162

بلند حوصلوں اور بے مثل ولولوں
سے گندمی تہلکہ خیز داستان

خراجِ تحسین

فنکار

شکیل صدیقی 47

پاکستان سے جسنی تک
پھیلی ایک مصور کی کھٹ

معلومات

شطرنج

محمد ایاز راہی 61

اس کھیل کا تذکرہ جو
برصغیر میں ایجاد ہوا

حیرت انگیز

عفریت

ابن کبیر 65

اس کھیل میں ایک
عجیب الخلقت جانور رہتا تھا

پہلی سچ بیانی

محسنہ

نگار عابد الرحمن 210

اسے خبر نہ تھی کہ اس کا سوتیلا بیٹا
باپ کے ساتھ مل کر ایسا کھیل کھیلے گا

دوسری سچ بیانی

عورت ایک پہلی

عمران 229

اس نے اپنے مفت ادنیٰ خاطر
اسے اپنا شوہر بنا لیا تھا

تیسری سچ بیانی

وہی ہوتا ہے

ارجمند 245

وہ مل کے لیے گڑھا کھودنے والے
اپنے انجام اس کے خبر رہتے ہیں

عزم و حوصلہ

بلند حوصلہ

طارق عزیز 85

بلند والا، زلف پوش پہاڑوں
کو سر کرنے کی داستان

حادثات

ہمت مرداں

امجد رئیس 91

اس نے موت
کو بھی شکست دے دی

نظم و صحافت

قلمی الفیصلہ

علی سفیان آفاقی 95

قلم تحفہ کی کی ان کی کہانیاں
قلم نگاری کی باتیں یادیں

چوتھی سچ بیانی

نہید چاہیے

منظر امام 251

ایک خواب کا تذکرہ جس
نے اسے الجھا دیا ہے

پانچویں سچ بیانی

زندہ درگور

بارون احمد 257

گھر والوں نے اسے
زندہ دفن کر دیا تھا

چھٹی سچ بیانی

گولڈ میڈل

گیتی آرا 265

وہ چھٹی کارکنی کا صلہ چاہتا
تھا مگر اسے ملا کیا؟

تحقیق

سیفی پیرز

اختر شہاب 117

ہر گھر میں استعمال
ہونے والا آلہ کیسے ایجاد ہوا

تذکرہ

بے نباں ہمدرد

امیمہ سلیم 121

ایک کتے کے حوصلے
اور وفاداری کا بیان

سفر حکمانی

ترکی نمی نرم

علی سفیان آفاقی 131

اتھے سفر نامے پڑھنے کے شوقینوں کے لیے
ثقافت پرانے میں ایک دلچسپ کہانی

ساتویں سچ بیانی

الٹی ندبیر

شکیل 269

وہ باپ کو بچانے کی خاطر
خود خپل سیر جاپھنسا

آٹھویں سچ بیانی

اشکِ ندامت

جاناں یار محمد 279

اس نے حد کے
مارے شوہر کو ہی کھو دیا

نویں سچ بیانی

ادائیگی

عظیم 283

اس نے اتق آ کے لیے
الگ انداز اختیار کیا تھا

ماہنامہ سرگزشت میں شائع ہونے والی ہر تحریر کے جملہ حقوق طبع و نقل بحق ادارہ محفوظ ہیں کسی بھی فرد یا ادارے کے اس کے کسی بھی حصے کی اشاعت یا کسی بھی طرح کے استعمال سے پہلے تحریری اجازت لینا ضروری ہے۔ بصورت دیگر ادارہ قانونی چارہ جوئی کا حق رکھتا ہے۔
تمام اشتہارات نیک نیتی کی بنیاد پر شائع کئے جاتے ہیں۔ ادارہ اس معاملے میں کسی بھی طرح سے ذمہ دار نہ ہوگا۔

قرآن حکیم کی مقدس آیات و احادیث نبوی آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لئے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے لہذا جن صفحات پر آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق برحرمی سے محفوظ رکھیں۔

جوان مرد

سرگزشت

سولہویں صدی عیسوی میں مکہ مکرمہ سے وہ لوگ آئے تھے۔ مغلوں نے انہیں سرنگھوں پر بٹھایا اس لیے کہ ان کا تعلق خاندان قریش سے تھا۔ دہلی یا آس پاس کہیں جاگیر دیتے تو وہ چھوٹی موٹی ہوتی اس لیے انہیں دکن کے علاقے کی طرف روانہ کر دیا۔ دکن ان دنوں شورش زدہ علاقہ تھا۔ اس علاقے میں پہنچتے ہی اس خاندان نے ہٹا کی خاطر تعلقہ داری قبول کر لی۔ تعلقہ داری پر قرار رکھنے کے لیے مشیر زنی ضروری ہے۔ آپسہ آہستہ بہ خاندان ساہیانہ زندگی کی طرف آنے لگا۔ اسی خاندان کے شیخ محمد کو جنونی ہند کے سرانصوے کی منصب داری ملی تھی۔ ان کی شادی مقامی زمیندار اکبر علی خان کی دختر مجیدہ بیگم سے ہوئی تھی۔ ان کے کٹنن سے اس بچے نے جنم لیا جس نے برصغیر کی تاریخ میں جو صلے اور ہمت کا ایک نیا باب رقم کیا۔ ابھی اس بچے کی عمر صرف 5 سال تھی کہ ماں کی کوچمن مٹی۔ ماں کے مرنے کے بعد شیخ محمد نے اسے اپنے بھائی شیخ حیدر صاحب کے سپرد کر دیا کہ ان کی بیوی اس کی نگہداشت کرے گی۔ شیخ حیدر صاحب میسور کی فوج میں اعلیٰ عہدے پر تھے۔ ان کی وجہ سے بچے نے بھی سناہ کری میں دلچسپی لینا شروع کر دی۔ بچے نے جوانی میں قدم رکھا تو اس کی فن سپاہ کری کی شہرت دور دور تک پہنچنے لگی اور کرناٹک کے نواب محمد علی والا جاہ کے بھائی عبدالوہاب نے اسے اپنے یہاں نوکری دے دی۔ بعد میں میسور کے راجا نے اسے سرنگھم میں سرپاسی فوج کے ایک دستے کا کماندار بنادیا۔ اس کی جاننازی اور فوجی صلاحیتوں کو مد نظر رکھتے ہوئے 1752ء میں اسے ڈنڈیکل کا گورنر بنادیا گیا۔ جس زمانے میں میسور کی فوجیں کرناٹک میں جنگ لڑ رہی تھیں مرہٹہ پیشوا بالاجی باجی راؤ نے میسور پر حملہ کر دیا۔ راجا نے ایک کروڑ روپے بطور تادان دینے کا وعدہ کیا اور بطور ضمانت ریاست کا ایک بڑا حصہ مرہٹوں کی کفالت میں دے دیا۔ جب رقم ادا کر دی گئی تو مرہٹے 1755ء میں دوبارہ حملے کی منصوبہ بندی کرنے لگے۔ رقم کا انتظام اسی نوجوان نے کیا تھا اس لیے راجا نے اسے شیخ حیدر بہادر کے خطاب سے نوازا اور میسور کی افواج کا سپاہ سالار مقرر کر کے مرہٹوں سے معاملات طے کرنے کے کئی اختیارات دے دیے۔ نوجوان نے اس بار تادان دینے کی بجائے جنگ کا راستہ اختیار کیا اور مرہٹوں کو بری طرح شکست دے دی۔ 1760ء میں اس نے مرہٹوں کے خلاف نظام دکن کے بھائی بسالت جنگ کو فوجی امداد دی اور تعلقہ ہوسٹہ فتح کر لیا۔ اس غیر معمولی کامیابی پر خوش ہو کر نواب بسالت جنگ نے شہنشاہ دہلی سے سفارش کی اور صوبہ سرانی صوبیداری اس کے نام کر دئی۔ اگست 1760ء میں میسور کے وزیر کھنڈے راؤ نے راجا کے ساتھ مل کر اسے بے دخل کرنا چاہا۔ نوجوان کے اندر ہمت و شجاعت تھی۔ اس نے پلٹ کر ایسا حملہ کیا کہ راجا کو باقی ریاست سے بھی ہاتھ دھونا پڑا۔ اب سرنگھم پر اس کا قبضہ تھا۔ اس نے کھنڈے راؤ کو قید کر کے اپنی حکومت قائم کر لی تھی۔ 1763ء میں مرہٹوں نے پھر میسور کا رخ کیا اور بدلو پر قبضہ کر لیا۔ خبر سننے ہی وہ اپنے لشکر کے ساتھ سرنگھم سے نکلا۔ اس کی آمد کی خبر سن کر مرہٹے خوف کے عالم میں ساز و سامان چھوڑ کر بھاگ نکلے۔ اس کی فتوحات سے آس پاس کی ریاستیں سخت خوفزدہ تھیں۔ مرہٹوں اور نظام نے انگریزوں سے ساز باز کر لی۔ کرناٹک کا نواب بھی انگریزوں سے مل گیا۔ ان سب نے مل کر مشیر کو فوج بنائی اور میسور پر حملہ کر دیا۔ 69-1767ء کی اس جنگ میں بھی کامیابی نے اس نوجوان کے قدم چومے۔ مشیر کو فوج کو پتہ چلا کہ راجا سیدھا انگریزوں کی فوج پر چاڑھا۔ اس حکمت عملی نے انگریزوں کے قدم اکھاڑ دیے مگر یز فوج اس افراتفری میں اس طرح بھلائی کہ اس کا سارا سامان میدان میں ہزارہ گیلیزیا انگریز سپہ سالار کرنل اوڈے دوبارہ کوشش کی تو اس پوری اچھ جتنی فوج حکومت کی تین سالہ اس کے بھاری توپ خانے رنو جوان کی فوج نے قبضہ کر لیا۔ 1770ء میں پیشوا دھور راؤ نے پھر حملہ کیا اور جنگ طویل ہوئی۔ 1772ء میں پیشوا امر گیا تو مرہٹوں نے صلاح کر لی۔ 1772ء میں کورگ۔ 1773ء میں ملیاڑ کوچین اور تیل گری۔ 1774ء میں ملاری اور گئی۔ 1775ء میں بادامی، دھاواڑ اور چنڈلرک۔ 1779ء میں کڈیہ شیخ کر کے اس نے اپنی سلطنت کی بنیاد رکھ دی۔ اس باہمت جوان کو دنیا حیدر علی کے نام سے جانتی ہے۔ وہ شیر میسور پٹھ سلطان شہید کے باپ کے نام سے بھی مشہور ہے۔

☆☆☆

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

قارئین کرام!

السلام علیکم!

اگر ہم یہ کہیں کہ سانچہ سقوطِ ڈھاکہ کے بعد تاریخ پاکستان کا دوسرا بڑا سانچہ بابائے قوم کی رہائش گاہ کوراکھ کا ڈھیر کر دینا ہے تو غلط نہیں ہوگا۔ کیونکہ یہ عقیدت قائد اعظم پر سیدھی ضرب ہے اور اس واردات کے لیے دہشت گردوں نے اس روز کا انتخاب کیا جس روز پوری دنیا "قادر ڈے" منارہی تھی۔ عین اسی روز آثارِ یات کو تباہ کرنا ثابت کرتا ہے کہ ایک پلاننگ کے تحت ہی تمام وارداتیں ہو رہی ہیں۔ الگ الگ جگہ، الگ الگ وارداتیں مگر ایک دوسرے سے مربوط۔ مثلاً قائد اعظم کی رہائش گاہ کو تباہ کرنے کا الزام ایک قوم پرست تنظیم نے قبول کیا تو کنوینٹ کی معصوم طالبات کی بس پر حملہ کرنے کی فتنہ داری ایک کالعدم مذہبی جماعت نے قبول کی۔ دو الگ الگ مقام پر الگ الگ قسم کی دہشت گردی لیکن غور کریں تو صاف نظر آتا ہے کہ اصل هدف بابائے قوم کی یادگار ہے۔ انسانی جانوں، خصوصاً معصوم طالبات کی اموات نے میڈیا کا رخ اُدھر موڑ دیا اور اتنی اہم بات بستی۔ انسانی فطرت کے اس کمزور پہلو کو آزما دیا گیا۔ گویا خیر سے کراچی تک قسم باہم کے نقصانات پھیلانے جارہے ہیں۔ دہشت گردی کی جو وارداتیں ہو رہی ہیں ان کا مقصد ہی استحکام پاکستان پر ضرب لگانا ہے۔ اور یہ سب کچھ لانگ ٹرم پروگرام ہے۔ یہ نسلی، گروہی، فرقہ واریت، لسانی تعصب وغیرہ بڑے منظم انداز میں پھیلا یا جا رہا ہے۔ تاکہ استحکام پاکستان کو زک پہنچے اور وطن پرستی کا جذبہ کم ہوتا جائے۔ اگر وطن پرستی کا جذبہ ہمارا خاصہ تھا، ملی طور پر باقی رہتا تو کیا قائد کی یادگار کی تباہی کے بعد ہمارے آنسو خیمے؟ مگر ایسا کچھ بھی نظر نہیں آیا۔ حیرت تو جب ہوئی جب ایک اہم شخصیت نے یہ کہا کہ زیارت کی واردات صوبائی حکومت کا مسئلہ ہے، تو کیا بابائے قوم صرف بلوچستان کے تھے۔ ہمارے یا ان صاحب کے نہیں تھے؟ ایک دو چھوٹی تنظیموں نے پلے کارڈ اٹھا کر احتجاج ریکارڈ کرایا یا باقی سب اپنے اپنے مسائل سلجھانے میں لگے رہے۔ کیونکہ فوراً ہی دوسری پھر تیسری واردات ہو رہی ہے، جو پہلی واردات کا اثر خود کم کر دیتی ہے۔ اس کا بس ایک حل ہے کہ جب الوطنی، اتحاد و یکجہلیت کو چھوڑ دیتے ہیں اور بیکرا یا جائے۔ بقول پردین شاہ

دوستو! آج ہی طے منزل فردا کر لیں منزلیں ساتھ رواں ہوں گی ارادہ کر لیں پاس ناموس وطن زیت کا عنوان غمیرے روح قاتک سے پھر اک بار یہ وعدہ کر لیں

معراج رسول

جلد 23 شماره 08 جولائی 2013ء

ماہنامہ سرگزشت

مدیرہ اعلیٰ: عذرا رسول

مصور: شاہ حسین

شعبہ اشتہارات

نیوز سٹڈیٹ محمد شہزاد خان 0333-2256789

نمائندہ کراچی محمود ضامن 0333-2168391

لانا محمد 0323-2895528

نمائندہ لاہور فراہیل ہاؤس 0300-4214400

♦♦♦♦♦

قیمت فی پرچہ 60 روپے ♦ زر سالانہ 700 روپے

پبلشر و پریپر انٹر: عذرا رسول

مقام اشاعت: C-63 فیئر II ایکس فیشن

ڈیفنس کراچی رہائش کوئی روڈ

کلیتی 75500

پرنٹر: جمیل حسن

مطبوعہ: ابنِ حسن پرنٹنگ پریس

ہاکی اسٹیڈیم کراچی

خط اکارت کا پتہ • پوسٹ بکس نمبر 982 کراچی 74200

Phone: 35804200 Fax: 35802551
E-mail: jdpgrp@a hotmail.com





ہزارا نامحرم شاہد، پورے والا سے رقم طراز ہیں "جون کا شمار سخت گرمی میں خریدا۔ گرمی کی شدت اور بے غیر اطلاع اور بدترین لوڈ شیڈنگ نے عوام کا جینا اجیرن کر دیا ہے۔ سوچنے والا اس محدود کے بارے میں جو ساری رات اپنے بچوں کو کھانا نہ ہونے کی وجہ سے بھٹکا بھٹکا رہتا ہے اور اگلی صبح کمر کا کام پر چلا جاتا ہے کیونکہ اگر وہ نہیں جائے گا تو کمر کا چلہا کیسے چلے گا؟ تو پھر اس کی تندرست اور کسے واپس کرے گا؟ نئی حکومت وجود میں آ چکی ہے۔ بجلی کے بحران کا حل اس حکومت کو ترجیحی بنیادوں پر اور جلد مل کرنا ہوگا۔ ورنہ ان کا انجام بھی کچھ اچھا نہ ہوگا۔ (فیصل آباد میں علاج کرنے کی کوشش تو ہوئی۔ بہت سے دینی اب تک اسپتال میں پڑے ہیں) اور ایسے میں معراج رسول صاحب نے ہماری معیشت کے لیے ریزہ کی ہڈی کی حیثیت رکھنے والے ایمان کیس پائپ لائن معاہدہ اور گوارڈ پورٹ کے مسئلہ کا ذکر کیا۔ یہ دونوں معاہدے پاکستان کے بہت سے مسائل کا حل ہیں جو یقیناً میاں نواز شریف کی حکومت کے لیے چیلنج ہوں گے۔ "مکمل تو دین" اگر ہمارا نظریہ بن جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ ہم دنیائے عالم میں ایک باوقار قوم کی طرح جی سکیں۔ ہماری بدقسمتی کا اندازہ اس کے بعد ہمیں کوئی ایسا پڑ رہا جو ایک ویزن و نظریات اعلیٰ لگ کر کھل کر سکا۔ ماؤزے تک سے صحافیوں نے پوچھا کہ نہ کرنے والی قوم تری کیسے کرے گی تو انہوں نے ایک بوڑھے کی مثال دی جس کا گاؤں پہاڑ کے عقب میں تھا۔ ایک دن وہ بوڑھا کدال لے کر پہاڑ کے اوپر گیا اور اسے توڑنے لگا تو لوگوں نے پوچھا تم اس پہاڑ کو ختم کر لو گے؟ اس بوڑھے نے جواب دیا کہ میں جب مرنے لگوں گا تو یہ کدال اپنی اگلی نسل کو دے دوں گا اور میرے بیٹے اسے اگلی نسل کو دیں گے۔ اس طرح ایک دن پہاڑ ختم ہو جائے گا اور سورج کی شعاعیں گاؤں میں آئیں گی۔ دے دے کہ ایران کیس پائپ لائن اور گوارڈ پورٹ کے معاہدے ہمارے ملک کو کبھی روشن کر دیں۔ اسلام آباد پہاڑیوں کے درمیان بن سکا ہے تو گوارڈ دینی کیوں نہیں بن سکا۔ بندرگاہ بننے کی گوارڈ دینی بننے کا کیونکہ آج سے 30 سال پہلے دینی بھی ایسا ہی تھا۔ برصغیر کے ایک بڑے پہاڑوں کا نظام تھا المعروف گاما پہاڑوں کی ایک ہی سرگزشت میں پہاڑیوں کے حوالے سے ان کی تربیت اور کارنامے دیکھے سے بھر پور تھے۔ عزیز اللہ ادیب کمار کے بڑے فن لگتے ہیں۔ (عزیز اللہ کا خاندان ہندو تھا مگر کبھی کے خط کے درمیان میں آ گیا جس کی وجہ سے وہ پک کر ماروا لاهسان کے خط کا حصہ بن گیا) بھر حال محبت کے حوالے سے ان کی بات سے اتفاق ہے کیونکہ محبت Age Limit کی پابندی نہیں ہوتی۔ عمران خان یا روکو کا حق زعمی میں اتنی کامیابیاں پہلے پر مبارکباد۔ اعجاز حسین شہزاد بے تکلف لہجہ گفتگو ہو میرے خیال میں عمروں کا فرق نہیں رہتا کیونکہ زعمی تو ہوتی ہی زندہ دلی کا نام ہے۔ احمد خان تو حیوی، ایک ڈاکٹر عبدالقدیر اور ایم ایم عالم ہی کیا..... ہمارے پاس تو احسان فراموشی کی ایک لمبی لسٹ ہے۔ ہمارے کسی بھی شعبے کے ہیرو ہوں، ہم نے انہیں کبھی وہ مقام نہیں دیا جس کے وہ مستحق تھے۔ حالانکہ مغربی دنیا اور ہمارے ہمسایہ ملک کے لوگ بھی اپنے ہیرو کی بے پناہ قدر کرتے ہیں۔ کیا کسی کسی نے سوچا کہ قرآن میں حیدر جی بڑی رانگیں کیوں ہیں بلکہ چھوڑ چلی گئیں؟ سار حیدر یا نوئی کیوں ہیں بلکہ چھوڑ گئے تو میں وہی ترقی کرتی ہیں اور دنیا میں باوقار طریقے سے جیتی ہیں۔ ہمارے ہیروز کی قدر کریں۔ ابن مقبول کا تبرہ پھندا آیا۔ عمران قریشی کی بات سے اتفاق ہے کیونکہ تجربہ شائع ہونے کے بعد رانگوں کو اعزاز کی کاپی کی ترسیل اس کا بنیادی حق ہے۔ اس دفعہ ڈاکٹر ساجد امجد شہزاد ایک سے عظیم مفکر کارل مارکس کا زعمی کا نام لے کر آئے کارل مارکس کے نظریات و افکار اس لیے عظیم تجربے کے اس نے خود مشکلات و مصائب میں زعمی کی گزاری مگر ایک دنیا کو جینے کا دھنک دے گیا۔ طارق عزیز خان نے غلام کے اولین مسافر کی روداد بڑے دلچسپ پیرائے میں لکھی۔ ایک عجیب انداز میں جانا ہونے والے ہوائی جہاز کی پر اسرار کہانی ابن کبیر سنار ہے۔ ایک مختلف انداز سے جہاز کا تھوڑا اور تاحیر سرگزشت کرنے کے باوجود حقیقت کا منطقی انجام تک نہ پہنچنا۔ یقیناً ایک اگ اور انہوں نے ناک پہلو ہے۔ "موت کے سامنے" اور "ساعت اقبال کی" "بہشتی گڑھے"، دلچسپ و منفرد انداز کی تحریریں ہیں۔ سید اشتیاق ایک

مہذب اور باخبر معاشرے کی بنیادی ستارہ ہے۔ کاش خبر کی یہ غلط ہمارے معاشرے کو بھی بے چین کر دے تو ہمارے ہاں بھی قانون و انصاف کی حکمرانی ہو۔ کہ ہمارے نئی حکومت کی تعلیمات اور اسلاف کی تاریخ ہمیشہ ہی انصاف کے کردار کو متحرک نظر آتی ہے۔ کھیل مدد دینے نے طنز و مزاح سے بھر پور لکھنے والے ایک بڑے لکھاری کا زعمی کا نام بڑے حقیقت انداز میں لکھا۔ آرٹ بکوالڈ ایک عظیم صحافی ہیں انہیں انسان تھا۔ اس کا کالم دنیا بھر کے تقریباً 1600 اخبارات میں شائع ہوتا تھا۔ جس میں سے زیادہ تر کا موضوع وہ مصائب و مشکلات میں گھرے انسانوں کے لیے وقف کر دیتا تھا۔ سبکدوش کے سامنے پر کیا گئیں۔ ورجن سے زائد مصحف میں اور ان کی ٹیچر وین میں زندہ مل گئے۔ ہم لوگ رہا ہاں میں یہ کہہ کر جان چھڑا لیتے ہیں کہ اللہ کو کبھی منظور تھا تو کیا اللہ نے چاہا تھا کہ ہشتے سکر آئے گھرانوں کے چہرے آنسوؤں سے بھجک جائیں۔ یقیناً نہیں، کیونکہ وہ تو خدا ہی کتاب قرآن مجید کی ایک آیت میں فرماتا ہے جس کا مفہوم کچھ یوں ہے کہ "تمہیں جو بھی تکلیف پہنچتی ہے وہ تمہارے اپنے کب و عمل کا نتیجہ ہے اور تمہیں ملنے والی برکت کا سرچشمہ میری رحمت ہے۔"

مختصر صوفی شاہ نے ہری پور ہزارہ سے لکھا ہے "سرگزشت 30 تاریخ کو مل گیا تھا سب سے پہلے ادارہ یہ پڑھا۔ ہم بھی اپنے وطن کے لیے دعا گو ہیں۔ شہر خیال میں سب کے خطوط پڑھ کر یوں لگتا ہے کہ جیسے ایک ہی گھر کے سب افراد مختلف طریقوں سے اپنا اپنا اظہار خیال کر رہے ہوں۔ بھائی طاہر الدین بیگ آپ کی یہ بات مجھے بے حد پسند آئی کہ سلی علی جیسی آپ جی کو تو کوئی ناکر واکتیرم کرنا چاہیے۔ میں نے اس پر عمل بھی کر لیا ہے۔ حق بیانیوں میں لے پاگ بڑھی تو حیرت نہیں ہوئی کیونکہ آج کل کے دور میں سب کچھ ممکن ہے۔ قابل جذبہ، ناخاندانہ جو کیا اس کا چل بھی پالیا۔..... محترم فخر حسین صاحب کی کہانی اذالہ پر بھی تو دل بہت دکھا، ہم واقعی بے حس ہو گئے ہیں، اس میں کچھ شک نہیں۔ میں خود ایک بیوہ عورت ہوں اور ایک بیٹی کی ماں۔ میں نے کسی طرح سفید پوشی کا بھرم رکھا ہوا ہے یہ میرا رب بہتر جانتا ہے۔ میں اگر اللہ نے رزق حلال اور مالی طور پر آسودہ کر رکھا ہو تو ہم غریب غریب لوگوں کو اس میں حصہ دار کیوں نہیں بناتے؟ باقی شمارہ ابھی دیکھیں، یہ مطالعہ ہے، کبھی وقت ملا تو اپنی آپ جی بھی تحریر کروں گی (انتظار رہے گا)"

مختار فاضل فاروق ساحلی کا مکتوب لاہور سے "جون کا سرگزشت خوبصورت اور جاذب نظر ماحول کے ساتھ منظر عام پر آیا۔ اشتہارات کی رنگین عمارت سے آگے بڑھے تو مگر کے نام سے تاریخ سادہ شخصیت کے حالات موجود تھے۔ کارل مارکس نے معاشی نظام، زعمی اور تاریخ میں انٹ نقوش چھوڑے، ان کی زندگی معاشی جدوجہد کا ایک سبق چھوڑ گئی ہے جس میں کی طرح کی قربانیاں شامل ہیں۔ آفاقی صاحب کی دونوں تحریریں اچھی ہیں۔ ترکی کے ماحول کا اچھا طائرانہ جائزہ لکھتے ہوئے۔ مضامین کے انتخاب میں دیر سرگزشت نے کافی محنت اور عرق ریزی سے منتخب واقعات کو سرگزشت کی زینت بنایا۔ موت کے سامنے، مراسر حادثہ اور ساجد امجد شہزاد کا انتخاب تھے۔ آپ بیانیوں میں لے پاگ، ایم ایس کی چڑیل، اور اپنی آجی بہتر معلوم ہوئیں۔ اس سیدے ہماری طرف توجہ فرما کر شکر یہ کاموں عمارت فرمائیں گے۔"

مختار وحید ریاست ممبئی لکھنویاں، راولپنڈی سے لکھتے ہیں "خوبصورت و سادہ سے سجا "سرگزشت" 28 مئی "یوم بخیر" کو ملا۔ سب سے پہلے آپ کا لکھنوی ادارہ یہ پڑھا۔ میاں نواز شریف میڈیا کے لیے نظر آتے ہیں لیکن جب کبھی اقتدار پر بحیثیت وزیر اعظم پاکستان تشریف فرما ہوں گے تو میری دانست میں یہی شعر بر وقت ٹھکانا ہے کہ بول شاعر "ہاتھ اچھے ہوئے ریشم میں پھنسا بیٹھے ہیں۔ اب بھلا لوں سے دھاکے کو جدا کس سے کریں" معراج صاحب شاید آپ میری اس فکر سے اتفاق کریں کہ میرے پیارے قائد محمد علی جناح کا بیارادوں "پاکستان" 1947ء سے ابھی تک سن رہا ہے۔ دعا ہے اس درپ عظیم سے جو تمام مخلوقات کا رب ہے کہ کوئی قلمس و ایما عمارت جس میرے پیارے ملک کا ہاتھ پکڑ کر اس کو منور مقصود تک لے جائے جہاں امیر و فہم ایک ساتھ بڑھتے ہوں، بیارادوں کا علاج بالکل فری ہوتا، ہو جہاں پیر و زعمی کا نام و نشان نہ ہو یا پیر و زعمی کو کھر بیٹھے و غلیظ رہا ہو جہاں کی یونہی شایاں ہر سال ہزاروں ریسرچر پیدار رہی ہوں۔ مذہبی ہم آہنگی ہو، امن ہی امن کا راج ہو، اے میرے خدا اب وہ وقت لے، آنا انصاف کی ظلم کی حد ہو چکی۔ تجھے تیری عظمت و بزرگی کا واسطہ اپنے حبیب کریم کا واسطہ اس ملک کے رہنے والوں کو اب معاف کر دے۔ اے بھر ویر کے خدا (آمین) باقی سرگزشت ناسازی طبع کی وجہ پکڑ زیادہ مطالعہ نہیں کر سکا ہے تمام شہر خیال کے بایوں کی خدمت میں دست برد سلام عرض کرتا ہوں اور آپ کا شکور ہوں کہ چنانچہ کا خط باقاعدگی سے شائع کر دیتے ہیں۔ ڈاکٹر ساجد امجد صاحب نے "مفکر" لکھ کر ہمارا دیرینہ مطالبہ پورا کر دیا، ڈاکٹر صاحب کا شعر ہے علی سفیان آفاقی صاحب نے ہمیں نائیز، فلسطین اور محبوب اسٹوڈیو کا تعارف بہت اعلیٰ انداز میں کر لیا۔ طارق عزیز خان صاحب نے تغیر خلاب بہت خوبصورت لکھا اور غلطی کی کوئی توجہ نہیں رہنے دی۔ "ترکی کا سفر نامہ" بہت جادہ رکھا ہے اگر ہو سکے تو "نیز لیز" کا سفر نامہ کسی سے لکھا لیجیے گا اچھی حق بیانیوں میں پڑھ کر ایک چیز جانتے جاتے عرض کروں گا ہے آرٹیکل محرم بصارت، جو کہ KC.D.EY کے حوالے سے تھا پکڑ میرے حق میں خدمت ہے ہو سکے تو سادہ آرتیکل میں شامل کر لیجیے گا" (بہت شکر ہے)

مختار عمران خان یاور کی آمد شاہ کوٹ، ننگر نہ صاحب سے "سب سے پہلے ادارہ یہ پڑھا۔ معراج رسول صاحب نے مختصر الفاظ میں ملکی حالات کا نقشہ کھینچ کر دکھایا میری رائے میں حکومت کے لیے سب سے بڑا اور اہم چیلنج کرپشن پر قابو پانا ہے۔ چونکہ کرپشن پاکستان کا سب سے بڑا مسئلہ ہے اور یہ سچا طور پر ہم انہیں انٹ لکھا ہے اور لوڈ شیڈنگ، بے روزگاری، مہنگائی سب اس کی دین ہیں۔ اس کے باوجود مختصر کی سرگزشت میں عظیم کا پہلو ان کے بارے میں دلچسپ اور حوالاتی تحریر پر بھی۔ کتنے انہوں کی بات ہے کہ گاما پہلو ان جیسے مرد میدان کے ملک کے پہلو ان کو شہر پر اس کا

پہلوانوں سے مقابلہ ہار گئے۔ پھر ہم غیر خیال میں جہاں ہمارا خطبہ شائع ہوا تھا جس سے جی بہت خوش ہوا۔ ڈاکٹر ارم ای صاحب نے گزارش کی کہ اپنی فلاحی revisits کریں۔ تاریخ کے طالب علم ہونے کی حیثیت سے ہم جانتے ہیں کہ تاریخ کوئی objective چیز نہیں ہوتی۔ اس لیے کہ ہر شخص ایک تاریخی واقعہ یا شخصیت کو اپنے نقطہ نظر سے دیکھتا ہے۔ تاریخ بیان کرتے ہوئے مورخ کے وقتی رجحانات، میلانات اور Prejudices کے بارے میں آگاہی بہت ضروری چیز ہے تاکہ ہم اپنی approach کو پیش رکھ سکیں۔ ڈاکٹر ساجد امجد صاحب کی ”مفکر“ پڑھی، کارل مارکس کے اپنے فلسفے اور نظریے کے ساتھ خلوص کے بارے میں معلوم ہوا، اس نے جو ٹھیک چاہا ساری زندگی اسی کی تبلیغ کرنا اور سبھا طور پر جدید دنیا کا نہایت پر اثر اور اہم مفکر ثابت ہوا۔ صائرا اقبال کی تحریر ”جہنمی کڑے“ بہت دلچسپ تحریر تھی۔ علی حنفیان آفاقی صاحب کی ٹی لف لیلہ نے اس بار بھی دل موہ لیا۔ ”شہنشاہ صحافت“ میں معروف کالم نگار آرٹ بلکوالڈ کی زندگی کے بارے میں تفصیلی معلومات جان کر خوشی ہوئی۔ شاید بہت سارے لوگ یہ نہ جانتے ہوں کہ یہودی ہونے کے باوجود وہ انسانیت کے لیے بڑا نرم گوشہ رکھتا تھا اور بلا تفریق مذہب، رنگ و نسل لوگوں کی فلاح و بہبود کے لیے کھلے دل سے کام کرتا تھا۔ کچ بیانیوں میں ”آٹھ لاکھ“ کا انجام ہماری سوچ سے بالکل مختلف نکلا، شروع میں آخر کی ناکام محبت پر انھوں ہوا لیکن آخر میں اس کے انتقام کے جذبے کی حرکت نے سب پر پانی پھیر دیا، محبت ہے تو انجام جو بھی ہوا انتقام کیسا؟ اس ماہ کی کہیں بھی بڑی دلچسپ اور معلوماتی رہیں۔ انشاء اللہ اگلے ماہ پھر ملاقات ہوگی۔“

☆ منظر مظفر خان کی لاہور سے تعریف آوری ”مفکر“ کے عنوان سے کارل مارکس کے حالات سے آگاہی ہوئی۔ کارل مارکس وہ پہلا مفکر ہے جس نے سائنٹفک انداز میں معاشرے کی طبقاتی کشش کا نظریہ پیش کیا۔ کارل مارکس پر دلری تھا اور شاید انہیں اور انقلاب کا قائل تھا۔ سرمایہ داری ہو یا اشتیالیات معاشرہ کو کسی ایک نظریے پر متحد نہیں کیا جاسکتا۔ ارتقائی عمل ایک حقیقت ہے معاشرے کا فرض ہے کہ حق و صداقت کو رائج کرے اور معاشرہ میں مساوات برپائی انصاف ہو تا نظر آئے۔ ہر حال سرمایہ داری ایک سخت ہے اور انسانی آزادی سب کرنے والا کوئی بھی نظریہ باطل ہے۔ فیضی غلام خاں رسائی کی شروعات کا تذکرہ تھا اور اب تو شرح اور خطا میں بتیاں بسانے کے قصورات بھی پتہ چلے ہیں۔ ”پراسرار حادثہ“ شاید وہ شہرت کر دی کا واقعہ ہی محسوس ہوتا ہے۔ ”موت کے سائے“ جنونی افریقا میں فطری حیات سے عقلیت دلچسپ واقعہ تھا۔ ”ترکی کی دائم“ وہ چاشنی نظریں آتی جو کہ آفاقی صاحب کی تحریروں کا حصہ ہے۔ ”ٹی لف لیلہ“ میں روایتی ہے۔ ”سراب“ حسب روایت دلچسپاں سینے ہوئے ہے۔ کچ بیانیوں میں ”لے پاک“ پسند آتی۔ بچہ نہ ہونے کی وجہ سے کوئی بچہ ایلا پٹ کرنا فطری تا مناسب اور فطرت کے خلاف ہے۔ ویسے خدمتِ وطن کے طور پر بچوں کی پرورش میں حصہ لیا جاسکتا ہے۔ ”بچہ چننے“ کے عنوان سے ہمدردیاں سینے کے بعد کسی کو دھوکا دینا اور اسے تباہ و برباد کر دینا صرف مردوں کا کیونکہ نہیں ہوتے ہی خواتین بھی ایسے ڈرے کرے سادہ لوح لوگوں کو لوٹ کر تارار لگ جاتی ہیں۔ ”ازالہ“ کسی بچہ کا ازالہ، معاشرہ میں رسوا کرنے کے بوجھ سے وہ بے لگ کب تک پتے رہیں گے۔ فوجی بھی شادی، اہل خانہ کا تباہ و برباد کر دینا اور اسے تباہ و برباد کر دینا صرف مردوں کا کیونکہ نہیں ہوتے ہی خواتین رنگ میں اختیار کیا گیا تو سراسر خرابی ہی صارفہ ہے۔ ”چڑیل“ نفسیاتی کہانی ہے۔ ”آزادی“ سبق آموز کہانی ہے۔ ”اپنی آگ“ معاشرہ میں بگاڑ کی سزا ہے انھوں نے دنیا ساتھ قبول کرنا چاہیے اور آوارگی کی ہیرا کرے۔ آشیانہ بادی پڑھ کر قبروں کی فروخت سے بے نیکی کمانے اور ہم خراب و مہربان کے صدق بہت سے لوگوں کا خیال آتا ہے۔ اللہ رحم کرے۔ ”آٹھ لاکھ“ وقتی ایڈیشنٹ کی کہانی ہے۔ ایسے لوگ ایک دوسرے کو قبول کر لیتے ہیں اور عزت و عظمت کی کوئی اہمیت محسوس نہیں کرتے بلکہ مادی فوائد ان کا منہج نظر ہوتا ہے۔“

☆ ظاہر ہو گزرا کی آمد پڑا دوسرے ”مرد میدان“ کو پڑھا اور دل فرور ہو کر سے پھر گیا کہ کبھی ہمارے پہلوان ایسے بھی ہوتے تھے جن سے ملک کا نام روشن رہتا تھا اور لوگ فخر کے ساتھ کہتے تھے He is Pakistani اور اب بولتے ہیں See he is Paki ہم نے اپنے دین و رسم و رواج کو ناپا شنایا دیے۔ دنیا میں پاکستانی وہ وہاں خود قوم ہے جو دوسروں کے غلط کام، غلط باتیں اور ان کے معاشرے کے رسم و رواج کو اپنا کر فخر محسوس کرتے ہیں۔ ہم اس پر پناؤ بغیر کسی پر بارمات ہیں لیکن انھیں ہمیں اپنے ان رویوں پر اور اس عمل پر جو ہمارے دین کے منافی ہیں شرم بھی نہیں آتی۔ ایک عمران عوام کا باپ ہوتا ہے۔ اور اس کی ڈیوٹی ہے کہ وہ اپنے بچوں میں اتفاق، اتحاد، تنظیم اور محبت و بھائی چارہ قائم کرے۔ اگر ایسا ہو گیا تو میرا یقین ہے کہ میرا ملک یہ پیارا ملک پاکستان ترقی ہی نہیں کرے گا بلکہ دوڑے گا۔ انشاء اللہ! اب کچھ دوستوں کے خطوط پر تبصرہ۔ پہلے نمبر پر ڈاکٹر ارم ای کی کاغذ پر دھا۔ واقعی نمبروں ہونے کے قائل تھا، مبارک ہو۔ روپیہ نفس انصاری صاحب آپ فتنی سویت ہیں۔ آپ جب وزیر اعظم بن جائیں گی تو مرد پھارے تو دل تمام لیں گے۔ ابن مقبول جاوید احمد مدنی آپ کا تبصرہ اور غیر عباسی بھائی کو تبصرہ میں دل کی آنکھوں سے دیکھتے ہوں۔ خوشی اس بات کی ہے کہ آپ اس بار حاضر ہیں وہ بھی اتنے اچھے تبصرے کے ساتھ۔ معراج الدین بھائی آپ سے بے امید نہیں تھی کہ آپ بھی اپنی باجی کو یاد ہی نہیں کریں گے۔ جاوید پاکستانی صاحب آپ کہاں قائب ہو گئے اور سسر بشری افضل آپ کے دوبارہ قائب ہو گئے، جناب یہ ابھی باجی نہیں ہے۔ قطرہ قطرہ زندگی بہت دیر لایا فتنی چاہیبت ہے ہم لوگوں میں۔ ہم کالج، یونیورسٹی کی خوبصورت عمارتوں میں تو بڑی شان سے پھرتے ہیں۔ کتابیں پڑھتے ہیں لیکن ہم صرف ڈگریاں حاصل کرنے کی دوڑ میں آئے ہیں۔ ہم علم کی روشنی حاصل نہیں کرتے۔ قائل جذبے، جویا لکھتے کی ہر ناکلہ اور اس کی بیٹی کی کہانی ہے، ہمیں ان کی کہیں میری بھی کہانی ہے۔ میرے بہت سے دوستوں کو پھر میری باتیں آگ لگیں گی لیکن یہ حقیقت ہے کہ مرد ہمیشہ عورت کو کھلونا بنا تا ہے۔ مکاری کے آئینہ ہمارے اس کے دل میں پہلے ہمدردی اور پھر محبت چمکتا ہے لیکن یہ مرد نہ بھی کسی کے ہوتے ہیں نہ ہوں گے۔ یہ صرف

اپنی عیاشیوں اور جذبات کو پورا کرنے کے لیے کسی کی بھی بہن بیٹی کی زندگی برباد کر دیتے ہیں۔ کہانی چڑیل، پڑھ کر بہت دکھ ہوا، دل بہت لمعل ہوا۔ کیا بد صورت لوگوں کو زندہ رہنے کا حق نہیں دوسروں کو تو چھوڑا انھوں تو نیم کے والدین پر ہوا اور پھر اسی احساسِ نفرت سے اسے اس حال تک پہنچایا کہ اس نے اپنی محبت کو حاصل کرنے کے لیے پلاسٹک سرجری تک کر لی لیکن اس ذلیل اور ناہنجار نے اس کے جذبے اور محبت کا کیا صلہ دیا۔ اس کی اہانت طوفان برپا کرتا تھا۔ بارہویہ کیوں بھول جاتا ہے کہ عورت اگر محبت میں حد سے گزر جاتی ہے تو نفرت اور انتقام میں بھی آخری حد تک جاتی ہے۔ کہانی اپنی آگ پڑھی اور اپنی دلچسپ اور قدردان بہت خوش ہوا اور سکون بھی ملا۔ عذرا اور تحریم نے بہت اچھا کیا ان جیسے مردوں کے ساتھ ایسا ہی ہونا چاہیے۔ بھائی تھا تو کیا ہوا، تھا تو بھی مرد نا جو دوسروں کی بہن بیٹی کی عزت سے کھیلتا رہا۔ کہانی 8 لاکھ، کچھ خاص نہیں اور نہ ذہن مانتا ہے، ویسے ڈائجسٹ کے چار صفحے اس پر خراب کیے ہیں۔ آخری کہانی آشیانہ بادی جو زبانِ محرم شاہ صاحب نے بیان کی ہے۔ کہانی سرگزشت کے ساتھ تو کچھ نہیں کھاری تھی اس نے اپنے کام کے بارے میں اتنی تفصیل سے بیان کیا کہ کچھ جیسے ہمیں بھی یہ کام شروع کرنا چاہیے۔ اپنی نفرت کہانی میں سراب، اب لکھتے لگے کہ سراب اپنی منزل کی طرف رواں دواں ہے۔ شہباز جنس تو کھٹے تھے وہم بھی ذہنی تھا لیکن پھر شہباز کو کرل اور مہر دے بجایا۔ یہ سب دوست پھر بھر گئے۔ دور تن، مجھ یا ز راہی کو پڑھا بہت اچھا تھا۔ ٹھیک صحتی نے شہنشاہ صحافت، آرٹ بلکوالڈ کے بارے میں تفصیل سے لکھا۔ بہت اچھا لگا۔ ساتھ ہی دل سے ایک ہوک اچھی کا کش ہمارے ملک میں بھی آرٹ بلکوالڈ پیدا ہوا ہے۔ (یونی کو پڑھیں) سید احتشام کی تحریر سزا بہت بڑبڑت کہانی تھی جو ہر باخیر انسان کے لیے ہے۔ آج ہم کیوں زوال پذیر ہیں کہ ہمارے معاشرے میں نمبر نام کی کوئی چیز موجود نہیں۔ ہم انہوں کے ٹپس سے ٹپس لے کر لہا پر پردہ ڈالتے ہیں یہ سوچ کر کہ یہ ہمارے اپنے ہیں۔ خوبیر ریاض نے ادا کالہری پر بہت مضر نظر لیتے سے لکھا۔ شمس نے ان کی تمام قلمیں دیکھی ہیں۔ خوبیر صاحب نے بہت اچھا لکھا لیکن ایک بات سے مجھے سخت اختلاف ہے کہ کاشے کار مار اور گوگرد اکو ایک برابر لکھا۔ کاشے، گوگردا کے پاؤں کی مٹی کے برابر بھی نہیں۔ باقی پھر یہی دھواں کی کا کھٹ کو دیر نہ ہو جائے۔“

☆ محمد عمران جو تانی نے کراچی سے لکھا ہے۔ ”معراج صاحب کے خوبصورت جملے“ وقت کا کام ہے گزرتا... گزرتی جاتا ہے“ اور حسب حال شعر سے جن کے شمارے کا آغاز ہوا۔ واقعی اللہ پاک کی بڑی نعمت ہے کہ وقت ہر حال میں گزر جاتا ہے۔ آنے والے وقت میں اللہ سے اچھی امید انسان کا بنیادی سہارا ہے۔ اس کے بعد پاکستان کا نام دنیا بھر میں روشن کرنے والے دورِ شہدہ ستارے غلام محمد عرف کا پہلا پلان کی مختصر سرگزشت سامنے آئی۔ دوسرا نمبر پہلوان کی عروج کا تھا عوام بھی دلچسپ رکھتے تھے، ہمیں سال تک پوری شان سے اکھاڑے میں باغی مقابلہ جیتو جیتو بات ہے۔ شہر خیال میں ڈاکٹر ارم ای اسے جامع اور خوبصورت الفاظ سے مرصع خط کے ساتھ بجا طور پر کسی صدارت کے تختہ نظر ڈالے، ڈاکٹر صاحب کی تحریر میں تجربہ کی فصاحت صاف محسوس ہوتی ہے۔ شاید جگہ جگہ صاحب کا طویل جملہ بھی پسند آیا، دو اٹھ گھنٹوں والے ضمن میں آپ نے لکھا کہ ایسے لوگوں کو کوشم آرمی چاہیے جو ایسے لوگوں کی مدد کرنے کے بجائے ان سے بیکہ منگواتے ہیں۔ ارے میرے بھائی تم جن جیٹ اقوم ایسی بہ شری اور مردہری کا کھلاڑ ہیں کہ بیان مشکل ہے۔ عزیز اللہ صاحب! انتہائی ادب کے ساتھ گزارش ہے کہ میں آپ کے اس خیال سے متفق نہیں کہ شہر خیال میں تمہروں کے علاوہ کوئی بات نہ ہو یا تنقید نہ کی جائے جہاں چار لوگ ہوں گے وہاں اختلاف بھی ہوگا۔ ”عمران خان یاور! بھائی آپ میرے ہم نام ہی نہیں ہیں ہم دونوں ہیں۔ ہم دینی میرے پسندیدہ ادیبوں کی فہرست بھی نہیں ہے۔ اللہ آپ کے علم میں خوب برکت دے۔“ اعجاز احمد شمارے کے ساتھ لکھ کر کہا ”معاذ اللہ“ کے حوالے سے آپ کا تبصرہ بہت خاص تھا۔ دل خوش ہو گیا۔ انھما رحمن صاحب کے بچوں کا اللہ مکمل صحت دے آئیں۔ احمد خان تو حیدری آپ کے خط کی تیز رفتاری دیکھی لیے ہوئے ہے لیکن آفاقی صاحب کی شاندار تحریر پر کو 25 صفحات کا ضیاع قرار دینا سراسر نا انصافی ہے۔ ابن مقبول جاوید احمد مدنی صاحب! جس طرح آپ نے شہر خیال کے حاضرین سے فردا فردا ایک سلیک کی حراہ کیا، اعجاز پسند آیا آپ کا جامع تبصرہ اور بات میں مطالعہ کی فحاشی کرتا ہے اور رانا محمد چاودا صاحب کا مکتوب تو پڑے کا پورا احوال شہر خیال تھا لطف آ گیا۔ آپ جس طرح غیر حاضر حاضر تھیں کو یاد کرتے ہیں، قائل واد ہے۔ عبدالعزیز میاں صاحب خوش آمدید۔ بھائی معراج الدین بڑی ہمت کی بات ہے کہ ایسا خوفناک حادثہ دیکھنے کے ایک نیکے بعد آپ خط لکھ سکے۔ کارل مارکس کی سرگزشت دیکھی ہی ہے جیسے عام طور پر ایسے لوگوں کی ہوتی ہے۔ دنیا بھر کی سوچ کا محور تبدیل کرنے والے اکثر اوقات اپنے گمراہنے سے قائل ہو جاتے ہیں حالانکہ ان ذمہ دار یوں سے کوئی انسان بری الذمہ نہیں۔ فیضی غلام خاں صاحب کا خزانہ ثابت ہوئی خاص کر بتراؤں کا حوالہ دے کر پھر انصاف کیا گیا۔ ایک رین جو جو عزت میں بجا طور پر اس کا مستحق تھا ایسے لوگ روز بروز بدلتے ہیں ہوتے اور پھر وہ کوئی پاکستانی تو ہوتا تھا جو اس کے ساتھ سرکاری طور پر ”ڈاکٹر خان“ یا ”انیم ایم عالم“ جیسا سلوک کیا جاتا۔ ”مجھ رازا ایسے ہیں جو پیدائش ہی میں بے نیکی کی ”پراسرار جواس“ بھی یقیناً ایسے ہی حادثے کی کہانی ہے۔ ہڈیاں ٹوٹ گئیں اور پاؤں کھال اور نسون کے سہارے لٹکا ہوا تھا اس ایک جملے میں آصف ملک صاحب ”حادثہ“ کے سائے سے ”میں تمام تکلف اور کرب کو سمیٹ کر مہارت سے بیان کر دیا، کچھ عرصہ سے سرگزشت میں شائع ہونے والے شکاری مضامین یکسانیت کا شکار تھے مگر اس کی سستی اور تنہی نے کبھی دور کر دی۔ آفاقی صاحب بہترین منظر نگاری کے ساتھ ترکی کی سیر کو راستہ نظر آئے۔ ترکی میں اپنی سیاحت کے عمل پر براہوں ڈال کر رہا ہے۔ ہم سے یہ قوم محبت بھی بہت کرتی ہے لیکن ہمارا معاملہ ”ہم ہیں شقائق وہ ہیں بڑا“ والا ہے، ہم اپنے دوست ملکوں سے بھی صحیح طور پر فوائد حاصل نہیں کر پاتے۔ اپنے اندرونی غلطکاری بنا رہے۔ ساتھ ساتھ روم کے محمدی تذکرہ نے بھی حراہ دو آتشہ کر دیا روم کے بارے میں پہلے کافی تفصیل سے معروف قلمی عباسی کے سرنامہ میں پڑھا تھا (قبر قمری) دو دن قبل انتقال کر گئے اللہ جنت نصیب فرمائے (آمین) آفاقی صاحب آپ کی تحریر میں ایسا جاوہ ہے کہ کردار ذہن کی اسکرین پر پلٹے پھرنے لگتے ہیں۔ صائرا اقبال کی جہنمی کڑے،

اپنے رنگ و عکب سے انگریزی مضمون کا ترجمہ کرے، موضوع نہایت حساس ہے جس کے ساتھ غیر جانبداری سے عمدہ انصاف کیا گیا، یہ جادو کا اثر تھا یا کچھ اور اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ یہ بات ضرور ہے کہ روایات میں قریب قریب تمام علّٰی زمین کے ٹھوس جانے کا ذکر ضرور موجود ہے، عقلی الف لیلہ میں آفاق صاحب نے اس مرتبہ تاریخی قلم اسٹوڈیوز کا بطور خاص ذکر کیا۔ اسٹوڈیوز میں ایک اور ہی جہاں آباد ہوتا ہے اس کے بارے میں پڑھنے اور جاننے کا اپنا رونا سنا ہے۔“

☆ احمد خان توحیدی، کراچی سے لکھتے ہیں "شہ جون ۲۷ مئی کو مل گیا۔ شکر ہے ادارے پر نہ کہ کہاں پر ہا ہے کہ برادر مرزا رسول صاحب وقت کسی کا انتظار نہیں کرتا۔ ہونے کو بہت کچھ ہو جاتا ہے۔ ایک روپیے سے خضر ابا کی پانچ شام تک دو چر دیو سے منافع فوسل ڈھائی روپے بٹایا ہے عنت میں عقلیت جان کر دنیا بھر میں برس میں کرب جی بن جاتا ہے تو بفضل خدا ہمارے پاس کسی چیز کی کمی ہے؟ صرف جذب صادق و نیک بخلی لازم ہے۔ ازلی دشمن امر کیا رکھا یا جو گئے کی لوگ پر مدد کر تو می مفاد کے فیصلے خود کریں۔ توانا بی بحران کا فوری کالا باغ ڈیم، یوں یادوں و چشموں پر قمر فل پاؤں بنا کر جواب دیا جا سکتا ہے۔ گاور پورٹ ویس الاٹن کے بارے میں اتنا کہتا ہے کہ چین و ایران ہمارے قصص دوست میں ہر کام ریکا اور سفر اسرائیل کا مفاد عزیز ہے، اللہ تعالیٰ ہی حکومت کو قوم و ملک کے مفاد میں کام کی توفیق دے (آمین ثم آمین) مرد میدان، گاگا پہلووان کے بارے میں پڑھا۔ فن پہلووان کی درست سرپرستی کی جائے تو وطن عزیز کے پہلووان دنیا بھر میں اپنا لو ہائو کر ملک کا نام روشن کر سکتے ہیں۔ شہریال میں خوب ٹوکنا تو ڈاکٹر RME صاحب کو کرسی حیدرات پر پیلا۔ لا جواب تبصرہ تھا۔ وہ کراڈی مطالعہ رکھتے ہیں۔ واقعی ہم غیر مسلم کی طرح قانون کا احترام نہیں کرتے۔ شاید جہانگیر پشاور، منتخب حکومت نے ٹیک جٹی سے درست قومی مفاد میں ابھی کام نہ کیا تو قبائلی کارواں ہمیں نگل لے گا۔ برادر عزیز اللہ معلوم مقام، زندگی کے سچے پیش آموز واقعات واقعی سرگزشت سیر سپر... تاج سجائے والا راڈی رسالہ ہے آفاقی صاحب بھی سفر کے اولمپی سچے واقعات لکھتے ہیں۔ کامریڈ کنول کھانا، مثالی علاقہ جات قدرت کا حسین شاہکار ہیں۔ تفصیلی تحریروں کی حمایت کرتا ہوں انہیں بقول، ارنا حامدا و معزلا ابوہ، امکا شخار، مسددہ ناگوہی کے اعلیٰ تبصرے تھے۔ اب بات ہو جائے کہانیوں پر۔ نقل و اکڑ ساہد صاحب کی اچھی معلوماتی تحریر جسے مجھ پرانی، تقریری تاریخ لکھیں (محرم حقیقت) یہی ہے کہ ہم نے بھی تاریخ سے سبق نہیں سیکھا، بغیر خطاطہ کمطوباتی تحریر نیم نے تو ہماب سے جہاز اڑانے کی ابتدا پر ہی ہے ہر اسرار حادثہ، ایسا ہی تو ہمارا فقریہ رنگت سے اسلام آباد آتے لاگتا ہو گیا۔ حال کو نام و نشان نہیں موت کے سامنے، ویوی گیڈ شکاری کہانی ہے۔ ترکی کی دائمی، دلچسپ سفر کی جی کہانی ہے۔ پولیو کے قطرے ہمارے ملک میں بھی عامی حال باعث جہالت ہے۔ مسکرائیوں کے، خضر، ابراہی مرحوم کی یادوں کا گرم تازہ کرو یا نہیں آفاقی صاحب تفصیل لکھ چکے ہیں۔ خوب ریاض صاحب، رفیع خاور عرف نعمت صاحب، عظیم مزاح ادوار کا تھے۔ تفصیلی حالات لکھیں۔ قلی الف لیہ، آفاقی صاحب آپ کی عمر کتنی ہے؟ آخری پرانی 8 نابینا تصاویر کے ساتھ 1906 کے حالات کا تذکرہ یہ سلسلہ جاری رکھیں۔ سزا، قانون کا احترام ہی انسانیت ہے۔ دورتن، دربار البری کے 9 ذوق (ذوق) کے بارے میں پڑھا۔ ریاض صاحب کا دوبارہ ادویہ بریل کی نوک بھولا کائنات کی تفصیل لکھیں۔ (چھپ چکا ہے) لے پاک، کے عدلی کو ابوتدا سے درست بتانا چاہیے تھا۔ حافظ گوگرد کشین، اسلام جیسے بے شمیر زندگی بھر سے رہے ہیں۔ قلندر قطرہ زنجبیل کے پولیو کے قطرے سے ملانے والے ایسی ستاروں پر حملے ابھی 28 مئی کو لائیو میلتہ دو کر پشاور میں شہید اور چارٹی ہوئیں، نازکہ کا چند قابلِ تعریف ہیں۔ قائل جبہ، والدین اور دادا کو باہر سے ہیں۔ تاثر بھی لڑکیوں کا کاپی انجام ہوتا ہے کہ عدم جیسے معذور کی کی آؤش چھپے بھڑے انہیں گل جاتے ہیں۔ ازلہ، بابہ بائیں سننے کے باوجود نظر حسین نے مگر والوں کو اور فضل شاہنگ کے ساتھ سالنی کو شاہنگ کرائی ایک جوزا غریب بچی کو خریدتا تو قیمت نہ آجاتی (کہانی بخود پڑھیں) چرمل، جدید ہستینی دور میں علیاسک سرجری ہر طرح ممکن ہے، عدیل کو نیلم نے سب بتا دیا بشرطانہ زندگی گزارتا جمائی کاپی انجام ہوتا ہے۔ آزادی، رحمان نکبت سے شادی کے بعد میرت و کشتی تھی۔ درست مرالی، اپنی آگ، اواباش لوگوں کو سوچنا چاہیے جس کے ساتھ ایک ویس حرکت، اس کی جگہ اپنی ماں، بین ہوئی تو پھر؟ عدرا کوتا جات ایسے لوگوں کا علاج کرتا چاہیے۔ آٹھ لاکھ، عباس مرد نادہ جیسی لڑکیوں کو چل پھرتا باز احسن بناتے ہیں۔ جموی طور پر شاردہ بہت اچھا ہے۔"

☆ شاہد جہانگیر شاہ کا اعلان یہ ہے کہ ہمارے میں ایک حقیقی متعلقہ خطہ کے ہمارا ارسال ہے۔ اس بار بھی سرگزشت شاہد ویر سے پہنچا ہے۔ نہ جانے یہاں کی نوا اجنبیوں کے ساتھ کیا معاملہ ہے جو تاخیر سے شمارہ۔ مارکیٹ میں لاتے ہیں۔ مارچ 2013ء کے شمارہ میں چینی والے میرے مضمون پر اشارہ کے بارے میں ابھی تک یہ شمارہ دستوں اور اوقات کاروں کے فون اور خطوط پینڈہ کی موصول ہو رہے ہیں مگر حید (مرحوم) کے پیچھے سرن احمد جہاں صاحب سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے مضمون کی پینڈہ کی کے ساتھ یہ بھی کیا کہ مجھے یہ سرن احمد کے گاؤں (جو کہ اب ایک بہت بڑی آبادی پر مشتمل ہے) کے خیر چنگی تو ہاں کے ہر گھر ان کے پشاور کارخانہ کیا اور کیسے ہیں دیکھتے شمارہ مارکیٹ سے ملتا ہو گیا۔ وہ کہتے ہیں کہ جب میں ہفتہ وار تحلیل پر گاؤں جاتا ہوں تو لوگ قہقہہ کرتے ہیں کہ میں ملنا دیکھ رہا ہوں۔ وہ کہتے ہیں کہ میں نے بہت سے لوگوں کو اپنے ذرائع سے دیگر شہروں سے سرگزشت منگوا کر دیا۔ بہت سے لوگوں کو میں نے مشورہ دیا کہ وہ خود بھی کوئٹہ کے کامیاب کرنے کے دوسرے شہروں سے مذکورہ شمارہ منگوائیں۔ چنانچہ پینڈہ کی خود میں خوش ہیں اور اپنی بیٹی کے ہر گھر میں سرگزشت کا ذکر وہ شمارہ یادگار کے طور پر موجود ہے۔ لوگوں نے مضمون کو پسند کیا۔ خود میں خوش ہیں اور اپنی بیٹی کے ہر گھر میں سرگزشت کیسے معیار پر ہے۔ سرن احمد مضمون شاہد ویر اور خوش اس لیے ہوں کہ سیکڑوں خطوط، رسائل اور انٹرنیٹ پر ان کے شمارہ کے پشاور کے کارخانہ کے ساتھ ان کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ حید مرحوم کوئٹہ ہونے 79 برس کرنے کے بعد بھی نسل و نسل ان کے جانے والے اور ان کے ساتھ میں جانے والے لوگوں کی آج

ادارہ جاسوسی ڈائجسٹ کے مدیر کا رکن جناب رضی الدین شمیم ایزدی سے انتقال کر گئے۔ ہم ان کے اہل خانہ کے غم میں برابر کے شریک ہیں۔ قارئین سے سورۃ فاتحہ کی درخواست ہے۔

کا احوال کا جواب رہا ہے معلوماتی مضامین ڈاکٹر صاحب کی پیکان بنے جا رہے ہیں زندہ یاد ڈاکٹر صاحب - تغیر خلا اور پراسرار حادثوں الگ الگ موضوع میں مگر ہیں زبردست، پڑھتے وقت پلٹ پلٹا رہا ہوں۔ اسی تحریر کو سکون اور آرام سے پڑھنے کو تلف دو لہا ہوا جا رہا ہے۔ موت کے سانس اور جنتی گڑھے میں ڈر دوا دیتے سرگزشت والوں کو اور صاعہ اقبال اور آصف کو، کھلا کہاں کہاں سے ایسے زبردست موضوع اور معلومات ہمارے لیے لاتے ہیں۔ مسکراہٹوں کے تغیر پر ہے اور مسکراہٹیں ہر مرحلہ پر کھنکھاتی ہیں۔ کاف کی معلوماتی تحریر محترم آقا کی صاحب کی بھی ہے محبوب اسٹوڈیو بلوستان اور یقینی ناگزیر پر بہت خوب لکھا ہے۔ محبوب صاحب کے بارے میں بھی کافی دلچسپ چیزیں لکھا ہے۔ شہنشاہ صحافت اور دردِ حق پر ہے اور اپنی معلومات میں اضافہ کر لیتے۔ آپ بیتاب اپنے اپنے رنگ میں خوب مگر تفرہ فقرہ زندگی اور خاص طور پر لے لے پلک بہت اچھی تھیں۔

☆ سدرہٴ نجم کا نام گوجر اوالہ ہے۔ ”میں تین برس سے مرکز شہر کا مطالعہ کر رہی ہوں۔ لیکن اب جاموش رہنے کی عادت کھو چڑھا چاقی ہوئی اس لیے آپ کی بزم میں پہلی مرتبہ قلم اٹھانے کی جسارت کر رہی۔ امید کرتی ہوں کہ آپ میری تنگ دود کو پاہل نہیں ہونے دیں گے۔ (خوش آمدید) شہر خیال میں انہر ہوئی تو اکثر آرامی راہیں سودیہ صدارت کی جیتیز پر اس قدر بھرتے ہوئے تھے کہ جس طرح گلستانِ بلبل۔ بنیہ دوستوں کے پسندیدہ جیمے جوائے تھے اے اعجاز زمین شمار اور پورکل سے، انجم فاروق ساحلی لاہور سے، ڈاکٹر روبینہ نقیس انصاری، آبی کیا میں آپ کا روجان سکتی ہوں۔ سدرہ بانو ناگوری کراچی سے، مانی ڈنیر آپ بہت اچھا لکھتی ہوئیں آپ کی بہت فین ہوں۔ سدا ایسا لکھتی رہو۔ اس کے بعد کہانیاں کی وادی کار کیا تو ان میں پہلی جگہ بیانی، ”لے پاک“ ”پرمی“ ”آزادی“ ”ریحان لاہور“ ”نذر کراچی، باجی آپ کی کہانی کو کراسنے لا یا جائے تو حقیقت کے سوا کچھ نہیں دکھائی دیتا۔ آخر میں میگزین کی پوری نم کے لیے دعاگو ہوں۔

☆ ایم افضل کھل کی آمد عظیم اور الشکا نہ صاحب سے ”میں اپنا سرگزشت باقاعدگی سے پڑھتا ہوں۔ جب تک اس کو پڑھ نہ لوں بے قرار رہتا ہوں۔ شہر خیال میں ڈاکٹر صاحب کو مبارک باد پیش کرتا ہوں کہ انہیں دوبارہ صدرات کی کرسی سنبھالنے کے لیے منتخب کیا، لیکن اب جمہوریت کا دور دورہ ہے اور عام انتخابات میں عوام کو حق ہے کہ وہ خود فیصلہ کر لیں۔ شاہد جگتیار پٹا دے، بھائی آپ کا تبصرہ جب آنکھوں کی زینت بننا تو صندل کے درخت کی طرح دل کو نونور کر دیا۔ کیونکہ صندل کا درخت کھڑے کو جوت کھا کر بھی کھٹا لے کو خوشی وادار بنا دیتا ہے۔ (مکرمفسوس ان کا خط دھجھوں میں تقسیم ہو گیا تھا) اعجاز حسین ششار نور پور محل سے، آپ کا اس محفل میں شرکت کرنا ایسے ہے جیسے گلستان میں پھول کا کھل آنا۔ عمران بھائی شاہ کوٹ ننگر صاحب سے، آپ کی اس بزم میں شرکت پر ہم آپ کو بھل کم کرتے ہیں اور امید کرتے ہیں کہ آپ ہمیشہ اس مجلس کی زینت بنے رہیں گے۔ مدود بانو ناگوری آپ کی شرکت سرگزشت میں ایسی ہے کہ جیسے صحرا میں چائے کے لیے پانی کا چشمہ، بیت بازی ہیں اپنا شہد کو کر رہا یا قلب گفتہ ہو گیا۔ جنہی گڑھے کہانی سے یہ پیش گوئی کی جاتی ہے کہ دنیا اپنے اعمالوں کی بنا پر ناپودہ ہوتی جارہی ہیں۔ کہانی لے پالک ہے یا لے پالک پلینز آگاہہ بھیجے گا (لے پالک)۔ ”قاتل جذبہ“، ”پنی آگ“ کہانی پڑھ کر اس بات کی نشاندہی کی جا سکتی ہے کہ ہماری معاشرت فاسی کے دہانے پر کھڑی ہے کہ نہانے کب قیامت کا مظہر آن پڑے۔“۔ بقیہ میگزین کی اسٹوریوں پر زیر مطالعہ ہیں۔

☆ سعید احمد چاند کراچی سے لکھتے ہیں "میں رہیں شہر خیال، بیت باغی، ملی آزمائش میں مصروف لینے کی کوشش کرتا ہوں اور میرے خط پوسٹ کرتا ہوں۔ مگر چین چارمینے سے میرا شہر خیال وغیرہ میں نظر نہیں آتا اور نہ ہی تاخیر سے موصول خطوط میں شمار ہوتا ہے اس کی کیا وجہ ہے؟ اس قدر غلط کلمہ راہوں دیکھیں اس کا کب حاصل نکلتا ہے (وجہ تاخیر ہے ورنہ ہم پابندی سے خطوط لکھنے والوں کے منتظر رہتے ہیں) شاہد جہانگیر، ابن مقبول یا داؤد احمد مدظلہ، رانا محمد صاحب کاشغر یہ کراچی میں مجھے یاد رکھا۔ تعجب ہے ڈاکٹر کوئی کیسے بھول گئیں۔ ان سے مجھے اسکا پتہ پڑی کی امید نہیں تھی۔ یہ وہی بات ہوئی کہ میرے سے جن کے لیے وہ شوکر کرتے یہ رہ گئے۔ آپ کھڑی تو ہوں ایکشن میں سب سے پہلا دوٹ میرا ہی ہوگا آپ کے حق میں۔ آئیہ نہ بولنا۔ بہروں میں مجھے ان کے بھرے پسند آئے، ابن مقبول یا داؤد احمد مدظلہ، رانا محمد جاد، شاہد جہانگیر، عزیز اللہ صاحب سے عرض ہے کہ ڈاکٹر آر ایم۔ اے صاحب نے دلپ کمار کے متعلق جو لکھا وہ ان کی تعریف میں نہیں تھا۔ انہوں نے تو ان کی ہمدردی میں لکھا تھا، مجھے یاد ہے، دلپ کمار نے حیدر آباد کی ایک بیوہ اس سے شادی کر لی تھی تو سارہ بانو نے کتنا اوصاف چاہا تھا۔ سارہ بانو کے داؤ میں آکر دلپ کمار نے اس کو طلاق دے دی۔ اصل میں دلپ کمار کی نسل کی قاتل سارہ بانو ہی ہیں۔ ان کی والدہ بیوہ بانو نے تو جیتے جی اپنے شوہر میں احسان کو چھوڑ دیا تھا۔ میاں احسان دلیر دانش ہو کر پاکستان چلے آئے اور کراچی میں انہوں نے احسان کارپوریشن کے نام سے بس عرصہ شروع کر دی۔ پرانے لوگوں کو اب بھی بیٹے رنگ کی بس یاد ہوگی۔ دراصل اس میں اس کا بھی قصور نہیں ہے، بیوہ بانو اسے وراثت میں ملی ہے۔ سارہ بانو کی بیٹی شہناز بیگم دہلی کے "اس" بازار سے تعلق رکھتی تھیں۔ (سعید صاحب، عزیز اللہ صاحب کے خط میں ہوا شاہد جہانگیر کا خط شامل ہو گیا تھا۔ وہ تمام طور شاہد جہانگیر شاہد..... پشاور تھیں۔ ڈاکٹر رولی کا تمبرہ کوغیر تھا مگر خوب تھا۔ باقی تمبرے بھی ایسے تھے۔ آفاقی صاحب نے قلمی الف لیہ میں محبوب خان کا تعارف اور حواد یا اور آخری صفحات میں قطار بندی کے متعلق اتنا کچھ لکھا کہ یورپیت ہونے لگی۔ سچ بانیوں میں شہلا عارف کی "لے پاک" اختر لاہوری کی "آٹھ لاکھ" عذر کی "۱۲۱ آگ" اچھی لکھیں باقی درمیانہ ہیں۔ ماضی کی بہرویں شہرہ آرا کے متعلق معلوم نہیں ہو سکا کرب و دس حال میں ہیں۔ گلوکارانی

جلیبا احسان شکر کا مافوقی سے کہتے ہیں ”ہر ماہ کی طرح دیدہ زیب اور خوبصورت کہانوں سے بھرپور سرگزشت نے اپنا دیوار گرا لیا۔ ایسی نوا اور دہشتی سوغات کا ایک ایک شکار ایک سے بڑھ کر ایک۔ پہلے اسے پڑھیں پھر پہلے اسے پڑھیں، ہر ماہ یہی نقش رشتی ہے۔ پڑھ کر پیاس اور بھی بڑھنے لگتی ہے۔ علم چڑھتی ایسی ہے کہ جتنا خرچ کرو اتنا ہی بڑھتا ہے۔ ایسی معلومات بہت کم پڑھنے کو ملتی ہیں۔ میں نے بہت سے معلوماتی ماہنامے پڑھے ہیں لیکن سرگزشت ان میں سے الگ، بیست اور معیاری پرچہ ہے۔ بہت عرصے سے پڑھ رہا ہوں۔ پہلے کرکٹ کے بارے میں عقلم کلڈزوں کے بارے میں مواد شامل ہوتا تھا۔ اب کچھ عرصے سے پڑھنے کو نہیں مل رہا۔ ہر ماہ نہ نسی دقتے سے اس پر بھی قلم چلایا کریں۔ قلمی الف لیلا کا سامانی سے چل رہی ہے۔ قلم کے علاوہ پاکستانی ڈراموں کے حوالے سے بھی لکھا جائے تو بہت اچھا ہوگا اور بہت سے عقلم ڈراما فنکار، ڈائریکٹر، رائٹرز کے بارے میں معلومات حاصل ہو جائیں گی۔ کیونکہ ڈراما کی صنعت جو کہ پاکستان کی مانی ہوئی صنعت ہے ڈراموں اور فلموں کی بات ہو اور پاکستان کے شاعروں کی بات نہ ہو یہ ذاتی ہوگی۔ اب تک ان پر بہت ہی کم لکھا گیا ہے۔ اور لکھا بھی کیا ہے تو مختصر مختصر، پلینز پاکستانی شاعروں پر ہر ماہ تفصیلی اور جامع مضمون شائع کریں (سرگزشت واحد پرچہ ہے جو ہر ماہ شاعر ادیب کی سوانح شائع کرتا ہے) احمد فراز، ناصر کاظمی، مرزا غالب، پروین شاکر، احسان دانش، سب ہمارے ملک کا سرمایہ ہیں۔ امید ہے آپ ہماری تجویز پر غور اور عمل ضرور کریں گے؟ (نقرا بیاس پرمچر پورٹر پر آچکی ہے) سفر نامے پڑھتے ہوئے ہمیں خیال آیا کہ اب تک بہت سے سفر نامے ہم پڑھ چکے ہیں۔ مصر کے حوالے سے ابھی تک مکمل اور جامع سفر نامے شائع کیوں نہیں ہوئے۔ (شاید آپ سرگزشت کے نئے کارکن میں شامل ہیں)

سائنسی ادب کی ایجادات پر بہت کچھ لکھا گیا ہے اور امید ہے سلسلہ چلتا رہے گا۔ بہت عرصہ پہلے غالباً 2004 میں ہم نے غلام قادر صاحب کی ترجمہ شدہ خبر پر بھی قلمی بامری مسجد شہید کے حوالے سے اور اس طرح کی اور بھی بہت سی معلوماتی خبریں شائع ہوتی دینی چاہئیں۔ اب بات ہو جائے مشہور شخصیات کے حوالے سے۔ فلمی ٹیلی ناول نگاروں میں جنرل... بیڈلے ایک بہت بے باک ناول نگار تھے اس پر بھی مکمل مضمون ہونا چاہیے۔ اسی طرح ادب کا ایک اور خاص نام آقا تھا کرکشی بھی ہے اسے بھی مت بھولیں گا (آقا تھا کرکشی اور جنرل بیڈلے پر مضامین اسی سال کے شمارے میں شائع ہوئے ہیں) اس کے علاوہ اسلامی دنیا کے سب سے بڑے راک اسٹار سیج یوسف کے بارے میں بھی لکھیں۔ جس کے 3 کروڑ 20 لاکھ اسلامی کیت فروخت ہو چکے ہیں۔ مائیکل ڈیل کی زندگی کے بارے میں بھی کچھ ہونا چاہیے۔ جس نے کمپیوٹر کی دنیا میں انقلاب برپا کر دیا۔

بھائی ان سب پر مضمون آچکے ہے (آرت کیو الڈ کے بارے میں فرمائش کرنے والا تھا۔ آخر دل کول سے راہ ہوتی ہے ناں، اس ماہ وہ شائع ہو گیا۔ شکر ہے سرگزشت۔ چھٹی ٹکڑے ایک عمدہ معلومات رہی جہاں سائنس اور پراسراریت دونوں زیر بحث رہے۔ انجیل کی بھاگ دوڑ آخر کامیاب رہی اور بہت سے حقائق سے پردہ جاک ہوا۔ موت کے سائے الیڈو چرے پھر پور رہی۔ سام اور جری کی ہمت کی دادوں کا جو واقعی موت کے سائے میں رہے۔ ہمت کر کے بال بال بچے۔ دور قلم طوفانی پارچہ تھا۔ پاکستانی چینل لہری صاحب پر مضمون نے متاثر کیا اور واقعی وہ عظیم انسان تھے۔ عظیم اور بلند کردار کے مالک انسان ہمیشہ زندہ رہتے ہیں۔ پراسرار احادیث بھی خوب رہی ہر رنگ اور ڈھنگ میں سراغ لگانے کی کوشش کی گئی پھر بھی جی صاف طور پر واضح نہ ہو سکا۔

ملک ڈاکٹر وینڈر شایب انصاری، بمکر سے قطر آئیں، سب سے پہلے میں اوزار شرف کو وزیر اعظم نے میں مبارک باد بتی ہوں۔ میں اس بار کا سروس
بند نہیں آیا۔ ایک لکڑی کا جیسے میں لوٹ کر بیٹھا گیا ہوں شہر خیال میں پہنچے تو آغا حسین صاحب سے کہے بغیر نہ رکنے کے اس میں شہر سے والی کیا بات ہے۔ میں تو
سب کو یاد دلاتی رہتی ہوں۔ کسی کام نہیں ہوں کی انھیں لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ میں ان کو بھول جاتی ہوں تمام احباب میرے ذہن میں رہتے ہیں۔ یہ
ادوات ہے کہ لوگ مجھے بھلا دیتے ہیں۔ اپنے خاص میں یاد نہیں رکھتے۔ ان مقبول جاوید صدیقی صاحب، یاد آوری اور دعاؤں کے لیے منگھو ہوں۔ امید ہے چندہ
بھی دعاؤں میں یاد نہیں گئے۔ رانا محمد جہاں میں تو ہر بار کو شرف کرتی ہوں کہ آپ سب کے درمیان میں لیکن کوئی نہ کوئی ایسی ضرورت آجاتی ہے اور میں جاؤں بھی
شال نہیں ہوتی ہوں۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ کوئی پریشانی دل و دماغ پر اس طرح تلخ بنتی ہے کہ میں کچھ لکھنے کے قابل ہی نہیں رہتی۔ ظاہر ہے کہ لکھنے کے
لے دل اور دماغ کا فریش ہونا ضروری ہے۔ رانا محمد شاہد پر اعلیٰ کی بیروں کے خاندان سے نہیں ہے مگر میں ایک بزرگ کی منو بی بی ہوں، بھانجیوں میں لے
پاک نے بہت احترام کیا۔ میں ایک دیر حال سے ایک فیصلہ کرنے کا سوچ رہی ہوں مگر سوال والے اجازت نہیں دیتے۔ ہم عورتوں کی یہی تو ایک مجبوری ہے
کہ وہ اپنا فیصلہ ہی نہیں کر سکتیں۔ اس کہانی نے بہت کچھ سونے پر مجبور کر دیا ہے۔ آپ سب کے لیے دھرم ساری دعا میں۔

عارف حسین، سکھر۔ شاعرین۔ نسیم الدین خان، فیضی اللہ (نوال کوٹ)۔ نوید شہزاد، احسن قاروقی، محمد محمود، نازش انصار، وسیم منصور قاروقی، ملک میاں سرور (لاہور)۔ محمد ظفر، سید نجم الحسن، اہم تسلیم (سیالکوٹ)۔ عاصم احسن، قاروقی خان (جھک)۔ ثناء رحمتی، نعیم ارباز خان (ملتان)۔ فرخان خان، رستماریاں (چنیوٹ)۔ فرحت حسین، نذیر بزاز، رضا احسن، نعمان (پشاور)۔ محمد رمضان، ادریس محمد خان (کراچی)۔ زہرہ گوہر (کراچی)۔

استادِ ادب

ڈاکٹر ساجد امجد

الفاظ سے کہیلنا، لفظوں کو زبان دینا ایک ایسا فن ہے جو ہر کسی کو اللہ تعالیٰ ودیعت نہیں کرتا۔ خاندانی پیشہ کچھ اورتھا جس سے ادب کا دور دور تک تعلق نہیں تھا لیکن جب الفاظ کے سوتے پھوٹے، وہ اپنی دنیا آپ تعمیر کرتے ہوئے ادب کا ایسا شناور بن گیا کہ کوئی اس کی گرد کو بھی پا نہیں سکا، انشائیہ کی راہ ایسی متعین کردی کہ لوگ پڑھنے کو ترسنے لگے، ڈاکٹر وزیر آغا جیسی شخصیت بھی اس کی قدردان بن گئی بلکہ انہی نے اس کے اندر سے فن کی دنیا تلاش کی۔

ادب کی دنیا میں پچھل مچا دینے والی شخصیت کا زندگی نامہ

تلے اوپر کے بچے گلی سر پر اٹھائے کھیل رہے تھے۔ کہیں کہیں سے کوئی گالی نعرے کی صورت بلند ہوتی پھر کوئی دوسرا آپس میں گتھم گتھا ہو جاتے۔ صل صفائی کروانے والا لشکر فوراً دوڑ پڑتا۔ کچھ دیر بعد سیاسی حریفوں کی طرح دونوں لڑنے والے پھر کھیل میں لگ جاتے۔

اس روز حریف کو گالی دینے، گتھم گتھا ہونے کی باری غلام جیلانی کی تھی۔ یہ دنگل ابھی شروع ہوا ہی تھا کہ شیخ محمد دین نے گلی میں قدم رکھا۔ بلند ہونے والی گالی کے آخری الفاظ ان کے کانوں میں بھی پڑ گئے تھے لیکن انہوں نے میدانِ کارزار میں رکنا مناسب نہیں سمجھا اور گھر میں چلے آئے۔

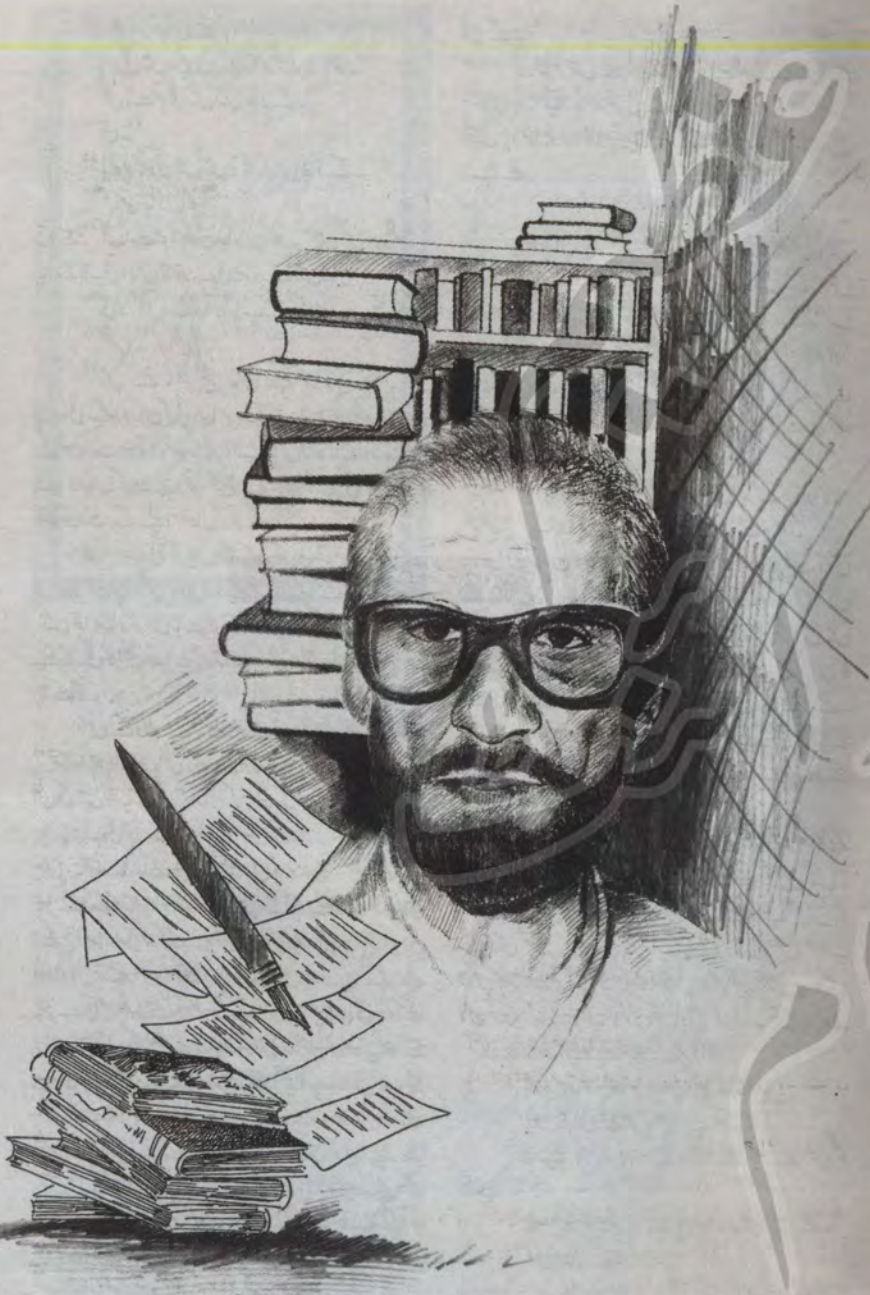
گھر میں داخل ہوتے ہی ان کی نظر اپنے والد یعنی غلام جیلانی کے دادا پر پڑی جو صحن میں بیٹھے حقہ پی رہے تھے۔ وہ ہمیشہ غلام جیلانی کی حمایت میں شمشیر بدست رہتے تھے اس لیے ان کے سامنے واقعے کی شدت بیان کرتا بہت ضروری تھا۔

”بس اباجی اب حد ہو گئی ہے۔ غلام بہت بگڑ گیا ہے۔“
”ارے اس عمر میں تو بھی ایسا ہی تھا۔ اک ذرا گلی میں جا کر بچوں کے ساتھ کھیل لیتا ہے تو حیرا کیا چلا جاتا ہے۔“
”میں نے آج اپنے کانوں سے سن لیا ہے۔“

”گالیاں بک رہا ہوگا۔“
”یہ کوئی بات ہی نہیں ہے؟“
”ایسی بات بھی نہیں ہے کہ تم اس کی شکایت مجھ سے کرنے بیٹھ گئے۔“
”بس وہ کل سے اسکول جائے گا۔“
”کچھ دن اسے کھیلنے کو دے دے پھر تو اسے ہماری طرح کام دھندے میں لگ ہی جاتا ہے۔“
”کام دھندے کے لیے بھی کچھ نہ کچھ پڑھنا ضروری ہوتا ہے۔ یہ آپ کا زمانہ نہیں ہے آج کل تجارت پڑھے لکھوں کے ہاتھ میں ہے۔“ شیخ محمد دین نے کہا اور باپ کے پاس سے ہٹ گئے۔

دادا کا مصالحو اندرونِ کام نہ آیا اور شیخ محمد دین صحن میں جار پائی ڈال کر بیٹھ گئے کہ آنے دو غلام جیلانی کو۔ حقے کی گڑ گڑا ہٹ سے صحن گونج رہا تھا۔

غلام جیلانی دنگل سے نکلا۔ کپڑے جھاڑے اور گھر میں داخل ہوا۔ حقے کی گڑ گڑا ہٹ کی آواز اس کے کانوں میں اس وقت آئی جب وہ واپس نہیں جاسکتا تھا۔ حقے کی گولہ باری سے بچتا ممکن نہیں رہا تھا۔ اس نے بچتا بھی چاہا تو باپ کی آواز نے اسے روک لیا۔



”اچھا آؤ، کہاں تھے تم؟“

”باہر گلی میں، بچوں کے ساتھ کھیل رہا تھا۔“

”کل سے تم گلی میں نہیں جاؤ گے۔“

”جی۔“

”یہ تو چھوٹی گلی میں نہیں تو پھر کہاں جاؤ گے۔“

”کہاں جاؤں گا؟“

”کل سے تم اسکول جا رہے ہو۔ تمہیں سختی اور قلم مل جائے گا۔ فی الحال قاعدے کی ضرورت نہیں۔“

”جی۔“ اس نے کہا اور باپ کے سامنے سے ہٹے لگا۔

”ٹھہرو۔“ وہ ٹھہر گیا۔

”میں نے ماسٹر شیر خان سے کہہ دیا ہے کہ اگر بڑھائی کے دوران کوئی ایسا مرحلہ آجائے جہاں شدید پٹائی کی ضرورت ہو تو وہ تمہارا چچا اپنے پاس رکھ لے اور ہڈیاں جچھے واپس کر دے۔ تم آج کے بعد سے گلی کو صرف آمد و رفت کے لیے استعمال کرو گے۔“

غلام جیلانی کو یوں لگا جیسے گھر کی تمام پتھیں ایک ساتھ زمین پر آ گئی ہوں۔ اسے اسکول جانے کا اتنا انہوس نہیں تھا جتنا کہ اس بات کا تھا کہ اب وہ گلی میں نہیں کھیل سکے گا۔ گلی کا اگلی نصاب چھوڑ کر اسکول کا معمولی قاعدہ بڑھانا پڑے گا۔

اس کے والد نے اسے دھمکانے کے لیے جویہ کہا تھا۔

”تمہارا چچا اپنے پاس رکھ لے اور ہڈیاں جچھے دے دے۔“

ان کی اس نصیحت کی ترجمانی کرتا تھا کہ اس خاندان کا آبائی پیشہ چمڑے کی تجارت تھا۔

تجارت کے دوسرے شعبوں پر ہندو قابض تھے لیکن چمڑے کے کاروبار کو ہندو ہاتھ نہیں لگاتے تھے۔ غلام جیلانی کے پردادا حاجی محمد تقسیم نے اس کاروبار کو قبول کر لیا۔ ان کی اولادوں نے اس کاروبار کو مزید وسعت دینے کے لیے چمڑے کی مصنوعات کی طرف توجہ دی چنانچہ ان کی بدولت زریں جوتوں کی صنعت کو بہت فروغ حاصل ہوا۔ یہ جوتے بیرون ملک بھی برآمد کیے جاتے تھے۔ یہ کاروبار اب تک چلا آ رہا تھا۔ غلام جیلانی کے والد کتبے کے دیگر افراد سے قدرے مختلف تھے۔ انہوں نے تجارت ہی کو اپنا پیشہ بنایا لیکن اس میں کم نہیں ہو گئے۔ سماجی اور سیاسی امور میں بھی دلچسپی لیتے رہے۔ انجمن خواجهگان کے صدر بنائے گئے۔ میونسپل کونسل منتخب ہوئے۔ مجلس احرار سے وابستہ ہوئے اور جب قرارداد لاہور منظور کرنی گئی تو مسلم لیگ کے سرگرم رکن

بن گئے۔

خود شاعر نہیں تھے لیکن شاعری سے شغف تھا۔ حالی کی مسمد اور حفیظ جالندھری کے شاہ نامہ اسلام کا بیشتر حصہ انہیں یاد تھا جو وہ غلام جیلانی کے کانوں تک بھی پہنچاتے رہتے تھے۔

☆☆☆

یہ خاندان تلہ گنگ (ضلع جہلم، حال پکوال) میں صدیوں سے آباد تھا۔ اجداد کا تعلق ہندوؤں کے سہگل خاندان سے تھا۔ اس خاندان کے کسی بزرگ نے کب اسلام قبول کیا یہ اب کسی کو بھی یاد نہیں رہا تھا۔ اسلام اور تجارت اس خاندان نے آکھ کھولتے ہی دیکھی تھی۔ اپنی خوش حالی کی بدولت تلہ گنگ میں یہ خاندان عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔

”ابا، ہمارے دادا کا نام تو حاجی میاں احمد ہے پردادا کا نام کیا تھا؟“ ایک روز غلام جیلانی نے اپنے والد سے پوچھا۔

”بیٹا ان کا نام تھا حاجی محمد تقسیم۔ بڑے نیک آدمی تھے۔ بچپن میں ہی قرآن مجید حفظ کر لیا تھا۔ وہ سارا سال قرآن مجید کا درود کرتے اور رمضان کے مہینے میں تراویح میں سناتے تھے۔ بڑی شہرت تھی ان کے پڑھنے کی۔ اس کا انعام اللہ نے یہ دیا تھا کہ انہوں نے گنی ج کیے تھے۔ تمہارے دادا بتاتے ہیں کہ جب ایک مرتبہ وہ حج پر جانے لگے تو دو دور دور سے عزیز و اقربا کو بلا لیا۔ جب سب جمع ہو گئے تو انہیں نصیحت کی۔

”اللہ کی سی کو مضبوطی سے تھام لو اور خاندان کے شیرازے کو بکھر نہ دو۔۔۔۔۔“ اور بہت سی نصیحتیں کیں۔ بعض لوگوں کو حیرت ہوئی کہ اس سے پہلے جب بھی حج کو گئے ایسی نصیحتیں کبھی نہیں کیں اب کیوں کر رہے ہیں۔ جب ارض حجاز سے خبر آئی کہ ان کا انتقال ہو گیا اور انہیں جدہ میں دفن کر دیا گیا ہے تب لوگوں کو یاد آیا کہ وہ یہ نصیحتیں کیوں کر رہے تھے۔ ایسے تھے تمہارے پردادا۔“

”پھر کیا ہوا؟“ غلام جیلانی نے تقاضا کیا۔

”یہ کوئی کہانی ہے جو پوچھ رہے ہو کہ پھر کیا ہوا۔“

”بتائیے ناں، ہمارے دادا کے بارے میں تو بتائیے۔“

”چلو اچھا سنو۔ تمہارے پردادا کے تین بیٹے تھے۔“

”کون کون سے؟“

”چپ چاپ سنو۔ حاجی میاں احمد، حاجی غلام

یاسین، حاجی میاں محمد۔ یہ تینوں اپنا آبائی کام یعنی چمڑے کا کاروبار کرتے تھے۔ ان تینوں کی بدولت تلہ گنگ کے زریں جوتے دنیا بھر میں مشہور ہوئے۔ اب تمہارے دادا اور میں بھی اسی تجارت سے وابستہ ہیں اور بڑے ہو کر تمہیں بھی یہی کرنا ہے۔“

یہاں تک پہنچنے کے بعد وہ کچھ اور نہ سنا سکے کیونکہ اس کے بعد ایسی باتیں نہیں جو وہ غلام جیلانی کو سنائیں سکتے تھے بلکہ اب دوبارہ خود بھی سننا نہیں چاہتے تھے۔

غلام جیلانی ابھی بہت چھوٹا تھا کہ اس کی والدہ اور والد کے درمیان گھریلو جھگڑے شروع ہو گئے۔ یہ تنازع اتنا بڑھا کہ خاندان کے بزرگ بھی اسے طے نہ کروا سکے۔ والدہ ناراض ہو کر سیکے چلی گئیں۔ اب یہ رسائی شروع ہو گئی کہ وہ آنے کو تیار نہیں ہیں۔

محمد دین کہتے تھے کہ بیوی خود گئی ہے خود چلی آئے۔ میرے دروازے کھلے ہوئے ہیں۔ بیوی کے سینے والے بعد تھے کہ محمد دین خود اپنی بیوی کو لینے ان کے گاؤں پہنچی آئیں۔ معمولی سے جھگڑے نے اتنا پرستی کی خوف ناک شکل اختیار کر لی اور آخر کار ہمیشہ کے لیے دونوں کے راستے جدا ہو گئے۔

اس جھگڑے کا سب سے زیادہ نقصان غلام جیلانی کو اٹھانا پڑا۔ وہ معصوم ماں سے چھین لیا گیا اور باپ کے پاس رہنے پر مجبور ہو گیا۔

☆☆☆

غلام جیلانی باپ کے حکم پر تلہ گنگ کے پرائمری اسکول بھیج دیا گیا۔ باپ کا اثر و رسوخ اتنا تھا کہ اسکول پہنچتے ہی ہیڈ ماسٹر غلام حسین کے کمرے میں پہنچا دیا گیا۔ غالباً باپ نے کچھ ہدایات دی تھیں جو ہیڈ ماسٹر کو غلام جیلانی تک پہنچانی تھیں۔

”اب تم اپنے محلے کی گلی میں نہیں ہو، اسکول میں ہو۔“

”جی، مجھے ابانے بتا دیا تھا۔“

”یہ بھی بتا دیا ہوگا کہ تمہیں یہاں کس طرح رہنا ہے؟“

”نہیں یہ تو نہیں بتایا۔“

”شرارتیں بالکل نہیں ہوں گی۔ گلی میں سکی ہوئی گالیاں یہاں نہیں دہراؤ گے۔“

”اچھا ہوا آپ نے مجھے بتا دیا۔“

”اگر ہر اسیں تو جانتے ہو کیا ہوگا؟“

”مجھے کیا معلوم۔“

”یہ میں نہیں ماسٹر شیر خان تمہیں بتائیں گے۔“ ہیڈ

سوانحی خاکہ

نام: غلام جیلانی

تخلص: اصغر

والد: شیخ محمد دین

پیدائش: یکم جون 1918ء تلہ گنگ، ضلع جہلم حال پکوال

تعلیم: میٹرک، گورنمنٹ اسکول تلہ گنگ۔ ایف اے، گورنمنٹ کالج کیمبل پور۔ بی اے، اسلامیہ کالج لاہور۔ ایم اے انگریزی، پشاور کالج۔

ملازمت: زمیندارہ کالج، گجرات۔ گوجر خان، جوہر آباد۔ گورنمنٹ کالج سرگودھا۔

اعزاز: ترقی یافتہ امتیاز

وفات: 26 دسمبر 2006ء سرگودھا

ماسٹر نے کہا اور ماسٹر شیر خان کو بلایا۔

ماسٹر شیر خان کو دیکھتے ہی غلام جیلانی کو باپ کی باتیں یاد آ گئیں۔ اپنی کھال اترتی ہوئی محسوس ہوئی۔ نام ہی ایسا تھا کہ دہشت تو ہونی ہی تھی۔

”غلام جیلانی، تمہیں یہاں رہ کر صرف پڑھنا ہے ورنہ تمہارے والد نے بتا دیا ہوگا کہ تمہارے ساتھ کیا ہوگا۔“

غلام جیلانی میں بولنے کی سکت نہیں رہی۔ ماسٹر شیر خان پھر دھاڑے۔ ”تمہارے والد نے مجھے پوری اجازت دے دی ہے کہ میں تمہاری پٹائی کروں لہذا دل لگا کر پڑھنا ہوگا۔“

غلام جیلانی نے پابندی سے اسکول جانا شروع کر دیا۔ گلی کی درس گاہ سے اس کا رابطہ ٹوٹ گیا۔ اسکول سے آنے کے بعد بھی اسے گلی میں جانے اور بچوں کے ساتھ کھیلنے کی اجازت نہیں تھی۔ یہ موقع اسے صرف اس وقت ملتا تھا جب وہ اپنی تعلیم میں اپنی ماں کے پاس رہنے جاتا تھا۔

اپنے والد کے جلائی حصار سے نکل کر جب وہ ماں کے پاس جاتا تو اسے ایسی فرحت ملتی جیسے ٹھنڈے پانی کے چشمے میں اتر گیا ہو۔ جب تک ماں کے پاس رہتا خود کو ہر مصیبت سے دور سمجھتا۔ ماں کی مکرانہ اس کے رگ و پے میں اتر جاتی اور وہ نہال ہو جاتا۔

اسی جاہ وجلال کی کیفیات سے دوچار ہوتے ہوئے وہ عمر کی منزلیں طے کرتا رہا۔ پرائمری پاس کر لی تو اسے گورنمنٹ ہائی اسکول تلنگ میں داخل کروادیا گیا۔

اس کے خاندان میں تعلیم کا رجحان نہیں تھا لیکن غلام جیلانی کسی اور طرح کا لڑکا ثابت ہو رہا تھا۔ اسے پڑھنے کا شوق ہی نہیں جنون تھا۔ گھر میں تین اخبارات ”زمیندار، سیاست اور الہلال“ آتے تھے۔ غلام جیلانی کو جیسے ہی اردو کی شد بد ہوئی وہ ان اخبارات پر ٹوٹ پڑا۔ گلی سے نانا ٹوٹ ہی چکا تھا اس نے ایک گلی پڑوس کے محلے میں قائم کر لی جہاں ایک لائبریری تھی جس میں یہ تین اخبار رکھے ہوئے تھے۔ زمیندار تو اس کی آنکھوں کا تارابن گیا۔ اس اخبار نے وقت سے پہلے اس کے سیاسی شعور کو بیدار کر دیا۔ ملک کے سیاسی حالات کیا ہیں اس کی عمر کے بچوں کو معلوم نہیں تھے لیکن اسے معلوم تھے۔ وہ الہلال کی طرف راغب ہوا تو اس کے اندر ادبی شعور نے بھر پور انگڑائی لی۔ سوچا کرتا تھا اسی ہی شہنشاہ اردو وہ بھی لکھنے لگے جیسے اس اخبار کے اداروں میں ہوتی ہے لیکن اس کے لیے ابھی وقت درکار تھا۔ اسکول میں اس کی انگریزی کی دھوم مچی ہوئی تھی۔

تلنگ میں ایک بڑا عوامی جلسہ ہوا۔ باپ کے ساتھ وہ بھی اس جلسے میں گیا۔ بڑا جھوم تھا۔ چند تقریروں کے بعد نفیس غلیلی اسٹیج پر آئے۔ وہ بنیادی طور پر ایکسپرتے لیکن شعر بھی کہتے تھے اور شعر تحت اللفظ میں پڑھتے تھے۔ انداز ایسا تھا کہ دلوں میں آگ لگادے۔ اس وقت بھی یہ عالم تھا کہ حاضرین پر وجد طاری ہو گیا۔ وہ نظم ختم کر کے اسٹیج سے نیچے اترے تو بڑی دیر تک میدان تالیوں اور نعروں سے گونجنے لگا۔

وہ جلسے سے واپس آیا تو اس کی عجیب حالت تھی۔ نفیس غلیلی کی جس طرح پذیرائی ہوئی تھی اس کا جی جاہتا تھا اس کی بھی اسی طرح پذیرائی ہو۔ لوگ اس کے لیے بھی تالیاں بجا سکیں۔ یہ تو جب ہوتا جب وہ نفیس غلیلی ہوتا، وہ یہ روپ کیسے دھارے؟

اس نے اسی رات نفیس غلیلی کے رنگ میں ایک نظم کہہ ڈالی۔ وہی انقلابی اعزاز، وہی سیاسی بازنشت اور سب سے بڑی بات یہ کہ پوری نظم وزن میں تھی۔ اس وقت تو اسے وزن کا شعور بھی نہیں تھا۔ بہت بعد میں جب اس نے اس نظم کو دیکھا تو حیران رہ گیا اور یہ کہنے پر مجبور ہو گیا۔ ”وزن کے متعلق میری یہ رائے ہے کہ اگر ان اللہ تعالیٰ کی دین ہے۔“

یہ اللہ کی دین ہی تو تھی کہ تیرہ سال کی عمر میں وہ وزن میں شعر کہہ رہا تھا اور کسی کا یہ قول اس پر صادق آ رہا تھا۔ ”شعر اچھا برا تو بعد میں ہوتا ہے پہلے وزن میں تو ہو۔“

اس واقعے کے بعد اس کی بہت نے کچھ پڑوئے۔ ہر شام اسے باپ کی طرف سے حالی کی سمدس یا حنیفہ کے شاہنامہ اسلام سے گزارہ جاتا تھا۔ ملت اسلامیہ کے عروج و زوال کی داستانیں اس کے کانوں میں پڑتی رہتی تھیں۔ یہ موضوع اسے ازبر ہو گیا تھا۔ اس نے جب کچھ اور نظمیں کہنے کی کوشش کی تو یہی موضوع اس کے پیش نظر رہا اور کئی نظمیں کہہ ڈالیں۔ مطالعہ کی عادت نے ذخیرہ الفاظ مہیا کر دیا تھا لہذا آسانی نظمیں کہتا رہا۔

اس کا یہ سفر اتنا خاموش تھا کہ والد صاحب کو بھی خبر نہ ہو سکی کہ برخوردار کیا فرما رہے ہیں۔ مطالعے کا شوق بڑھتا رہا۔ میٹرک کا امتحان پاس کر لیا۔

خاندانی روایت کے اعتبار سے میٹرک تک کی تعلیم بہت تھی۔ تجارت پیشہ خاندانوں میں تعلیم نہیں کاروبار کرنے کا سلیقہ اہمیت رکھتا تھا۔ ان کے خاندان کا طریقہ بھی یہی تھا۔ جوان ہونے کے بعد بننا کاروبار سنبھالنا تھا لیکن غلام جیلانی کو کاروبار سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ گھر میں آنے والے اخبارات کے مطالعہ نے مزید علم حاصل کرنے کی شیخ دل میں روشن کر دی تھی۔ والد تو بدلتے ہوئے ماحول میں تعلیم کی اہمیت کو سمجھ رہے تھے لیکن دادا کی ضد تھی کہ وہ کتابوں میں اپنا وقت ضائع کرنے کے بجائے کاروبار میں ہاتھ بٹائے۔ شیخ محمد دین بھی نیم دلی سے باپ کی ہاں میں ہاں ملا رہے تھے لیکن غلام جیلانی کی ضد کے آگے دونوں مجبور ہو گئے۔ دادا یہ کہہ چپ ہو گئے کہ کچھ تعلیم اور حاصل کر لے پھر اسے کاروبار ہی تو سنبھالنا ہے۔ غلام جیلانی نے بھی سوچا کہ ”کچھ تعلیم اور“ کے طعنے کے ساتھ ہی سہی وہ باہر تو نکلے، بعد کی بعد میں دیکھی جائے گی۔ اس نے دادا سے وعدہ کیا کہ واپس آ کر وہ کاروبار سنبھال لے گا۔

وہ مزید تعلیم کے لیے گورنمنٹ انٹر کالج کیمبل پور (جواب الگ موسوم ہوتا ہے) میں داخل ہو گیا۔ وہ یہاں آ تو گیا تھا لیکن انجمنی ماحول میں اس کا دم گھٹ رہا تھا۔ کبھی بھی تو یہ سوچنے لگتا تھا کہ کاروبار سنبھال لیتا تو اچھا تھا لیکن جب کلاس میں جاتا اور علمی معلومات میں اضافہ ہوتا ہوا محسوس کرتا تو اسے اپنا فیصلہ درست معلوم ہوتا۔ وہ اپنے ہٹکنگ ریلے بالوں میں ہاتھ پھیرتا اور خود سے کہتا، چل

بھڑ (چل چھوڑ) جو ہوا اچھا ہوا۔ چند دوست ملے لیکن ان سے دلی رفاقت نہیں تھی۔

کئی مہینے کی تنہائی کے بعد اس کی ملاقات سید ضمیر جعفری نام کے ایک طالب علم سے ہوئی۔ غلام جیلانی ایک درخت کے نیچے بیٹھا کاغذ پر کچھ لکھ رہا تھا کہ ایک لڑکا اس کے پاس آ کر بیٹھ گیا۔

”یار یہ کوئی اچھی بات تو نہیں کہ میں کسی تعارف کے بغیر تمہارے پاس آ کر بیٹھ گیا اور تمہیں ڈسٹرب کر رہا ہوں لیکن تمہاری تنہائی مجھے اچھی لگی۔ سوچا تم سے اپنا تعارف کروا دوں۔ میرا نام سید ضمیر جعفری ہے۔“

”میرا نام غلام جیلانی اصغر ہے۔“

”عالی، اصغر تمہارا خالص ہے تم شعاعی کرتے ہو؟“

”ہاں، نظمیں لکھتا ہوں۔“

”پھر تو ہم دونوں کی خوب گزرے گی۔ میں بھی شعر کہتا ہوں۔“

”ارے واہ، یہ تو خوب انہونی ہوئی کہ ہم دونوں کی ملاقات ہو گئی۔ ہم کوئی اتنے بڑے شاعر تو ہیں نہیں کہ ہمیں کوئی مشاعرے میں بلائے۔ ایک دوسرے کو سنا کر دل خوش کر لیا کریں گے۔“

”دو میں تمہیں اپنے دوست شیر محمد شاد سے ملواتا ہوں وہ بھی شعر کہتا ہے۔“ وہ دونوں شیر محمد شاد کی تلاش میں نکلے اور ایک جگہ اسے ڈھونڈ لیا۔ وہ ضمیر جعفری کے ساتھ ایک نئے لڑکے کو دیکھ کر حیران ضرور ہوا تھا لیکن پھر اس طرح محل مل گیا جیسے برسوں کا حلق ہو۔

وہ تینوں اس طرح ایک ساتھ دیکھے جانے لگے جیسے ان تینوں کے علاوہ کالج میں کوئی چوتھا نہ ہو۔ اکثر لاہور کی اور وہاں کے ادبی ماحول کی باتیں ہو کرتی تھیں۔ اختر شیرانی کی شاعری پڑھی جاتی تھی یا پھر بدلتے ہوئے سیاسی حالات پر بحثیں ہونے لگتی تھیں۔ ان باغیانہ تحریکوں پر باتیں ہوتی تھیں جو ہندوستان کی آزادی کے لیے چلائی جا رہی تھیں۔ ان دنوں پڑھے لکھے جوانوں کے یہی موضوعات تھے۔

غلام جیلانی نظمیں لکھ رہا تھا جبکہ شیر محمد شاد غزلوں کا طرفدار تھا اور اکثر اسے غزل کہنے پر اکساتا تھا۔

”دیکھو تم جو یہ طویل نظمیں کہتے ہو اس ایک خیال کو ایک شعر میں ادا کیا جاسکتا ہے۔ غزل کے پانچ شعر کہہ لو تو مجھو تم نے پانچ نظمیں کہہ لیں۔“

”موضوع کے ساتھ جو انصاف نظم میں ہوتا ہے غزل

تصفیفات

میں اور میں، ایک ذرا شام سے پہلے، نرم دم گفتگو، شاعری کے پروں پر (انگریزی)

تالیفات

نذرِ عقاب، پاکستان کا بہترین ادب 1968
پاکستان کا بہترین ادب 1970ء

میں تو نہیں ہوتا۔ اس میں تو صرف اشارہ کیا جاسکتا ہے۔“

”یہ اشارہ ہی تو قیامت ہوتا ہے پیارے۔“

مشاعروں میں بھی غزلوں پر ہی وادہ ملتی ہے کیونکہ موضوع فوراً سامع تک پہنچتا ہے۔ نظم جب تک مکمل نہ ہو داد دینے کو جی ہی نہیں چاہتا۔“

یہ تقریباً روز ہی کا قصہ تھا۔ روزانہ ہی یہ باتیں ہوا کرتی تھیں لیکن بچپن میں جو نقش قائم ہو گئے تھے اتنی جلدی مٹنے والے نہیں تھے۔ وہ بدستور نظموں سے چننا رہا۔

ایک حادثے نے اس سے پہلی نظم کھسکائی تھی۔ نفیس غلیلی کون کراس نے نظم لکھی تھی۔ ایک حادثے نے اس سے غزل کھسکادی۔

ان کے حلقہ احباب میں ایک لڑکا سورج پرکاش شامل ہوا تھا۔ یہ لڑکا نہایت خوب صورت تھا اور اپنے نین نقش کی وجہ سے نمایاں تھا۔ شاد نے غلام جیلانی سے فرمائش کی کہ سورج پرکاش پر غزل لکھے جس میں اس کے حسن و جمال کی تعریف کی گئی ہو۔ مقصد یہ تھا کہ اس غزل کے اشعار سنا کر سورج کو چھیڑ جائے گا۔

غلام جیلانی نے غزل لکھ دی۔ اسے نظمیں لکھنے کی تو کچھ شق فراہم ہو گئی تھی لیکن غزل کہنے کا سبب تک اتفاق نہیں ہوا تھا۔ یہ اس کی پہلی غزل تھی اور وہ بھی فرمائی۔ اس میں سورج کے حسن کی تعریف تو ہو گئی تھی لیکن غزل میں تو قافیے اور ردیف کا سارا مکمل ہوتا ہے۔ قافیہ اور ردیف فی دستگاہ سے آگے نکل گئے تھے۔ وہ قافیوں کا پوری طرح خیال نہ رکھ سکا۔ وہ سخت مایوس ہوا اور پھر نظموں کی پناہ میں چلا گیا۔

یہ غزل جیسی بھی تھی بہت دن تک گردش میں رہی اور سورج کو چھیڑنے کے کام آئی رہی۔

کیمبل پور کا یہ کالج جس میں وہ پڑھ رہا تھا انٹر کالج تھا لہذا جب اس نے انٹر میڈیٹ کے امتحان میں کامیابی

حاصل کر لی اور مزید تعلیم حاصل کرنے کا خیال ہوا تو کسی ایسے کالج میں داخلے کا سوال تیار تھا جہاں بی، اے کی کلاسز ہوتی ہوں۔ لاہور ہی وہ شہر تھا جہاں اسے یہ ہولت مل سکتی تھی۔ لاہور میں اس وقت نئی کالج فرخہ والا نہ بنیادوں پر قائم تھے۔ ہندوؤں کا ساتھ دھرم کالج تھا، سکھوں کے لیے کنگھن کالج قائم کیا گیا تھا اور عیسائیوں نے اپنے لیے فارمن کالج بن کالج کھولا تھا۔ اس فضا میں انجمن حمایت اسلام اسلامیہ کالج علی گڑھ یونیورسٹی کے خطوط پر جاری کیا تھا اور مسلمانوں کا کالج قرار دیا جاتا تھا۔ یہاں کے مسلمان طلبہ نے مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن قائم کر لی تھی۔ اس فیڈریشن کا نصب العین علامہ اقبال کے مشورے سے ”ہندوستان میں آزاد اسلامی ریاست کا قیام“ قرار دیا گیا تھا۔

یہ کالج مسلمان طلبہ میں بے حد مقبول ہو رہا تھا۔ سید ضمیر جعفری بھی اسی اسلامیہ کالج میں داخل ہو چکے تھے۔ غلام جیلانی بھی اپنے سیاسی اور ادبی ذہن کی بدولت اسی ادارے کے حق میں تھا لیکن سوال پھر سامنے تھا کہ گھر سے اجازت ملتی ہے یا نہیں۔

دادا نے کہا تھا کہ کچھ اور تعلیم حاصل کر لو پھر کاروبار سنبھالنا۔ ان کے نزدیک کچھ اور تعلیم ہو چکی تھی اب اسے کاروبار سنبھالنا تھا البتہ والد نے اب بھائی کا اصول اپنا لیا تھا۔ وہ زیادہ پڑھے لکھے نہیں تھے لیکن دینا دیکھ سکتی تھی۔ سیاسی تحریکوں میں بھی شامل تھے۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ اب ہوا کدھر کی ہے۔ دادا نے بہت مخالفت کی لیکن باپ نے اجازت دے دی اور غلام جیلانی کے دادا کو یہ کہہ کر مطمئن کر دیا کہ بس دو سال کی بات اور ہے اس کے بعد غلام جیلانی گھر آکر کاروبار میں حصہ لگا۔

غلام جیلانی لاہور چلا آیا اور اسلامیہ کالج میں داخلہ لے لیا۔ ضمیر جعفری یہاں پہلے سے موجود تھا۔ شیر محمد شاد بھی آ گیا تھا۔ یہ نکلن پھر ایک جگہ جمع ہو گئی۔

اس کے پہنچنے کے کچھ دن بعد ہی اسلامیہ کالج کے گراؤنڈ میں ایک شاندار مشاعرہ ہوا۔ اسے عید میلہ کا نام دیا گیا تھا۔ براڈر تھ روڈ کی طرف میدان کے کنارے کنارے مسلمان تاجروں کے اسٹال قائم تھے۔ ریواڑ ہوٹل کے سامنے کھانے پینے کی اشیاء کے اسٹال لگائے گئے تھے اور بیچوں بیچ عوام کی دلچسپی کے لیے کشتیوں، بازی گری کے کھیلوں اور دوسرے مشاغل تفریح کا انتظام کیا گیا تھا۔ اس میلے کا مقصد یہ تھا کہ عید کے دن خاص و عام ایک مرکزی

مقام پر جمع ہوں تاکہ مرکزی ارتباط کو تقویت پہنچے۔ اسی رات مشاعرہ ہوا کسی نے اس کا نام بھی کھنکھوایا۔ جب اس کا نام پکارا گیا تو اس نے بھی نظم سنائی۔ یہ پہلا موقع تھا جب وہ اپنی کوئی نظم دوسروں کو سنارہا تھا۔ اس مشاعرے میں لاہور کے تقریباً تمام ہی شعرا شریک ہوئے تھے۔ غلام جیلانی کو انہیں دیکھنے اور سننے کا موقع ملا۔ اسے پہلی مرتبہ معلوم ہوا کہ وہ لاہور میں نہیں کسی ادب کدے میں ہے۔ اگر وہ اس سے فیض حاصل نہ کر سکا تو خالی الذہن ہی چلا جائے گا۔

”یار سب سے ملاقات ہوئی“ آخر شیرانی سے ملاقات نہ ہو سکی۔ ملنا تو انہی سے تھا، کیا انہیں بلایا نہیں گیا جو وہ مشاعرے میں نہیں آئے؟“

”بلایا تو ضرور ہوگا۔ ہو سکتا ہے وہ لاہور میں نہ ہوں یا کوئی اور وجہ ہو۔“ شاد نے عجیب معنی تیز انداز میں کہا۔ ”کوئی اور وجہ سے تمہارا کیا مطلب ہے؟“

”وہ شراب ناب میں غرق رہتے ہیں۔ ہو سکتا ہے انہیں یاد ہی نہ رہا ہو۔“

”یار ان سے ملاقات ہو سکتی ہے؟“

”کیوں نہیں ہو سکتی۔ آج کل فلیمنگ روڈ پر رہتے ہیں۔ ان کے رسالے رومان کا دفتر بھی وہیں ہے۔ کسی دن میرے ساتھ چلنا۔“

”وہ چھپ جاتے ہیں؟“

”ایک دوبار ملا ہوں۔ ویسے تو اتنے غلیظ ہیں کہ اجنبیوں سے بھی اخلاق سے ملے ہیں۔ خاص طور پر نوجوانوں سے مل کر تو بہت خوش ہوتے ہیں۔“ وہ اور شیر محمد شاد، آخر شیرانی سے ملنے رومان کے دفتر پہنچے۔ ایک بڑی حویلی تھی جس کی سڑکیوں کے درمیان ایک چھوٹا سا کمرہ تھا۔ یہی رومان کا دفتر بھی تھا اور یہیں ان کی اقامت گاہ بھی۔

اس وقت اتفاق سے وہ اکیلے بیٹھے تھے۔ دونوں کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور یہ دیکھنے کے لیے کہ ان سے بات کی بھی جاسکتی ہے یا کسی موضوع پر کی جائے انہوں نے جیلانی سے کچھ سنانے کی فرمائش کی۔

تمام عمر سہاے عذاب آنکھوں کا کھلیں..... تو چاروں طرف تھا غبار چروں کا وہ چہرے جن پہ کبھی ہے حکایت شب و روز گزرتے تھوں کی تحریر کا وہ نقش دوام جو تو اپنے جھینفوں پہ لکھ کے چھوڑ گیا

میں پڑھ رہا ہوں یہ ساری اداس تحریریں چھپے ہوئے پر مشتمل یہ نظم آشوب ذات کی بھرپور عکاسی کر رہی تھی۔ معلوم نہیں آخر شیرانی کو یہ نظم پسند آئی یا نہیں لیکن اتنا ضرور ہوا کہ انہوں نے اصرار کر کے کہا کہ وہ دونوں ان کے پاس آئندہ بھی آ سکتے ہیں۔

غلام جیلانی کو یہ اچھا لکھا ٹھنڈا لگا گیا تھا۔ وہ ان کے پاس پانچویں سے حاضری دینے لگا۔ بھی اکیلا کسی شاد کے ساتھ، بھی کسی اور دوست کے ہمراہ۔

آخر شیرانی اس دور میں نوجوانوں کے محبوب شاعر تھے۔ ان کی رومان پرور نظریں نوجوانوں کو نہ صرف متاثر کر رہی تھیں بلکہ وہ ان کے رنگ میں کہنے کی کوشش بھی کر رہے تھے۔ غلام جیلانی بھی ان کے بحر میں گرفتار ہوئے بغیر نہ رہ سکا، بقول اس کے ”میری شاعری میں رومان کا جو عنصر ہے وہ انہی ملاقاتوں کی دین ہے۔“

لاہور کے اس قیام میں اس کی ملاقات مختار صدیقی اور تابش صدیقی سے بھی ہوئی۔ اس نے دیکھا کہ یہ حضرات نظم کے ساتھ ساتھ غزل بھی کہہ رہے ہیں۔ غزلیں مشاعروں میں دلچسپی سے سنی جاتی ہیں اور رسالوں میں شجعتی ہیں تو اپنے داخلی، موضوعی اور فکری انفرادیت سے متاثر کرتی ہیں۔ اس نے بھی ان دوستوں کی طرح غزل اور نظم کہنے پر یکساں توجہ دینی شروع کر دی۔

”میں مختلف اصناف کو ایک ہی عمل کے اظہار کے لیے مختلف سانچے سمجھتا ہوں۔ جب جذبہ مجرد لیکن اندر سے بڑا ہوا ہوتا ہے تو وہ اپنے اظہار کے لیے غزل کا بیجا منتخب کرتا ہے۔ جب وہی جذبہ وضاحت طلب ہوتا ہے تو نظم کا پیکار اس لیے موزوں ہوتا ہے۔ اس کی موزونیت کا میں انتخاب نہیں کرتا بلکہ وہ جذبہ خود کرتا ہے۔

اس کو یاد رکھنا ہے اس کو بھول جانا ہے دکھ تو ایک جیسا ہے انتخاب کرتا ہے

☆ ☆ ☆ وہ لاہور کی ادبی فضا میں کھل مل گیا۔ مشاعروں میں بھی شریک ہونے لگا۔ غزلیں بھی کہتا رہا، نظمیں بھی، البتہ اب اس میں مسدس حالی کی پیروی نظر نہیں آتی تھی۔ ان کے موضوعات، ان کا لب و لہجہ بدل گیا تھا۔ وہ اگر پابند بھی نہیں تو قدیم سے مختلف تھیں۔

آج کے روز جس کل کو خدا پر چھوڑیں ایک لمحے کے لیے وقت کا بندھن توڑیں

انتخاب شاعری

میں کیسے زخم چھینا تری مروت کے یہی تو میرے اٹانے میں ساری دولت تھی ☆

اک ذرا سی بات سے شے میں آجاتا ہے بال بات میں کتنی سہی اونچا نہ بولا کیجیے ☆

اس کو یاد رکھنا ہے اس کو بھول جانا ہے دکھ تو ایک جیسا ہے انتخاب کرتا ہے ☆

بس یہی بات کہ لوگوں کو نہ چاہو دل سے تجربے اس کے سوا عمر کو کیا دیتے ہیں ☆

میں خود اپنے آپ سے بچ کر نکل جاؤں کہاں اس زمیں کے چار جانب آسمان ہیں شہر میں ☆

جس کو دیکھو اس کے چہرے پر پلکریں سوچ کی جیسے ہو جائے کسی شے کا مقدر سوچنا ☆

کتنے چہرے کتنے موسم کتنے دن یاد آگئے جب کبھی اس بے مروت کا بیاں ہونے لگا ☆

اک عمر میں نے اپنے تعاقب میں کاٹ دی لیکن یہ تھا گماں کہ تمہیں ڈھونڈتا رہا ☆

مسافر کس پڑاؤ پر رکیں گے امیر کارواں سویا ہوا ہے ☆

اب تو اس شہر کے سانے سے ڈر لگتا ہے اپنے اندر ہی کوئی شہر بسایا جائے

زیست خود اپنی رضا اپنی تعزیر وفا
اس کا ہر لمحہ گریزاں ہے خود اپنی تقدیر
اپنے اسلاف کے ژولیدہ خیالات کا بوجھ
کتنی صدیوں سے اٹھائے ہوئے ہم پھرتے ہیں

ایک مجروح پرندے کی طرح
اپنی ہی قید میں محبوس ہیں ہم
اپنی ناکردہ گناہی کے طفیل
کس قدر زیست سے مایوس ہیں ہم

دیکھ یہ لمحہ جو سورج کی طرح ابھرا ہے
شب کی ڈائن اسے دم بھر میں نکل جائے گی
اب تو ہر ساعت تابندہ ہے پھرے بس میں
کل یہی وقت کی گری سے پھیل جائے گی

اس نے بی، اے کا امتحان پاس کر لیا اور کچھ کچی پکی
نظموں اور غزلوں کو ساتھ لے کر وہ تلہ لنگ چلا آیا۔ دادا
ابھی زندہ تھے۔ انہوں نے اس کا وعدہ یاد دلایا ”کچھ اور
تعلیم، مکمل ہو چکی۔ اب اسے کاروبار سے شکست ہو جانا
چاہیے اور اسے روزنامہ، کھانا اور کیش بک لکھنے کی ابتدائی
ترتیب دینے لگے۔ دادا لکھا سمجھاتے تھے اس نے کوشش بھی
کی لیکن کھانا لکھتے ہوئے نظمیں اس کے ذہن میں شعلی رہتی
تھیں۔ کوشش بسیار کے باوجود کھاتے اس کے بس میں نہ
آتے تھے۔ اکثر لوگوں کو شکایت پیدا ہو گئی کہ جو رقم انہوں
نے جمع کروائی تھی وہ ان کے نام لکھی ہی نہیں گئی یا جمع نہیں
کی گئی۔ اس کا استدلال تھا کہ رقم تو موجود ہے نام اور جمع
سے کیا فرق پڑتا ہے۔

ایک شام اس نے اپنے دادا کو یہ کہتے سنا۔ ”محمد دینا
یہ تیرا پتر ہی نہیں چلا سکے گا۔“ وہ غلام جیلانی کے والد سے
کہہ رہے تھے۔ ان لفظوں میں ایسی تاثیر تھی کہ غلام جیلانی
مجموم اٹھا۔ اس کا مطلب یہ ہے دادا میری طرف سے مایوس
ہو گئے ہیں۔ اب مجھے کاروبار کے جھنجھٹ میں نہیں پھنسیا
جائے گا۔ میرے سامنے مزید تعلیم کے لیے میدان کھلا ہے۔
اس زمانے میں اسلامیہ کالج پشاور صوبہ سرحد کا سب
سے بڑا تعلیمی ادارہ شمار ہوتا تھا۔ اس نے بہت غور و فکر کے
بعد طے کیا کہ وہ اسلامیہ کالج پشاور میں داخلہ لے گا اور

انگریزی میں ایم، اے کرے گا۔ وہ پشاور پہنچ گیا ہے۔
یہاں آکر اسے معلوم ہوا کہ یہاں داخلے سے قبل انگریزی
میں ایک مضمون بھی لکھوایا جاتا ہے۔

اس داخلے کے لیے غلام جیلانی کو میتھو آرٹلڈ کے
ایک ادبی مکتوبے پر مضمون لکھنا پڑا۔ یہ مضمون جب
پروفیسر اسٹور کے سامنے پیش ہوا تو انہوں نے اسے سراہا۔
”تم انگریزی میں بہت اچھا ہے۔ ہم تمہاری فیس
بھی معاف کرے گا۔“ یوں اس کا داخلہ نہایت اعزاز کے
ساتھ اسلامیہ کالج پشاور میں ہو گیا۔

اس کالج کا معیار تعلیم اتنا بلند تھا کہ اوسط درجے کا
طالب علم اس کا ساتھ نہیں دے سکتا تھا۔ اس کے لیے سخت
محنت اور قابلیت کی ضرورت تھی۔ غلام جیلانی کی انگریزی
نہایت اعلیٰ درجے کی تھی۔ پروفیسر اسٹور نے اسے مشورہ
دیا کہ وہ کالج میگزین ”خیبر“ میں مضامین لکھا کرے۔

اس کے قلم نے اب تک نظر و غزل کا ڈالغہ چکھا تھا۔
کالج کے میگزین کے لیے مضامین لکھنے کا آغاز کیا تو اس پر
اپنا یہ جو برہمی کھلا کہ وہ اعلیٰ پایے کے مضامین لکھ سکتا ہے۔
کالج میں ہونے والے مباحثوں میں بھی حصہ لینے لگا۔ چند
مباحثوں کے بعد تو تقریر کا بادشاہ کہلانے لگا۔ وہ ہر موضوع
پر ہر جگہ اور ہر وقت بلا تکان بول سکتا تھا۔ سوچنے کا وقت تو
جیسے اس کے پاس تھا ہی نہیں۔ مزاح اس کا خاص ہتھیار تھا۔
سنجیدہ سے سنجدہ موضوع میں... مزاح کے پہلو تلاش کر لیتا
تھا۔ کیسی ہی ہونک ہو کیسا ہی ماحول ہو اس کی تقریریں ہی لی
جاتی تھی۔ اس خوبی خطابت میں اس کے حافظے کا بھی بڑا
دھڑ تھا۔ وہ مطالعے کا جو ہر اپنے حافظے میں محفوظ رکھتا تھا اور
حسب ضرورت کثرت سے استعمال کرتا تھا۔ کہتے یہی ہیں
کہ تقریر ہوا میں تحلیل ہو جاتی ہے لیکن اس کی تقریریں یا ان
کے اقتباسات بار بار محفلوں میں سامنے بھی جاتے تھے۔

اس نے کالج کے لیے کئی شرافیاں اپنے نام کیں اور
کالج کی ناموری کا باعث بنا۔ ایسے طلبہ جو غیر نصائی
سرگرمیوں میں فعال ہوتے ہیں اکثر تعلیم کے میدان میں
پیچھے رہ جاتے ہیں لیکن وہ قابل فخر طالب علم بھی تھا۔

یہ 1941ء کا سال تھا جب اس نے ایم، اے
انگریزی کا امتحان پاس کر لیا۔ اب اسے عملی زندگی کے لیے
کسی شعبے کا انتخاب کرنا تھا۔ خاندان کا پیشہ تجارت تو وہ اپنا
نہیں سکتا تھا اور اب اس سے کوئی کچھ بھی نہیں سکتا تھا۔ اس
نے مشورہ بھی ضروری نہیں سمجھا۔ درس و تدریس کا میدان

اس کے سامنے کھلا ہوا تھا اور وہ اس کے لیے موضوع بھی
تھا۔ انگریزی اردو دونوں روانی سے بول سکتا تھا۔ ہنسی ہنسی
میں بات کو سمجھانا بھی آتا تھا۔ انگریزی میں ایم، اے اس
وقت کرتے ہی کہتے لوگ تھے۔ اسے زمیہ دارہ کالج ہجرات
میں انگریزی کی لیکچرر شپ یہ آسانی مل گئی۔

یہ غیر سرکاری کالج ایک مقامی انجمن نے قائم کیا تھا
جس کے صدر نواب سر فضل علی تھے اور مقصد متوسط درجے
کے مسلمانوں کو تعلیم سے آراستہ کرنا تھا۔ پرنسپل ڈاکٹر جہانگیر
خاں تھے جن کی کشادہ نظری اور اسپورٹس مین اسپرٹ کے
قصبے زبان و خاص و عام تھے۔

غلام جیلانی اس ماحول میں کالج پہنچا تو اس کے تمام
جوہر ایک ایک کر کے کھلنے لگے۔ اس نے سب سے پہلے تو
طلبہ کا دل جیتنے کے لیے انہیں محنت سے پڑھانا شروع کیا۔
طلبہ اس استاد سے خوش ہوتے ہیں جو انہیں کتاب
سے باہر کا علم دے۔ کتابیں تو وہ خود بھی پڑھ لیتے ہیں۔
کتاب سے باہر کا علم وہی استاد دے سکتا ہے جس نے خود
کچھ پڑھا ہو۔ غلام جیلانی کتاب کی چند سطریں پڑھتا اور پھر
اس کی تشریح میں مختلف کتابوں کے حوالے دیتا چلا جاتا۔
طلبہ نے کچھ ہی دنوں میں جان لیا کہ وہ تو علم کا ایک سمندر
ہے اور پھر سمجھانے کا ایسا گھٹتہ انداز کہ ہر بات دل میں
اترتی جائے۔

ہوتا یہ ہے کہ اساتذہ اپنے لائق شاگردوں پر توجہ
دیتے ہیں اور نالائق شاگردوں کو درخور اعتنا نہیں سمجھتے۔ غلام
جیلانی کا قاعدہ یہ تھا کہ وہ کمزور طالب علموں پر زیادہ توجہ
دیتا تھا۔ لائق طلبہ تو پہلے ہی اس کے گردیدہ ہو گئے تھے،
نالائق طلبہ بھی اس کے کن گانے لگے۔ عالم یہ ہو گیا کہ طلبہ کو
اس کی آمد کا انتظار رہتا۔ وہ اشاف روم سے نکلتا تو طلبہ بے
تابی سے چھک چھک کر اس کا انتظار کرتے اور جو بھی اس
پر نظر پڑتی اچانک ایک لڑکا چیختا۔ ”وہ جیلانی صاحب
آگئے۔“ تقریباً روز کا معمول تھا۔

جب اس نے طلبہ کے دلوں میں اپنی جگہ بنالی تو اس
نے ایسے طلبہ کا انتخاب کیا جو ادبی ذوق رکھتے تھے اور ان
طلبہ کی خصوصی سرپرستی شروع کی۔ کسی کو مائٹھ کے لیے تیار
کرنا کسی کی شاعری کی اصلاح کرنا۔ کالج میں مشاعروں کا
انتقاد بھی کیا۔

اس کی اپنی ادبی سرگرمیاں بھی عروج پر تھیں۔ اس نے
یہاں رہ کر ایک ”ظلم“ ”آذوقہ“ تخلیق کی۔ ہجرات میں ایک مشاعرہ

موت (نظم)

رات آنگن میں اتری
بہت دیر تک مجھ کو سینے سے چمٹا کے کہتی رہی
شانتی! شانتی!

چاند بوڑھے لبادے میں لپٹا ہوا
زینہ زینہ مرے پاس آتا گیا
اپنی خوش رنگ ٹھنڈی سی انگشت سے
میری ہتھیلی جیس پر یہ کلمہ لکھا
شانتی! شانتی!

اس کے برقباق سے ٹھنڈے ہونٹوں کے خم
میرے ہونٹوں سے پیوست ہوتے گئے
خون بجھتا گیا
رات ڈھلکی گئی
چاند کلا گیا
چاندنی سوئی
شانتی! شانتی!

ہو تو اسے بھی بلایا گیا۔ اس نے یہی نظم نذر سامعین کی۔
زندگی گریڈ پیہم ہی تو ہے
مسکراتے ہوئے ہونٹوں سے نہ جا
تو نے پھولوں کو بھی دیکھا ہے
ان کے عارض پہ دکتے ہوئے نئے مونی
ان کی الفت کا یہ اظہار جمیل
ان کو شبنم نہ سمجھ

میرے رونے کا براہمتی ہو
اس سے مطلوب شکایت تو نہیں
یہ مرا اشک ندامت بھی نہیں
یہ مرے ذوق عقیدت کی فراوانی ہے
اشک بن کے جو نگاہوں میں ڈھلک آئی ہے

جدید انداز کی یہ نظم ایسی مقبول ہوئی کہ مشاعرہ تو لونا
ہی لونا طلبہ کا یہ حال ہوا کہ پورے ایک سال کالج کے
احاطے میں اس نظم کے مصرعے گنگنا تے پھرتے تھے اور پھر
یہ نظم اس سے ہر مشاعرے میں فرمائش کر کے کی جانے لگی۔

سلسلہ بھی رک گیا۔ یہ فائدہ ضرور ہوا کہ تلہ گنگ میں اس کے خاندان کے مایوس چہرے جن کے ساتھ اس کے خون کے رشتے تھے اس کے گرد پیش موجود تھے۔ شہر میں ہر طرف اس کے چرچے ہو رہے تھے کہ اس شہر کے ایک فرزند نے گورنمنٹ کالج کی قیادت سنبھال لی ہے۔ اس شہر نے آج تک کوئی ایسا فرزند پیدا نہیں کیا تھا جو اس عہدے پر پہنچا ہو۔ اس کے والد بھی اب سرٹاٹھ کر چلے گئے۔

سب خوش تھے لیکن غلام جیلانی کا دکھ وہی جانتا تھا۔ وہ گلیوں میں گھومتا رہا۔ بچپن کے دوستوں کو تلاش کرتا رہا۔ دنیا ہی بدل گئی تھی۔ وہ چہرے نہیں نظر نہ آتے تھے۔ وہ تمام دوست جنہوں نے میٹرک تک اس کے ساتھ تعلیم پائی تھی یا تو کاروبار میں مصروف ہو گئے تھے یا اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے تلہ گنگ چھوڑ کر بڑے شہروں میں اعلیٰ عہدوں پر فائز تھے۔ تلاش زر میں بہت آگے نکل گئے تھے۔ چھوٹے شہروں کا البیہ یہی ہوتا ہے۔ بچپن کے دن بہت سہانے ہوتے ہیں لیکن گلیوں سے نکل کر کچھ بھی نہیں ہوتا۔ رزق کی تلاش میں ایک ایک کر کے سب اڑ جاتے ہیں۔ اسے رہ رہ کر سرگودھا یاد آتا تھا۔ تلہ گنگ اس کا شہر تھا، اس کا بچپن ان گلیوں میں کھیلا تھا۔ اس کی محبت اپنی جگہ لیکن اس کی فکری ارتقا کا کوئی سامان یہاں نہیں تھا۔ وہ جس داخلی کیفیت سے گزر رہا تھا اس کا اظہار وہ غزل کے پیرائے ہی میں کر سکتا تھا۔

تجھ کو چاہوں تو زمانے کی عداوت دیکھوں بھول جاؤں تو شب مرگ کی ساعت دیکھوں جی کڑا کر کے کسی روز چمچڑ جائیں ہم کیسے ہر روز جدائی کی قیامت دیکھوں کوئی تو خول سے نکلے گا شناسا چہرہ کس عقیدت سے ہر اک شخص کی صورت دیکھوں پہلے حیرت سے ٹکا کرتا تھا دیواروں کو اب میں دیواروں کی آنکھوں میں وہ حیرت دیکھوں اس کے دل کی آواز شاید گوش فلک تک پہنچ گئی۔ وہ سوچا کرتا تھا اس صحرا میں کب تک اذانیں دے گا۔ اس کاروباری شہر میں کسی کو اتنی فرصت نہیں تھی کہ ادبی تخلیقات سمجھتا۔ کسی کے پاس وقت نہیں تھا کہ علوم نو پر اس سے تبادلہ خیال کرتا۔ یہاں کے طلبہ بھی ادب سے محبت کے آثار نظر نہیں آتے تھے۔ کالج چلے جانا، طلبہ کو نصاب پڑھانا اور گھر آکر بند ہو جانا۔ وہ بے زندگی چاہتا تھا۔ سرگودھا یا تارکے موافق بھی فراہم نہیں ہو رہے تھے پھر خدا نے اس

کی سن لی۔ قدرت کو یہ منظور نہیں تھا کہ یہ ادیب یوں ضائع ہو جائے۔ اس کا تبادلہ تلہ گنگ سے جوہر آباد کر دیا گیا جو سرگودھا سے صرف ایک ڈیڑھ گھنٹے کی مسافت پر ایک نوآبادی بستی تھی اور دریائے جہلم کے دائیں کنارے پر آباد قدیم شہر خوشاب سے ملتی تھی۔

یہ شہر تیزی سے ترقی کر رہا تھا۔ جو ہر ثقافتی نے ایک چھوٹا ادبی سرگودھا اس شہر میں قائم کر رکھا تھا۔ غلام جیلانی یہاں پہنچا تو گویا سرگودھا کو اٹھا کر جوہر آباد میں لے آیا۔ ادب و شعری تخلیقات کالج میں بھی منعقد ہونے لگیں۔ ہندوپاک مشاعرے ہونے لگے۔ اس شہر کی کیفیات کو اس نے ایک غزل میں سمیٹ دیا۔

میں نے وہ پھول وہ خوشبو وہ سخن بردیکھے
جائگی آنکھوں نے کیا خواب کے منظر دیکھے
وہ بھی اندھ بھی دھوپ بھی سایہ ہے
میں نے موسم کے بدلنے ہوئے تیر دیکھے
اس طرف جائد اُدھر عارض تاباں نکلا
ایک لمحے میں گئی خواب کے منظر دیکھے

☆ ☆ ☆
اب اس کی عمر پختہ ہو چکی تھی۔ باطن کی گہرائی میں جھانکنے کی عمر کو پہنچ چکا تھا۔ داخلی و خارجی تجربات کے علاوہ عالمی مصنفین کا بھی بھرپور مطالعہ کر چکا تھا۔ یہ مطالعہ زیادہ تر انگریزی ادب کا تھا۔ ابتدا میں انگریزی حصول رزق کا ذریعہ تھی لیکن پھر انگریزی نثر نے اسے اپنے سحر میں گرفتار کر لیا۔ اسے انگریزی کے انشائیہ نگاروں سے عقیدت پیدا ہو گئی۔ یہ عقیدت اسے انشائیہ نگاری کی طرف لے آئی جس کا آغاز اردو میں ہو چکا تھا۔ وزیر آغا نے اپنے انشائیوں کا مجموعہ ”خیال بارے“ شائع کیا تھا۔ مشتاق قمر کے انشائیوں کا مجموعہ ”ہم ہیں مشتاق“ شائع ہو چکا تھا۔ جمیل آذر کے تین مجموعے منظر عام آچکے تھے۔

غلام جیلانی نے یہ مجموعے بھی بخور پڑھے اور اس نتیجے پر پہنچا کہ انشائیہ لکھنے کے لیے جس جوہر کی ضرورت ہوتی ہے وہ اس کے اندر بدرجہ اتم موجود ہے۔ خاص طور پر اس کے شکستہ جملے اور مزاح کا عنصر جو اس کی تقریروں میں ابھرتا ہے اگر تحریر میں آجائیں تو نمبروں انشائیہ کا روپ دھاریں گے۔ وہ انگریزی کے حوالے سے انشائیہ کی فنی قدروں سے واقف ہو چکا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ انشائیہ نگار اسلوب کے خیلے پن سے سنجیدہ موضوع پر ایک دیزیت

چڑھا دیتا ہے۔ قاری مزاح سے لطف اندوز ہوتا ہوا اسے پڑھتا چلا جاتا ہے۔ جب اختتام کو پہنچتا ہے اور اس پر غور کرتا ہے تو اس کی آنکھیں چکاچوند ہو جاتی ہیں۔ اس پر ایک نئی دنیا کا انکشاف ہوتا ہے۔

وہ ان سب باتوں کو مد نظر رکھتے ہوئے اپنا پہلا انشائیہ لکھنے بیٹھ گیا۔ ”انشائیہ بستر پر لیٹنا“ وجود میں آیا جو اوراق میں شائع ہوا۔

”بعض لوگ بستر اور بے کاری کو ہم معنی سمجھتے ہیں مثلاً آپ کسی روز یونہی اپنے دفتر کے کسی بھلے مانس سے پوچھیں، صاحب! آپ فارغ وقت میں کیا کرتے ہیں تو وہ نہایت معصومیت سے کہہ دے گا۔ بس یونہی لیٹا رہتا ہوں۔ اس سے احمقانہ جواب میں نے آج تک تنقید میں بھی نہیں پڑھا۔ یونہی لیٹنا اور بستر پر لیٹنا بنیادی طور پر دو مختلف عمل ہیں۔ یونہی لیٹنے سے بے کاری، بے زاری اور اپنے افسردہ دفتر سے شدید نفرت کا تاثر ملتا ہے لیکن بستر پر لیٹنا تو ایک سوچا سمجھا فعل ہے۔ جب آدمی غیر شاطرانہ قسم کے بوٹ اور کپڑے اتار کر شب خوابی کا زورہ بکتر پہن کر بستر میں داخل ہوتا ہے تو زندگی کا سب سے صرف پر وگرام شروع ہو جاتا ہے۔ بستر تو دراصل ایک میدان عمل ہے۔ ایک کارگاہ فکر ہے جس میں نئے تخلیقی منصوبے وجود میں آتے ہیں۔ بستر پر آدمی بے کاریٹ ہی نہیں سکتا۔ بے کاری تو ایک ذہنی کیفیت ہے اور یہ صرف اس صورت میں ممکن ہے جب آدمی ڈاکٹر سے ساز باز کر کے سرکاری طور پر بیمار پڑتا ہے۔“

(اقتباس بستر پر لیٹنا)
ماہنامہ ”اوراق“ (جس کی ادبی ساکھ کسی کی نظروں سے پوشیدہ نہیں) میں انشائیہ شائع ہوا تو تازہ ہوا کا ایک جھونکا آیا۔ اس کی ایک ایک سطر سے ایسا پختہ فکر ادیب جھانک رہا تھا جس نے غزل اور نظم کی شاعری کرتے کرتے اچانک اظہار کا بیان انشائیہ کی صنف سخن سے لے لیا تھا۔

اس پہلی کاوش کے بعد اس کا قلم سرپٹ دوڑنے لگا۔ اس نے پے در پے کئی انشائیے تحریر کر ڈالے اور اردو انشائیے کو پیرانے دائرے سے نکال کر نئی فضا میں سرگرم ہونے کی راہ دکھائی۔

اس کے انشائیوں میں شکستگی کا عنصر غالب تھا لہذا بعض لوگوں نے انہیں مزاحیہ مضنون کی ایک صورت قرار دیا حالانکہ ان کا یہ مزاح اس میک اپ کی طرح تھا جس کے

بیچے اصل چہرہ چھپا ہوتا ہے۔ مزاح کی تخلیق ان کا بنیادی مقصد نہیں، مثلاً ”ایقتباس“۔

”بیچے ایک مکمل سوشلسٹ ہے۔ وہ خود مال و دولت، سیم و زر ہر قسم کی مزدور و غیر مزدور اراضی سے آزاد ہوتا ہے۔ وہ دنیا کی ہر چیز کو اپنی ملکیت سمجھتا ہے۔ وہ خود کچھ نہیں کھاتا لیکن سب سے پہلے اور سب سے اچھا کھانا طلب کرتا ہے۔ اس میں دودھ دینے کی چنداں صلاحیت نہیں ہوتی لیکن دن بھر دودھ پیتا ہے چنانچہ مارکس جس جنت اراضی کی تلاش میں ہے وہ دراصل انسانی معاشرے میں بچپن کو دریافت کرتا ہے اور جس سیاست داں کو اپنے بچپن کے سوا کسی اور بچے کو پروان چڑھانے کا تجربہ نہیں وہ کیسے جان سکتا ہے کہ بچہ پالنا کتنا بڑا اخلاقی تجربہ ہے۔“

(اقتباس بچہ پالنا)
اس نے اتنے انشائیے تخلیق کر لیے کہ ایک مجموعہ ”نرم دم گفتگو“ ترتیب دے لیا۔ اردو کے مشہور ناقد و دانشور ڈاکٹر وزیر آغا اس پر اپنی یہ رائے پیش کرتے ہیں۔

”انشائیہ کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ لفظ یا مظہر، شے یا تصور کو اس کے متعین اور مقرر معنی سے نجات دلا کر تازہ کرتا ہے۔ انشائیہ کی یہ خوبی غلام جیلانی اصغر کے ہاں اپنا بھرپور مظاہرہ کرنے میں پوری طرح کامیاب ہے۔ وہ عام اشیاء، مظاہر، تصورات اور افکار اس طور متعین کرتے ہیں کہ ان میں قوت انکسار پیدا ہو جاتی ہے۔ غلام جیلانی اصغر کے انشائیوں کی ایک اور خاص خوبی ایک ایسا دلکش انشائی اسلوب ہے کہ جو اپنی شکستگی، کاٹ، چھین، ایمائیت اور لفظوں کے تخلیقی استعمال کے باعث حد درجہ جاذب نظر ہے۔ سب جانتے ہیں کہ انشائیہ میں غنائش و انداز معدوم اور سیم کی لکیر فروزاں ہوتی ہے اور آنکھیں خارج سے کہیں زیادہ باطن کو ٹوٹ لے لیتی ہیں۔ غلام جیلانی اصغر کو انشائیہ کے یہ دونوں اوصاف حاصل ہیں لہذا یہ کہنا غلط نہیں کہ وہ اب خود بھی ایک چلتا پھرتا انشائیہ ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ غلام جیلانی اصغر اردو انشائیہ کے ایک بہت بڑے ستون ہیں۔“

خود غلام جیلانی اصغر نے اپنے بارے میں یہ لکھا۔
”میں انشائیوں کو اپنی ذات کی ہی توسیع سمجھتا ہوں۔ اس لیے آپ محسوس کریں گے کہ میں ہر انشائیے کے ظاہر اور باطن میں موجود ہوتا ہوں۔ جب میں محسوس کرتا ہوں کہ انشائیہ میری سطح سے اوپر اٹھ کر کھلی فضا میں داخل

ہو گیا ہے تو مجھے خوف آنے لگتا ہے کیونکہ یہ مرحلہ انتہائی نازک ہوتا ہے۔ اگر پائلو کیوٹر اور انشائیہ اپنے مرکز کی طرف واپس نہ آئے تو آپ نے دونوں کو کچھ تہذیب نہیں دی۔“

☆☆☆

1974ء میں اسے پرنسپل گورنمنٹ کالج رینا کر سرگودھا بھیج دیا گیا۔ خوب گزرے گی جول بیٹھیں گے دیوانے چندے کے صدقات ہر شام ڈاکٹر وزیر آغا کی رہائش گاہ پر ”شام دوستوں“ کی محفل آراستہ ہوتی تھی۔ بحث کے دروازے کھل جاتے۔ کوئی خاص موضوع نہ ہوتا۔ بحث خود بخود بڑھتی چلی جاتی۔ ادب، سائنس، نفسیات، عمرانیات، سیاسیات اور مذہبات وغیرہ۔ علما نے فن کے حوالے یوں چلے آتے جیسے کتابیں کھلی سامنے رکھی ہوں۔ علم کے ایسے دریاب تھے کہ اگر کوئی کاغذ قلم لے کر بیٹھتا تو کئی کتابیں تصنیف ہو جاتیں۔

وہ یہاں سے اٹھ کر شیخ محمد سعید کے گھر پہنچ جاتا جو اس شہر کے مشہور صنعت کار تھے۔ ادب اس کا شعبہ تھا لیکن صنعت و تجارت کے شعبے سے بھی دوستیاں تھیں۔ دوستیاں کرنا اور انہیں قائم رکھنا اس کا مشغلہ تھا۔ جو اس کے ذرا قریب آیا اس کے خانہ محبت میں رہائش پذیر ہو گیا۔ سرکاری افسروں تک اس کی رسائی کا عالم یہ تھا کہ جو نیا مشین آتا اسے سلام نیاز پیش کرنے ضرور آتا اور وہ اس سے اس پر برابری سے ملنے جیسے برسوں کا یار نہ ہو۔ یہ اس کی خود اعتمادی تھی جو ایسے موقعوں پر رنگ دکھاتی تھی۔ اس کا اصل مظاہرہ تو لوگوں نے اس وقت دیکھا جب ادبیات پاکستان کی ایک اہل قلم کانفرنس میں اس کی ملاقات صدر مملکت سے کروائی گئی۔ اس نے ایسی بے تکلفی سے ان سے گفتگو کی جیسے کہہ رہا ہو کہ اگر صدر مملکت ہوتا تو میں صدر مملکت ادب ہوں۔ دونوں ہم منصب ہیں پھر خوشامد یا خوف کیا۔ یہ بے خوفی اس کے علم نے اسے عطا کی تھی۔

ایک مرتبہ ن، م، راشد سرگودھا آئے تو ان کے اعزاز میں ایک تقریب منعقد کی گئی۔ منتہین کو افسوس ہو رہا تھا کہ غلام جیلانی اس وقت سرگودھا میں نہیں۔ لوگ ایک اچھی تقریر سے محروم رہ جائیں گے۔

وہ اسی شام تلہ گنگ سے واپس آیا۔ آتے ہی اس نے تقریب کی بابت سنا تو جلد گاہ میں پہنچ گیا۔ اس کی سیکرٹری کی اس پر نظر پڑی۔ دیکھتے ہی تقریر کے بلایا۔ سب کو معلوم تھا کہ اسے اچانک بلایا گیا ہے۔ سوچنے کا

موقع بھی نہیں ملا ہے۔ تقریر تیار بھی نہیں کی ہوگی چند جملے رکھی سے کہہ کر اتر آئیں گے لیکن جب وہ تقریر کرنے کھڑا ہوا تو تقریر اتنی معرکہ آرا تھی کہ لوگ دم بخود رہ گئے۔ اپنی ہر دلیل کے جواب میں راشد کی نظموں کے اقتباسات پیش کرتا جا رہا تھا جیسے لکھ کر لایا ہو۔ جدید نظم کے تناظر میں راشد کی شاعری پر ایسی پرمختصر تقریر کی کہ خود راشد جھوم اٹھے۔ تقریر ختم ہوئی تو انہوں نے برسر محفل اعتراف کیا۔

”جدید اردو نظم پر ایسی پرمختصر تقریر میں نے پہلے کبھی نہیں سنی۔ میں اس نوجوان مقرر کے مطالعے سے متاثر بھی ہوا ہوں اور مرعوب بھی۔“

”نوجوان مقرر“ کے الفاظ پر محفل میں ایسا فتنہ بلند ہوا کہ راشد سوچنے لگے کہ اس میں نتیجہ کی کیا بات تھی لیکن جب انہیں حقیقت معلوم ہوئی تو خود بھی بے بغیر نہ رہ سکے۔ غلام جیلانی اس وقت اپنی عمر کی پچاس سے زیادہ بہاریں دیکھ چکا تھا لیکن اپنے نوجوانی جسم، مہارت و ادراک اچھی صحت کی بدولت ویسا ہی نظر آتا تھا جیسا راشد کا خیال تھا۔

ایسا ہی دھوکا ایک مرتبہ صاحب اسلوب مزاح نگار مشتاق احمد یوسفی کو ہوا تھا جب انہوں نے ایک مجلس میں اسے نوجوان مزاح نگار کہا۔ غلام جیلانی نے برکت کہا۔

”آپ واقعی صاحب نظر ہیں۔“ اس کی اچھی صحت کا راز یہ تھا کہ پیدل چلنا اس کا محبوب مشغلہ تھا۔ ایک مرتبہ کار خرید بھی لی تھی اور سینے کے شوق میں چلانے کی مشق بھی کر لی تھی لیکن اس کار سے اسے یہ شکایت تھی کہ چلتی بہت تیز ہے۔ بھلا اس بات کا کسی کے پاس کوئی جواب تھا۔ دو چار مرتبہ جھمبوں سے ٹکرانے کے بعد وہ پھر زمین پر اتر آیا۔ کار سے نجات حاصل کر لی۔

”بھئی کار میں بیٹھنے والے کا ناز زمین سے ٹوٹ جاتا ہے۔“ زمین سے ناسا جوڑے رکھنے کا خیال اتنا تھا کہ صوفی پر بیٹھنا ہوتا تو جوتے اتار کر اپنے دونوں پاؤں زمین پر رکھ دیتا۔ وہ سارے جہاں میں گھومتا لیکن شام کو کسی کچھوتر کی طرح اپنی چھتری پر اتر آتا یعنی وزیر آغا کی رہائش گاہ پر۔ اس ادبی محفل کے بارے میں اس نے خود ایک جگہ لکھا۔

”یہ ایک بے تکلف سی ہنسیک ہوتی۔ عام سی باتیں ہوتیں مختلف ادبی اور غیر ادبی موضوعات پر بحث بھی ہوتی۔ لطیف بھی ہوتے لیکن ان باتوں کا مزاج بہت دوستانہ ہوتا۔ ان کو ادبی معرکوں سے موسوم کرنا غلط سمجھتا تھا۔ اس کا سہارا وہ ادب میں معرکوں کا ذکر ہوتا ہے تو ان سے آگے و تاج،

انہیں اور دبیر کے باہمی اختلافات کا تاثر پیدا ہوتا ہے۔ ہمارا مل بیٹھنا ایک تخلیقی عمل ہوتا تھا جس میں شعر بھی ہوتے تھے۔ تنقیدی مباحث بھی اور خوش گپیاں بھی۔ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ کوئی ایسی تباہ بات کی جائے جس سے رنگ محفل میں مٹی یا بد مزگی پیدا ہو۔“

☆☆☆

تنقید کا جوہر اس کی ذات میں کہیں گم تھا۔ یہ جوہر تقریروں میں تو ظاہر ہوتا تھا لیکن تحریر میں ظاہر ہو نہ سکتا تھا۔ اس نے اپنا شاعری سے شروع کیا تھا اور انشائیہ تک آتا تھا لیکن بے پناہ مطالعہ کا تقاضا تھا کہ وہ ادب پاروں کی تنقید کا فریضہ بھی انجام دے۔ اس کے لیے نیک کر بیٹھنا ضروری تھا اور وہ اس کا عادی نہیں تھا۔ کلاس میں وقت گزارتا یا دوستوں کی محفل میں۔ اس لیے... ایک لمبے عرصے تک تنقید نگاری اس کی شخصیت کا حصہ نہ بن سکی۔ کتنا ہی ماخذات اس کے سینے میں محفوظ تھے جنہیں وہ کلاس روم میں سمجھا دے کہ تار پتا تھا یا ادبی تقریبات میں فیاضی سے لانا تھا۔ ڈاکٹر وزیر آغا نے جب ”اوراق“ جاری کیا تو اس میں ”سوال یہ ہے“ کے عنوان سے مضامین کا ایک سلسلہ جاری کیا۔ ان کی نظروں سے غلام جیلانی کی تنقیدی جوہر چھپا ہوا نہیں تھا۔ انہیں یہ بھی معلوم تھا کہ غلام جیلانی کے لیے تنقید بیٹھنا اور مضامین لکھ کرنا کاردار ہے مگر انہیں یہ بھی معلوم تھا کہ اگر اسے ہمیں کیا جائے تو اسے آمادہ کیا جاسکتا ہے اور اس کی بانگ نظری سے ہزاروں قارئین کو فائدہ پہنچایا جاسکتا ہے۔ وزیر آغا نے اسے اسکا نا شروع کیا۔ نتیجہ یہی نکلا۔

”ارے صاحب تنقید نگاری بڑے عالم فاضل لوگوں کا کام ہے۔ میری تحریریں کون پڑھے گا؟“ ”آپ سے تحریر کرنے کو کون کہہ رہا ہے۔ آپ جو تقریریں کرتے ہیں انہی کو کاغذ پر اتار دیں۔ یہی وہ مضامین ہوں گے جو میں ”اوراق“ میں چھاپوں گا۔“ ”رسالے سے دل بھر گیا ہے تو اور بات ہے ورنہ میری تحریروں سے تمہارے رسالے کا بھلا تو ہونے سے رہا۔ اس کے برعکس تباہی سے اٹھ کھڑے ہوں گے۔“

”کچھ سوال انہیں ملے آپ اسے تازہ کیوں کہہ رہے ہیں۔ ان سوالوں کے جواب دینے میں ہی تو ادب کی زندگی ہے۔“ ”میں نے بڑی مشکل سے چند دوست جمع کیے

آرزوئی

(1922-2001) پاکستانی مصور، عتبات

اللہ نام، قصور پنجاب میں پیدا ہوئے۔ میوا سکول آف آرٹس (اب نیشنل کالج آف آرٹس) لاہور میں تعلیم حاصل کی۔ 1950ء میں اٹلی میں ڈکٹریٹ کی ڈگری لی، اور تین سال سیو اٹنی ٹیوٹ روم میں آرٹس کی تعلیم دی۔ علامہ اقبال اور دیگر شعرا کے کلام کو مصور کیا۔ بین الاقوامی شہرت کے مالک ہیں۔ متعدد ممالک میں ان کے شبہ پاروں کی نمائش ہو چکی ہے۔ 1970ء میں اکیڈمی آف ایلانڈ آرٹس کراچی کے پرنسپل مقرر ہوئے۔

مرسلہ: ناہید فاطمہ، کراچی

ہیں۔ آپ انہیں میرا مخالف بنانے پر تلے ہوئے ہیں۔“ ”اگر ہوگی تو ادبی مخالفت ہوگی۔ ذاتی دشمنی تو ہوگی نہیں جو دوستوں پر حرف آئے۔ آپ اپنا موقف پیش کریں گے، کچھ اور دوست اپنا خیال پیش کریں گے۔“ ”بھائی میں کیا اور میرا موقف کیا۔ مجھے کیوں کانٹوں پر کھینٹے ہو؟“

”عاجزی ایک حد تک ہی اچھی ہوتی ہے۔ آپ کا سینہ ادب کا خزینہ ہے۔ آپ اس خزانے کو لانے میں کج روی اختیار نہ کریں تو ادب کی ترقی کے لیے کتنا اچھا ہو۔ آپ شاعر ہیں، انشائیہ نگار ہیں، چاہتا ہوں آپ تنقید نگاروں کی صف میں بھی کھڑے ہو جائیں۔ آپ کیسے کیسے گوہر نایاب تقریروں اور نوجوان محفلوں میں لٹاتے ہیں۔ میں چاہتا ہوں ان سب کو تحریر میں آنا چاہیے۔“

”دوستوں کی میں نے بھی کوئی بات نہیں ٹالی۔ آپ کہتے ہیں تو آپ کی خاطر لکھنے کو تیار ہوں۔ کہیے کیا سوال ہے، کیا لکھتا ہے؟“

مضامین کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا۔ وزیر آغا نے انہیں ”اوراق“ میں شائع کر کے اردو دنیا کے طول و عرض میں پھیلادیا۔

یہ مضامین ہی اس کا کل اثاثہ تنقید ہیں لیکن ان میں جو خیالات پیش ہوئے۔ مغربی حوالوں سے جس طرح انہیں مزین کیا گیا پھر جس طرح ان حوالوں کی مدد سے اپنی ایک رائے منتہین کی گئی۔ قاری کی انفرادی سوچ کو برا سمجھتے کیا گیا۔ ابھی ہوئی آرا کو سلجھا گیا۔ سب سے بڑھ کر یہ

مضامین ایک دلکش اسلوب میں تحریر کیے گئے اور تنقیدی شکل کو رواں اور دلکش اسلوب کا پیرا بن عطا کیا اس سے یہ مضامین بہترین تنقیدی مضامین بن گئے اور غلام جیلانی کو معتبر نقادوں کی صف میں لا کھڑا کیا۔

ان مضامین سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ مصنف غیر ملکی دانش وروں اور مصنفوں کے حوالے سے ہمیں مرعوب کرنے کی کوشش نہیں کر رہا ہے بلکہ ہمیں اپنے مطالعے کے نتائج سے آگاہ کر رہا ہے مثلاً اسے مقالے ”اسلوب کیا ہے“ میں اس نے کئی مغربی فنکاروں کی مثالیں دی ہیں لیکن نہ تو وہ ان سے مرعوب ہے اور نہ ان کے لیے اچھے اقتباسات دے کر صفحے ضائع کیے ہیں۔ محض نام لینے پر اکتفا کیا ہے اور بات سمجھ میں آ جاتی ہے۔

”فارم یا ہیئت کتنی ہی مکمل کیوں نہ ہو اگر اس کے پیچھے خیال موجود نہیں تو وہ آزادانہ طور پر زندہ نہیں رہ سکتی۔ اس طرح خیال اپنی تمام تر قدرت اور منطق کے باوصف اس وقت تک قابل قبول نہیں ہوتا جب تک اسے سوزوں ہیئت نہ ملے۔“ ”لاک“ کے یہاں خیال کی جدت تو ہے لیکن اس کی تحریر میں اسلوب کی کمی ہے۔ اس کے برعکس ”برکے“ کی تحریر میں خیال کی جدت کے ساتھ ساتھ اسلوب کی تازگی بھی موجود ہے۔ تقابلی مطالعہ میں بطور فنکار ہم برکے کو لاک پر فوقیت دیتے ہیں حالانکہ جہاں تک مطالعے کی بنیادی صحت کا تعلق ہے وہ دونوں میں ایک مشترک حیثیت رکھتی ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکلا کہ اسلوب کا اپنا ایک کردار تو ہے لیکن بقول ”ادرنی“ اس میں خیالات کے بنیادی عنصر کا ہونا ضروری ہے۔“

اس اقتباس میں نہایت اختصار سے تین مغربی مصنفین کے خیالات بیان کر دیے اور ان مثالوں سے اپنے نقطہ نظر کو بھی بیان کر دیا اور کس سہولت سے وہ انگریزی کا پردہ فشر تھا لیکن اردو پر بھی اسے مکمل عبور حاصل تھا اور چونکہ انگریزی سے مرعوب نہیں تھا لہذا حسب ضرورت اپنی بات کو سمجھانے کے لیے اردو کے مصنفین کے بھی بے دریغ حوالے دیتا جاتا تھا۔

”ہم یہ جان سکتے ہیں کہ مولوی نذیر احمد نے ایسا کیوں لکھا اور سر سید کا اسٹائل (اسلوب) مہدی افاری سے کیوں جدا گانہ ہے اور اختر شیرانی، اقبال سے مختلف اسلوب میں اپنا اظہار کیوں کرتا ہے اور شاہد علی کی تصویروں کے خطوط اسے تراشیدہ کیوں نہیں جتنے کہ عبدالرحمن چغتائی کی

تصویروں میں ہیں۔“

اس کی تنقید صرف ”اوراق“ کے سلسلہ مضامین تک محدود تھی لیکن مختلف النوع موضوعات کا احاطہ کرنی تھی اور وہ ہر موضوع کے ساتھ انصاف کر رہا تھا۔

ایک تو وہ ناقد ہوتے ہیں جو صرف ناقد ہوتے ہیں لیکن وہ چونکہ تخلیق کار بھی تھا لہذا اس کی تنقید زیادہ معتبر ہو گئی تھی۔ اگر ان دیباچوں کو بھی شامل کر لیا جائے جو غلام جیلانی نے مختلف کتابوں کے لیے تحریر کیے تو ان کے تنقیدی کام کی تعداد میں کچھ اور اضافہ ہو جاتا ہے کیونکہ دیباچہ نگاری بھی تنقید کا ایک شعبہ ہی ہے۔ دیباچہ نگار نہ کڑا نقاد ہوتا ہے اور نہ محتسب۔ اسے ہمدردی کا کہہ سکتے ہیں۔ وہ کتاب کے ساتھ ساتھ مصنف کا تعارف بھی کر دیتا ہے اور کتاب کے موضوع کا تعارف اس انداز میں کر دیتا ہے کہ کتاب پڑھنے کی ترغیب ہو۔ یہ دراصل تنقید سے بھی زیادہ مشکل کام ہے۔

غلام جیلانی کی شہرت اور تخلیقی و علمی حیثیت اس بات کی متقاضی تھی کہ مصنفین اپنی کتابوں پر دیباچہ لکھوانے کے لیے رجوع کریں۔

غلام جیلانی نے جو دیباچے لکھے وہ اس تکنیک کے مطابق لکھے کہ پہلے مصنف کی شخصیت اور اس سے اپنے تعلق کا اظہار کیا اور اس کے بعد کتاب کے موضوعات کا جوہر اپنے مخصوص انداز میں بیان کیا، اس ہمدردی کے ساتھ کہ قاری کتاب خریدنے یا پڑھنے پر مجبور ہو جائے۔ اس ہمدردی کے پیچھے کوئی فرمائش کارفرما نہیں ہوتی بلکہ ایک نرم تجویزی عمل سے ایک ادبی فضا کا اہتمام کرتا ہے۔

اکثر دیباچہ نگار دیباچے میں وہ لکھتے ہیں جو مصنف چاہتا ہے لیکن غلام جیلانی نے اول تو پیشہ وردیباچہ نگاروں کی طرح زیادہ کتابوں کو ہاتھ نہیں لگایا اور جن پر دیباچے لکھے وہ وہی کتابیں تھیں جنہیں وہ خود بھی پسند کرتا تھا۔ اس کے تمام دیباچے قاری اور کتاب کے درمیان ایک پل کا کام کرنے کے لیے لکھے گئے۔

غلام جیلانی ان لوگوں میں سے نہیں تھا جن کا ذوق مطالعہ کسی ایک جگہ آ کر رک جاتا ہے۔ وہ ادب کی تمام تر منزلیں طے کرنے کے بعد بھی مطالعہ کتب کرتا رہتا تھا۔ وہ یہ کتابیں نہ صرف یہ کہ خود پڑھتا بلکہ جب کوئی نئی کتاب پڑھتا تو اس کا ذکر دوستوں سے ضرور کرتا اور انہیں بھی پڑھنے کی ترغیب دیتا۔ اس کتاب کے ایک ایک پہلو پر سیر

حاصل بحث کرتا۔ یہی اس کی تیرہ نگاری کی ابتدا تھی پھر رفتہ رفتہ یہ ہوا کہ وہ ان زبانی تبصروں کو ضبط تحریر میں لانے لگا۔ تیرہ دراصل تنقید ہی کا ایک پہلو ہے۔ زیادہ سے زیادہ ہم اسے ”تائثراتی تنقید“ کہہ سکتے ہیں جس میں تیرہ نگار اختصار کے ساتھ اپنی چینی کی رائے کا اظہار کرتا ہے۔

اس کے جو تیرے سامنے آئے ان میں یہ بات نمایاں تھی کہ پیش نظر کتاب کے ساتھ ساتھ وہ اپنے سابقہ مطالعے کی کرنیں بھی بکھیرتا رہتا ہے۔ کبھی مصنف ہی کی سابقہ کتب کا حوالہ دے کر مصنف کے فکری ارتقا پر بحث کرتا ہے۔ کبھی کسی اور مصنف کی کسی کتاب کا حوالہ دے کر زیر نظر تیرہ کتاب سے اس کا رشتہ جوڑتا ہے۔ اس طرح پڑھنے والے کو ایک کتاب پر تیرہ پڑھتے ہوئے کئی کتابوں اور مصنفین سے واقفیت ہو جاتی ہے یا خود پیش نظر کتاب کے مصنف کے ارتقائی عمل سے آگاہی ہو جاتی ہے۔

تیرہ نگاری اس کے لیے ایک آزاد عمل تھا۔ وہ کسی کتاب کو پڑھتا اس پر تیرہ لکھنے بیٹھتا پھر اس کا قلم اس کے مطالعہ کے ساتھ ساتھ آگے بڑھتا اور دائرہ سامنا کر اسی نقطہ آغاز سے آ کر مل جاتا جہاں سے آغاز کیا گیا تھا۔ دائرہ بنانے کی یہ کوشش بہت شعوری تھی اس لیے... بات سے بات نکالنے کے باوجود بے ترتیبی نظر نہیں آتی۔

ان تبصروں میں اس کا اسلوب بھی معرکے کی چیز ہے۔ وہ تیرہ شروع کرتا ہے اور پھر انشائیے کی طرح اسے پھیلاتا شروع کر دیتا ہے۔ اس نے اسلوب کے اعتبار سے بھی تیرے اور انشائیہ کو ملا دیا ہے۔

تیرہ پڑھتے پڑھتے پڑھنے پر اچانک احساس ہوتا ہے کہ ہم کوئی انشائیہ پڑھ رہے ہیں۔

”میں نے کتاب ”فکر و خیال“ کا مطالعہ خود اپنی تحریر سے شروع کیا پھر پہلے مضمون کا ابتدائی حصہ پڑھا اور پانچویں سطر سے فوراً دوسرے مضمون کے وسط میں پہنچ گیا پھر نیمے غالب کے شعور گنگائی طرف متوجہ کر لیا اور جب میں موت کے معنی دن تک پہنچا تو میں نے اپنی قدیم بھری اور مصنف کے ساتھ افسانوں کے دیہات میں گھومنے لگا۔ یہاں میں قاش قاش ہو کر بلونت سکھ، احمد ندیم قاسمی اور جمیل ہاشمی کے درمیان بٹ گیا۔ میں دن بھر قلم پارسی اور دربار اکبری کے درمیان معلق رہا۔ ابھی میں اس کیفیت سے نکلنے کی کوشش کر رہا تھا کہ تیسری آنکھ کے شاعر نے دوزخ کی دیوار سے اونچا اٹھا کر مجھے اچک لیا اور میں دن بھر درجا

مہدی علی خان کی رفاقت میں رہا۔ حسن اتفاق سے دوزخ میں میرا قیام زیادہ طویل نہیں رہا۔ میری اس ہذیبی کیفیت سے آپ کو موضوعات کے تنوع اور حسن موضوع کی یوگمونی کا اندازہ ہو گیا ہوگا۔ اس تنوع سے بہت کر تحریر کا اسلوب اس سے کہیں زیادہ جاذب اور دلکش ہے۔“

اس کے ان تبصروں کو اگر ”تنقیدی انشائیے“ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ اس نے زیادہ کتابوں پر تیرے نہیں لکھے شاید اس لیے کہ ایسی تحریریں روز روز نہیں لکھی جاتیں۔ تیرہ تو کتابوں کی خاکہ نگاری ہے۔ ایک چیز شخصی خاکہ نگاری بھی ہوتی ہے جسے ”سوانح“ کا ذیلی حصہ سمجھنا چاہیے۔ سوانح میں کسی شخص کی مکمل زندگی بند ہوتی ہے۔ خاکہ اس زندگی کے کسی ایک حصے کو پیش کرنے کا نام... ہے۔ ظاہر ہے اختصار اور طوالت خود بخود پیدا ہو جائے گی۔ خاکہ نگاری کی کامیابی یہ ہے کہ ہیرو کی زندگی کے چند واقعات اس جامعیت سے بیان کر دے کہ اس کی پوری شخصیت کا احاطہ ہو جائے۔

غلام جیلانی مجلسی آدمی تھا۔ کثرت احباب کا قائل تھا۔ مشاہدے کی قوت بھی رکھتا تھا اور تنقیدی نظر بھی پھر یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ ان احباب میں سے بعض خا کے لکھ کر انہیں تحسین پیش نہ کرے لہذا اس نے خا کے لکھے اور خاکہ نگاروں میں بھی اپنا نام لکھوایا۔

ان خا کوں میں اسے مزاح نگاری کا بحر پر موقع ملا جو اس کی طبیعت کا خاصہ تھا۔ اس شگفتہ نثر نے ان خا کوں کو نہایت پر لطف بنا دیا۔

وہ دوست کی خامیوں کو اچھالنے کے بجائے اس کی خوبیوں کا تذکرہ کرتا ہے۔ اسے غلام جیلانی کی کمزوری بھی کہا جاسکتا ہے اور بخشی خوبی بھی۔

اگر کسی کی کا ذکر کرتا بھی ہے تو اس ہنر سے کہ بات مذاق میں مل جاتی ہے۔

”سجاد نقوی نے پچھلے پچاس سال کا افسانوی ادب پڑھ لیا ہے جو اس نے نہیں پڑھا اس کا نہ پڑھنا ہی بہتر ہے۔ مجھے اس کے مطالعے کی رفتار سے یہ ڈر ہے کہ اگر وہ اسی طرح پڑھتا رہا تو وہ آئندہ پچاس سال کا ادب وقت سے پہلے پڑھ کر فارغ ہو جائے گا۔“

ایک ”خود نوشت خاکہ“ بھی لکھا جس میں اپنی شخصیت کو مزاح کی چاشنی میں لپیٹ کر پیش کیا۔

”میں ایک متوسط خاندان کا چشم و چراغ ہوں۔ بالکل ویسے ہی جیسے متوسط خاندانوں کے چشم و چراغ ہوتے ہیں۔ میں جب پیدا ہوا تو بہت چھوٹا تھا۔ اس لیے وٹوق سے تائیں سکتا کیمیری شکل و صورت کسی تھی لیکن جب ذرا بڑا ہوا اور مجھے اپنے آپ کو تنقیدی نظر سے دیکھنے کا اتفاق ہوا تو میں اس نتیجے پر پہنچا کہ اگر میں کسی اور خاندان میں پیدا ہوتا تو میری شکل و صورت مختلف یا کم از کم بہتر ہوتی۔“ (میری امر کہانی)

غلام جیلانی کی ایک حیثیت ”خط نگار“ کی بھی تھی۔ خط نگاری ایک نئی فعل ہے لیکن اب اس نے بھی ادب کی ایک صنف کی حیثیت اختیار کر لی ہے۔ خطوط غالب سے پہلے نئی خطوط محض خطوط ہوا کرتے تھے لیکن غالب کے خطوط میں کچھ ایسی ادبی خصوصیات جمع ہو گئیں کہ انہیں بھی اردو نثر کے شاہکار کی طرح پڑھا گیا۔ اس کے بعد اردو ادب کے ہر بڑے آدمی کے خطوط شائع ہوتے رہے اور ان پر لمبی چوڑی بحثیں ہوتی رہیں۔

نثر لکھنا سب جانتے ہیں لیکن خط لکھنا ایک عطیہ خداوندی ہے۔ فیضی جذبہ غلام جیلانی کو بڑی فیاضی سے عطا کیا گیا تھا۔ وہ اچھی گفتگو کا بادشاہ تھا۔ اس کا یہی انداز گفتگو اس کے خطوط میں در آیا۔ افسوس یہ ہے کہ احباب کی کثرت کی وجہ سے اسے کثرت سے خطوط لکھنے پڑتے تھے لیکن ان خطوط کو محفوظ نہیں کیا گیا ورنہ مشاہیر کے خطوط میں اس کے خطوط کو نہایت اہم جگہ ملتی کیونکہ اس کے خطوط نئی ہوتے ہوئے بھی تخلیقی حس کی بیداری کا مرقع ہوتے تھے۔ ذاتی نوعیت کو ادبی افادیت سے ملانے کے حامل ہوتے تھے۔

غالب کے نئی خطوط اس لیے ادب کا حصہ بن گئے کہ ان میں ادبی لطافت موجود تھی۔ غلام جیلانی کے خطوط بھی ادبی لطافت کا مظہر تھے۔

غالب کے لیے بھی کہا جاتا ہے کہ جب 1857ء کی جنگ آزادی کی ہنگامہ آرائی کے بعد ان کے بہت سے دوست ان سے دور ہو گئے تو انہوں نے خطوط کا سہارا لیا۔ وہ فرض کر لیا کرتے تھے کہ ان کا فلاں دوست ان کے پاس بیٹھا ہے اور وہ اس سے باتیں کر رہے ہیں۔ غالب نے اسی لیے تو کہا تھا۔ ”میں نے مراسلے کو مکالمہ بنا دیا ہے۔“ غلام جیلانی کا بھی یہی عالم ہے۔ جب تنہائی حملہ آور ہوتی تو وہ دوستوں کی انجمن میں دوستوں سے باتیں کرنے لگتا۔ ”کل ہمدانی صاحب آئے تھے۔ مختصر ملاقات کے

لیے۔ تمام عرصہ آپ (پروفیسر آغا جلیل) ہی کی باتیں ہوتی رہیں۔ آپ اس لحاظ سے خوش قسمت ہیں کہ دو مقتول انسان آپ سے بہتر کوئی موضوع سخن تلاش ہی نہ کر سکے۔“ غلام جیلانی کے ساتھ بھی غالب کی طرح کا معاملہ پیش آیا۔ جب ملک ملازمت تھی سرکاری نوعیت کے خطوط کے سوا کچھ لکھنے کی نوبت نہ آتی تھی لیکن ریٹائرمنٹ کے بعد (گویا جنگ آزادی کے بعد) اور خاص طور پر بڑھاپے کی کمزوری کے باعث دوستوں سے ملنا چلنا کم ہو گیا تو خط لکھنا اس کا معمول بن گیا۔

وہ بے کار آدمی نہیں تھا کہ بے کار گفتگو کرتا۔ اس کے خطوط میں عام سی باتیں ضرور ہیں لیکن بے ہنگم نہیں۔ بے تکلفی کی فضا میں دانش کی ایک کیمیری کچنی چلی جاتی ہے۔ ”..... اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ عمل بنیادی طور پر جتنا ضروری ہے اتنا ہی بے سود ہے۔ اس سے مطلب یہ نہیں کہ آدمی اپنی کوشش یا کاوش کم کر دے بلکہ یہ ہے کہ کوشش کے ساتھ اپنے ایمان کو بھی شامل کر لے کیونکہ کامیابی اور ناکامی کا منہج اور مصدر ایک ہی ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔“ غالب کو حیوان طریف سمجھا جاتا تھا۔ ان کے مزاج کی خوبی ان کے خطوط میں خوب ابھرتی تھی۔ غلام جیلانی کے خطوط میں بھی یہ مواقع اکثر آتے ہیں۔

”سرگودھا میں رہنے کا ایک خاص فائدہ ہوا ہے۔ آئندہ زندگی میں اگر مجھے کسی خاص مصلحت کے پیش نظر جنت میں نہ بھیجا یا بارگاہ جہنم میں صرف نامناسب خوراک کی شکایت ہوگی۔ موسم کی شکایت نہیں ہوگی۔“

اس کے خطوط انشائیہ بھی ہیں، تبصرے بھی، ادبی تنقید بھی، خودنوشت بھی، افسوس کہ ان خطوط کو سنبھال کر نہیں رکھا گیا۔ انہیں شائع ہونا چاہیے تھا۔

☆☆☆

ہر سرکاری ملازم کو ریٹائرمنٹ کا منہ دیکھنا پڑتا ہے۔ اسے بھی ہماری جوانی میں ساٹھ سال کی عمر کو پہنچ کر 1978ء میں ریٹائر کر دیا گیا۔ ابھی کل کی بات تھی کہ مشتاق احمد یوسفی نے اسے ”نوجوان مزاح نگار“ کہا تھا مگر سرکار بڑی بے درد ہے۔ اسے ساٹھ سال کا قرار دے کر ریٹائر کر دیا۔

اس نے سیکڑوں نادانیاں کی ہوں گی لیکن ایک عقل مندی کا کام بھی کیا تھا۔ سرگودھا میں اپنا ذاتی مکان تعمیر کر لیا تھا۔ وہ اپنے وسیع کنبے کو لے کر اس نئے گھر میں منتقل ہو گیا۔ یہ کنبہ مزید وسیع اس لیے ہو گیا تھا کہ اس کے والد بھی تلہ

مرگ سے آکر اس کے ساتھ رہنے لگے تھے۔

یہ مکان نہایت ہوادار تھا۔ ہر طرف گھاس کا مچھلی فرش بچھا ہوا تھا اور متعدد اقسام کے پھولوں سے آراستہ تھا۔ ان پھولوں کی دیکھ بھال وہ خود کیا کرتا تھا۔ فرصت ہی فرصت تھی لہذا پھولوں کا منہ دھلا دیتا رہتا اس کا مشغلہ ہو گیا تھا۔

ایک روز ڈاکٹر وزیر آغا اس سے ملنے اس کے نئے کوشی نما مکان پر پہنچے۔ گیٹ کے قریب پہنچے تو ایک بوڑھے مانی کو کپڑے اتارے جا گتیا پہنے کیاری میں بیٹھے دیکھا۔ آغا صاحب نے اس سے کہا، جیلانی صاحب کو اطلاع دو کہ آغا جی آئے ہیں۔ بوڑھے مانی نے سر اٹھایا کیاری سے نکلا اور لپک کر وزیر آغا سے لپٹ گیا۔ جب پتا چلا کہ یہ تو خود جیلانی ہے۔

جب پھول اچھی طرح خوشبود بنے گئے۔ بیٹے اپنے اپنے کاروبار کے سلسلے میں لاہور چلے گئے۔ تنہائی کاٹنے کے لیے اس نے اپنے شاگردوں پر گھر کے دروازے کھول دیے۔ شام کو احباب جمع ہوتے اور ادب کی گتھیوں کی گرہیں کھولی جاتیں۔

اب اس کا معمول یہ ہو گیا تھا۔ صبح سیر کے لیے نکل جاتا۔ دن کے وقت کالج کے طلبہ آجاتے۔ شام کو با تو اس کے گھر دوستوں کی محفل جتنی یا وہ خود وزیر آغا کی محفل دوستوں میں پہنچ جاتا۔

عمر بھر شاعری کی تھی۔ انشائیے لکھے تھے، خاکے تراشے تھے۔ تنقیدی مضامین تحریر کیے تھے۔ دانش کے جتنے جوہر تقریروں میں بھر گئے تھے وہ تو اپنی جگہ لیکن تحریری سرمایہ بھی کم نہیں تھا لیکن طبیعت ایسی بے حیا تو بانی تھی کہ وسائل ہونے کے باوجود کوئی کتاب منظر عام پر نہیں آتی تھی۔ اس کے شاگردوں کے مجموعے شائع ہو چکے تھے لیکن وہ ابھی تک صاحب کتاب نہیں تھا۔ دوستوں نے اسے خالی بیٹھے دیکھا تو اصرار کیا کہ وہ اپنا مجموعہ کلام شائع کرے۔

خود شاعری آدمی کی کاہلی نے اس اصرار پر کان نہ دھرے۔ بالآخر دوستوں نے خود یہ کاروبار اپنے ہاتھ میں لیا۔ منظوری اس کی بھی محنت دوستوں کی۔

جائیں غزلوں اور چوبیس نظموں کا ایک مجموعہ مرتب ہو گیا۔ مناجات، تہن نصائیں اور چند قوی نظمیں بھی تھیں۔

یہ سرمایہ جمع ہو گیا تو مجموعے کا نام رکھنے کا مسئلہ درپیش ہوا۔ دوستوں نے ہاتھ اٹھالے کہ نام خود جیلانی صاحب رکھیں گے۔

غالب 1952ء کا ذکر ہے سبھی خاندان کے

ایک بڑے صاحب، حبیب جالب مرحوم کے فن سے بے حد متاثر ہوئے اور جالب مرحوم کو اپنے پارچہ بانی کے کارخانے میں ملازم رکھ لیا۔ یہ کارخانہ لائل پور ٹم فیمل آباد میں (کوہ نور ملز) تھا اب بھی ہوگا۔ کچھ دن گزرے تو سبھی خاندان کے بڑے صاحب جو بہر حال مالک تھے جالب مرحوم سے روایتی سلوک پر اتر آئے۔ جالب مرحوم فطری طور پر آزاد منش اور درویش آدمی تھے کسی سے دب کے رہنا ان کے مسلک میں تھا ہی نہیں کہ صاحب ایمان فن کار تھے۔ کارخانے میں حسب معمول ماہانہ مشاعرے کا انعقاد ہوا تو پنڈل میں سب سے اعلیٰ نشست پر بڑے صاحب جلوہ فرما تھے۔ پنڈال کے عقب میں بڑے صاحب کی کوشی بھی سراٹھائے کھڑی تھی۔ حبیب جالب مرحوم کی باری آئی تو شاعر شمشاد قداس کی بے باک آواز بھر پور انداز میں چہار جانب گونج اٹھی۔

شعر ہوتا ہے اب مہینوں میں زندگی وصل مہنی مہینوں میں دوسرا شعر بڑے صاحب اور اس کی کوشی کی طرف اشارہ کر کے ادا کیا کچھ اس طمطراق سے کہ پورا جلسہ دم بہ خود رہ گیا۔

پیار کی روشنی نہیں ملتی ان مکاتوں میں ان مکینوں میں نتیجتاً دوسرے روز جالب مرحوم قارع کر دیے گئے۔ دوستوں کے استسار پر جالب مرحوم نے صرف اتنا ہی کہا۔ ”ہاں“ یارو آزاد ہو گیا ہوں۔“ جالب مرحوم یقیناً جرأت ایمانی سے مالا مال تھے۔ عمر بھر طاعت کے آگے ڈٹے رہے اور خود کو امر کر گئے۔

مرسلہ: محمد یازاری، مانسہرہ

غلام جیلانی ان لوگوں میں سے تھا جو سچے کے نام کو سچے پر فوقیت دیتے ہیں۔ اس نے نہایت منفرد نام تجویز کیا۔ ”مجموعے کا نام رکھیے“ میں اور میں۔“

”یہ کیا نام ہوا۔ میں اور تو ہوتا تو پھر بھی کچھ تھا؟“

”اس نام کی معنویت پر ذرا غور کیجیے۔“ غلام جیلانی نے اصرار کیا۔ ”پہلا میں میری شناخت ہے اور دوسری میں میرا وہ سیلف (self) ہے جو تمہاری کے کھوں میں میرے خارجی سیلف پر غالب آجاتا ہے۔“

اس کی وضاحت کے باوجود یہ نام کئی دنوں تک دوستوں کے درمیان زیر بحث رہا۔ بات جب ڈاکٹر سید عبداللہ تک پہنچی تو انہوں نے اس نام کی تحریف کی۔

”میں اور میں نہایت عمدہ نام ہے۔ شاید احباب یا ناشر کی نظر اس کے فکری مطالب پر نہیں پڑی۔“ یہ مجموعہ شائع ہوا تو بھی اس کے منفرد نام ”میں اور میں“ پر گفتگو جاری رہی اور اس عنوان ہی سے اس کی شاعری کو سمجھنے کی کوشش کی جاتی رہی۔

غزلوں کا مجموعہ سپرد قارئین کرنے کے بعد وہ نظموں کی طرف زیادہ متوجہ رہا۔ یہ نظمیں ”اوراق“ تخلیق اور صریح جیسے ممتاز ادبی رسائل کی زینت بنتی رہیں۔

پہلے مجموعے کی خاطر خواہ پذیرائی نے اسے حوصلہ مند کر دیا تھا۔ 2002ء میں پہلے مجموعے کے تقریباً پندرہ سولہ سال بعد اس نے دوسرا مجموعہ ”اک ذرا شام سے پہلے“ پیش کیا۔ اس میں ستر سے زیادہ نظمیں شامل تھیں۔

شاعری سے نمٹنے کے بعد وہ اپنے انشائیوں کی طرف متوجہ ہوا۔ تیس سال کے عرصے میں اس نے بیس انشائیں تحریر کیے تھے۔ اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ اس نے ان پر کتنی محنت کی ہوگی۔ صرف نوک پلک سنوارنے میں کتنا وقت لگایا ہوگا اور مبرکتا کہ تیس سال تک انہیں شائع کرنے کا خیال تک نہیں آیا۔ بہر حال ایک کتاب.... انشائیوں کی مرتب ہوگئی جولاہور سے شائع ہوئی۔

مرزا اسد اللہ خاں غالب کی بری منائی جاری تھی۔ غلام جیلانی ”سرگودھا اکادمی“ کا معتقد تھا۔ اس نے غالب کے بارے میں مضامین نظم و نثر کا ایک انتخاب مرتب کیا جو اس موقع پر آؤاؤ خزانے سرگودھا نے لکھے تھے۔ یہ مضامین ”نذر غالب“ کے عنوان سے سرگودھا اکادمی نے شائع کیے۔

غلام جیلانی کی مرتب کردہ اس کتاب کے دو حصے

تھے۔ پہلے حصے میں غالب کے فکر فون اور احوال و آثار پر نثر کے اچھے مضامین تھے جبکہ دوسرے حصے میں غالب کی زمین میں شعرا کی غزلیں شامل کی گئی تھیں۔

غلام جیلانی نے یہ طرہ غزل لکھی تھی

اک ترے ترک تعلق سے بھی کیا ہوتا ہے
وہی ہوتا ہے جو منظور خدا ہوتا ہے
یہ لیے ہونٹ بھی تو قیصر وفا کی خاطر
سانس لیتے ہیں تو یاروں کو لگھ ہوتا ہے
موج گرداب میں لے آؤ سینے اپنے
صرف ساحل سے بھی کیا لطف دعا ہوتا ہے
آج رو لینے دے جی بھر کے مجھے شام فراق
آج کچھ درد مرے دل میں سوا ہوتا ہے

سرگودھا اکادمی ہی کے زیر اہتمام انور مسدیدی کی معاونت سے اس نے ”بہترین ادب“ کے تحت ان تحریروں کو یکجا کر کے شائع کیا جن میں زندہ رہنے کی سکت تھی۔

اس کتاب کو جب حسین امین نظروں سے دیکھا گیا تو دو سال بعد ایک اور انتخاب شائع کیا۔ اس انتخاب کو بھی ادبی حلقوں میں پسند کیا گیا۔ وہ افسانے، نظمیں، غزلیں، مقالات جو رسائل میں ادھر ادھر بکھرے ہوئے تھے یکجا ہو گئے۔

والد کا انتقال پہلے ہی ہو چکا تھا لیکن جب بیوی کی وفات ہوئی تو صدمے کے ساتھ ساتھ بھی نہ ختم ہونے والی تنہائی نے اسے گھیر لیا۔ بیوی کی ضرورت جوانی میں نہیں بڑھا پے میں ہوتی ہے۔ یہ تنہائی اس کی رگوں میں اترنے لگی۔ کب کی سنبھالی ہوئی صحت میں مہل لگنے لگا۔ اب اس کی فطری شوخی کبھی کبھی ہی رنگ دکھائی تھی ورنہ مسلسل خاموشی اس کے ساتھ رہنے لگی تھی۔ گھر میں بند ہو کر بیٹھ گیا۔ دوست خود اس سے ملنے چلے آتے تھے پھر ایک دن اس نے چادر کی سیاہی پسیدی میں تبدیلی کی اور ”شام دوستان“ میں جا پہنچا۔ دوستوں نے سمجھ کا سانس لیا کہ وہ خانہ حزیں سے نکلا تو سہمی۔ یہ پہلا موقع تھا کہ وہ دوستوں میں تھا اور خاموش تھا۔ دوست پھر بھی مطمئن تھے۔

وہ اسی طرح ہر شام دوستوں کی محفل میں جا کر بیٹھتا رہا۔ اندر ہی اندر اس کا علاج ہوتا رہا۔ اس نے وقت کے ساتھ ساتھ مفاہمت کر لی۔

زخم مندمل بھی ہو جائے تو زخم کی جگہ بہت دن تک دکھتی رہتی ہے۔ یہی حال اس کا تھا۔ صدمے کو برداشت کرنے کی قوت آگئی لیکن کرب کی کیفیت ختم نہ ہوئی۔ وقت کاٹنا مشکل ہو گیا۔

وہ ایک روز اسی کرب کے عالم میں بیٹھا تھا۔ سوچا وقت گزاری کے لیے کسی کتاب کی ورق گردانی کر لی جائے۔ وہ کتابوں کی الماری کے پاس پہنچا۔ ہونے والی بات کہ ایک شاعرہ نجمہ منصور کی نثری نظموں کا مجموعہ ”اگر نظموں کے پر ہوتے“ اس کے ہاتھ میں آگیا۔ وہ نثری نظموں کے حق میں نہیں تھا۔ اس نے تو یہ تک لکھا تھا ”میں نثری نظم کو باقاعدہ شاعری کی صنف نہیں سمجھتا۔“

ان خیالات کے باوجود اس کتاب میں کچھ کش محسوس ہوئی۔ اس نے کتاب ہاتھ میں لی۔ نجمہ منصور اس کی شاگردہ پختی تھی۔ بڑی محبت سے اس نے کتاب پیش کی تھی لیکن ابھی تک اس کے مطالعے میں نہ آسکی تھی۔ وہ اسے پڑھنے بیٹھ گیا۔ اس کتاب کے شعری مواد میں اسے محبت، جدائی اور اداسی کا ایک ایسا رتو نظر آیا جسے وہ کچھ دنوں سے خود بھی محسوس کر رہا تھا۔ وہ بعض نظموں کو بار بار پڑھتا رہا اور اہلٹا رہا۔ گھبراہٹ تھی کہ ختم ہونے میں نہ آتی تھی۔ وہ برآمدے میں پڑے ہوئے صوفے پر آکر بیٹھ گیا۔ کتاب اب بھی اس کے ہاتھ میں تھی۔ اس نے کتاب صوفے پر رکھی اور پودوں اور پھولوں سے باتیں کرنے لان میں نکل آیا۔ وہ بہت دیر تک خود کلامی کی کیفیت میں رہا۔ یہاں بھی اس کا دل نہیں لگا۔ وہ پھر برآمدے میں آکر صوفے پر بیٹھ گیا۔ کتاب پھر اس کے ہاتھ میں آگئی۔ نجمہ منصور کی ایک نظم اس کے سامنے تھی غلام جیلانی کے دکھ کی ترجمانی کر رہی تھی۔

وہ رات
کتنی غمگین کتنی اداس
کتنی چپ چاپ گزرتی ہے
جب میرا اپنا آپ
میرے پاس ہوتے ہوئے بھی
میرے پاس نہیں ہوتا
مجھ سے بہت دور، بہت دور
چلا جاتا ہے
بالکل تیری طرح

☆☆☆
اس نے گھبرا کر صفحہ پلٹا۔ ایک اور نظم سامنے تھی۔

جس رات تری یادیں آتی
مجھے یوں لگتا ہے
جیسے مرے دل کے اندر کوئی چپتا ہے
چپتا ہے اور شور کرتا ہے
شور کرتا ہے اور راہ نکلتا ہے
راہ نکلتا ہے اور روتا ہے
روتا ہے اور پھر
تھک ہار کے سو جاتا ہے

☆☆☆

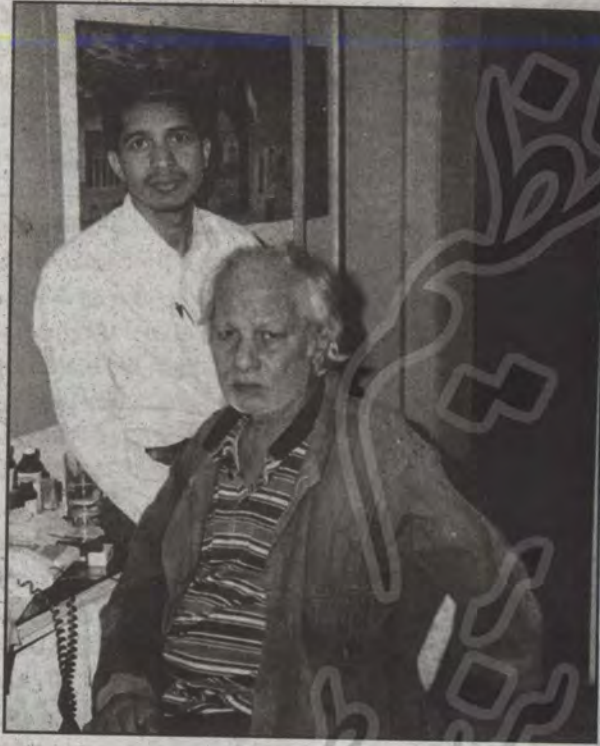
اسے یوں لگا جیسے یہ نظمیں اس نے کہی ہیں۔ نجمہ منصور نے اپنا نام ٹانگ دیا ہے۔ اگر اس نے نہیں کہی ہیں تو اسے کہتی چاہیے تھیں۔ اب کیا ہو سکتا ہے۔ وہ ان نظموں کو دوبارہ کیسے کہے۔ اب تو ایک ہی صورت ہے۔ اب تو ایک ہی صورت ہے۔ وہ گنگنانے کے انداز میں کہتا رہا اور لکھنے کی میز پر جا کر بیٹھ گیا۔ اپنی تخلیقی صلاحیت کو آواز دی اور دونوں نظموں کو انگریزی کے قالب میں ڈھال دیا۔

انگریزی میں ترجمہ کر کے اس نے ان نظموں کو دوبارہ کہہ دیا۔

اسے انگریزی زبان پر مکمل دسترس حاصل تھی لیکن وہ انگریزی سے محروم نہیں ہوا تھا۔ اس نے زندگی بھر انگریزی پڑھا ہی تھی لیکن منہ بڑھا کر کے انگریزی بھی نہیں بولی تھی۔ نہ ضرورت محسوس کی تھی کہ انگریزی میں شاعری کرے لیکن ان نظموں کو انگریزی میں ڈھالنے میں ایسی لذت ملی کہ باقی نظمیں بھی لے کر بیٹھ گیا۔ ترجمہ نگاری کی اس محویت میں ایسا گم ہوا کہ چند ہی روز میں ستر سے زائد نثری نظموں پر مشتمل اس کتاب کو انگریزی میں منتقل کر دیا۔ اس نے بالکل آخری دنوں میں اپنی شخصیت کا ایک نیا پہلو پیش کر دیا۔

اس نے ان نظموں کے ترجمے میں پناہ ڈھونڈی اور ایک مرتبہ پھر زندگی میں واپس آگیا۔ اس کے بیٹے اعجاز اصغر کی شادی کی بات چل نکلی۔ گھر میں شادیانے پہنے گئے۔ سب اولادیں جمع ہوئیں۔ وہ بھی بہل گیا۔ ان دنوں اس کی خوشی دیکھنے کی چیز تھی۔ احباب اور رشتے داروں سے گھر بھرا ہوا تھا۔ وہ بڑے ارمانوں سے بہو بیاہ کر لایا۔ شادی کو ابھی ایک ہفتہ گزرا تھا کہ برین ٹیمبرج نے اعجاز اصغر کو موت کے منہ میں دھکیل دیا۔

”میرا تو بیٹا مرا ہے اس دلہن بے چاری کا کیا قصور تھا



فکر

شکیل صدیقی

وہ ایک پاکستانی مصور تھا لیکن اس کے خیالات مغربی تھے۔ اس کے فن میں بھی مغربیت تھی اسی لیے یہاں کے ماحول میں رہ پڑا نہ پایا۔ اس نے شاہکار تصاویر بنائیں مگر جرمن بیوی کے روئے جانے سے ٹوٹ کر رہ گیا۔ اپنا نگارخانہ بند کیا اور خود بھی جرمنی میں جاکر بیٹھ گیا مگر اسے حاصل کیا ہوا؟

ایک مشہور و معروف مصور کی روداد

تقسیم کا اعلان ہو چکا تھا، اس لیے خوں خوار درندے گلی کوچوں میں گھوم رہے تھے۔ ان کا نشانہ بے کس اور نیتے مسلمان تھے۔ انہیں لوٹا، گھروں کو آگ لگا، ان کا مشغلہ تھا۔ شیر مرزا اور اس کے اہل خانہ کے لیے ہدایت کی

تجھ سے بچنے میں قیامت تو نہیں ٹوٹی ہے
اک ذرا سی بات یہ کیوں حشر اٹھایا جائے
☆☆☆

غلام جیلانی اصغر نے ایک زمانے میں (85ء سے 87ء) انگریزی روزنامہ ”دی پاکستان ٹائمز“ میں اردو کے جدید شعرا پر مضامین کا ایک سلسلہ شروع کیا تھا۔ پہلا مضمون فیض احمد فیض پر اور آخری مضمون وزیر آغا کی شاعری پر لکھا تھا۔ یہ مضامین مقبول بھی ہوئے تھے اور ادب کے لیے اثاثہ بھی تھے۔ بہت اہم تھے لیکن ابھی تک کتابی صورت میں نہیں آئے تھے۔ اس کی وفات کے بعد اس کے ایک شاگرد ڈاکٹر زاہد منیر عامر نے حق شاگردی ادا کیا اور زینت جیلانی کی مدد سے ان مضامین کو تلاش کیا۔ یہ مضامین جیلانی کی فائلوں میں محفوظ تھے۔ زاہد منیر نے انہیں ترتیب دیا اور اردو اکیڈمی لاہور سے جولائی 2007ء میں شائع کر دیا۔ پیش لفظ زاہد منیر نے تحریر کیا تھا۔

”ان کے یہ مضامین جن میں ان کی دانش و فراست و بصیرت موجود ہے بہت کم لوگوں تک پہنچے۔ تاہم اب یہ مضامین شائع کیے جا رہے ہیں۔“

اس کتاب کے پہلے حصے میں دس شعرا پر مضامین شامل ہیں یعنی فیض احمد فیض، ن، م، راشد، جمید احمد، یوسف ظفر، مختار صدیقی، راجا مہدی علی خاں، وزیر آغا۔

دوسرے حصے میں غالب، اقبال، وارث شاہ پر مضامین ہیں۔

یہ تمام مضامین نیم تنقیدی ہیں کیونکہ یہ مضامین ادبی رسالے کے نہیں بلکہ اخبار کے عام قاری کے لیے لکھے جا رہے تھے۔ اس لیے انداز گفتہ ہے اور کسی خاص بحث و تجسس کے بغیر ان شاعروں کی شاعری کے چند نئے زاویے تلاش کیے۔ اس کتاب کا نام ”شاعری کے پروں پر“ تجویز کیا گیا۔ شامل کتاب تمام مضامین انگریزی میں ہیں۔

یہ کتاب بہترین بدیع و عقیدت تھا جو مرحوم غلام جیلانی اصغر کو ان کے دوستوں کی طرف سے پیش کیا گیا۔

کیسے کیسے نقش تھے سلاب میں جو بہہ گئے
جانے کس کا نام تھا، دیوار پر لکھا رہا

ماخذات

پروفیسر غلام جیلانی اصغر، شخصیت اور فن
ڈاکٹر انور سدید، سرگزشت عبدالمجید سالک

کہ بخت کے اندر بیوہ ہو گئی۔“ وہ بے اختیار چیخ اٹھا۔ یہ ایسا غم تھا کہ بیوی کا غم پس پشت چلا گیا۔ ہر وقت بیٹے کو یاد کرتا رہتا اور آنکھوں سے آنسو بہتے رہتے۔ وہ بظاہر زندہ تھا لیکن اندر سے مر چکا تھا۔ اس مرتبہ مسکراتا ایسا بھولا کہ ہونٹوں پر جیسے مہر لگ گئی۔ بہت سے دوست لاہور منتقل ہو گئے تھے جو سرگودھا میں تھے وہ برابر دلداری کو آتے رہتے۔ کمزوری بڑھتی جا رہی تھی۔ چلتا پھرتا مفلوک ہو گیا تھا۔ گفتگوں کے درد نے بے حال کیا ہوا تھا کسی کے سہارے چند قدم چل پھر لیتا تھا اور بس۔ وہ بستر کا ہو کر رہ گیا، سماعت بھی کمزور ہو گئی۔

صاف نظر آ رہا تھا کہ چراغ سحری کسی وقت بھی بجھ سکتا ہے۔ وہ شخص رخصت ہونے کو تھا جس سے سرگودھا کی پہچان تھی۔ اس کا قرض کس طرح اتارا جائے۔

اہل سرگودھا نے ایک شام جیلانی کے نام کی۔ ٹیکڑوں شاگرد تھے جسے خبر ملی اس تقریب میں شرکت کے لیے پہنچ گیا۔ احباب کا بڑا مجمع شریک ہوا۔ وزیر آغا لاہور میں تھے۔ اس تقریب میں شرکت کے لیے سرگودھا آئے اور اپنا تاثراتی مضمون پڑھا۔ وہ چپ سادھے ہوئے تھا۔ دوستوں کو دیکھ کر چہرے پر ایک روشنی ضرور آئی لیکن پھر فوراً ہی اپنے خول میں بند ہو گیا۔

یہ اس کے ساتھ سرگودھا کی آخری تقریب ثابت ہوئی۔ سماعت پہلے ہی جاتی رہی تھی۔ یادداشت نے بھی ساتھ چھوڑ دیا۔ پہچانے ہوئے لوگوں کو پہچانا دشوار تھا۔ جب کوئی دوست ملنے آتا تو پہچاننے کی کوشش میں آنکھیں ادھر ادھر گھماتا۔ اس وقت اس کی آنکھوں میں عجیب بے بسی ہوتی۔ اس کی بیٹی زینت جیلانی اس کے کان میں اونچی آواز میں بتاتی کہ فلاں صاحب ہیں۔ کچھ دیر کے لیے مزید گم صم ہو جاتا جیسے ذہن کے اہل میں اس شخص کی تصویر تلاش کر رہا ہو پھر جب ذہن کی تصویر سے آنے والے کے چہرے کو ملا لیتا تو کل افسانہ۔ دیر تک باتیں کرتا رہتا۔ بیماری کے غلے کے باوجود توانائی آجاتی۔ آنے والا رخصت ہو جاتا تو توانائی بھی رخصت ہو جاتی۔

یہ کیفیت تقریباً ایک سال رہی۔ وہ زبان حال سے یہ کہتا نظر آتا تھا۔

تمہارے شہر کا تنہا ستارہ شب ہوں
مجھے بجھا کے سر شام کیا جلاؤ گے
26 دسمبر 2006ء کو وہ بے مثل ادیب اپنے دوستوں کو یہ تلقین کرتا ہوا رخصت ہو گیا۔

افراد جو امر تر چھوڑ رہے تھے، اپنا اثاثہ سنبھال کر ریلوے اسٹیشن کی طرف بھاگتے تھے۔ کسی نہ کسی طرح سے ٹرینوں میں بیٹھتے اور پھر وہاں ہمہ پہنچ جاتے۔ آگ و خون کا یہ سفر آسان نہیں تھا۔ اس لیے کہ دوندے ان ٹرینوں کو راستے میں روک کر قتل عام شروع کر دیتے۔ جب وہ ٹرینیں وہاں پہنچتیں تو ان کے ڈبوں سے خون فک رہا ہوتا۔ دروازے کھولے جاتے تو بعض اوقات ایک فرد بھی زندہ نہ ملتا۔ بشیر کا باپ تاگتے جاتا اور فردخت کرتا تھا، بالکل جیسے آج کل کاروں کے شوروم ہوتے ہیں اور کاریں فردخت کی جاتی ہیں۔ اس کا باپ محمد دین مرزا آسودہ زندگی بسر کر رہا تھا۔ اس کے چار لڑکے اور دو لڑکیاں تھیں۔ وہ بشیر کو بھی اپنے ساتھ دکان پر لے جایا کرتا تھا۔

بشیر 8 جون 1941ء میں پیدا ہوا تھا۔ خاندانی نام بشیر احمد مرزا تھا۔ ابتدا میں وہ بشیر اے مرزا ہی لکھا کرتا تھا پھر اس نے نکال دیا اور بشیر مرزا بن گیا۔ ایک زمانہ آیا کہ وہ صرف بی ایم ہو گیا۔ اسے رنگوں سے آشنا ہونے میں دیر نہ لگی۔ تاگوں کو دل کش اور دیدہ زیب بنانے کے لیے جو نیلی پیلی پٹیاں چھتوں پر لٹکی جاتی ہیں، کھوڑے کو خوب صورت اور انوکھا بنانے کے لیے اس کی لگام سے لے کر دم تک جو رسیاں لٹکی جاتی ہیں، وہ بھی رنگین ہوتی ہیں۔ تقریباً سب ہی رنگ ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ تانبے اور نیکل کے مصنوعی زیورات ہوتے جن سے تانگے میں چمک آ جاتی ہے۔ بشیر کہتا تھا۔ ”میرے والد بزرگوار پر فخر کرتے تھے، اس لیے کہ میں نے انہیں گاڑی کا کوئی پینٹا میزھا بناتے نہیں دیکھا۔ ان کی بنائی ہوئی ہر ایک چیز تناسب میں ہوتی تھی۔ میں خود بھی لکڑیوں کو رنگین بنانے کے لیے ان پر پینٹ کرتا تھا۔ بس اسی کے بعد میرے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ میں تصویریں بنائوں۔ جب بھی کوئی سفید کاغذ مل جاتا میں اسے سیاہ کرنے بیٹھ جاتا۔ یقین کیجئے اس زمانے میں بھی میری تصویریں لوگوں کو پسند آتی تھیں۔ ابتدا میں پڑھنے لکھنے کی طرف طبیعت مائل نہیں تھی، والدین اسکول بھیجتے تھے تو میں بیتے لے کر مسجد کے زینے پر جا کر بیٹھ جاتا تھا اور اس کے صحن کی طرف دیکھا کرتا یا پھر جو لوگ سڑک پر سے گزر رہے ہوتے ان کا مشاہدہ کرتا رہتا۔ یہ مشاہدات آگے چل کر بہت کام آئے۔ خیر میں گھر سے زیادہ دور نہیں جاتا تھا، جب ظہر کی اذان ہو جاتی تھی تو گھر واپس آ جاتا تھا۔ اس طرح سے اس بات پر پردہ پڑا رہتا کہ میں اسکول

گیا ہوں یا نہیں۔“

رنگوں کی اس دنیا سے آشنائی کے بعد بشیر کے دل میں یہ خیالات جاگزیں ہوئے کہ وہ مصور بنے گا اور ان اشکال کو نیوٹن پر منتقل کرے گا۔ مگر فسادات کیا ہوئے کہ سب کچھ گنڈہ ہو گیا۔ اس کے دماغ میں دہشت انگیز مناظر نقش ہو گئے، جس کی ہر شے میں سرخی نمایاں تھی۔ سکتے بکتے چہرے، ہر ایسکی میں لپٹے ہوئے اجسام، مدد کے لیے پکاری ہوئی چیخیں، سرخی میں نہاے ہوئے لوگ، کرب و اذیت کا نہ رکنے والا سلسلہ تھا جو اس کی آنکھوں کے سامنے سے گزر رہا تھا۔ بربریت کا ایک سیل رواں تھا جو اس کی بصارت میں جذب ہو کر دماغ کی پالیٹوں میں محفوظ ہو گیا تھا۔

سرخ اور شعلوں جیسا رنگ اس کی پینٹنگز میں غالب کیوں ہے، وہ اس کی وجہ یہ بتاتا ہے کہ ایک بار وہ اپنے چھوٹے بھائی کے ساتھ باہر سے آیا تو منظر کشی کو دل چاہنے لگا۔ اس نے ایک کاغذ لیا اور اس پر پینٹ چلانے لگا۔ اس دوران چھوٹے بھائی کو نہ جانے کیا سمجھی کہ وہ ماچس سے کھیلنے لگا۔ پھر اس نے تیلیاں نکالیں اور سالے پر رگڑ کر شعلہ پیدا کرنے لگا۔ حالانکہ وہ سگریٹ نہیں پیتا تھا، لیکن بس شعلے کے طور پر تیلیاں جلانے جا رہا تھا۔ کسی چیز میں آگ لگ گئی۔ بشیر تصویر بنانے میں مہو تھا۔ اس نے توجہ نہیں دی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ آگ پھیلنے چلی گئی۔ جب گرمی محسوس ہوئی تو بشیر نے کروڑپوش پر لگا ڈالی۔ پھر اضطراب میں چپا اور اپنے چھوٹے بھائی کا ہاتھ تمام کر مکان سے باہر نکل آیا۔ ڈرا سی دیر میں شعلوں نے مکان کو چاٹ لیا، اس لیے کہ تانگے بنانے والا لکڑی کا سامان زیادہ تھا۔ اس کے بعد بربادی کی داستان شروع ہو گئی۔ اس لیے کہ اس آگ میں سب کے کپڑے تک جل کر خاک ہو چکے تھے۔

جب تقسیم کا اعلان ہوا تو اس کا خاندان واہگہ تک پہنچ گیا اور پھر وہاں سے لاہور آئے میں کامیاب ہو گیا۔ معلوم نہیں وہ کیسے زندہ بچ گئے۔ قسمت نے یاوری کی اور انہیں سر چھپانے کے لیے جیل بھیج دی۔ وہ ٹھیک 14 اگست 1947ء کو نئے وطن پاکستان پہنچے تھے، جب سب ایک عزم کے ساتھ وطن کو بنانے سنوارنے کے لیے کھڑے ہوئے تھے۔ ان دنوں کو یاد کرتے ہوئے وہ کہتا کہ جس ٹرین میں ہم لوگ آئے تھے، اس کے تقریباً سارے ڈبوں سے خون فک رہا تھا۔

وہ غوثی واقعہ اس کے ذہن پر اس طرح سے متشع ہوا کہ اس نے ایک میمورل بنایا جس کا نام ”ڈی لاسٹ ٹرین فرام امرتسر“ تھا۔ اس میمورل کے مختلف حصے تھے، اس کی یادوں کا عکس، سیاسی حالات، پاکستان کا پس منظر بھی تھا۔ یہ میمورل 1998ء میں بنایا گیا تھا۔ اس کے دس پرنٹ بنوا کر بشیر نے دوستوں میں تقسیم کر دیے۔ یہ میمورل بنانے کا خیال اسے اس وقت آیا جب اس نے خشونت سنگ کا ناول ”اے ٹرین ٹو پاکستان“ پڑھا تھا۔ پھر اس پر بننے والی فلم بھی دیکھی۔ بشیر چھ بھائی بہنوں میں پانچواں تھا۔ جب ہجرت کر کے وہ یہاں آیا تھا تو اس کی عمر صرف چھ برس تھی۔ لاہور آکر وہ مہاجرین کے کیمپ میں رہے جو واپس روڑ پر تھا۔ اس کے بعد کرائے کے مکان میں رہے۔ پھر تھڑو کہ املاک کے بدلے انہیں قلعہ گوجرگٹھ میں ایک مکان مل گیا۔

احمد پور شرقیہ میں اس کے بہنوئی محمد یوسف رہتے تھے۔ ان کے بارے میں پتا چلا تو والد نے سب کچھ چھوڑ چھاڑ کے احمد پور کا رخ کیا۔ اس کا باپ سختی اور جفاکش تھا، وسائل نہ ہونے کے باوجود اس نے ہاتھ پاؤں مار کر اپنا ورک شاپ قائم کر لیا اور تانگے بنانے لگا۔ روزی روٹی چلنے لگی۔ وہ سیدھا سادا تھا۔ فطانت اور چالاکی اس میں نہیں تھی۔ اس لیے ادھار پر کام کروانے والوں نے اس کا جینا حرام کر دیا۔ کشاکش زندگی میں تقریباً سب ہی جلا تھے۔ اس لیے وہ دل کو بہلا لیتے تھے کہ قدرت ان کے نوازندہ ملک کے لیے کچھ تو کرے گی۔ بہر حال اس کے دن بدل گئے اور وہ پھر سے آسودہ زندگی بسر کرنے لگا۔

اس کے والد کو چھوٹے شہر میں رہنے کی عادت نہیں تھی۔ لاہور اس کے دماغ میں بس گیا تھا۔ اس لیے اس نے فیصلہ کیا کہ وہیں رہنا چاہیے۔ محمد یوسف نے سمجھا یا کہ اب وہاں نہ جاؤ۔ یہاں کا دوبارہ جم چکا ہے۔ پریشانی اٹھاؤ گے، لیکن وہ نہ مانا۔ پھر لاہور آ گیا۔ اس کے پاؤں نہ جم سکے اور دور رہنا شروع ہو گیا۔

واپسی پر لوہاری منڈی میں کوچہ بھر بولے شاہ میں رہنا پڑا۔ ایک چھوٹا سا کرا تھا اور اتنے افراد رہنے والے۔ بشیر کو اسکول بھیجنے کے لیے اس کے والد کے پاس پیسے نہیں تھے۔ اس لیے بشیر پرچون کی ایک دکان پر بطور معاون کام کرنے لگا۔ اس کے والد کا خیال تھا کہ جب وہ کالہ باری باریکیوں کو کچھ لے گا تو اسے دکان کرا دی جائے گی۔ جبکہ دکان دار نے یہ سمجھ لیا تھا کہ بشیر کو اس کی غلامی میں دے

دیا گیا ہے، لہذا وہ اس سے گھر کے کام بھی کراتا تھا۔ اس کے بچوں کو اسکول پہنچانے اور لانے بھی جاتا تھا۔ گویا بشیر کی ذمہ داریاں دہری تھیں۔

اس کی ایک خالہ نے بہن سے کہا کہ بشیر اب ان کے گھر رہے گا اور وہ اسے تعلیم دلوائے گی، وہی اس کا خرچہ اٹھائیں گی۔ ان کی ایک ہی لڑکی تھی۔ اس کی شادی کے بعد وہ تنہا ہو گئی تھیں۔ اس کے خالو ریلوے میں ملازم تھے اس لیے گزر بسر اچھی ہو رہی تھی۔

بشیر کی ماں نے اجازت دے دی۔ اسے ایک اسکول میں داخل کر دیا گیا۔ پرانری تعلیم ختم کرنے کے بعد اسے مسلم ماڈل اسکول میں داخلہ دلا دیا گیا۔ جہاں اسے ڈرائنگ سے خاص شغف تھا۔ اس نے بتایا کہ جماعت کے سارے لڑکے اپنی ڈرائنگ کو اسی سے بنوایا کرتے تھے۔ وہ دعویٰ کرتا ہے کہ پیدائشی پیٹر ہے، اس لیے کہ جب بھی کلاس میں وقت ملتا تھا تو میں ”قلم فیئر“ کا کوئی شمارہ اٹھا لیتا اور اس میں سے دیکھ کر مدعو بالیا بلراج سہنی اور ولیپ کماری کی تصویر بنانا شروع کر دیتا۔ تاہم میں محسوس کرتا تھا کہ مجھ میں کچا پن ہے اور مجھے رہنمائی کی ضرورت ہے۔ اس اسکول کے ہیڈ ماسٹر ایم اے عزیز تھے جو معروف سیاست دان، ماہر اقتصادیات اور سابق وزیر خزانہ ڈاکٹر محبوب الحق کے والد تھے۔ ڈرائنگ ماسٹر اسلم صاحب تھے۔ 1958ء میں اسکول کی تعلیم ختم ہوئی، اس نے امتحان اول درجے میں پاس کیا۔ بعد کے زمانے میں شاکر علی نے اس کے یہ اٹچا دیکھ کر کہا تھا۔ ”یہ تو بازاری کام ہے۔ یہ تو سب ہی کر لیتے ہیں۔ آرٹ سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ تم آرٹ بننے کی کوشش کرو۔“

اسے مسلم ماڈل اسکول میں داخل کر دیا گیا۔ اسے چونکہ ابتدا ہی سے ڈرائنگ بنانے کا شوق تھا، اسی لیے وہ اس میں خصوصی دلچسپی لیا کرتا تھا۔ ساری کلاس کے لڑکے اس سے متاثر تھے، لہذا اپنی ڈرائنگ اسی سے بنوایا کرتے تھے یا کچھ کرایا کرتے تھے۔ جب ہائی کلاس کا رزلٹ آیا تو بشیر نے فرسٹ کلاس نمبر حاصل کیے۔ گھر والوں نے اس کا شوق دیکھ کر ہدایت دی کہ اسے کسی سائن بورڈ بنانے والے کے ہاں ملازمت کرنا چاہیے۔ اس کی پینٹنگ مزید بہتر ہو جائے گی۔

بشیر نے ان کی تجویز مان لی اور ایک سائن بورڈ پیئٹر کے ہاں کام کرنے لگا۔ اس باہر میں وہ کہتا ہے ”پہلے تو اس

نے میرا امتحان لیا اور اس کے بعد چھوٹے چھوٹے خاکے دینے لگا۔ چند مہینوں کے بعد ہی اس نے ایک بڑا سا سائن بورڈ بنوایا۔ اس کے لیے یہ کوئی دشواریات نہیں تھی، اس نے سائن بورڈ بنادیا۔ دکان کا مالک یہ دیکھ کر حیران ہو گیا۔ اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ اسے کیا تربیت دینا چاہیے۔ بس وہ اس سے کام کروانے لگا۔ بشیر سمجھ گیا کہ وہ اس سے استاد کی کر رہا ہے اسے کچھ سکھانا نہیں چاہتا اور صرف کدھوں کی طرح سے کام کرانا چاہتا ہے۔ چنانچہ اس نے سائن بورڈ کی دکان پر کام کرنا چھوڑ دیا۔

انہی دنوں کالج آف آرٹس کا ایک اشتہار پاکستان ٹائمز لاہور میں شائع ہوا۔ بشیر اس وقت ایک پارک میں بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے اشتہار پڑھ کر داغے کے لیے درخواست دے دی۔ اسے انٹرویو اور ٹیسٹ کے لیے منتخب کر لیا گیا۔ جب ڈرائنگ کا ٹیسٹ ہوا تو اس سے کہا گیا کہ وہ میبل کی ایک تصویر بنائے۔ وہ چونکہ کئی بار داتا منج پینسل کے مزار پر جا چکا تھا اور اس نے عرس بھی دیکھا تھا، اس لیے اس نے وہی پینٹ کر دیا۔ اسے کالج میں تعلیم کے لیے منتخب کر لیا گیا۔ یہ 1958ء کا واقعہ ہے۔ اس نے جو جو ذکر فیس بیج کی اور کالج جانا شروع کر دیا۔ کالج کی فیس چار روپے تھی اور طلبہ کو میٹرل کالج کی طرف سے ملتا تھا۔

یہ بابو اسکول آف آرٹس تھا جسے انگریزوں نے 1875ء میں قائم کیا تھا۔ اسی کو اپ گریڈ کر کے کالج بنادیا گیا تھا۔ نئے کالج کا چارج پروفیسر ایم۔ آراسیون برگ نے سنبھال لیا۔ وہ کالج کے پہلے پرنسپل مقرر ہوئے۔ بشیر پہلے گروپ (بیج) میں شامل تھا۔ پہلے سال کے مضامین مشترک تھے۔ سب کو سارے مضامین پڑھنا تھے۔ جب دوسرا سال شروع ہوا تو تین گروپ بن گئے۔ ہر طالب علم کو ان میں سے کسی ایک گروپ کا انتخاب کرنا تھا:

۱۔ کرسٹل آرٹ

۲۔ ڈیزائن

۳۔ آرٹس

پروفیسر شاکر علی جنیوں نے بشیر مرزا میں آرٹ کے جراثیم تلاش کر لیے تھے، اسے مشورہ دیا کہ وہ فائن آرٹ کا انتخاب کرے۔ جبکہ دوسرے خیر خواہوں نے اس کے برعکس مشورہ دیا کہ وہ کرسٹل آرٹ یا پھر ڈیزائن کا گروپ لے، تاکہ اس کی دال روٹی کا بندوبست ہو سکے۔ فائن آرٹ تو وقت ملنے پر وہ بھی کر لے گا۔ بشیر مجھے میں جیلا

ہو گیا اور اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ کرنا کیا چاہیے۔ تہذیب کے عالم میں اس نے ڈیزائننگ کا انتخاب کر لیا۔ جب فائنل امتحان ہونے لگے تو اس نے ایک پینٹنگ بنائی جو فنی اور دریا کی منظر کشی تھی۔ یہ پینٹنگ پروفیسر شاکر علی کو اتنی اچھی لگی کہ انہوں نے اسے اپنے پاس رکھ لیا اور اس کا انکشاف کئی برس بعد کیا۔

اس وقت شاکر علی کا طوطی بول رہا تھا۔ بشیر بھی ان سے متاثر تھا، مگر جب انہیں معلوم ہوا کہ ان کی خواہش کے برعکس اس نے ڈیزائننگ لی ہے تو وہ ناراض ہوئے۔

بہر حال جب انہوں نے دیکھا کہ وہ پینٹنگ بھی کر رہا ہے تو ان کی ناراضی جاتی رہی۔ وہ ان کے گھر پر حاضری دینے لگا۔ انہوں نے بھی اعزازہ لگا لیا کہ اس لڑکے میں تخلیقی جراثیم ہیں۔ اسے رنگوں کی پہچان ہے اور وہ انہیں استعمال کرنا بھی جانتا ہے۔ سب سے بڑی بات یہ کہ اس کے پاس موضوعات بھی ہیں۔ اسے بخوبی معلوم ہے کہ اسے کیا بنانا ہے۔ کیسے بنانا ہے۔ چنانچہ انہوں نے اس پر محنت کی اور بہت کچھ بنادیا۔ ان کی رہنمائی میں بشیر کی تخلیقی صلاحیتیں دو چند ہو گئیں۔ وہ اب اندر سے خالی نہیں رہا تھا، اس کے اندر کا پیشتر بیدار ہو گیا تھا۔ بشیر ان دنوں کو یاد کرتے ہوئے کہتا ہے کہ میرے اندر کا دروازہ نہیں کھلا تھا شاکر علی نے وہ دروازہ کھول دیا۔ وہ اس کے لیے ماڈل کا بندوبست کرتے اور اسے پیسے اپنے پاس سے دے دیا کرتے تھے۔ انہیں بشیر کی معاشی اعتری کے بارے میں اچھی طرح سے معلوم تھا، اس لیے انہوں نے اس کا وظیفہ جاری کر دیا۔

شاکر علی کا شمار جدید معصوروں میں کیا جاتا تھا۔ انہوں نے آرٹ کی تعلیم میں 12 برس ممبئی، پیرس اور لندن میں گزارے۔ پیرس میں کام کیا پھر پراگ چلے گئے۔ 1952ء میں وہ پاکستان لوٹ آئے۔

ان کی زیادہ تر پینٹنگز کا موضوع یورپ کی لوک داستانوں پر منحصر تھا اور ان میں سرخ رنگ نمایاں ہوا کرتا تھا۔ انہوں نے پرنڈوں کو بھی پینٹ کیا، جو آزاد فضا میں سانس لیتے ہیں اور رسم و رواج کے پابندیوں سے بے شاگرد علی رنگوں کو اس طرح سے استعمال کرتے تھے کہ وہ نفسی سکھیرتے محسوس ہوتے تھے۔

1956ء ان کے عروج کا زمانہ تھا۔ 1960ء میں انہوں نے اسلامی خطاطی بھی کی۔ 1961ء سے 1973ء تک وہ اسکول آف آرٹس لاہور کے پرنسپل

رہے۔ پاکستان کے مشہور و مقبول مصوران کے شاگرد تھے جن میں بشیر مرزا کے علاوہ جمیل نقاش اور احمد پرویز ہیں۔ 14 اگست 2006ء میں پاکستان کے ٹھکانہ ڈاک نے معصوروں کے یادگاری ٹکٹ جاری کیے جن میں مشہور معصوروں کے ساتھ ان کا ٹکٹ بھی شامل ہے۔ وہ 1914ء میں کان پوراٹھیا میں پیدا ہوئے اور انہوں نے 1975ء میں لاہور میں انتقال کیا۔

☆☆☆

بشیر جب فائنل ایئر میں تھا تو شاکر علی نے اسے اپنے پاس بلایا۔ وہ فائنل آرٹ کے شعبے کے سربراہ تھے۔ انہوں نے کہا: ”تمہارے پاس اپنا خرچہ اٹھانے کے لیے پیسا نہیں ہے، لہذا کچھ کرو۔“

”جناب! کیا کروں؟“ اس نے پوچھا۔

”سید حسن کے پاس جاؤ۔ میں انہیں فون کر دوں گا۔“ انہوں نے ہدایت دی۔

اس زمانے میں سید حسن ”لیل و نہار“ کے مدیر ہوا کرتے تھے۔ دوسرے دن بشیر ان کے پاس گیا اور اس نے شاکر علی کی حوالہ دیا۔ انہوں نے نو جوان لڑکے کو دیکھا اور سوچنے لگے۔ بشیر سوچنے لگے کہ چند کھٹے کا کام مل جائے گا تو خرچہ چل جائے گا۔ سید سید حسن نے اس کی طرف ایک کاغذ بڑھایا اور کہا: ”اس پر لکھو کہ تیری رقم لوگے؟“

بشیر سوچنے لگا کہ رقم لکھنا تو ایک امتحان ہے، اگر زیادہ لکھ دی تو لینے کے دینے نہ پڑ جائیں۔ ایسا نہ ہو کہ وہ کورا سا جواب دے کر باہر جانے کا راستہ دکھا دیں۔ اسے خیال آیا کہ جب وہ ڈھائی سو لکھے گا تو بڑھ سول ہی جائیں گے۔ چنانچہ اس نے ڈھائی سو لکھ دیے۔ حیران کن بات یہ ہوئی کہ سید حسن نے اس رقم کو منظور کرنے میں دیر نہیں لگائی۔ بشیر کا کہنا ہے کہ میں نے سوچا کہ میری تو لائبریری نکل آئی۔ چند مہینوں کے کام کے لیے ڈھائی سو روپے! مجھے معلوم تھا کہ اتنی رقم میں تو میں عیش کروں گا۔

بشیر مرزا نے فائنل امتحان فرسٹ کلاس نمبروں سے پاس کر لیا۔ اس لیے کہ قدرت نے اسے ذہانت کا جو ہر عطا کر رکھا تھا۔ اسی اثنا میں گورنمنٹ آف پاکستان پینٹنگ پریس کے عہدے دار آئے اور انہوں نے کالج کے پروفیسروں سے پوچھا کہ کالج کا سب سے ہونہار اور مشاق طالب علم کون ہے۔ بشیر مرزا اور کسی ایک طالب کا نام لیا گیا۔ پینٹنگ پریس والوں نے ان دونوں کو جڑ و قی

لمازمت کی پیشکش کی، جو ان دونوں نے قبول کر لی۔ یوں وہ لاہور سے کراچی آ گیا۔ اتفاق سے یہ بھی 14 اگست کا دن تھا۔ اس سے چند ستراس نے 14 اگست کو اس سرزمین پر قدم رکھا تھا۔

وہ یہاں آ گیا، لیکن رہائش کا مسئلہ تھا۔ کوئی جان پہچان ہی نہیں تھی، اس لیے کچھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرنا چاہیے؟ سربراہ اس کا ایک دوست مل گیا۔ اس نے پوچھا کہاں رہ رہے ہو اور کیا کر رہے ہو؟ ڈرگ کالونی (اب شاہ فیصل کالونی) میں رہتا تھا۔ اس نے بشیر کی چٹان کر پیش کی کہ وہ چاہے تو اس کے ساتھ ایک کمرے کے گھر میں رہ سکتا ہے۔ وہ خود اپنی قسمت آزمائے کراچی آیا تھا۔ حالات اس کے بھی اچھے نہیں تھے، مگر دل کشادہ تھا۔ اس نے جس غلوں سے پیشکش کی تھی اس کے جواب میں بشیر نے اس کے کوارٹرس میں رہنا منظور کر لیا۔

پریس میں بہت سے ڈیزائنز کام کر رہے تھے۔ بشیر سے کہا گیا کہ وہ ان کا کام دیکھے اور اگر وہ ڈیزائننگ میں کوئی غلطی کا ارتکاب کر رہے ہوں تو ان کی اصلاح کرے اور اس کے علاوہ پریس کے سارے شعبوں میں جا کر انتظامی معاملات پر بھی نگاہ رکھے۔ اگر اس کے خیال میں کوئی کام بہتر انداز میں ہو سکتا ہو تو اس کی رپورٹ انتظامیہ کو دے۔ اس کی یہ مصروفیت چھ ماہ تک رہے گی۔

یہ بھی طے پایا کہ اس کے بعد اسے چند ٹکٹ کے ڈیزائن بنانا ہوں گے۔ بشیر ٹکٹ فوراً ہی بنانا چاہتا تھا، لہذا اس نے انتظامی امور کے ساتھ ساتھ ٹکٹ بنانے پر بھی اصرار کیا۔ یہ کام اسے دے دیا گیا۔ ٹکٹ کا عنوان اس نے ”بھوک سے نجات رکھا۔ اس میں صرف ایک ٹکٹ نہیں تھا، بلکہ یہ بیر بھی۔

اس زمانے میں ڈاک ٹکٹ فوٹو انگریزوں سے چھپتے تھے اور باہر سے چھپ کر آتے تھے۔ ابھی پاکستان میں چھپائی کا یہ طریقہ شروع نہیں ہوا تھا۔ ٹکٹ اصلی ساز میں ڈیزائن کیے جاتے تھے۔ اس پر لکھائی اور تصویر دونوں اصل ساز پر ہی بنائی ہوتی تھیں۔ گویا پورا ڈیزائن ہی اصل ساز میں بنانا پڑتا تھا۔

بشیر کو ہدایت دی گئی کہ وہ چھ ماہ تک کام کا مشاہدہ کرے اور اس کے بعد خود بنائے، لیکن اس نے پہلے مینے میں ٹکٹ ڈیزائن کرنا شروع کر دیے۔ انتظامیہ کو اس کے بنائے ہوئے ڈیزائن پسند آئے اور ان کی چھپائی کی منظوری دے دی گئی۔ یہ بشیر کے لیے کسی اعزاز سے کم نہیں تھا اس

لیے کہ جڑ کے پریش میں کام کرنے آتے تھے، ان کے ڈیزائن برس دو برس کے بعد منظوری حاصل کر پاتے تھے۔ دوسرے لڑکوں نے اسے رشک اور حسین کی نظروں سے دیکھا۔

ملازمت تو مل گئی تھی، لیکن اس کے اصول اور ضوابط پر عمل کرنا بشیر کے لیے دشوار تھا۔ وقت پر دفتر جانا اس کے لیے کاردار تھا۔ اکثر جب وہ پریشک پریس کے گیٹ پر پہنچتا تو وہ بند ملتا۔ چنانچہ وہ آوارہ گردی کر کے وقت گزارتا۔ صبح ٹائم میں وہ دوسروں کے ساتھ اندر چلا جاتا تھا۔ جب اس کے تاخیر سے دفتر پہنچنے کا سلسلہ جاری رہا تو انتظامیہ نے اسے نوٹس دینا شروع کر دیے۔ بس میں سوار ہو کر دفتر جانے والا بشیر مزاحمت کرکے پیش کرنے کے سوا کچھ بھی کیا سکتا تھا۔

پریشک پریس سے دل اچاٹ ہونے کا سبب ایک واقعہ بھی بنا۔ ہوا یوں کہ ایک روز وہ ڈرگ کالونی کے کوارٹر سے نکلا تھا کہ اسے پریشک پریس کے انگریز منیجر کی کار نظر آئی۔ اس نے ہاتھ دے کر اسے روکنا چاہا، لیکن منیجر نے اسے دیکھنے کے باوجود روخوڑا اٹھنا نہ سمجھا۔ بشیر کا دماغ غصے میں ہلکے سے اڑ گیا۔ اسے انگریزی میں مٹنی گالیاں آتی تھیں وہ اس نے بک دیں۔

اس نے سوچا کہ مشاہرے میں اضافہ ہو جائے گا تو وہ اپنے لیے اسکوٹر خرید لے گا۔ اس نے مشاہرہ میں اضافے کی بات کی جو منظور نہیں کی گئی تو اس نے وہ عارضی ملازمت چھوڑ دی۔ انتظامیہ نے اندیشہ ظاہر کیا کہ وہ فاقے کرے گا اور مارا مارا پھرے گا۔ بشیر نے اس کی پروا نہیں کی۔ وہ جانتا تھا کہ اس میں اتنی صلاحیت ہے کہ اب وہ اپنے پاؤں پر کھڑا ہو سکے۔

اسے ایک برطانوی اشتہاری ایجنسی کراؤنڈ میں سینئر آرٹسٹ کی حیثیت سے کام مل گیا اور اس کی تنخواہ سات سو روپے مقرر ہوئی۔ ایجنسی کا مالک آرٹسٹوں کی نازک مزاجی اور حساسیت سے بخوبی واقف تھا، لہذا اس نے بشیر پر کوئی بے جا قدر نہیں لگائی اور نہ ہی اسرار کیا کہ وہ پابندی سے اپنی آئے۔ اس نے کہا کہ اسے کام دیا جا رہا ہے جو اسے ایک معینہ مدت میں ختم کرنا ہوگا۔ چاہے وہ اسے ایک روز میں کر لے چاہے چار دن میں۔ اس لیے کہ آرٹسٹوں کا بہر حال ایک موڈ ہوتا ہے اور تخلیق کار کو کوئی مشین نہیں ہوتا۔ تخلیق ایک کیفیت کا نام ہے جو کسی وقت بھی طاری ہو سکتی ہے۔ بشیر نے اس کا شکریہ ادا کیا اور کام میں

مصروف ہو گیا۔

اب اس کا معیار زندگی بڑھ گیا، اس لیے کہ سات سو روپے بہت زیادہ تھے۔ وہ بی بی ای سی ایچ ایس میں ایک صاحب کے گھر میں بے انگ کیسٹ کی حیثیت سے رہنے لگا۔ اب اس کی شامیں گھینے لبرٹی میں گزرتی گئیں (کینے لبرٹی اب بند ہو گیا ہے)

اس کے کام کو سراہا گیا۔ لیکن جب مالک چند مہینوں کے لیے ملک سے باہر چلا گیا تو اس کے نائب کو بشیر کا انداز پسند نہیں آیا۔ خاص طور پر انگریزی سے کئی دن تک غیر حاضر رہنا۔ اس کا خیال تھا کہ یہ بے اصولی ہے۔ آرٹسٹ کو پابندی سے کلکوں کی طرح دفتر میں آنا چاہیے۔ بشیر نے پابندی کو قبول نہیں کیا اور ابھی چھوڑ دی۔ اب اس میں خود اعتمادی آگئی تھی اور وہ جانتا تھا کہ زندگی کی گاڑی کو کیسے چلایا جاسکتا ہے۔

اس نے کراچی آمد کے بعد چند ماہ میں کافی ڈرامٹیکو بنا ڈالیں۔ اس کی ملاقات ناٹمیر باکے سفارت خانے کے ہائی کمشنر سے ہوئی۔ انہیں وہ ڈرامٹیکو پسند آئیں اور انہوں نے اجازت دے دی کہ وہ ان کی نمائش ان کی رہائش گاہ پر کر سکتا ہے۔ یہ اس کا پہلا دن۔ میں شکر تھا جو اس نے کراچی میں آنے کے دن ابھی 27 جون 1963ء میں کیا تھا۔ شو میں اس نے اپنی چالیس تصاویر رکھیں، جن میں پال پوائنٹ، ایک پین اور کیریون کا استعمال کیا گیا تھا۔ اس کے علاوہ پینٹنگز بھی تھیں جن میں آئل، واٹر کالر اور پوسٹر فلر کا استعمال کیا گیا تھا۔

نمائش کو پسند کیا گیا۔ پریس نے اس کے کام کو راجح حسین پیش کیا۔ اس نمائش میں اس نے نیوڈ بھی بنائیں تھیں۔ ناٹمیر باکے ہائی کمشنر برائے پاکستان، جناب الحاج عبدالقادر ابوبکر کو گوانے اپنے تاثرات مہمانوں کی کتاب میں یوں درج کیے:

”..... وہ پینٹنگز جو خاص طور پر آئل میں بنائی گئی ہیں میں ان سے متاثر ہوا ہوں۔ انہیں دیکھ کر احساس ہوتا ہے کہ بشیر نے پہلی بار بشیر کی سے آرٹ ورک کیا ہے۔ میں آرٹ کا شائق ہوں میرے اندرونی جذبے نے بے اختیار مجھے اکسایا کہ میں بشیر کی سائنس کروں۔ میں نے غصوں کیا ہے کہ نوجوانوں نے بھی اس کے کام میں دلچسپی لی ہے۔ بشیر بہت حساس ہے، اس نے کیوس پر جو رنگ بھیرے ہیں وہ اس کے احساسات اور مشاہدات ہیں۔ میں نے غصوں کیا ہے کہ یہ نوجوان مستقبل کا بڑا

آرٹسٹ ہے۔ ہم اسے نظر انداز نہیں کر سکتے اور نہ اس لاوے کو روک سکتے ہیں جو اندر سے باہر آنے کے لیے بے تاب ہے۔“

بشیر کی عمر اس وقت بائیس برس تھی اور اس کی مونچھیں بھی تھیں۔ اس کا حلقہ احباب بڑھ گیا اور سامی رہنے میں اضافہ ہو گیا۔ اسے پارٹیوں میں بلایا جانے لگا۔ وہ جب ... دلچسپ اور حرے دار گفتگو کرتا تھا تو لوگ اس کے گرد جمع ہو جاتے تھے۔ خاص طور پر خواتین اس کے گرد میڈلائی تھیں۔ جب ایک صحافی نے اس سے پوچھا کہ اسے کبھی کسی سے عشق ہوا ہے تو اس نے واڈ کا کا گلاس اٹھا کر دو گھونٹ بھرے اور پھر کہا کہ بہت سے عشق ہوئے۔ جب میں طالب علم تھا تو محلے کی ایک لڑکی کا پیچھا کرنے لگا۔ وہ روزیج اسکول جاتی تھی اور مجھے بھی اسکول جانا ہوتا تھا۔ وہ جس وقت گھر سے نکلتی تھی اتفاق سے اسی وقت میں بھی گھر سے نکلتا تھا۔ چنانچہ میں اس کے پیچھے پیچھے چل پڑتا۔ جب اس کا اسکول آتا وہ اندر چلی جاتی اور میں اپنے اسکول کی طرف چل پڑتا۔ یہ ایک طرف عشق تھا، مگر تھا بہت جذباتی اور بیجان خیر۔ اس میں شدت تھی۔ میں نے اس کا چہرہ تو نہیں دیکھا، لیکن خواب و خیال میں اس کا ایک خاکہ ضرور بنایا تھا۔ آنکھیں ایسی ہوں گی، ناک ویسی ہوگی اور چہرہ اس قسم کا۔ وہ لوگ حلقہ چھوڑ گئے تو عشق ختم ہو گیا۔

دوسرا عشق اس وقت ہوا جب میں میٹرک میں تھا۔ میرے گھر کے سامنے والے گھر کی لڑکی میں ایک لڑکی آرکٹری ہو جاتی تھی۔ وہ مجھے دیکھتی تھی اور میں اسے دیکھتا تھا۔ بہت دنوں تک محض دیکھنے کا سلسلہ جاری رہا۔ ایک روز جب وہ گھر میں تھیں تو میں اس کے گھر میں داخل ہو گیا۔ سوچا تھا کہ وہ مجھے دیکھ کر خوش ہوگی، لیکن اس نے مجھے دیکھ کر شور مچا دیا۔ میں گھبرا گیا اور ہواک کروا دیا۔ اس نے سوچا اس معاملے پر خفاک ڈال دینی چاہیے، لیکن معاملہ یہیں ختم نہیں ہوا اور اس لڑکی کی ماں نے آکر میری ماں سے شکایت کر دی۔ بس نہ پوچھیے کہ شرمندگی سے کیا حال ہوا۔ کوئی خاص عشق نہیں تھا، لیکن نہ جانے کیا بات ہے کہ بھلائے ہی نہیں بھولتا۔ ذہن پر اس کا نقش گہرا ہے۔

جب کالج میں پڑھتا تھا تو وہاں بھی ایک عشق ہوا۔ ایک بڑے شخص کی بیٹی پر عشق تھی۔ وہ فرسٹ ایئر میں تھی اور میں فائنل میں۔ بری چہرہ اور دل میں اتر جانے والی۔ اس کی چوٹی بہت لمبی تھی اور وہ پھول لگا کر آتی

تھی۔ میں وقت پر کالج نہیں جاتا تھا، لیکن اس کی وجہ سے وقت پر جانے لگا۔ کالج کا وقت آٹھ بجے ہوا کرتا تھا اور میں ایک گھنٹا پہلے ہی یعنی سات بجے پہنچ جاتا تھا یوں باتیں کرنے کے لیے وقت مل جاتا تھا۔ مالا جلا معاملہ تھا، عشق بھی اور دوستی بھی۔ اب بھی اچھی دوست ہے۔ ایک بچے کی ماں ہے، طلاق ہو چکی ہے۔ آرکٹسٹ ہے۔

اس وقت بہت سنجیدہ قسم کا عشق ہو گیا جن دنوں میں طارق روڈ پر رہتا تھا۔ میں بے انگ گیٹ تھا، وہ مالک مکان کی لڑکی تھی۔ کالی اور بد شکل سی۔ وہ بتدریج میرے قریب آتی چلی گئی۔ اکثر آکر میرے قریب بیٹھ جاتی اور ہم لوگ بے لگتی سی باتیں کرتے رہتے۔ ابتدا میں تو کچھ پتہ نہ چلا، ایک روز احساس ہوا کہ مجھے اس سے عشق ہو گیا ہے۔ چہرہ وہ لاہور چلی گئی اور اس نے کالج میں داخلہ لے لیا۔ اگر وہ کراچی میں رہتی تو میں یقیناً اس سے شادی کر بیٹھتا۔ لاہور سے وہ امریکا چلی گئی اور میں یہاں روتا بیٹھا رہ گیا۔ بعد میں خط و کتابت بھی ہوئی، لیکن وہ بہت چالاک تھی۔ میرا خیال ہے کہ لڑکیاں چالاک ہی ہوتی ہیں۔

جب اس سے یہ سوال کیا گیا کہ کسی لڑکی نے اس سے کبھی محبت کی؟ اس نے اعتراف کیا کہ ایک طالبہ تھی جس نے آخری وقت میرا ساتھ نہیں چھوڑا۔ اس وقت وہ تین بچوں کی ماں بن چکی تھی۔ وہ شادی کے بعد دوسرے صوبے میں چلی گئی تھی اور اپنے شوہر کے ساتھ رہتی تھی۔ وہ وقفہ وقفے سے کراچی آتی رہتی تھی اور مجھ سے ملتی بھی تھی۔ میری شدید بیماری کے دوران بھی آتی رہی۔ میں اس سے خط و کتابت بھی کرتا تھا۔ ہمارے درمیان ہر طرح کے تعلقات تھے۔

☆☆☆

بشیر مرزا کی پینٹنگز کی دوسری نمائش اپریل 1965ء میں امریکن گیلری سینٹر میں ہوئی۔ پریس اس کے کام سے متاثر ہوا۔ انگریزی اخبار لیڈرز کے مدیر سلطان احمد نے لکھا:

”بشیر مرزا میں عزم و حوصلہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ وہ ایک بیدار مغز آرٹسٹ ہے اور اس کا مشاہدہ وسیع ہے۔ پہلے اس نے زندگی گزارنے کے لیے کمرشل آرٹ کی طرف توجہ دی۔ پھر اس کی سیاہ لکیروں نے اسے کھینچ کر شکل اختیار کر لی۔ اس کے بعد اس نے واٹر کالر کا تجربہ کیا۔ اس کے بعد اب آئل سے کام کر رہا ہے۔ اس نے بتدریج مصوری کی انتہا کی طرف سفر کیا۔ بشیر پر خارجی اثرات بھی ہیں۔ اس کی پینٹنگز کو دیکھ کر احساس ہوتا ہے کہ اس نے

ہمارے جیسے انسانوں کو پیٹ کیا ہے۔ وہ محض آنکھوں کو تسکین پہچانے اور سٹلی جذبات کو حرارت بخشنے کے لیے نیوڈز نہیں بناتا۔ اس کا موضوع کچلے ہوئے جذبات اور نا تمام خواہشات ہیں۔ اس کے میورڈ ”پتھر کا شہر“ نے مجھے خاص طور پر متاثر کیا۔“

مارچ 1966ء میں اس کی پینٹنگ کی تیسری نمائش ہوئی۔ پینٹنگز بن رہی تھیں، لوگ تعریف و توصیف بھی کر رہے تھے، پریس میں شائع ہونے والے تبصرے بھی ستائشی تھے لیکن خریدار میسر نہیں تھے۔ یہ اسی وقت ہوتا ہے جب باقاعدہ گیلری کھول کر پینٹنگز کی نمائش کی جائے۔ اپنا اور دوسروں کا کام وہاں رکھا جائے۔

اسی زمانے میں ایک جرمن لڑکی لوی اس کی زندگی میں داخل ہوئی..... وہ سیر کرتی ہوئی کراچی آئی تھی۔ ایک دوست کے وسیلے سے اس کا تعارف بشیر مرزا سے ہو گیا۔ بشیر تو ایسے موقعوں کے انتظار میں رہتا تھا۔ لوی کو رہنے کے لیے ٹھکانا چاہیے تھا اور بشیر کو کسی لڑکی کی قربت۔

لوی مصورہ تھی اور آرٹ کے حوالے سے پاکستان آئی تھی۔ وہ نہ صرف اس کی دوست بن گئی بلکہ اس کے لیے ماڈل بھی اودھ دیتی طور پر ایک دوسرے کے قریب آئے یا نہیں، بہر حال کچھ دنوں کے لیے ایک دوسرے کے ہو گئے۔ غالباً ان کے لیے پہلی ضرورت یہی تھی۔ ان دنوں بشیر طارق روڈ کے قبرستان کے قریب ایک چھوٹے سے کمرے میں رہتا تھا۔ لاہالی اور بے پروائی سے، اس کے کمرے کی ہر چیز بکھری رہتی تھی۔ تنہم و سلیقہ اس کی زندگی میں بھی آیا ہی نہیں۔ لوی چار برس تک اس کے ساتھ رہی۔ انہوں نے شادی نہیں کی، لیکن ساتھ رہتے تھے۔ اس کی ماں تک یہ بات پہنچ گئی۔ جب وہ ان کے سامنے گیا تو انہوں نے پہلا سوال یہی کیا۔ جموٹ وہ بول نہیں سکتا تھا اور سچی بات بتا نہیں سکتا تھا، اس لیے اس نے ان کی بات کا گول مول جواب دیا۔ اس کے بھانجے شہباز قریشی نے ایک بار انکشاف کیا کہ بشیر مرزا لوی کو احمد پور شرقیہ بھی لے گیا، جہاں اس کی بہن رہتی تھی۔

وہاں مسئلے کھڑے ہو گئے۔ وہاں کا کلچر کراچی سے بالکل مختلف تھا۔ گھر میں اثر کنڈیشنر بھی نہیں تھا، نہ ہاتھ روم، نہ فلش سسٹم۔ وہ اس زمانے میں وہاں گئے تھے جب سورج سوائٹرز پر تھا۔ اس لیے دونوں فرش پر بستر کے بغیر سو جاتے تھے، تاکہ موزائیک کی ٹھنڈک سے ہی نیند

آجائے۔ جرمن خاتون کا وہاں جانا ایک عجوبہ تھا۔ جب دونوں کسی گلی سے گزرتے تو لڑکے ”میم“ دیکھنے کے چکر میں پیچھے لگ جاتے تھے۔

1965ء میں اس کی کرشیل آرٹ گیلری کھولنے کی خواہش پوری ہوئی۔ اس نے اپنے ایک انگریز دوست آرٹسٹ پیٹر چنکاک کے اشتراک سے ایک آرٹ گیلری کھولی تھی جس کا نام ”دی گیلری“ تھا۔ نیچے گیلری تھی اور اوپری منزل پر اس کی رہائش گاہ تھی جہاں وہ لوی کے ساتھ رہتا تھا۔

وہ گیلری پچھری روڈ پر تھی جو اب ٹوٹ چکی ہے۔ اس کے ساتھ۔ دوسری عمارتیں بھی گرا کر تکی عمارات قائم کر دی گئی ہیں۔ اس گیلری کا افتتاح ذوالفقار علی بھٹو کو کرنا تھا، مگر 65 کی جنگ کے سبب وہ نہ آ سکے۔ چنکاک ان کا انتظار نہ کر سکا اور گیلری بشیر کے حوالے کر کے واپس برطانیہ چلا گیا۔ گیلری جلنے لگی۔ اس کا دعویٰ تھا کہ اس نے پاکستان میں سب سے پہلے گیلری کھولی تھی۔ اس سے پہلے مشرقی پاکستان کے پیٹریل جھانگیر نے راول پنڈی میں ایک آرٹ گیلری بنائی تھی، لیکن کہا جاتا ہے کہ وہ گیلری سے زیادہ دکان تھی، جہاں مصوروں کے فن پارے فروخت ہوتے تھے۔ چنانچہ بشیر کا یہ دعویٰ کسی حد تک درست ہے کہ اس کی گیلری سب سے پہلی پاکستانی گیلری تھی۔

اس گیلری کے افتتاح کے وقت چالیس پچاس افراد آئے تھے اس کے بعد ایک ماہ تک بھولے بھٹکے لوگ آ جاتے تھے۔ لوگوں کو ابھی آرٹ کا پتا نہیں تھا اس لیے اسے خریدنا کون؟ بشیر اس صورت حال سے آزرده ہوا لیکن اس نے اپنی گیلری کو جاری رکھا۔ پھر ایک سال بعد اس کی سال گرہ بھی منائی۔ اس سال گرہ پر فیض احمد فیض نے بھی ایک پیغام بھجوایا تھا۔ اسی دور میں حکومت امریکا کی طرف سے بشیر کو ہوائی میں اسکارا کی پیشکش کی گئی۔ اس نے انکار کر دیا اس لیے کہ پھر لوی کو چھوڑنا پڑتا۔ وہ یقیناً جرمنی چلی جاتی، لہذا اس نے اسکارا شپ پر لوی کو تریج دی۔ یہ اس کی بڑی ہونے کی خود اعتمادی تھی جس کا اسے بعد میں افسوس ہوا۔ اس نے سوچا اسکارا شپ تو بعد میں بھی مل سکتی ہے۔

اپنی دنوں ایک ایسا واقعہ ہوا جس نے اسے بلیک لسٹ کر دیا۔ فیض صاحب نے اس سے کہا کہ ویت نام میں کشتی کا اجلاس کرنا ہے، تمہاری گیلری میں کر لیتے ہیں۔ وہ فیض صاحب سے انکار کیسے کر سکتا تھا۔ اس نے اجازت دے

دی۔ چنانچہ ”دی گیلری“ میں ویت نام کشتی کا اجلاس ہوا، تری پسند مقررین نے امریکا کے خلاف تقریریں کیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بشیر امریکا کے نزدیک ”کیونٹ“ بن گیا۔ ہوائی کی اسکارا شپ اسے دوبارہ نصیب نہیں ہوئی۔ بہر حال اسے لوی پر ہی گزارہ کرنا پڑا۔ وہ کہتا ہے۔ ”لوی پر میرے فن کے گہرے اثرات مرتب ہوئے۔ وہ بعد میں ایک بڑی پیٹریل بن گئی۔ جرمنی میں آرٹ کے ایک مقابلے میں جہاں 118 پیٹریلوں کا کام رکھا گیا تھا، اس میں لوی کو پانچواں انعام ملا۔“

☆☆☆

اس سوال پر کہ وہ نیوڈز کیوں بناتا ہے اس نے جواب دیا۔ ”موسم برسات ہو یا موسم بہار، پھول پھلنے یا پت جھڑ ہوا، درخت ایک موسم میں پتوں سے بے نیاز ہو جاتے ہیں اور ٹنڈ منڈ ہو جاتے ہیں۔ قدرت انہیں رہنہ کر دیتی ہے تو پھر آرٹسٹ پر قدغن کیوں؟ بھر بازار میں عورتوں کو رہنہ کرنے والوں، جسموں کا کاروبار کرنے والوں کو تو کوئی کچھ نہیں کہتا، لیکن سب آرٹسٹوں کے پیچھے بڑ جاتے ہیں۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ مجھ پر کسی قسم کی اخلاقی ذتے داری نہیں ہے۔ مجھے یقین ہے کہ پیٹریل کا عوام سے براہ راست تعلق بھی نہیں ہے۔ میں تو تھ پیٹ تو نہیں بچتا، میری ذتے داری تو تخلیق کرنا ہے۔ یہ لوگوں پر منحصر ہے کہ وہ میرے کام کو پسند کرتے ہیں یا نہیں۔ اگر انہیں میرا کام پسند آتا ہے، تو خوش آمدید۔ میں لوگوں کو ایجوکیٹ نہیں کرتا۔ میں کوئی کلاس نہیں ہوں کہ انہیں بتاؤں کہ ان کے لیے کیا اچھا ہے اور کیا برا۔ میں مانتا ہوں کہ میرے نیوڈز جنسی حیثیت کے حامل ہیں، مگر عریاں یا فحش نہیں ہیں۔ ایک فرد کی حیثیت سے آزاد انداز ظہار میرا حق ہے اور میں تنہا کچھ کر رہا ہوں۔ زمانہ قدیم سے نیوڈز مصوروں اور مجسمہ سازوں کا موضوع رہا ہے، پھر مجھ ہی پر اعتراض کیوں؟ میں لوگوں کو... تفریح کا سامان کیوں مہیا کروں۔ میں کوئی اداکار یا گانے والا نہیں ہوں۔ میں جو کچھ بناتا ہوں اپنی تسکین کے لیے بناتا ہوں۔“

اس زمانے میں لوگوں کا رجحان آرٹ کی طرف اتنا نہیں تھا کہ پینٹنگز دھڑا دھڑ فروخت ہوتیں اور مصور کی زندگی آسانش کے ساتھ کٹ جاتی۔ یہ گیلری پچھری روڈ پر کھولی گئی تھی۔ وہ مکان جہاں آرٹ گیلری کھولی گئی نصرت بھٹو کی ملکیت تھا۔ کاروباری نقطہ نظر سے وہ علاقہ آرٹ کے

لیے موزوں نہیں تھا، مگر بشیر نے تجویز کر لیا تھا کہ وہ اس گیلری کو آرٹ کی بنیاد بنائے گا۔

ستمبر 1965ء کی جنگ کے بعد اس نے اپنا حصہ پینٹنگز کی شکل میں بھارت کے خلاف نکالا۔ پینٹنگز کا عنوان ”چین“ تھا۔ تقسیم کے وقت کا بھارت اس کے لاشعور میں بسا ہوا تھا، اس لیے اسے کیوں پر غفلت کر دیا۔ امرتسر کی گلیاں اور کوہے اب بھی اسے شعلوں کی لپٹ میں دکھائی دیتے تھے۔ عورتوں اور بچوں کی چیخیں اور شیطان صفت لوگوں کے قہقہے۔ یہ سب اسے یاد تھا۔ ان پینٹنگز میں زیادہ تر سورج کو سیاہ دکھایا گیا تھا، جو روشنی نہیں تار کی کھیر رہا تھا۔ یہ نمائش اپریل 1966ء میں کراچی آرٹس کونسل میں ہوئی تھی۔

بچپن کا ایک اور واقعہ جو اس کے ذہن پر نقش ہو گیا تھا وہ بکری کی قربانی کا تھا۔ قربانی کے بعد بننے والے لال لال خون کو دیکھ کر وہ بدحواس ہو گیا۔ اسے انسانوں کا وہ بہتا ہوا خون یاد آ گیا جو اس نے تقسیم کے وقت دیکھا تھا، لہذا اس نے اپنی پینٹنگز میں لال رنگ کو بطور دہشت اور دواغی سے معذور کیا۔ اس نے بہت سی پینٹنگز میں بھڑکتے ہوئے شعلوں کو کھینچا۔ اس کی طرح پر استعمال کیا ہے۔ خاص طور پر 1990ء میں پینٹ کی گئیں سیاسی پینٹنگز جن کا عنوان ”مہر بہ لب“ تھا۔ بشیر مرزا کا خیال تھا کہ لوگوں کے لبوں پر خاموشی کی مہر لگی جاتی ہے اس لیے وہ اپنے جذبات و احساسات کا اظہار نہیں کر پاتے۔ ان کا سب کچھ سینے میں ہی گھٹ کر رہ جاتا ہے۔ اسے کیوں پر ظاہر کرنا چاہیے۔

ہمارے ہاں اکثر لوگوں کی آنکھیں نیلی نہیں ہوتیں، لیکن اس کی پینٹنگز میں جہاں جہاں نیلا رنگ استعمال کیا گیا ہے وہ نمائش طور پر کرپشن اور گری ہوئی اخلاقیات کی ترجمانی کرتا ہے۔ اسی طرح سے شوخ نارنجی، پیلا اور ہلکا سرخ اس نے ہندوستان کے علاقے راجستھان کی عورتوں کو پیٹ کرتے وقت استعمال کیا ہے۔ جبکہ بالکل سیاہ رنگ کو اس نے برصغیر کی عورتوں کے بالوں کے لیے استعمال کیا ہے۔ ہر چند کہ وہ مکمل آرٹ سے متاثر تھا، لیکن اس نے مغربی انداز کو اپنایا۔ اس کی پینٹنگز میں جہاں بھی سبز رنگ استعمال ہوا ہے وہ مٹا کے جذبے کو ظاہر کرتا ہے، جس میں قدرتی طور پر نسوانیت اور زرخیزی ہوتی ہے۔ گہرا بھورا اس نے زمین کو ظاہر کرنے کے لیے استعمال کیا ہے۔

جنگ 65ء کی ان پینٹنگز اور ڈرائنگز کو روزنامہ لیڈر

کے مدبر سلطان احمد نے اپنے کالم میں سراہا۔ ”جنگ کی ہولناکیاں ان پینٹنگز سے بخوبی عیاں ہیں۔ بشیر کا کام نہایت عمدہ ہے۔“

نصرت بھٹو کو جب کچھری روڈ کے اس مکان کو فروخت کرنے کا خیال آیا تو انہوں نے بشیر مرزا سے کہا کہ وہ اپنی آرٹ گیلری کو کسی اور علاقے میں لے جائیں۔ بشیر مرزا نے اس بار سنگی مسلم سوسائٹی میں ایک مناسب جگہ تلاش کی اور گیلری کو وہاں منتقل کر دیا۔ پہلے والی گیلری کا نام صرف ”دی گیلری“ تھا، لیکن نئی گیلری کا نام ”نی ایم گیلری“ رکھا گیا۔ کیونکہ یار دوست اب اسے مختصر نام سے پکارنے لگے تھے۔

1966ء کے آخر میں اس نے ”پاکستان کے چہرے“ کے عنوان سے متحدہ انیسچیز پیش کیے۔ جن میں سارے صوبوں کے لوگوں کو کیٹس پر اجا کر کیا گیا تھا۔ ان آٹھ بین انیسچیز میں صرف ایک ٹون استعمال کیا گیا تھا۔ ان انیسچیز میں اپنے دیس کے لوگوں کی ہمت اور لوالہ عزری کو ظاہر کیا گیا تھا۔ بلاشبہ وہ اس سلسلے میں صادقین سے متاثر تھا، جنہوں نے رنگوں کے ساتھ لائن ورک کا ایک حسین امتزاج پیش کیا تھا۔ یہ انیسچیز تجربہ کی بجائے حقیقت پسندانہ تھے۔ یہ انیسچیز چھوٹے تھے اور فائلوں میں رکھ کر فروخت کے لیے پیش کیے گئے تھے۔ ان انیسچیز میں کوئی خاص بات نہیں تھی، البتہ اس کا کام متاثر کرتا تھا۔ خاص طور پر جہاں جہاں اس نے لکیروں کو گنجان کر کے گہرائی کا تاثر دیا تھا اور سفیدی کو ابھار کے طور پر استعمال کیا تھا۔

اس کے علاوہ اس نے دوسری سیریز ”پاکستان کے لوگ“ بنائی جس میں مشہور اور باوقار لوگوں کی قدردانہ پینٹنگز بنائیں، ان میں قائد اعظم محمد علی جناح، فیض احمد فیض، جالب، احمد فراز اور دیگر نامور شاعر شامل تھے۔

یہ سب کام ہو رہا تھا، لیکن ملکی اقتصادی حالت ابتر تھی، کیونکہ جنگ تو ختم ہو چکی تھی، لیکن اس کی ہولناکیاں اب تک سروس پر منتظر لاری تھیں۔ ایسے میں پینٹنگز کی طرف کون توجہ دیتا؟ آٹا بھر حال پر تہہ پر مقدم ہوتا ہے، کیونکہ اس سے روٹی تیار ہوتی ہے۔ جب معاشی دباؤ بڑھا تو اس نے اپنا قیمتی قلیت چھوڑ کر ایک کم تر درجے کا قلیت تلاش کر لیا۔ پاکستان کے چہرے کے بعد اس نے چند اور کتابچے نکالے مگر بات نہیں بنی۔ پھر اس نے ایک میگزین شائع کرنا شروع کر دیا جس کا نام ”آرٹسٹ پاکستان تھا۔ چند شمارے

شائع کرنے کے بعد اس کا وہی حشر ہوا جو کہ موضوعاتی میگزینوں کا حشر وطن عزیز میں ہوتا ہے۔ اس نے میگزین شائع کرنے کی ذمہ داری علی رضا کے سپرد کر دی جو علی امام کا بھائی تھا اور خود اس ذمہ داری سے علیحدہ ہو گیا۔ ان دنوں کو یاد کرتے ہوئے وہ کہتا ہے کہ ان دنوں آرٹ تو فروغ پا رہا تھا، لیکن خریدار اب بھی نہیں تھے۔ میرے اسٹوڈیو میں باہر سے غیر ملکی خواتین آتی تھیں۔ پینٹنگز دیکھتی تھیں، ان کی تعریف کرتیں پھر اپنے پنڈ بیگ میں سے کوئی رنگین پھولدار کپڑا نکال کر سامنے رکھ دیتیں اور کہتیں کہ ان رنگوں کی کوئی پینٹنگ دے دو۔ میں ان دنوں واٹر کالر سے کام کر رہا تھا، انکی خواتین کے لیے کام کر کے رکھ دیتا تھا۔ وہ ان کے حوالے کر دیتا۔ اس کام کو میں ٹورسٹ پینٹنگز کہا کرتا تھا۔

معاشی دباؤ کا تو شکار تھا ملکی معاشی صور کی راہ پر چلنے ہوئے وہ اپنی محبت کی بازی بھی ہار بیٹھا۔ جرمن حسینہ لوی نے اسے چھوڑ کر ایران جانے اور پھر جرمنی جانے کا فیصلہ کر لیا۔ اس کا تمام محبت پر بشیر بہت آزرده ہوا۔ اس نے اپنی گیلری سلطان احمد ڈائریکٹریوٹا نیٹڈ اور نائزر کو فروخت کر دی اور اپنی محبوبہ کے ساتھ جرمنی کا رخ سفر باندھ لیا۔

1969ء اس کے سفر کا سال تھا۔ جرمنی جاتے ہوئے وہ اپنے ساتھ پاکستان کے چند آرٹسٹوں کی پینٹنگز لے گیا۔ جن میں احمد پرویز، جمل نقاش، تھوڈا اخلاق، منصور اسے، راشد آرائیں شامل تھے۔ اس کے علاوہ مشرقی پاکستان کے آرٹسٹوں کی بھی پینٹنگز شامل تھیں۔ پاکستانی سفارت خانے کی مدد سے یوٹو، ڈنٹ، گارٹ، کولون اور کرفلڈ میں ان پینٹنگز کی نمائش کی۔ پھر اس نے بین الاقوامی سطح کے شوشم شرکت کی اور پیرس اور ٹوکیو گیا۔ وہ لوی کے چکر میں گیا تھا مگر اب اس نے لفٹ نہ دی کیونکہ اس کے سر میں بڑا جینر بننے کی دھن سوار ہو چکی تھی۔ اس لیے اس نے بشیر کو اس دنیا میں یکہ وجہا چھوڑ دیا۔

واپس آکر اس نے جرمنوں کی تحریف کی۔ اس کا کہنا تھا کہ جرمنوں کے بارے میں یہ خیال کیا جاتا ہے کہ وہ سرد مزاج اور اکڑ ہوئے ہیں۔ لیکن ان کا رویہ میرے لیے دوستانہ اور بڑی حد تک شفقتانہ تھا۔ وہ مجھ سے نرم و ملائم لہجے میں گفتگو کرتے تھے۔ اس نے بتایا کہ اس نے بہت سے آرٹسٹوں سے ملاقاتیں کیں، لیکن ان سے تعلقات نہ بڑھا سکا اس لیے کہ میرے پاس اتنی رقم نہیں ہو پاتی تھی کہ میں انہیں کہیں مدعو کر سکوں۔ یہ دو سال بشیر کے لیے بہت جاں

مسل اور عذاب ناک تھے۔ وہ جہاں چاہتا سو جاتا اور جو مرضی آتی کھا لیتا۔ شراب خوب پی لیتا۔ وہ خود کہتا کہ میں کتنی لی سکتا تھا؟ تاہم اس نے آرٹ کے وسیلے سے مشاہدات کیے اور بہت کچھ اپنے میں جذب کیا۔ بشیر نہایت کرب سے کہا کرتا تھا کہ صرف کاروباری افراد ہی ایسے ہوتے ہیں کہ جہاں چاہے ملے جاتے ہیں اور جہاں چاہے قیام کر لیتے ہیں۔ مگر ایک آرٹ صرف اپنے ہی ملک میں محو مگر سکتا ہے اور یہیں لطف اندوز ہو سکتا ہے۔ اس میں اتنی طاقت نہیں ہوتی کہ وہ زندگی کی بیش بہا آسائشوں کے بارے میں سوچ سکے۔ بالآخر وہ جرمنی سے واپس آ گیا۔ اس نے بتایا۔ ”جب میں نے ایک آرٹ گیلری میں پینٹنگز چائیں تو اور لوگوں کو پتا چلا کہ پاکستان سے ایک آرٹسٹ پینٹنگز لے کر آیا ہے تو وہ حیرت زدہ رہ گئے۔ ان کے گمان میں بھی نہیں تھا کہ پاکستان میں آرٹ نام کی بھی کوئی چیز ہو سکتی ہے۔ بہر حال جب انہوں نے مختلف مصوروں کا کام دیکھا تو اسے سراہا۔“

1971ء میں اس نے چار آرٹسٹوں کا شو انٹرس آرٹ گیلری میں منعقد کیا۔ جن میں گل جی، علی امام اور مقصود علی شامل تھے۔ مقصود علی نے سندھ کی ثقافت پیش کی تھی، جب کہ علی امام نے اپنے پیچیدہ مزاج سے ہٹ کر شوخ اور بولتی ہوئی پینٹنگز بنائی تھیں۔ گل جی نے دھنک رنگوں کا استعمال کیا تھا اور قدرتی مناظر پیش کیے تھے۔ جب کہ بشیر مرزا نے نیوڈز پیش کیے تھے۔ اس کے دل میں لوی کا درد جاگزیں تھا۔ جسے اس نے ہمیشہ کے لیے خود پایا تھا۔ یہ اس کی آزاد نظم سے بھی ظاہر ہوتا ہے، جو کچھ یوں ہے:

وہ آئی تھی ایک دور کی سرزمین سے
جرمنی کے رنگوں میں ملبوس
اس کی کوئی خواہشات نہیں تھی
وہ انبوہ میں بے لباس تھی
سب دم بخود رہ گئے
(حالانکہ ہر ایک دل ہی دل میں اس کی توصیف کر رہا تھا)

مگر انفس
چاروں طرف سے سرگوشیاں ابھرنے لگیں
لوگوں نے اس کی طرف سے پیچھے کر لی
لڑکی کو اس کا احساس ہی نہیں ہوا
لوگوں نے اسے تنہا چھوڑ دیا

کبیدہ خاطر اور نچور
وہ بے چاری تنہا لڑکی
اوہ! اس کی پروا نہ کرو
یہ ملاؤں کے طور پر تھی
لباس پہنو، سیدھے ہو کر چلو۔۔۔ سر جھکا کر چلو
جب کوئی تمہاری تو صیغہ کرے
تو اپنا سینڈل اسے بچھ مارو
اوہ! وہ بچاری
ایک دور کی سرزمین سے آئی تھی
☆☆☆

1971ء کے آخر میں اس نے اپنی پینٹنگز کی سولو نمائش کی اور اس کا نام ”تنہا لڑکی سیریز“ رکھا۔ اس سیریز میں 40 پینٹنگز پیش کی گئی تھیں۔ وہ سب نیوڈز تھیں۔ مکمل نیوڈز تو نہیں مگر کچھ اس طرح سے کہ صاف چھپتے بھی نہیں سامنے آتے بھی نہیں۔ اس پر ملک بھر میں ہنگامہ مچ گیا۔ بشیر کا کہنا تھا کہ وہ مجبور و مشہور مصنف نازک کی نمائندگی بھی جو اس کہن رسیدہ معاشرے میں پس رہی تھیں۔ جب بشیر کو سیول اوپیکس گیمز میں مدعو کیا گیا تو اس نے اپنی یہ سیریز سیول کی انتظامیہ کو تحفے میں دے دی، جو وہاں کے عجائب گھر میں لگا دی گئی۔ اس سیریز کا خیال اسی جرمن لڑکی لوی نے پیش کیا تھا، جس کی محبت میں بشیر مرزا گرفتار ہوا اور اپنا سکھ اور محسن گنوا بیٹھا تھا۔ بشیر نے خود کہا کہ ”تنہا لڑکی سیریز“ کا خیال اسے یورپ کے دورے کے بعد آیا۔ وہاں شخص آزادی تو بہت ہے لیکن اس کے باوجود مجھے مصنف نازک چلی ہوئی مخلوق لگی۔

اس نمائش کے بعد لوگوں کے حریف نزدیک آنے کے لیے بشیر مرزا نے اخبارات اور رسائل کے لیے انیسچیز بنانا شروع کر دیے، تقصیر کہنے لگا، منٹرل انسٹی ٹیوٹ آف آرٹس اینڈ کرافٹس کراچی میں ہیڈ آف دی ڈیپارٹمنٹ کی حیثیت سے پڑھانے لگا۔

1971ء میں بنگلہ دیش علیحدہ ہو گیا۔ بھارت نے اسے سب طرف سے گھیر کر زندگی کی انتہا کر دی۔ ہمارے خطے پر سوکارت چھا گئی۔ عتوان حکومت ذوالفقار بھٹو کے ہاتھ میں آ گئی۔ جو ایک بڑے جوش اور انقلابی لیڈر کی حیثیت سے لوگوں کے دلوں میں جگہ بنا چکے تھے۔ اس زمانے میں بشیر بھٹو سے بہت متاثر تھا۔ اس سے کہا گیا تھا کہ وہ ایک یادگار بنائے جس پر بھٹو کی پہلی تقریر کا وہ جملہ لکھا ہو ”اب ہم ان

ٹوٹے ہوئے ٹکڑوں کو جوڑ کر نیا پاکستان بنائیں گے۔“
بشیر مرزا نے اس یادگار کا ذکر اپنی کتاب کیا تھا۔ ایک شخص جس کے دونوں ہاتھ فضا میں اٹھے ہوئے تھے، ایک ہاتھ میں کلہاڑی لیے ہوئے تھا۔ یہ بھی منظور ہو گیا تھا کہ کسی بھارتی طیارے کو پھینکا کر اس کی دھات سے مجسمہ بنایا جائے گا۔ پھر نہ جانے کیا ہوا کہ سناٹا چھا گیا اور وہ پراجیکٹ کسی اور ”جیتے“ کو دے دیا گیا۔ بشیر دل شکستہ ہو گیا۔

اس نے ”جمہوریت کی سیخ“ کے عنوان سے بہت سی پینٹنگز بنائیں جس کا افتتاح بیگم نصرت بھٹو نے کیا اور نمائش میں شریک ہونے والوں نے اس کی جدوجہد کو سراہا۔ اس بار تعریف و توصیف کرنے والوں کی تعداد زیادہ تھی۔ اس لیے کہ آرٹ کی سرپرستی حکومت کی طرف سے ہو رہی تھی۔ 1972ء میں اس نے ایک اور لکیری پینٹنگ بنائی جس میں اسٹوڈیو اور ایڈیٹنگ کے اجنبی بھی تھے۔ پتا نہیں کیا بات تھی کہ وہ اجنبی کی طرف زیادہ مائل ہو گیا اور اشتہاری فلمیں بنانے لگا۔ اس دوران میں اس کی پینٹنگ کا کام متاثر ہونے لگا۔ مگر بہر حال اجنبی کا نام اخبارات کی زینت بننے لگا۔

وزیر اعظم پاکستان ذوالفقار علی بھٹو ایک ترقی پسند اور انقلابی حکمران تھے۔ وہ ہر چیز کو آگے بڑھتا دیکھنا چاہتے تھے۔ ان کے دور میں آرٹ پر کوئی قدغن نہیں تھی۔ انہیں بشیر مرزا کا کام پسند تھا۔ انہوں نے پیش کش کی تھی کہ اگر وہ چاہے تو پاکستان نیشنل کونسل آف آرٹس میں عہدے دار بن سکتا ہے یا پھر نیف ڈیک میں کوئی عہدہ قبول کر لے۔ بشیر نے ان کا شکریہ ادا کیا اور کوئی عہدہ قبول نہیں کیا اس لیے کہ وہ جانتا تھا کہ حکومت کے عہدے قبول کرنے کے بعد انسان کسی کام کا نہیں رہتا۔ سیدھی سادی ملازمت کرتا ہے اور ایک اچھا کلرک بن جاتا ہے۔ اس کی تخلیقی صلاحیتیں ختم ہو جاتی ہیں۔

اسی زمانے میں اس کے دل میں آرٹ کو عام کرنے اور اس کے بارے میں تعلیم دینے کا شوق ابھرے لگا۔ اس نے ایک چھوٹا سا انسٹی ٹیوٹ کھول لیا۔ اس اسکول میں طالب علموں نے داخلہ لیا۔ وہ دیر سے آنے والے طالب علموں کی فہمائش کرتا تھا۔ اس کے پڑھانے کا انداز دوسرے اساتذہ سے مختلف تھا۔ وہ تین دن کے پچھرتار کر لیتا۔ پھر اسکول کے دروازے بند کر دیتا اور درس دینا شروع کر دیتا۔ اس دوران کسی کو باہر جانے یا باہر سے اندر آنے کی اجازت نہ ہوتی۔

اپنی آئندہ نمائش اس نے 1978ء میں لگائی جس کا نام ”چھوٹوں والی لڑکی سیریز“ تھا۔ یہ ”تہا لڑکی“ سے ملتا جلتا تجربہ تھا۔ جس میں لڑکیاں صرف اوپری جسم اور پھولوں کے ساتھ تھیں۔ رنگوں کا استعمال بھی تقریباً یکساں تھا۔

بشیر مرزا روایتی آرٹسٹ نہیں تھا۔ اس کا انداز تھا کہ وہ نمایاں لکیروں کے ساتھ کام کرتا تھا۔ اس کے اسٹروکس عموماً عمودی ہوتے تھے۔ اس اندیشے سے کہ لوگ یہ نہ کہہ سکیں کہ وہ نمایاں لکیروں سے ہی کام کر سکتا ہے۔ اس نے 1980ء میں منچر پینٹنگز بنائیں، لیکن ان کا سائز ایزل کے برابر تھا۔ (منچر پینٹنگز عام طور پر بہت چھوٹی ہوتی ہیں)۔ وہی بادشاہ، ملکہ، ان کی کنیزیں اور دربار کا ماحول۔ رنگوں کا استعمال اس نے مختلف کیا تھا۔ اجسام گہرے رنگوں کے، ہونٹ گلابی، آنکھیں کشادہ اور معمول سے بڑی۔ اس کی یہ سیریز نہایت دل نشیں اور جدید تھی۔ مداحوں نے اس کا کام پسند کیا۔

1977ء میں ملک میں مارشل لاء لگ گیا تو مصوروں کو سانس نہ بگھ گیا۔ سب پر سخت طاری تھا کہ وہ کیا کریں؟ بشیر مرزا بھی ناک ٹوٹیاں مارنے لگا۔ اس سے کچھ نہ ہو سکا۔ اس اثنا میں اس نے بہت کم کام کیا۔ البتہ جب مارشل لاء ہٹا تو اس نے ایک مہینے میں ہی ایک سو پینٹنگز بنوا لیں۔ گویا اس کے تخلیقی سوتے سے ایک دھارا پھوٹ پڑا۔ یہ اتنا کام تھا کہ جو اس نے گزشتہ دس برس سے نہیں کیا تھا۔

تاہم 1989ء میں جب بے نظیر کی حکومت آئی تو وہ پھر تجریدی آرٹ کی طرف آ گیا۔ اس نے ایک سیریز ”دوسرے سیارے سے آنے والی آوازیں“ بنا ڈالی۔ منچر سے تجریدی آرٹ کی طرف آنا بالکل ایسے ہی تھا جیسے کوئی شاہانہ لباس اتار کر قمیض میں سوٹ پہن لے۔ تاہم اس کے کام میں انفرادیت تھی، اس لیے اس کا کام پسند کیا گیا۔

بشیر مرزا میں یہ خصوصیت تھی کہ وہ کبھی لکیر کا فقیر نہیں رہا۔ اگر ”تہا لڑکی کی سیریز“ میں اس نے آئل پینٹ کا اپنا میڈیا بنایا تو ”مہرباب“ میں انکرائٹنگ کو۔ اس نے تجریدی آرٹ، حقیقی آرٹ، اور نان آکسیڈیٹ پریچ آزما کی۔ اس کی پینٹنگز میں شدت اور جذبات کی بھرپور طاقت ہوتی تھی۔ وہ اپنی پینٹنگز میں حتمی شکل کا بھی سہارا لیتا تھا۔ وہ بہر حال ایک عظیم مصور تھا اور مصوری اس کا اوڑھنا بچھونا تھا، لیکن اس کے باوجود وہ عوام الناس کا خیال رکھتا تھا۔ اس کی کوشش ہوتی تھی کہ وہ جو کچھ بنائے وہ لوگوں کی سمجھ میں بھی آجائے، تاکہ

خلائات کی ترسیل ہوتی رہے۔ سیاست، عمرانیات اور ثقافت اس کے دیرینے عنوانات تھے۔ اپنے ان رجحانات کی بنا پر وہ اور صادق ”نور حسین طر فنگر“ کے آرٹسٹ کہلائے۔

جب آرٹ گیلری سے زیادہ آمدنی نہیں ہوتی تو اس نے گیلری بند کر کے اشتہاری اجنبی کھول لی۔ یہ اجنبی بہت کامیاب ثابت ہوئی اور اس کی زندگی سے مفلسی اور درمندی کا نقاب اتر گیا۔ اب وہ لاکھوں میں کھینچنے لگا۔ چونکہ اس کے خاندان والوں سے تعلقات خوش گوار نہیں تھے، اس لیے وہ تنہا تھا۔ اس تنہائی کو دور کرنے کے لیے داڈ کا بھی اور دوستوں کی تحفیں۔ وہ بات بات پر پارٹی دیتا تھا اور دوستوں کے درمیان رہنا پسند کرتا تھا۔ تنہائی میں رہنے سے اسے ڈپریشن ہو گیا تھا۔ جب وہ زیادہ نشے میں ہوتا تو اس کی حالت غیر ہو جاتی اور وہ رونے لگتا۔ وہ کہتا: ”میری دیکھ بھال کرنے والا کوئی نہیں ہے۔ میری جرابیں اور کپڑے دھونے والا کوئی نہیں ہے۔ اگر میں بیمار پڑ گیا تو مجھے ڈاکٹر کے پاس کون لے جائے گا؟“

تنہائی کا یہ کرب ناک احساس تھا جو اسے اندر ہی اندر سے کھائے جا رہا تھا۔ اس تنہائی کو دور کرنے کے لیے اس نے اپنے آفس کی ایک لڑکی نوشین سے شادی کر لی۔ وہ معمولی شکل و صورت کی عین لڑکی تھی۔ نکاح آفس میں ہوا۔ بشیر نشے میں دھت تھا۔ قاضی صاحب نے اسے دیکھا تو کہا کہ میں یہ نکاح نہیں پڑھا سکتا اس لیے کہ یہ نشے میں ہیں۔ نشر حرام ہے۔ جب حاضرین نے ان کی منت سماجت کی تو راضی ہو گئے۔ مولانا نے بشیر سے کہا کہ وہ کلہ پڑھے۔ اس نے نشے میں ہونے کے باوجود بالکل صحیح کلہ پڑھا۔ مولانا نے کہا دوبارہ پڑھیں۔ اس نے دوبارہ بھی صحیح پڑھا۔ یوں نکاح ہو گیا۔ سب نے اطمینان کا سانس لیا۔ یہ نکاح اسلام آباد میں ہوا تھا۔ جب وہ کراچی آیا تو نوشین کے والدین نے کہا کہ ہم اس نکاح کو نہیں مانتے، نکاح ہمارے سامنے ہوگا۔ بشیر اپنے خاندان والوں کو بھی بلائے۔ بشیر کے خاندان والوں سے تعلقات خراب تھے۔ بہر حال اس نے اپنی بہن کو بلا لیا۔ نکاح دوبارہ ہوا۔ ولیمہ قایم اسٹار ہوٹل میں دیا گیا۔

نوشین کو بشیر کی تنہائی دور کرنے سے زیادہ اپنے لیے آرام و آسائش درکار تھی۔ اس کی نظر بشیر کی دولت پر تھی جسے لوٹنے کے لیے اس نے شادی سے پیشتر ہی اس سے تعلقات استوار کر لیے تھے۔ یہ تین زیادہ عرصے نہ منڈھ

سکی۔ ان میں طلاق ہو گئی۔ اس کی ایک سے زیادہ وجوہ تھیں۔ دونوں کی عروں میں کافی فرق تھا، شادی جذباتی انداز میں پلاسوچے کچے کی گئی تھی۔ سب سے بڑی وجہ اس کی شراب نوشی تھی۔ اب اسے شدت سے بچپاں آنے لگی تھیں۔ 1994ء میں وہ پاکستان کے شاعری اشاعتی حیثیت سے آسٹریلیا گیا۔ اس وقت اس کی طبیعت ناساز تھی۔ وہاں باہو ٹائپ زندگی اسے پسند نہیں آئی تو وہ ایک برس کے بعد وطن عریز آ گیا۔ ناسازی طبع کی بنا پر اس نے اپنے برش اور رنگ ایک طرف رکھ دیے۔ کافی عرصے آرام کرنے کے بعد 1999ء میں اس کا کام چونکڑی آرٹ گیلری میں دیکھا گیا۔ بیماری اس پر غالب آ رہی تھی۔ زبان میں لکنت آچکی تھی اور ہاتھوں میں رعشہ بہت زیادہ داڈ کا پینے سے اسے ہچکیوں کی بیماری ہو گئی۔ اپنے ساتھیوں سے بہر حال کوئی پردہ نہیں تھا، البتہ جب وہ کسی اجنبی سے گفتگو کرتا تو اپنے منہ کے آگے اخبار یا کوئی رسالہ رکھ لیتا۔

ایک بار پیٹ میں درد کی شکایت ہوئی تو اسے اسپتال لے جایا گیا۔ جہاں ایڈمیکس کا آپریشن ہوا، دو ماہیں تو اس نے جیسے جیسے کھائیں، لیکن اپنے ایک دوست کے ذریعے سے داڈ کا بھی منگوایا۔ ڈاکٹر نے پوسٹ ویکھ لی تو سنجیدگی کہ وہ شراب چھوڑ دے ورنہ یہ شکایات بھی نہیں جائیں گی۔

بشیر مرزا کے فن کی پہلی نمائش 1963ء میں کراچی میں ہوئی تھی، اس کے فن پاروں کی آخری نمائش 1999ء میں ہوئی۔ پہلی پینٹنگ اسی روپے میں فروخت ہوئی۔ جبکہ آخری نمائش میں دس فن پارے دس لاکھ روپے میں فروخت ہوئے۔ ان دونوں نمائشوں میں چھتیس برس کا منچر خارا اور صبر آزما وقت پھیلا ہوا ہے۔ اس نے تھک کر بیٹھنا نہیں سیکھا۔ اس نے کئی روپ اختیار کیے۔ بہت سے انداز اپنائے۔ میڈیم تبدیل کیے۔ متعدد جہتیں سامنے آئیں، اس نے اپنی گہرائی اور گہرائی سے ہنسنے سے ڈھک ٹکا لے۔ اس کے فن کا کمال یہ ہے اس نے بھی پلٹ کر نہیں دیکھا۔ وہ کہتا تھا کہ آرٹ کی تعریف یہ ہے کہ اسے دوبارہ نہ بنایا جاسکے۔ میری ”تہا لڑکی“ پر سب مرتے ہیں، لیکن میں اب اسے بنانا چاہوں تو نہیں بنا سکتا، اس لیے کہ وہ کرافٹ نہیں تخلیق ہے۔ بالکل ایک جیسی تخلیق دوبارہ نہیں کی جاسکتی۔

5 جنوری 2000ء میں وہ انتقال کر گیا۔ جس ڈاکٹر نے اس کی موت کا اعلان کیا اس کا کہنا تھا کہ اسے ہارٹ ایک ہوا تھا۔ تاہم حقیقت یہ تھی کہ اسے تنہائی کا عارضہ لاحق



شطح

محمد اياز راہی

برصغیر کا ایجاد کردہ یہ ایک ایسا کھیل ہے جسے عقل کو کند کرنے کے لیے کھیلتے تھے۔ آج بھی اسے کامیابی سے وہی کھیل سکتے ہیں جن کی عقل تیز ہو۔ اسے عالمی پیمانے پر پسند کیا جاتا ہے۔ ہر ملک میں اسے پزیرائی حاصل ہے لیکن بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ یہ خالصتاً برصغیر کا کھیل ہے۔

قدردان علم و فن کے لیے توشہ خاص

وقت گزاری اور دل پٹوری کے لیے مختلف قسم کے کھیل ہر جان دار کی فطرت میں شامل ہیں۔ جانور پھل کو دھکے دے کر، ایک دوسرے کو دھکے دے کر، طاقت آزمائی کر کے خوش ہو لیتے ہیں مگر اشراف المخلوقات انسان نے

دل خوش کرنے کے لیے انت سے طریقے ڈھونڈے ہیں۔ طرح طرح کی راہ تلاش کرتے ہیں اور نئے نئے کھیل ایجاد کرتے ہیں۔ بنیادی طور پر کھیل کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ جسمانی کھیل اور ذہنی کھیل۔ ذہنی کھیلوں میں

مصور کا دعویٰ ہے کہ اس کے پاس وہ پیالہ بھی ہے جس میں سراط نے زہر پیا تھا، بدھا کا کوئی مجسمہ جو تبت میں بھی کسی کے پاس نہیں ہوگا۔ غلاورد چاند سے جو مٹی کھود کر لائے تھے وغیرہ۔ اس کے برعکس بشیر مرزا کی سوچ جدید تھی، اس لیے اس کے پاس کوئی ایسی چیز نظر نہیں آتی تھی۔

اساتذہ میں وہ چار پیشروں کا مداح تھا۔ اس نے بتایا ”عبدالرحمن چغتائی نے ایرانی مٹی انچر کی توسیع کی ہے۔ ان کی واٹ ٹیکنیک کی تو کوئی کاپی نہیں کر سکتا۔ استاد اللہ بخش ماسرائف کلر تھے۔ انہیں خود بھی احساس نہیں تھا کہ وہ کتنے عظیم آرٹسٹ ہیں۔ حاجی شریف رواجی آرٹ فارم میں منفرد تھے۔ وہ اپنی کمپوزیشن ہی نہیں بلکہ اپنے برش اور رنگ بھی خود ہی بناتے تھے۔ اس کے علاوہ شاہ کریم نے بھی کوئی تصویر بری نہیں بنائی اور نہ اس خیال سے بنائی کہ اسے فروخت کرنا ہے۔“

1995ء میں اسے حسن کارکردگی (پرائز آف پرفارمنس) کے ایوارڈ سے نوازا گیا۔ 2006ء میں حکمہ ڈاک و تار نے وطن عزیز کے دس نامور مصوروں کی یاد میں ڈاک کے ٹکٹ نکالے جن میں بشیر مرزا، صادقین، علی شہزاد، زبیدہ آغا، علی امام، شاہ کریم، ظہور اخلاق، احمد پرویز اور عسکری میاں ایرانی شامل تھے۔

اس سوانح میں جن کتابوں اور مضامین سے مدد لی گئی:

- 1۔ دی لاسٹ آف دی یوگمین، بشیر مرزا۔ مارچوری حسین۔ (آرٹ کی نقاد)
- 2۔ بشیر مرزا۔ ایس امجد علی۔
- 3۔ بشیر مرزا۔ وکٹر آئنٹ۔ (انٹریا)
- 4۔ ایک آرٹسٹ کی کہانی۔ مارچوری حسین (آرٹ کی نقاد)
- 5۔ پینٹ کرنے کی آزادی۔ دیپا گھڑار (ٹائٹل آف انٹریا)
- 6۔ بشیر مرزا کی نمایاں لائیں۔ حمید زمان (رپورٹر مارننگ نیوز)
- 7۔ مطلوب شخص۔ علی امام (عظیم پینٹر)
- 8۔ چوٹا دینے والا۔ پیٹریلے بی ایس جعفری (دینی)
- 9۔ پیغام دینے والا میڈیا۔ نجمہ باہر
- 10۔ تنہا لڑی۔ تنویر فرخ
- 11۔ دو مصور۔ شفیق عقیل

تھا۔ وہ اسی کے سبب دنیا سے سدھار گیا۔ وہ عموماً ساڑھے دس بجے تک بستر سے اٹھ جایا کرتا تھا۔ اس کے بعد اپنے طالب علموں کو آرٹ کی تعلیم دیا کرتا تھا۔ لیکن 5 جنوری کو اس کے طالب علم 11 بجے تک آگئے، لیکن وہ اپنے بستر سے نہ اٹھا۔ طالب علموں نے تین گھنٹے تک انتظار کیا پھر اس کے ڈرائیور کو بلایا اور دروازہ کھولا تو وہ زندگی کے آخری سفر پر روانہ ہو چکا تھا۔ چونکہ وہ بونے والی آخری نمائش میں اس نے کہا تھا کہ وہ دنیا میں تنہا ہے اور یہ تمہاری اسے مارے ڈال رہی ہے۔ اس نے دیکھ کر لہجے میں کہا تھا کہ کیا اب میں دیواروں سے باتیں کروں؟

اس کی زندگی میں تصنع اور رکھ رکھاؤ بھی نہیں تھا۔ زندگی اتنی سادہ تھی جیسے کھلی کتاب۔ بلاشبہ وہ ایک بڑا مصور تھا، لیکن اس میں ہر گز خاندانوں جیسا کردار نہیں تھا۔ جو مل گیا وہ پہن لیا (زیادہ تر وہ جینز پہنتا تھا) کھانے کا بھی خصوصی اہتمام نہیں تھا۔ سوات سے آئی ہوئی ایک خاتون اس کے پاس ملازم تھی اور وہی اس کی دیکھ بھال کیا کرتی تھی۔ اس کا اسٹوڈیو ایک رہائشی علاقے میں تھا، مگر ایک بنگلے کا پچھلا حصہ۔ اسٹوڈیو کے اس نے دو حصے کر دیے تھے۔ اگلے حصے میں لوگ کام کرتے تھے جبکہ اسٹوڈیو اس کے بعد بڑتا تھا۔ ہر طرف رنگ بھرے ہوئے۔ اسے انکار انک سے کام کرنا پسند تھا۔ اس لیے کہ وہ جلدی سوکھ جاتا ہے۔ مہمانوں کے لیے وہاں بید کی کرسیاں پڑی تھیں اور فرش پر ہرن کی کھال کا ایک ٹکڑا۔ دیوار پر اس ٹکٹ کی تصویر لگی تھی، جو اس نے ابتدائی دنوں میں پرنٹنگ پریس کے لیے بنایا تھا۔ اسے موسیقی کا بھی شوق تھا۔ وہ شپ ریکارڈر پر لٹ میٹھیٹر، مہدی حسن اور باب ڈیٹن کے گانے سنتا رہتا تھا۔ مہدی حسن سے اتنا متعلق تھا کہ اس نے ”جب رنگوں کے نئے“ نامی پینٹنگز نمائش کے لیے رکھیں تو اس کا افتتاح کرنے کے لیے مہدی حسن کو بلایا۔ ان پینٹنگز میں خاص بات یہ تھی کہ ان میں برش کا استعمال بہت ہی کم تھا، رنگوں کو ٹوب سے نکالتے ہوئے اس نے لہریے بنائے اور براہ راست کیٹوئس پر پھیلا دیے۔ اس سے یہ تاثر ملتا تھا کہ جیسے رنگ نمہ بارہوں۔

برصغیر ہندوپاک کے جس مصور کے پاس آپ جائیں گے وہاں دو چار چیزیں قدیم زمانے کی ضرورت سمجھ دیکھائی دیں گی، جنہیں نوذرات میں شامل کیا جاسکے گا، مثال کے طور پر قرآن پاک کی قدیم خطاطی، کاشی کا کوئی برتن (ایک

262 قتل مسیح بہت ہی خوف ناک اور بھیسا تک منظر تھا۔ گھسان کارن بیا تھا دونوں لشکر پورے جوش و خروش سے برسرِ پیکار تھے اور ایک دوسرے کو نیچا دکھانے لگتے دینے میں کوشاں تھے۔ تیروں کی سنناہٹ ڈکھالوں کے لکرانے اور کھانڈوں کے جتنے سے جتنے چنگاریاں پکھوٹ رہی تھیں۔ شائو نوں پر سے سرکٹ کٹ کر گیندوں کے مانند اچھل اور گر رہے تھے۔ اڑیہ (بھارت) کا میدان جتنی رقص گاہ بنا ہوا تھا جہاں شہود یوتا بڑے وحشیانہ جوش سے اپنا تانڈو تانچ رہا تھا جو شے پجاری اپنے دیوتا کو لاشوں اور کٹے ہوئے جسموں کی ہیٹھ دے رہے تھے۔ جسمانی قوت کے ساتھ ساتھ شہنشاہ سیاہ گری کا جوشیلا اٹھارہ دونوں طرف سے اپنی انتہا پر تھا۔ برہمہ ہندوستان کا پہلا اور آخری ہندو شہنشاہ مہاراجا اشوک یہ نفس میدان کارزار میں موجود اپنے لشکر کی قیادت کر رہا تھا اس کی موجودی سے اس کے سپاہیوں کے حوصلے بہت بڑھے ہوئے تھے ہر سپاہی جان توڑ کر لڑ رہا تھا۔ عظیم مہاراجا اشوک اپنے باپ راجا بندوسار کے عہد میں کھیشلا یا کٹکشا (نیلا نیلا۔ پاکستان) پر کامیاب ماتحت وزیر کی حیثیت سے حکومت کر چکا تھا اس کی انتظامی صلاحیتیں وہاں تجربے سے مزین ہو کر چلا چکی تھیں۔ اور اب باپ کے انتقال کے بعد مہرات (افغانستان) سے سیام (تھائی لینڈ) اور کیمیرے مدراس تک وسیع و عریض مملکت کا بلا شرکت غیر سے حکمران تھا اور سابقہ تجربے کی بنیاد پر فرائض حکومت بڑی خوش اسلوبی سے نبھا رہا تھا درمیان میں کٹنگ (اڑیہ۔ بھارت) کا غلط غیر مفتوح تھا جسے وہ اس وقت فتح کرنے اور اپنی سلطنت کی تکمیل میں مصروف تھا راجا چندر گپت موریا کا یہ عظیم الشان پوتا اشوک، مہاراجا سے شہنشاہ بننے کا آخری مرحلہ طے کرنے ہی والا تھا اس کے اقبال کا ستارہ اس وقت بلندی پر تھا دشمن اپنی ہاری ہوئی جنگ زیادہ دیر تک جاری نہ کر سکا اور بالآخر کٹنگ (اڑیہ۔ بھارت) کا رن مہاراجا اشوک کے ہاتھ رہا۔ نصرت اس کی بلا میں لگتی ہے۔ مہاراجا اشوک کے برہمہ ہندوستان پہ پہلے آخری اور واحد ہندو شہنشاہ بننے کی مہر ثبت ہوئی ہے۔ ”ثبت است بر جریہ عالم دوام ما۔“ دشمن کے ایک لاکھ سپاہی

رزم گاہ میں کھیت ہوئے اور ڈیڑھ لاکھ جنگجو قید کثیر تعداد میں قیدی اور مال غنیمت سمیت کر مہاراجا اور اب شہنشاہ اشوک جب اپنی راج دھانی پائی پتر (پنڈ۔ بھارت) میں داخل ہوتا ہے تو اسی شہنشاہ کے طفیل برہمہ ہندوستان کو پہلی بار اک وحدت بنا لے لیا ہوتا ہے۔ چھوٹی بڑی ریاستوں میں بنا ہوا برہمہ ہندوستان یکجا اور یک جان ہو کر اک پرچم تلے واحد مملکت بنا گیا۔ اس پرچم کو اشوک چکر کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے (جو آج بھی بھارت کا قومی پرچم ہے) گویا شہنشاہ اشوک اپنی ہندو قوم کو نہ صرف ایک عظیم مملکت بلکہ ہمیشہ کے لیے ایک غیر متنازع پرچم بھی عطا کرتا ہے۔ جھنڈے پر چکر یا دائرے کا نشان بہت سی علامتوں کا مظہر ہے۔ 1۔ جگوان وشنو کی کا ہتھیار (سدرن چکر)۔ 2۔ ایک فوجی بندش یعنی جنگ کے وقت فوج کو ایک دائرے میں حلقہ کی طرح آراستہ کر کے لڑانا۔ 3۔ حرکت زمانہ کی تاویل میں قدم ہند کا فلسفہ کہ زمانہ ایک دائرے (چکر) میں حرکت کرتا ہے اور ہر دس ہزار سال بعد اپنا دائرہ (چکر) مکمل کر کے اپنے آپ کو دہراتا ہے۔ 4۔ آواگون کے چکر کی علامت کہ آدمی بار بار پیدا ہو کر اگلے جنموں میں آتا اور جاتا رہتا ہے۔ نیک کام کرنے والا اگلے جنم میں اعلیٰ انسان بن کر پیدا ہوتا ہے اور برے کام کرنے والا بری جگہ پر شیطان یا جانور کی صورت جنم لیتا ہے۔ کاتنگ یا کٹنگ (اڑیہ۔ بھارت) کی شان دار اپنی جگہ مگر یہ خوں ریز لڑائی فطری طور پر نیک دل شہنشاہ کی یا پلٹ دیتی ہے ہزاروں لاکھوں آدمیوں کا بے پناہ کٹل اسے پشیمانی، تاسف اور افسردگی میں مبتلا کر دیتا ہے وہ سچے دل سے تاب ہو کر اُنہما (عدم اعتدال) کا پیر و کار بن جاتا ہے مخلوق ارضی کو زیادہ سے زیادہ سکھ پہنچانا اس کا مسلک بن جاتا ہے اپنے نام اشوک کا اس پہ بہ تمام وکمال اثر ہوتا ہے اشوک سنسکرت زبان کا لفظ ہے جس کے معنی ہیں سکھ، چین، آرام۔ رسا بدھ مت اختیار کرنے والا شہنشاہ اشوک پھر ساری عمر بنیادی نیکیوں اور سچائیوں کی عملی تبلیغ کرتا ہے۔

مرسلہ: مجھ یا زراعی، مانسہرہ

شترج کو خاص اہمیت حاصل ہے کیونکہ یہ خالصتاً ذہنی کھیل یا مشغلہ ہے۔ شترج بہت ہی قدیم کھیل ہے اس قدر قدیم کہ اس کھیل اور اس کے مندرجہ متعلق مختلف روایات پائی جاتی ہیں۔ گونا گوں آراء ملتی ہیں لیکن ابھی تک کسی مستند روایت کا علم نہیں ہو سکا۔ شترج ایک شاہانہ انداز کی امیرانہ بازی یا کھیل ہے جو وہ اشخاص کھیلے ہیں۔ یوں کہ ہر کھلاڑی کے پاس سولہ مہرے ہوتے ہیں جن کو وہ جارحانہ اور مدافعتیہ انداز میں چونٹھ مربع خانوں کی بسات پر اس مقصد سے چلاتا ہے کہ مخالف کا سب سے اہم مہرہ یعنی بادشاہ ہر طرف سے اس طرح گھر جائے کہ کسی بھی خانے میں جانے سے بچت کی گنجائش نہ ہو اور اسے شہ مات دی جا سکے۔ مزید تعریف کچھ اس طرح کہ ایک کھیل جس کی بسات یا فرش پر دو مختلف رنگ کے چونٹھ چوکھ یا مربع خانے بنے ہوتے ہیں (عموماً یہ خانے سیاہ اور سفید رنگ کے ہوتے ہیں) تیس مہرے ہوتے ہیں۔ سولہ مہرے ایک رنگ کے اور سولہ دوسرے رنگ کے۔ ہر رنگ کا ایک بادشاہ، ایک وزیر، دو رخ (دو گھوڑے) (اسب) دو ہاتھی (ٹیل یا ٹیل) اور آٹھ پیادے ہوتے ہیں۔ گویا دو لشکر آمنے سامنے صف آراء ہوتے ہیں۔ شترج کی ایجاد سے متعلق ایران اور

بہ معنی بدن۔ جسم، عضو، چار عضو والا یعنی فوج۔ سنسکرت میں شترج کی اس فوج کو کہتے ہیں جس میں چار رکن (ہاتھی، گھوڑے، رتھ اور پیادل) ہوں۔ شترج میں بھی شاہ و فرزند (وزیر) کے علاوہ چار ہی رکن (ہاتھی، گھوڑے، رخ (رتھ) اور پیادے ہوتے ہیں لہذا شترج یعنی چار عضو والا (لشکر یا فوج) نام رکھا گیا۔ کہتے ہیں کہ یہ راوان (رام چندر جی کے مخالف اور سیتا جی کے اغوا کار) کی ایجاد ہے جو اس نے سیتا کا دل بہلانے کے لیے تیار کی تھی راوان ہی کے حوالے سے غالباً یہ محاورہ بنا کہ شترج نہیں صدر رخ سے یعنی شترج کے کھیل میں وقت ضائع کرنے والے کو بہت تکلیفیں پہنچتی ہیں اس کی لت پھر چھوٹے نہیں چھوٹی۔ روگ بن جاتی ہے۔ جہاں کو وضع جہاں پانچال رکھتی ہے نئی طرح کی یہ شترج چال رکھتی ہے (آسیہ) کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ شترج سنسکرت کے لفظ شت رنگ کا معرب (عربی نام) ہے کیونکہ لفظ شت سنسکرت میں بہ معنی صد (100) کے آیا ہے چنانچہ شت رنگ یعنی بہت سے رنگوں والا کھیل۔ صاحب نفاس

اللغات کے مطابق قاضی ابن خلقان اپنی کتاب رفعیات الامعیان میں لکھتے ہیں کہ شطرنج کا مخ موجد حکیم حصہ (سہ) بن داہر ہندی ہے جس نے اس کھیل کو شاہ شیران کے نام پر اختراع کیا سبب یہ ہوا کہ ارد شیر ابن بابک بھی بادشاہ نے تختہ زرد ایجاد کیا اس وجہ سے اسے ارد شیر بھی کہتے ہیں۔ اس ایجاد سے بھی لوگ ہند اور ہند کے بادشاہ پر برتری کا اظہار کرنے لگے جب یہ خبر بادشاہ ہند کو پہنچی تو اس نے حکیم حصہ (سہ) بن داہر ہندی کو جوابی کھیل بنانے کا حکم دیا چنانچہ حصہ (سہ) بن داہر ہندی نے شطرنج ایجاد کیا اور اس زمانہ کے تمام حکیموں نے شطرنج کو تختہ زرد پر وقت اور ترجیح دی لہذا شطرنج کے ہندی ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔ مرزا شمس علی بیگ خان صاحب رضوان مولف رسالہ ”بساط فرنگ“ اس باب میں یوں تحریر فرماتے ہیں کہ یہ ہندی چترنگ کھیل ہی ٹھیک ہے اسی کا مترتب (عربی نام) شطرنج ہے چونکہ جنگ کے چار عضو، ہاتھی، گھوڑا، رن (تھ) پیادہ مشہور ہیں۔ لہذا یہی نام چترنگ درست ہے اور جس طرح ایک ایک آدمی اپنے اپنے لشکر سے نکل کر حریف کے مقابل آیا کرتا تھا وہی طریق چترنگ (شطرنج) کے مہروں کی چال کا ہے سو چترنگ کا موجد مرزا شمس علی بیگ کی رائے میں حکیم حصہ (سہ) بن داہر ہندی ہی ہے اور یہ فارس (ایران) کی بجائے ذہن ہندی (سندھی) کا ہی کمال ہے۔ شطرنج کے قواعد و ضوابط پر مشتمل ایک کتاب سید مصطفیٰ صاحب المتخلص بہ شاطر حیدر آبادی نے 1849ء (1266ھ) میں لکھی ہے جس میں نہ صرف شطرنج کے قواعد و ضوابط درج ہیں بلکہ چالوں کے طریقے بھی مثالیں دے کر واضح کیے گئے ہیں۔ نقشے بھی کتاب میں شامل ہیں۔ شطرنج کے کھیل میں نقشہ سے مراد یہ ہے کہ چند مہرے بساط پر رکھ کر قید لگاتے ہیں کہ اتنی چالوں میں مات کرے۔ اس کتاب کا قلمی نسخہ کتب خانہ سالار جنگ حیدر آباد دکن (بھارت) میں محفوظ ہے۔ شطرنجی ایک قسم کے دبیز سونی کپڑے کو کہتے ہیں جس کی بناوٹ شطرنج کے خانوں کی طرح ہوتی ہے۔ دری یا فرش جس پر درود رنگ کے چوکور یا مربع خانے بنے ہوتے ہیں۔ شطرنج کھیلنے والا شاطر، شطرنج باز اور شطرنجی بھی کہلاتا ہے۔ شطرنج کے انگریز عالم اور محققین بھی معترف ہیں کہ شطرنج جس پر دنیا کے تمام دانائے حیران ہیں

کہ کس طرح موجد نے اس ڈیڑھ باشت چوکور کپڑے پر دانائی کو ختم کر دیا ہے ہندی میں ایجاد ہوئی۔ مسکرت میں اس کا نام چترنگ ہے۔ عربی میں پہلے شاطرنگ کہلائی پھر شطرنج کے نام سے مشہور عالم ہوئی۔ ایسے عقلی کام سوائے ہند کے اور کہیں ایجاد نہیں ہوئے۔ شطرنج کے سلسلے میں ایک بہت ہی دلچسپ روایت بیان کی جاتی ہے۔ کہتے ہیں کہ شطرنج کے موجد نے جب یہ کھیل بادشاہ وقت کو پیش کیا تو بادشاہ بڑا حیران اور خوش ہوا۔ بادشاہ نے موجد سے شاہانہ انداز میں فرمایا ”ماگو“ جو مانگتے ہو۔“ موجد ہاتھ جوڑ کر عرض گزار ہوا۔ ”جہاں پناہ! صرف اس قدر چاہتا ہوں کہ بساط کے چوتھ خانوں میں چاول کے دانے رکھ دیے جائیں اس طرح کہ پہلے خانے میں ایک دانہ تو دوسرے میں دو دانے، تیسرے میں چار دانے تو چوتھے میں آٹھ دانے۔ اسی طرح اگلے خانے میں چاول کے پہلے پچھلے دانوں کی دگنی تعداد رکھی جائے۔“ بادشاہ کو موجد کی یہ خواہش بڑی حقیر سی لگی مگر جب حساب کیا گیا تو تمام اعداد ختم ہو گئے اور وزن کا شمار ممکن ہی نہ رہا۔ اس پر بادشاہ موجودگی ذہانت پر مزید حیران اور خوش ہوا۔ قدر دان، نکتہ شناس اور سلیم الطبع بادشاہ نے موجد کو بے حد انعام و کرام، تعریف اور داد سے نوازا۔ شطرنج کا موجد کتنا ذہین تھا ایک چھوٹی سی فرضی مثال کا سہارا لیا جاتا ہے۔ شطرنج کے چوتھ خانے ہوتے ہیں۔ پہلے خانے میں چاول کا ایک دانہ رکھا جائے اور اگلے خانوں میں دانے دگنے کرتے جائیں تو چوتھے خانے میں چاول کے آٹھ دانے بنتے ہیں جو ایک رتنی وزن کے برابر ہو جاتے ہیں لہذا اس حساب سے چھبیسویں خانے میں ایک من چاول بنتے ہیں اب اگر چاول چار آنے سے ہوں اور سونا پچیس روپے تولہ ہو تو اس حساب سے انیس کروڑ من سونا بنتا ہے۔ واللہ عالم بالصواب۔ اور اب آخر میں شطرنج سے متعلق امجد اسلام امجد کی ایک مختصر نظم نذر بقارئین ہے جو موزوں بھی ہے اور بر محل بھی۔

وہ بادشاہ ہو، گھوڑا ہو، فیل ہو کہ وزیر
بساط دہر پر بٹھرے ہوئے بھی مہرے
جو کوئی غور سے دیکھے تو صرف پیادے ہیں
ٹکست و فتح کے جھگڑوں سے بے خبر چپ چاپ
صلیب وقت پہ لٹکے ہوئے ارادے ہیں



ابن کبیر

اسکات لینڈ کی جھیل ان دنوں پوری دنیا کی مرکزِ نگاہ ہے۔ اخبار و ٹی وی کے رپورٹر اس جھیل کو گھیرے رہتے ہیں کیونکہ اس جھیل میں ایک عجیب الخلق مخلوق نظر آ رہی ہے۔ کہتے ہیں کہ یہ مخلوق النسل جانور ہے۔



ایک عجیب النسل جانور کی تلاش

وقت ٹھہر سا گیا تھا۔ ہر سوسو خاموشی چھیلی تھی۔ سکوت تھا اور بادلوں سے چمن کرائے والی دھوپ جھیل پر چمک رہی تھی۔ جارج ایڈورڈ ہاتھ میں کیرا لیے لانچ کے عریشے پر کھڑا تھا۔ پہاڑوں سے آنے والی ہوائیں احساس کی حامل تھیں۔ اسکات لینڈ کے بالائی علاقے میں واقع یہ حسین جھیل جارج کا گھر تھی۔ رہائش تو انورین شہر میں تھی مگر وہ گزشتہ تین عشروں سے جھیل کا طواف کر رہا تھا۔ وقت کا بڑا حصہ یہیں گزارتا۔ اس کی گزراوقات کا ذریعہ دنیا بھر سے آنے والے وہ

سراج تھے جنہیں اس علاقے کی پراسرار خاموشی اپنی جانب مچھلی تھی۔ وہ اپنی لالچ پر سیاہوں کو 21 مربع میل پر پھیلی اس جھیل کی سیر کرواتا۔ مگر جہاز رانی اس کا پیشہ نہیں تھا۔ یہ تو اس لیے اپنا ناپڑا کہ وہ یہاں رہنا چاہتا تھا۔ جھیل کے انتہائی نزدیک، پانی پر نظریں جمائے، کیمرہ ہاتھ میں لیے، بالکل چوکس۔

اچانک اُسے مغرب میں کچھ پھل دکھائی دی۔ جارج کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ اس نے سچ آب پر نظریں گاڑ دیں۔ وہاں لہریں تھیں، جھاگ تھے، جو کسی کی موجودگی کی خبر دے رہے تھے۔ کوئی ایسا... جس کی تلاش نے جارج کو پاگل کر رکھا تھا۔

کوئی شے ابھری۔ جارج کے جسم میں بجلی دوڑ گئی۔ اس نے فوراً کیمرہ آنکھ سے لگایا۔ لینس درست کیا۔ فریم سیٹ کیا۔ انگلی بٹن تک گئی۔ اور بٹن... مایوسی نے اس... پر حملہ کر دیا۔

لہجے کے ہزاروں حصے میں سب غائب ہو گیا۔ اب نہ تو کوئی ابھرا تھا نہ ہی جھاگ۔ بس پانی تھا، جس پر دھوپ چمک رہی تھی۔

جارج نے سرد آہ بھری۔ وہ مضحکہ منگوا رہا تھا۔ ایک قیمتی لمحے حد نزدیک سے نکل گیا۔ وہ پھر ناکام رہا۔ گوانج شکار اس کی آنکھوں کے بالکل سامنے تھا۔

☆☆☆

بوڑھے کی کشتی جھیل کے سینے پر تیر رہی تھی۔ آنکھوں کے آگے دوورین لگی تھی۔ نظریں چند میل پرے ایک لالچ پر مچی تھیں۔

وہ جارج ایڈورڈ کی لالچ تھی۔ بوڑھا دیکھ سکتا تھا کہ جارج کاؤچ پر دراز ہے۔ مایوسی چہرے سے جھلک رہی تھی۔ اُس نے گہرا سانس لیا اور دوورین نیچے رکھ دی۔

دفعتاً اُسے کشتی کے گرد کچھ پھل محسوس ہوئی۔ گہرائی میں حرکت ہوئی۔ جھاگ سچ آب پر ظاہر ہونے لگے۔

بوڑھا کھڑا ہو گیا۔ ایک خاص نوع کا اطمینان چہرے سے جھلکتا تھا۔ وہ ریٹک سے جھکا اور بائیں ہاتھ سے کشتی کے بیرونی حصے کو تین بار بجایا۔

”سب ٹھیک ہے دوست۔“ اُس نے یہ آواز بلند کہا۔ ”سب ٹھیک ہے۔“ یوں معلوم ہوتا تھا، جسے وہ خود کلا کی عمل سے گزر رہا ہو۔

دھیرے دھیرے لہریں مٹنے لگیں۔ جھاگ غائب

ہو گئے۔

بوڑھا اطمینان سے اپنی نشست پر بیٹھ گیا۔

وہ ایک مائی گیر تھا۔ بیس جھیل کے مغربی کنارے پر واقع تھبہ ڈرمیڈ روچڈ میں نہ جانے کتنے برس سے وہ تنہا رہ رہا تھا۔ بوڑھے کے ہم عمر تو بک کے مر چکے تھے لیکن وہ تاحال زندگی سے بھر پور تھا۔ مقامی افراد قابل رشک صحت اور بے پناہ طاقت کی وجہ سے اُسے بوڑھا ہر کوئیں کہہ کر پکارتے۔ اُسے ”جھیل کا راز داں“ تصور کرتے۔ اور وہ کچھ ایسے غلط نہیں تھے۔ گزشتہ کئی عشروں سے جھیل اور اس کے درمیان مکالمہ جاری تھا۔ ایسا مکالمہ جسے کوئی اور نہیں سن سکتا تھا۔

کوئی نہیں جانتا تھا کہ بوڑھے کی عمر کتنی ہے۔ کچھ لوگ ازراہ مذاق کہا کرتے کہ بوڑھا جھیل میں مقیم عفریت کا ہم عمر ہے۔ بوڑھے نے بھی اس بات پر اعتراض نہیں کیا۔ شاید یہ بات درست تھی۔ کیونکہ مئی 1933 میں ایلکس کیسبل نامی جس شخص نے اس جھیل میں ایک عفریت کی موجودگی کا انکشاف کیا، اُس نے یہ پراسرار قصہ کسی اور سے نہیں... بوڑھے ہی سے سنا تھا۔

وہ پہلا اور آخری موقع تھا، جب بوڑھے نے یہ قصہ بیان کیا اور بعد اُسے اپنے فیصلے پر پچھتا پڑا۔

☆☆☆

”سمندری عفریت صدیوں پرانا تصور ہے، اتنا ہی قدیم جتنی سمندری سفر کی تاریخ ہے۔“

کیمرل ویل کا ج آف آف آف کے تاریک آڈیو ریم میں ڈاکٹر جے اینگری کی آواز گونجی۔

لندن میں واقع انسٹی ٹیوٹ آف لندن کے اس کیسپس میں ”سمندری عفریت سے متعلق ذرائع ابلاغ کا کردار“ کے موضوع پر سیمینار جاری تھا۔

بائیں سالہ کنولس پچھلی صف میں بیٹھا تھا۔ عین پیچھے پروجیکٹر نصب تھا، جس سے پھوٹی روشنی جب اسٹیج پر گئی پردے سے ٹکراتی، تو سمندری عفریت کی خیالی تصاویر کی شکل اختیار کر لیتی۔ ڈائنامو جیسا جیش، کھوڑے جیسا سر، سانپ جیسا جسم... مگر کنولس کی توجہ کا مرکز نہ تو وہ عجیب و غریب تصاویر تھیں، نہ ہی ڈاکٹر کا ڈاکٹر۔ وہ تو کنولس کیسپس سے پہلو میں موجود دو شیزہ کو دیکھ رہا تھا جو پورے اسٹیج کے نوٹس لے رہی تھی۔

گہرے سیاہ بالوں والی اس لڑکی کا نام جیکولن تھا۔

اس کی جھیل ہی آنکھوں پر بڑی بڑی پلکوں کا سایہ تھا۔ جیکولن اس کی جونیئر تھی۔ وہ میڈیا ڈیپارٹمنٹ میں فرسٹ ایئر کی طالبہ تھی۔ اسی کا جادوئی حسن کنولس کو یہاں پہنچ لایا تھا۔

ڈاکٹر نے بات جاری رکھی۔ ”اگر آپ جہاز رانوں کے برسوں پرانے روزناموں پر نظر ڈالیں تو آپ کو سمندری عفریت کا ذکر ملے گا۔ مثلاً سولہویں صدی کے ایک انگریز بہم جو سرسمیری گھٹ نے بحری سفر کے دوران ایک شیر نما مخلوق دیکھنے کا دعویٰ کیا تھا۔ ایسے ہی روزناموں میں جولائی 1734 کے ایک واقعے کا ذکر ملتا ہے، جب ناروے کی مشنری ٹیم نے گرین لینڈ کے مغربی کنارے پر پراسرار مخلوق دیکھنے کا دعویٰ کیا۔ الا۔ اس کا جنوبی حصے میں بسنے والی ایک تہذیب میں بھی گونا گونا گوست نامی سمندری مخلوق کا ذکر ملتا ہے۔“

ڈاکٹر سانس لینے کے لیے رکا۔ ”آپ کو یاد ہوگا، کسی زمانے میں ہمدرداثرانی اینگل میں پیش آنے والے پراسرار واقعات کو بھی کسی خوفناک مخلوق سے جوڑا جاتا تھا۔ میڈیا نے ان واقعات پر خصوصی توجہ دی۔ دراصل میڈیا ہمیشہ اس قسم کے معاملات میں دلچسپی لیتا ہے، مگر بد قسمتی سے اس تعلق کو بھی ثابت نہیں کیا جاسکا۔ سائنس اور میڈیا کا رویہ متضاد معلوم ہوتا ہے۔“

کنولس نے نظر اٹھایا کہ جیکولن کو دیکھا۔ بالوں کی ایک لٹ اُس کے حسین چہرے کو چھو رہی تھی۔

”یہ ایک طویل موضوع ہے۔“ ڈاکٹر نے دقتی گھڑی دیکھی۔ ”سمندری عفریت ہے یا نہیں؟ اگر موجود ہے تو کبھی اس کا ثبوت کیوں نہیں ملا؟ وہ سمندر کے کس حصے میں پایا جاتا ہے؟ ان سوالات پر بات کرنے کے لیے الگ دفتر درکار ہے۔ چونکہ میرے ایک طالب علم نے خصوصی درخواست کی تھی، اس لیے میں محققوں کا رخ اسکاٹ لینڈ کی جھیل نیس کی جانب موڑنا چاہوں گا، جہاں گزشتہ آٹھ عشروں سے کسی پراسرار مخلوق کو دیکھنے کے دعوے سامنے آرہے ہیں۔ مخلوق جیسے بھی کا نام دیا گیا ہے۔“

اسکاٹ لینڈ کا ذکر آتے ہی حسین جیکولن نے گہرا سانس لیا۔ وہ میڈیسی ہو کر بیٹھ گئی۔ اس کی دلچسپی اپنے اوج پر تھی۔

”معزز حاضرین، عفریت کا قصہ یوں تو سمندر اور جھیلوں کے کنارے آباد تمام تہذیبوں میں ملتا ہے، مگر جو شہرت اس کھا ڈی میں نظر آنے والے جاندار کو حاصل ہوئی، اس کا تصور بحال ہے۔ یہ مخلوق Cryptozoology

(نامعلوم جانداروں کا علم) کی بہترین مثال ہے، تاہم ایک ایسی مثال جسے ثابت نہیں کیا جاسکتا۔ کم از کم سائنسی لحاظ سے تحت تو نہیں۔“ ڈاکٹر دھیرے سے پوچھا۔ ”اگرچہ میڈیا نے اس عفریت کو بہت توجہ دی۔ سیٹروں تحقیقی کتابیں لکھی تھیں اس بارے میں، تصویر اور ویڈیو منظر عام پر آئیں، مگر چانچ کی کسوٹی پر ہر دعویٰ خام نکلا۔ خاص کر وہ سرخرو نوگراف... وہ قصہ تو ایک تاریخی مذاق بن گیا۔ مجھے کہنے دیجیے کہ یہی فقط ذرائع ابلاغ میں زندہ ہے، حقیقت میں اس کا کوئی وجود نہیں کیا۔ یہ کیسا عفریت...“

”کنولس بند کرو۔“ ایک کرخت آواز آڈیو ریم میں بھر گئی۔ سب نے آواز کا تعاقب کیا۔ وہ دوسری صف میں بیٹھا ایک ادیب عمر آدمی تھا۔ شیوہ بڑھی ہوئی، بال بھرے ہوئے۔

”تم لوگوں کو اندھیرے میں رکھنا چاہتے ہو۔“ اس نے مٹھیاں بچھ رکھی تھیں اور اس کی سمت بڑھ رہا تھا۔ ”وہ انسانوں کا دشمن ہے۔ جون کو بک کی موت کا ڈرتے دار۔“

وہ اسٹیج پر چڑھ گیا۔ بوڑھے ڈاکٹر نے دفاعی پوزیشن اختیار کر لی۔ آدمی نے پوری قوت سے بازو گھمایا۔ ڈاکٹر نے کمال مہارت سے سر پیچ کر لیا۔ اس سے پہلے کہ وہ دوسرا حملہ کرتا، دو دو جوانوں نے اُسے دیو بچ لیا۔

آڈیو ریم کی بٹیاں روشن کر دی گئیں۔ کنولس نے حملہ آور کو غور سے دیکھا۔ اسے لگا جیسے وہ اسے پہلے بھی نہیں دیکھ چکا ہے۔

اس اسٹا میں سیکورٹی اہلکار وہاں پہنچ گئے، جو اسے گھمٹتے ہوئے باہر لے گئے۔ وہ مسلسل بڑبڑا رہا تھا۔ اس افسوس ناک واقعے کے بعد کیسٹن روک کر کافی بریک کا اعلان کر دیا گیا۔

☆☆☆

جیکولن کتاب میں گہمی تھی کہ اُسے کسی کی موجودگی کا احساس ہوا۔ اس نے سر اٹھایا۔ کانچ کی نقبال ٹیم کا کیپٹن کنولس اس پارک سامنے کھڑا تھا۔

”کیا میں یہاں بیٹھ سکتا ہوں؟“ اس کے چہرے پر دوستانہ مسکراہٹ تھی۔

”ضرور۔“ اُس نے کتابیں اور ڈائری اٹھا کر پیچ پر اس کے لیے جگہ بنائی۔ کنولس کی نظر کتابوں کے سرورق پر پڑی۔ ایک کا عنوان تھا ”میتھی: حقیقت یا فائنٹا“

”اس موضوع میں آپ خاصی دلچسپی رکھتی ہیں مس...“

THE LOCH NESS MONSTER

THE EVIDENCE

Steuart Campbell

جھیل پر لکھی جانے والی کتابوں میں سے ایک کا نکل

نکولس نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

”جیکولن۔ جیکولن ڈیر۔ اور آپ نے درست کہا۔“ اُس کے سرخ ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ ”پراسرار واقعات مجھے اپنی جانب متوجہ کرتے ہیں۔ مگ فٹ، برمودا ٹرائی اینگل، گروپ سرکل اور سمندری عفریت۔“ اس کی آنکھوں میں یادیں تیر رہی تھیں۔ ”میرے والد رائل نیوی میں ملازم تھے۔ میں نے بچپن میں خاصا سمندری سفر کیا۔ لہروں میں چھپی پراسراریت مجھے پکارتی ہے۔ اور پھر... وہ آئرش بھی تھے۔“ وہ دیر سے بے بسی۔ ”شاید اسی وجہ سے دیگر نامعلوم مخلوقات کے مقابلے میں میس، مجھے زیادہ متوجہ کرتا ہے۔“

”میس... ہوں۔“ نکولس کو بات جاری رکھنے کا بہانہ مل گیا۔ ”ڈیپ اپ کیا آپ مجھے اس کے بارے میں کچھ بتانا پسند کریں گی؟“

”یہ ذرا طویل موضوع ہے۔“ وہ جھجکی۔

”میرے پاس بہت وقت ہے۔ کیوں نہ ایک کپ کافی ہو جائے؟“ نکولس کے وجہ چہرے پر مسکراہٹ ابھری۔

جیکولن کی حسین آنکھیں جھپکیں۔ ”ضرور۔“

کچھ دیر بعد وہ قریبی کافی ہاؤس میں بیٹھے تھے۔ نیس جھیل ان کا موضوع تھا۔

”یہ اسکاٹ لینڈ کی دوسری بڑی جھیل ہے۔ میرے والد کے آبائی شہر انورنیس سے لگ بھگ 37 میل دور۔ بچپن میں میرا ایک بار وہاں جانا ہوا تھا۔“ اُس نے کافی کا گھونٹ بھرا۔ ”یہ ظاہر یہ ایک پرسکون جھیل ہے، مگر اس کا رخ کرنے والوں کا مقصد کشتی کی سیر نہیں ہوتا۔ وہ تو ایک عفریت کی تلاش میں وہاں جاتے ہیں جسے عیسائی کہا جاتا ہے۔“

نکولس پوری توجہ سے سن رہا تھا۔ آنکھیں جیکولن کے چہرے پر لگی تھیں جو دیک رہا تھا۔ دیر سے دیر سے یہ لڑکی اس کے دل میں اتر رہی تھی۔ ساتھ ہی... جھیل کا اسرار بھی ذہن پر دستک دینے لگا تھا۔

جھیل کا محل وقوع بیان کرنے کے بعد اب جیکولن اُس سے جڑے پراسرار واقعات کا ذکر کر رہی تھی جنہوں نے ایک شانت جھیل کو دنیا بھر کی توجہ کا مرکز بنا دیا۔

”قصوں کہانیوں کے عفریت اپنی جگہ، مگر اسکاٹ لینڈ کے باسیوں نے بھی یہ نہیں سوچا ہوگا کہ سرسبز پہاڑوں میں گھری نیس جھیل بھی اس کا مسکن ہو سکتی ہے۔ اس قصے کی شروعات 1933 میں ہوئی، جب ایک شخص نے...“

جیکولن بول رہی تھی۔ ”آواز میں محاسن تھی۔ اپنا نیت تھی۔ مگر ساتھ اس کے الفاظ پر اسراریت سے لبریز تھے جو نکولس کو ایک انوکھی دنیا کی کہانی بنا رہے تھے۔

”اس پیچیدہ مکالے کا آغاز 2 مئی 1933 کو ”انورنیس کوریئر“ نامی اخبار میں شائع ہونے والی خبر سے ہوا، جس میں نیس جھیل میں کسی عفریت کی موجودگی کا خطرہ امکان ظاہر کیا گیا تھا۔ پھر جارج اسپر نامی ایک سیاح کا ذکر آیا، جس نے اس عفریت کو دیکھنے کا دعویٰ کیا تھا۔ آنے والے چند ماہ میں کئی پریشان کن دعوے دار سامنے آئے۔ ہر ایک نے جھیل میں کچھ انوکھا دیکھنے کا دعویٰ کیا تھا۔ کچھ ایسا، جس نے انہیں خوف کی گھاٹی میں ڈھکیل دیا تھا۔ اسکاٹ لینڈ میں کھلبلی پچی تو درجنوں فوٹو گرافروں نے جھیل کا رخ کیا، جن میں ہوٹلیرے بھی شامل تھا۔ وہ پہلا شخص تھا جو اس پراسرار عفریت کی تصویر کھینچنے میں کامیاب رہا۔ کوہوٹلیرے کی تصویر انتہائی دھندلی تھی، مگر عوام میں پھیل جانے کے لیے کافی تھی۔

”اُس تصویر کی اشاعت کے بعد جھیل کی پراسراریت اسکاٹ لینڈ سے نکل کر برطانیہ میں داخل ہو گئی۔ مگر بات یہیں تمام نہیں ہوئی۔“ جیکولن کی آنکھوں میں ڈرامائی رنگ تھا۔

”اسکاٹ لینڈ انتظامیہ نے حکمہ پولیس کو اس عفریت کے ممکنہ حملے سے نمٹنے کے احکامات جاری کر دیے۔“

”عفریت کا حملہ؟ تو کیا ایسا کوئی واقعہ رونما ہوا؟“ نکولس نے دریافت کیا۔ اپنے لہجے پر اسے تھوڑی حیرت ہوئی۔ اس میں محسوس تھا۔

جیکولن نے اسے گہری نظروں سے دیکھا۔ پھر مسکرائی۔ ”نہیں کیپٹن، ایسا کبھی نہیں ہوا۔“

”اور یہ سرجنرل فوٹو گراف کا کیا معاملہ ہے؟“ اس بار اس نے اپنی آواز معتدل رکھتے ہوئے پوچھا۔

”اس بارے میں ہم پھر بعد میں بات کریں گے۔“ جیکولن نے گھڑی دیکھی۔ ”خاصی دیر ہو چکی ہے۔“

”بے شک! تو کل اس طالب علم کی آپ سے کہاں ملاقات ہو سکتی ہے مس جیکولن۔“ اُس نے تہذیب یافتہ عشاق کے انداز میں جھکتے ہوئے دریافت کیا۔

”یہ جگہ شان دار ہے مسٹر کیپٹن۔“ وہ چمکی۔ ☆☆☆

انورنیس کے گرد نو اچ پرات اتر چکی تھی۔ جھیل پر تاریکی کی چادر تنی تھی۔

جیب ڈرمیڈر چیچڈ کے مغرب میں واقع گلینارک بارٹ نامی گھاٹی کے بائی وے سے گزر رہی تھی۔ ڈرائیونگ سیٹ خارج اینڈروڈ نے سنبھالی ہوئی تھی۔ شعلے چہرے سے عیاں تھے۔ آج کا دن بھی رائیگاں کیا۔ عفریت کو کبیرے میں مقید کرنے کی کوشش ناکام رہی۔

موز کاٹتے ہوئے اُس کی نظر قبرستان پر پڑی۔ وہ چونک اٹھا۔ درختوں سے گھرے، کھرے سے لپٹے قبرستان میں کوئی تھا۔

”بوڑھا ہرکولیس!“ جارج بڑبڑایا۔ اس نے جیب روک دی۔ نیچے اتر اور اس کی سمت بڑے لگا۔ بوڑھا یوپی خاموش اور لالچ کر رہا۔

جارج نے دیر سے کہا۔ ”میلو ہرکولیس۔ اس وقت یہاں؟“

”ہاں، ایک دوست سے ملنے چلا آیا۔“ بوڑھے کے چہرے پر اطمینان تھا۔

جارج قبر کے کتبے کی جانب متوجہ ہوا۔

”جون کوپ۔ انتقال 29 ستمبر 1952۔“ وہ بڑبڑایا۔ ”دوبی رینک ڈرائیونر ناں، جو عالمی ریکارڈ بنانے کی خواہش لیے نیس جھیل آیا اور اپنی جان سے تھوڑا بچا۔“

”ہاں وہی۔“ بوڑھے نے آہ بھری۔ ”وہ ایک مصلاحت انسان تھا۔ دوسری جنگ عظیم میں اس نے رائل



نکولس

افروفس میں خدمات انجام دیں۔ وہیں ہماری دوستی ہوئی تھی۔ پھر اس کے سر میں رفتار کا سودا سا گیا۔ کئی ریکارڈ اپنے نام کیے زمین کو فتح کرنے کے بعد وہاں میں پانی پر تیز رفتاری کا ریکارڈ قائم کرنے کی خواہش جاگی، جو اسے یہاں لے آئی۔ مجھے یاد ہے وہ دن... بوڑھا ماضی میں تھا۔ اس کی کشتی میں جیٹ لگا تھا۔ 320 کلومیٹر فی گھنٹے کی رفتار سے وہ سطح آب پر دوڑ سکتی تھی، وہ واقعی پرجوش تھا مگر... وہ چپ ہو گیا۔

”اس کی موت سے کئی پراسرار باتیں منسوب ہیں۔“ جارج نے ذہن پر زور ڈالتے ہوئے کہا۔ ”جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے، اس کی کشتی جھیل میں اچانک نمودار ہونے والی کسی چٹان سے ٹکرا کر پاش پاش ہو گئی تھی۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ وہ... یہی تھا۔“

بوڑھا یوپی خاموش کھڑا تھا۔ کھرا بوڑھا تھا۔ رات دبیز ہوتی جا رہی تھی۔ بالآخر اُس نے خاموشی توڑی۔ ”کیا تمہیں واقعی لگتا ہے کہ میرا پیارا دوست کسی عفریت سے جا بکرایا تھا؟“

جارج نے نفی میں سر ہلایا۔ ”نہیں“ میں تین عشروں

سے یہاں ہوں۔ یہی کے وجود پر کامل یقین رکھتا ہو لیکن اس بات پر اعتبار کرنا مشکل ہے کہ وہ باب کی موت کا سبب بنا۔ وہ تو... انتہائی شرمیلے ہے۔ کمراد دیکھتے ہی چھپ جاتا ہے۔ اس نے براسات بنایا۔

بوڑھا نہیں پڑا۔ ”کیا تم جانتے ہو جارج“ اس واقعے کے بعد وہیل کے کئی شکاری یہاں آئے تھے۔ ان کے پاس ایک بڑا سا جھگڑا بھی تھا۔ انہوں نے جمیل کو کھلا، مگر کوئی اُسے نہیں پاسکا۔ جمیل شانت رہی۔“

جارج خاموش ہو کر کچھ بھولا ہوا یاد کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کے لب واپہوئے۔ ”میں نے ایک شخص کا قصہ سنا تھا جو خود کو مرحوم جون کو ب کا بیٹا کہہ کر متعارف کرواتا تھا۔“

”مجھے یاد ہے۔“ بوڑھے نے دھیرے سے کہا۔ ”وہ 1970 کا موسم سہرا تھا، جب ایک نوجوان ہاتھ میں شوٹ گن لیے جمیل کی سمت بڑھا۔ وہ انتقام کے جذبے سے لگ رہا تھا۔ اُس نے کئی دن کشمی میں گزارے۔ جمیل کئی بار فائرنگ سے گونجی۔ اس کے برترندہ دروئے نے قہیے میں بیجان برپا کر دیا تھا۔ بالآخر پولیس کو اسے شہر بدر کرنا پڑا۔“

”کیا پھر کبھی وہ یہاں آیا؟“ جارج کی نظریں کتبے پر جمی تھیں۔

”ایک بار۔ میں برس قبل۔“ بوڑھا ماضی میں تھا۔ ”اس روز پالا پڑ رہا تھا۔ جب میں کشمی باعد رہا تھا، تب میری نظر اس پر پڑی۔ وہ کنارے پر خاموش بیٹھا جمیل کو گھور رہا تھا۔“

ایک بار پھر خاموشی درآئی۔

جارج نے ٹھنکار کر گلا صاف کیا۔ ”ہر کوئیس، نہ جانے تمہاری عمر کتنی ہے۔ تمہارے بارے میں کئی پراسرار باتیں مشہور ہیں۔ لوگ ہمیں جمیل کا رازواں کہتے ہیں؟“ اس نے ایک لمحہ کا توقف کیا۔ ”کیا تم نے کبھی اس عفریت کو دیکھا؟“

”عفریت!“ بوڑھا مسکرایا۔ ”خدا کی مخلوق کو عفریت کہنا کتنا درست لگتا ہے۔ خیر جہاں تک تمہارے سوال کا تعلق ہے کہ میں نے کبھی یہی کو دیکھا ہے، تو اس کا جواب ہے، نہیں، کبھی نہیں!“

وہ قبرستان میں کھڑے تھے۔ درختوں پر کھرا چھایا تھا۔ ہنڈ بڑھ رہی تھی اور جمیل کی سطر جھاگ جہنم لے رہے تھے جو کسی کی موجودگی کی خبر دیتے تھے۔

☆☆☆

”تو ہم سرجنز فونو کے بارے میں بات کر رہے تھے گزشتہ روز۔“ جیکولین پُر جوش تھی۔

”ہاں۔ 1934 میں اتاری جانے والی یہی کی مشہور زمانہ تصویر۔ ان معنوں میں انتہائی اہم کہ وہ پہلی واضح تصویر تھی جس میں عفریت کا سانپ نمرا اور لمبی گردن نظر آ رہی تھی۔ تصویر لندن کے ایک سرجن رابرٹ لینتھ ولسن نے اتاری تھی۔“

”خاصی ریسرچ کر کے آئے ہو کیپٹن۔“ جیکولین چبکی۔

”تھوڑی بہت۔“ وہ مسکرایا۔ ”اُس تصویر نے واقعی دھوم مچادی۔ لوگوں کو یقین ہو چلا کہ یہی واہر نہیں۔ اور وہ بھی اگر ثبوت پیش کرنے والا شخص ایک ڈاکٹر ہو تو شک کی خاصی کم گنجائش رہ جاتی ہے۔ گواں پر متعدد اعتراضات اٹھائے گئے۔ کسی نے اسے ہاتھی کی سونڈ کہا، کسی نے پرندہ۔ محققین نے اسے جھوٹا ثابت کرنے کے لیے ایڑی چوڑی کا زور لگا دیا، مگر کچھ ثابت نہیں ہوا۔ برسوں تک اس تصویر کا سحر قائم رہا، یہاں تک کہ 94ء کا سال آ گیا جب۔۔۔“

یہاں تک پہنچ کر وہ رک گیا۔ جیکولین چہرے پر مسکراہٹ لیے اُسے دھمکتی رہی۔ ”میں سن رہی ہوں کیپٹن۔“

”او۔ کے۔ تو پھر 94ء کا سال آ گیا، جب 90 سالہ کرچن اسپرنگ نامی ایک شخص سامنے آیا، جس نے ایک انوکھا انکشاف کیا۔ بلکہ اسے اعتراف کہنا چاہیے۔“ اس نے کافی کا گھونٹ بھرا۔ ”اُس کا کہنا تھا کہ یہ تصویر اُس کے سوتیلے باپ نے اتاری تھی جو ایک اخبار کا ملازم تھا۔ ادارے کی جانب سے اُسے عفریت کی تصویر اتارنے کی ذمہ داری سونپی گئی۔ ناکامی کے باعث یہ اندیشہ پیدا ہو گیا کہ شاید اُسے فارغ کر دیا جائے۔ ملازمت بچانے کے لیے اس نے ایک جال چلی۔ لکڑی کو تراش کر ایک عفریت کی شکل دی۔ اُسے ایک تختہ پر نصب کیا۔ اس کے بٹنے نے وہ تختہ پانی میں چھوڑ دیا اور کچھ فاصلے سے تصویر اتاری گئی۔ پھر اسے ایک سرجن کے حوالے کر دیا۔ یعنی۔۔۔ وہ سانس لینے کے لیے رکا۔“

”کروڑوں افراد کی نیند حرام کرنے والی، جیکولین تحقیق کا قیمتی وقت برباد کرنے والی تصویر درحقیقت کسی عفریت کی نہیں، بلکہ چھوٹے سے کھلونے کی تصویر تھی۔ ایک فراڈ۔“

کولس بول رہا تھا۔ جیکولین اپنی جمیل سی آنکھوں میں مسکراہٹ لیے اسے دھمکتی رہی۔ تقریر کے اختتام پر اس نے کافی کا گھونٹ لیا۔

”کیپٹن مجھے ماننا پڑے گا، تم ٹھیک ٹھاک ریسرچ کر کے آئے ہو۔ اس نے ہاتھ رگڑے۔“ پھر تو تم نے سینڈز کے صوبے برٹش کولمبیا کی مشہور زمانہ پوکھن اوگن جمیل کے بارے میں بھی پڑھا ہوگا۔ خصوصاً وہاں موجود عفریت اور گوجھو کو کے بارے میں؟“

کولس دھیرے سے مسکرایا۔ ”یہی کے بارے میں پڑھتے ہوئے اس پر بھی نظر ڈالنے کا موقع ملا۔ اس مخلوق کی متعدد ویڈیوز اور کئی تصویریں دیکھیں۔ مجھے کہنے دیجیے، یہ عفریت یہی کے مقابلے میں خاصا دوستانہ ہے۔ کمرے سے گھبراتا نہیں ہے۔“

جیکولین نے زور دار قہقہہ لگایا۔ اس کے شانے ہلنے لگے۔ حسن نگہریا۔

”تو ہم سرجنز فونو گراف کے بارے میں بات کر رہے تھے؟“ بالآخر اس نے کہا۔

”ہاں!“ کولس نے سیدھے ہوتے ہوئے کہا۔

”جس کے بارے میں ثابت ہو چکا ہے کہ وہ جعلی ہے۔“

”نہیں۔“ اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ”فقط دعویٰ کیا گیا ہے۔ ٹھیک دیا ہے ہی، جیسے اس کے خفی ہونے کا دعویٰ کیا جاتا ہے۔ یہ بدویہ غیر سنجیدہ ہے کہ ہم ایک دعوے کو قبول کر لیں اور

ایک کور۔“

”کیا تمہیں لگتا ہے کہ وہ تصویر اصلی ہے؟“ کولس نے سوال کیا۔

”اس کا جواب یہاں کافی ہاؤس میں بیٹھ کر نہیں ملے گا۔“ وہ چبکی۔ ”میں اسکاٹ لینڈ جانا ہوگا۔ جواب وہیں ہے۔“

”کیا تم وہاں جانے کا ارادہ رکھتی ہو؟“ کولس کے لیے اس کے الفاظ حیران کن تھے۔

”بالکل۔“ اس نے ہاتھوں پر چہرہ دکاتے ہوئے کہا۔

”تم چلو گے میرے ساتھ کیپٹن؟“

ایک غیر متوقع پیش کش۔ کولس ششدر رہ گیا۔ حیران کن خاموشی درآئی۔

دن تیزی سے شام کی جانب بڑھنے لگا۔ کرنیں مغربی افق میں کم ہونے لگیں اور وہ خاموش بیٹھے ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔

”ہیلو۔“ چھن سے لمبے کا حروٹ لگایا۔

کولس نے سر اٹھایا۔ ایک خوش شکل نوجوان سامنے کھڑا تھا۔

ایجاد و صنعت کے لحاظ مسلمانوں کا اہم کام

کافذ کا رواج ہے۔ اس کے اصل موجد تو چینی تھے۔ مگر مسلمانوں نے بغداد، دمشق، نیشاپور، شیراز، خراسان، مراکش، قرطبہ، غرناطہ اور سسلی وغیرہ میں کافذ سازی کے کارخانے لگائے اور پہلی بار انہیں کتابوں اور تحریروں کے لیے استعمال کیا۔

مسیو لیان لکھتا ہے کہ کافذ پر پہلی تحریر عربوں ہی کی تھی۔ اسی طرح قطب نما کا استعمال بھی مسلمانوں ہی نے کیا اور شورے کے استعمال کو ترقی دے کر بارود ایجاد کیا۔ توپ کو سب سے پہلے

افریقا کے سردار یعقوب نے 1205ء میں استعمال کیا اور سلطان مراکش ابو یوسف نے پہلی بار توپ بنانے کا کارخانہ لگایا۔ مسلمانوں کی قابل ذکر ایجاد گھڑی اور کلاک ہے۔ مسلمانوں نے عجیب و غریب قسم کی گھڑیاں بنائیں۔ جن کے تذکروں سے تاریخ کے اوراق سیاہ ہیں۔ ول

ڈیوران لکھتا ہے کہ ابنین کے ایک مسلمان ابن فرناس نے تین چیزیں ایجاد کر کے دنیا کو حیرت میں ڈال دیا تھا۔ اول ٹینک کا شیشہ، دوم وقت

بتانے والی گھڑی اور سوم ہوا میں اڑنے والی مشین۔ اسی طرح پہلا چھاپا خانہ بھی ابنین میں لگا۔ جس پر عبدالرحمان اول (788ء) کے احکام

چھپتے تھے۔ تاریخ میں ماہِ غضب کا ذکر عموماً آتا ہے۔ یہ وہ مصنوعی چاند ہے، جسے ترکستان کے ایک عالم حکم بن ہاشم نے بنایا تھا۔ یہ چاند غضب کے ایک کونے سے نکلتا، اندازاً سومر میل کے رقبے

کو نور کرتا اور طلوع آفتاب سے پہلے ڈوب جاتا۔

اس دور میں چند شہر اپنی مصنوعات کی وجہ سے مشہور تھے۔ موصل کی ملم، دمشق اور طبلہ کی

تکواریں، عدن کے ادنی کپڑے، حلب کے شیشے، رے کے رنگین برتن۔ رقعہ کے صابن، ایران کے

قالین اور نیشاپور کا عطر مشہور تھے۔

مرسلہ: یعقوب عثمانی، کراچی

”میں کب سے تمہارا انتظار کر رہی تھی“، جیکولن پہنکی اور کھڑے ہو کر اس سے گلے ملی۔
لمحے کے اس لمحے میں نکولس نے خود کو غیر آرام دہ محسوس کیا۔

”نکولس، یہ ہے کیری، کیری فین۔ میرے بچپن کا دوست۔ اسے بھی نہیں جھیل میں بہت دلچسپی ہے۔ ٹھیک میری طرح۔“ اس نے تعارف کروایا۔ ”اور کیری، یہ ہیں مسٹر نکولس اسبارک۔ کالج کی ٹیم کے کپتان ہیں۔ تازہ تازہ ہی ہماری دوستی ہوئی ہے اور میں نے انہیں اپنے ساتھ اسکاٹ لینڈ چلنے کی پیشکش کر دی ہے۔“

”کیا واقعی؟“ کیری نے اس سے ہاتھ ملایا۔ ”یہ تو شان دار ہے۔“

نکولس واقعی بے آرامی محسوس کر رہا تھا۔ ایک بے نام جذبہ اس میں پھنس چکا تھا۔

”ابھی میں اور نکولس کینیڈا کی یوکن اوگن جھیل کے بارے میں بات کر رہے تھے۔“ اس نے کیری سے کہا۔

”خوب یاد دلایا۔“ کیری چپکا۔ ”میری آج مسٹر جون کرک سے بات ہوئی تھی۔ وہ اپنی ریسرچ ہمارے ساتھ شیئر کرنے کے لیے تیار ہیں۔“

”زبردست خبر ہے۔“ جیکولن نے تالی بجائی۔ پھر نکولس کی جانب مڑی۔ ”جون کرک برٹش کولمبیا میں حکمہ پولیس سے منسلک ہیں۔ انہوں نے اس جھیل پر خاصی تحقیق کی ہے۔“

”میں نے ان کے بارے میں پڑھا تھا۔“ اس نے مختصر سا جواب دیا۔

”کیلینورنیا کی غلیج سان فرانسسکو میں ایسی ہی کسی مخلوق کو دیکھ جانے کے دعوے کیے جاتے ہیں۔“ کیری نے کہا۔ ”وہ جزواں بھائی بل اور باب کراک برسوں سے اس پر تحقیق کر رہے ہیں۔ ان سے بھی بات ہوئی، مگر مجھے وہ کچھ بتائی گئے۔“

”خیر، ہماری توجہ کا مرکز تو نیس جھیل ہے۔“ جیکولن نے کہا۔ ”اور اب ہمیں سفر کے بارے میں حتمی فیصلہ کر لینا چاہیے۔“

”میری طرف سے ہاں ہے۔ کیا تم تیار ہو؟“ کیری نے کہا۔

”سوفیہ۔“ وہ چپکی۔
”اور تمہارا نیا دوست؟“ وہ نکولس کی سمت مڑا۔
”اوہ۔“ وہ ڈھونڈتا ہوا متذبذب تھا۔ ”کچھ کہ نہیں سکتا۔“

خاصی مصروفیات ہیں۔“
”چلو کیپٹن، آگے چھٹیاں ہیں۔ تمہارا کوئی بیچ بھی نہیں۔ تم ہمارے ساتھ خوب لطف اندوز ہو گے۔“

”ہمارے ساتھ۔“ اس نے دل ہی دل میں دہرایا۔ پھر کھٹکھٹا کر گلا صاف کیا۔ ”بھئی، میری طرف سے معذرت اور یاد آیا، مجھے کہیں پہنچنا ہے۔ آپ دونوں گپ شپ کریں پھر ملاقات ہوگی۔“

وہ کھڑا ہو گیا۔ جیکولن نے اسے گہری نظروں سے دیکھا۔ جب وہ گہری سمت بڑھ رہا تھا لندن پر رات چھا چکی تھی، جس میں رقابت کا جذبہ تیرا ہاتھ جس کے بوجھ سے اس کے کاندر ڈھل رہے تھے۔

چلتے چلتے وہ دریائے ٹیز کے کنارے پہنچ گیا۔ اس نے خاموشی سے خود کو ایک بیچ کے حوالے کر دیا۔ ایک سگریٹ سلگائی۔ چند لمحوں تک کش لینے کے بعد اس پر ایک انکشاف آرا۔

”خدا یا، میں اس سے محبت کرنے لگا ہوں۔“
وہ دریائے ٹیز کے کنارے بیٹھا تھا۔ پانی پر روشنی جھللا رہی تھی۔

☆☆☆

گھورا اندھیرا تھا۔ منظر کھڑے میں پوشیدہ تھا۔ آسمان برس رہا تھا۔ لالچ جھکولے کھا رہی تھی۔ نکولس ریڈنگ سے لگا بیٹھا تھا۔ سر میں درد کی ٹپکیاں اٹھ رہی تھیں۔ نقابہ بدن میں جاگزیں تھی اور خطرے کی بوھٹوں میں گھس رہی تھی۔

اس نے اپنی بائیں سمت دیکھا۔ ایک شخص عرشے پر اوندھا رہا تھا۔ اس کا کاندرھاڑتی تھا۔

پھر اسے لالچ کے آخری کونے پر ایک سایہ نظر آیا۔ ایک لڑکی، جس کے ہنسنے والے بال طوفانی ہوا میں لہرا رہے تھے۔

اس نے آگے بڑھنے کی کوشش کی مگر نقابہ آڑے آگئی۔ وہ کراہا۔

لڑکی مڑی۔ اس کی جھیل سی آنکھوں میں گہری اداسی تھی۔ اداس آنکھیں، جن پر کئی پلکیں سایہ کرتی تھیں۔

”جیکولن۔“ اس نے دھیرے سے کہا۔ خطرے کی بو تیز ہوئی۔

اسے قدموں کی آواز سنائی دی۔ کوئی عرشے پر تھا۔ بائیں جانب سے ایک سایہ برآمد ہوا۔ لڑکھڑاتے ہوئے

آگے بڑھا اور ایک خاص مقام پر پہنچ کر رک گیا۔ اس کے ہاتھ میں بندوق تھی۔

نکولس کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ وہ چلایا، مگر آواز حلق میں اٹک گئی۔

اس شخص نے بندوق سیدھی کی۔ رخ جیکولن کی جانب تھا اور پھر ایک فائر ہوا۔ ڈھس...

”جیکولن۔“ وہ چلایا اور اس کی آنکھ کھل گئی۔ وہ اپنے بستر پر تھا۔ پسینے سے شرابور۔ ڈرا ہوا۔

اس نے گہری پر نظر ڈالی۔ رات کے تین بج رہے تھے۔ اس نے جیکولن کا نمبر ڈائل کیا۔ کچھ دیر بعد نمبر ڈیوٹی آواز سنائی دی۔ ”ہیلو۔“

”ہیلو جیکولن، میں... میں نکولس بول رہا ہوں۔ تم... تم خیریت سے ہو نا؟“

”نکولس... کیا ہوا؟“ جیکولن پوری طرح بیدار ہو گئی۔ ”وہ میں...“ نکولس چپکچاپا۔ ”میں نے ایک خواب دیکھا تھا۔ ایک شخص، جھیل اور ایک شخص... اس نے تم پر فائر کیا اور...“

”نکولس۔“ جیکولن نے دھیرے سے کہا۔ آواز میں غمراہی تھا۔ ”میں ٹھیک ہوں اور چاہتی ہوں کہ تم بالکل شانت ہو جاؤ۔“

”میں ٹھیک ہوں۔“ اس نے فوراً کہا۔ اب وہ کچھ سنبھل گیا تھا۔

ایک لمحے کا توقف آیا، جس کے دوران دونوں نے محسوس کیا کہ ایک خاص نوع کے جذبے نے انہیں جوڑ دیا ہے۔ ایک قدیم جذبہ، جو زندگی کا اخذ ہے۔ محبت!!

”نکولس۔“ اس نے دھیرے سے کہا۔ ”کیا ہم کل مل سکتے ہیں؟“

”ہاں۔“ اس نے مختصر جواب دیا۔

”اور کیا تم...“ ایک لمحے کا توقف۔ وہ اپنے الفاظ تولد رہی تھی۔ ”اسکاٹ لینڈ چلنے کا ارادہ رکھتے ہو؟“

نکولس نے گہرا سانس لیا۔ ”کس کے ساتھ؟“

”میرے ساتھ نکولس، میرے ساتھ۔“ اس کی آواز نفرتی تھیں۔ ”جادو کی محبت سے لبریز۔“

رات کے تین بج رہے تھے اور لندن کے مرکز میں دو حسین دل دھڑک رہے تھے!

☆☆☆

”میں ایک کتاب تلاش کر رہا ہوں۔ کیا آپ میری کچھ

مدد کر سکتے ہیں؟“ نکولس نے لائبریرین کو مخاطب کیا۔ ”ضرور جناب۔“ لائبریرین خوش دلی سے مسکرایا۔

”کس کتاب کی تلاش ہے آپ کو؟“

”وہ...“ نکولس جھجک رہا تھا۔ ”ایک کتاب ہے جس جھیل سے متعلق تھی۔ تو تم پرستی اور حقائق کے درمیان۔“

”اوہ وہ کتاب۔“ لائبریرین سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ ”معذرت خواہ ہوں جناب۔ وہ ابھی ابھی کسی نے ایٹو کروائی ہے... بلکہ کیے۔ شاید وہ صاحب نہیں ہو۔“

وہ کرسی پر بیٹھے بیٹھے بائیں جانب جھکا۔ ”آپ خوش قسمت ہیں۔“ چہرے پر دوستانہ مسکراہٹ تھی۔ ”تیسری رو میں جو صاحب بیٹھے ہیں، کتاب انہوں نے ہی ایٹو کروائی ہے۔“

”شکریہ۔“ کہہ کر نکولس اس شخص کی جانب بڑھنے لگا۔ جوں ہی وہ اس کے سر پر پہنچا۔ حیرت کی شدید لہر اس سے گزری۔ ”ڈاکٹر! انگلو! آپ یہاں؟“

ڈاکٹر نے سر اٹھایا۔ شاسانی چہرے پر ابھری۔ وہ جانتا تھا کہ نکولس کالج کی فٹبال ٹیم کا کپتان ہے۔

”ہاں بھئی میں۔“ چہرے پر مسکراہٹ تھی۔ ”برائے مہربانی بیٹھ جاؤ اور آواز سنی رکھو۔ ورنہ ہم دونوں کو لائبریری سے باہر کر دیا جائے گا۔“ اس نے کتاب بند کر دی۔

نکولس کی نظر سرورق پر پڑی۔ اس پر کئی ازار تاریخ کے ایک تخیلاتی جانور کی تصویر بنی تھی۔ ذہن کے پردے پر آڈیو ٹیم کی اس دوپہر کے مناظر ابھرے، جب ڈاکٹر نے بڑے ہی استہزاء سے اعزاز میں نکولس جھیل کے عفریت کو واہمہ قرار دے دیا تھا۔

”آپ جیسے عقلیت پسند کو ایک اساطیر کا مطالعہ کرتے ہوئے دیکھ کر حیرت ہوئی۔“ وہ کرسی پہنچ گیا۔

ڈاکٹر نے ایک نظر کتاب کی سمت دیکھا، پھر نکولس کی جانب متوجہ ہوا۔ ”خیر ان ہونے میں کوئی برائی نہیں۔ حیرت سے تلاش جنم لیتی ہے۔ جیسے تمہاری حیرت تمہیں لائبریری میں پہنچ لائی۔ شاید تم بھی کتاب ڈھونڈ رہے ہو؟“

”اوہ ہاں۔ آج کل میں اس موضوع پر مطالعہ کر رہا ہوں۔ کل انٹرنیٹ پر اس کتاب کے بارے میں پڑھا تو سوچا کہ...“

”سن کر خوشی ہوئی کہ تم اس موضوع میں دلچسپی لے رہے ہو۔ مگر اس کا سبب کیا ہے؟ شاید ایک حینہ جس نے تمہارا دل چرایا ہے؟“ ڈاکٹر کے جھریوں زدہ چہرے پر

شرارت تھی۔

وہ بھونچکارہ گیا۔ پھر خود کو سنبھالا۔ ”آپ غالباً جیکولن کی بات کر رہے ہیں؟“

”غالباً نہیں، بھئی!“ ڈاکٹر نے خفیف سا قہقہہ لگایا۔

”وہ میری اسٹوڈنٹ رہ چکی ہے۔ اس موضوع میں خاصی دلچسپی ہے۔ اسے یاد ہے۔ اس روز آڈیو ریم میں تم اس کے پہلو میں بیٹھے تھے۔ بس اسی سے اعزاز لگایا۔“

”آپ کا اعزاز درست ہے جناب۔“ وہ جھنجھپ سا گیا۔

”خیر، یہ تو الگ موضوع ہے۔ کہوں میں تمہاری کیا مدد کر سکتا ہوں۔“ وہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

”دراصل میں...“ وہ کچھ کہتے کہتے رک گیا۔ پھر

کہنیاں میز پر رکھ کر جھکا۔ ”جب آپ کسی پراسرار مخلوق کی موجودگی پر یقین ہی نہیں رکھتے ڈاکٹر تو آج کی خوشوار صبح اس بابت مطالعے کی بجائے ضرورت پیش آگئی؟“

”فوجوان۔“ اس نے کولس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے

کہا۔ ”میں امکانات پر یقین رکھتا ہوں، جو مجھے اس نوع کی کسی مخلوق کو رد کرنے سے روکتے ہیں۔ ہاں، سائنس ہمارے یقین پر ثبوت کا تقاضا کرتی ہے۔ اور بد قسمتی سے اب تک اس عفریت کی موجودگی کے حوالے سے کوئی ثبوت نہیں ملا۔“

”امکانات کے مانند کیا آپ اس عفریت پر بھی یقین کرتے ہیں ڈاکٹر؟“ اس نے سوال کیا۔

ڈاکٹر نے کانڈھے اچکائے۔ ”میں دنیا کے کروڑوں

انسانوں کی طرح کہانیاں سنا پسند کرتا ہوں۔ پراسرار کہانیاں۔

سندھ اور جمیلوں میں سائنس لیتے عفریت ایسی ہی کہانیاں ہیں۔

مگر سائنس... جیسے میں نے کہا، فقط ثبوت مانگتی ہے۔“

”پلیز مجھے بتائیں ڈاکٹر۔ میں آپ کی رائے جاننا چاہتا ہوں۔ کیا اس قسم کی کسی مخلوق کی موجودگی سائنس کے نزدیک امکانی ہے؟“

چند ساعت ڈاکٹر خاموش رہا۔ پھر اس کے لب و

ہوئے۔ ”دیکھو، Cryptozology میرا موضوع

نہیں، مگر میں اس میں دلچسپی رکھتا ہوں۔ مسئلہ تسلیم کرنے اور

نہ کرنے کے درمیان معلق ہے۔ دنیا کی تمام تہذیبوں میں

پراسرار مخلوقات کا ذکر ملتا ہے، مگر جوں جوں سائنس ترقی کرتی

گئی، یہ قصے دم توڑتے گئے۔ بیسویں صدی میں داخل ہونے

والا انسان یہ یقین کر چکا تھا کہ وہ زمین پر موجود ہر جاندار کی

بابت علم رکھتا ہے، مگر کہانی میں ایک ڈرامائی موڑ آیا۔“

وہ براہ راست کولس کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا، جو ہمہ

تن گوش تھا۔

ڈاکٹر نے بات جاری رکھی۔ ”کسی زمانے میں تو ای

چھپکلیوں کو ایک واہمہ یا ایک داستان کہہ کر رد کر دیا جاتا تھا

1910 میں ہم نے ایک ایسی مخلوق ڈھونڈ لی۔ آج انڈون

کے جزائر کو ڈوڈو رین کہلانے والی ان چھپکلیوں کی وجہ سے

ہیں۔ قوی الجیہ قیرماہی (Giant squid) کے بارے میں

صدیوں سے بات ہو رہی ہے، مگر سائنس دان ان کی موجودگی

ثبوت 2004 میں حاصل کر سکے۔ شاید تم نے مرگا ماؤ

شارک کے بارے میں سنا ہو۔ اس انوکھی قسم کی چھپکلی

1976 میں دریافت کیا گیا۔ خیال کیا جاتا تھا کہ یہ مرسوں

ختم ہو چکی ہے۔ اور بھی کئی مثالیں ہیں۔ دراصل یعنی ہم کسی

طور پر کچھ نہیں کہہ سکتے۔ شاید بگ فٹ موجود ہو، شاید سندھ

عفریت وجود رکھتا ہو۔“

”میکروڈ لوگ انہیں دیکھنے کا... دعویٰ کر چکے ہیں۔

کولس کو یوں لگا، جیسے جیکولن اس کے اندر بول رہی ہے۔

ڈاکٹر نے نفی میں گردن ہلائی۔ ”قانون یعنی شاہد

اور گواہوں کو اہمیت دیتا تھا فوجوان، مگر سائنس نہیں۔ کئی افراد

پھوکن اوگن کے عفریت کو دیکھنے کا دعویٰ کر چکے ہیں۔ تصاویر

اور ویڈیو موجود ہیں۔ امریکا کی ٹیلیفون نیٹ کے بارے میں

بھی ایسی ہی باتیں ہوتی ہیں۔ مگر... تمہیں دیگر جمیلوں کے

مقابلے میں نہیں جمیل پرتو پھر مرکز رکھنی چاہیے۔“ ایک بار پھر

اس کے چہرے پر شرارت کھیل رہی تھی۔ ”شاید تم لوگ وہاں

جانے کا بھی پروگرام بنارہے ہو؟“

”آپ خاصا کچھ جانتے ہیں ڈاکٹر۔“ کولس جھینپ

سا گیا۔ ”جی ہاں، ہمارا ارادہ ہے۔ میں نے آپ کا بہت

وقت لیا، مگر ایک سوال اور کرنا چاہوں گا۔ اس جمیل کے

بارے میں آپ کی رائے کیا ہے؟“

ڈاکٹر نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگالی۔ چند ساعت

خاموشی چھائی رہی۔ ”سچ کہوں تو کسی بھی جمیل میں پراسرار

مخلوق کی موجودگی کے برعکس جمیل نہیں میں اس کے امکانات

قوی تر ہیں۔“ بالآخر اس نے کہا۔

”اس کا سبب ڈاکٹر؟“ کولس کو ڈاکٹر کے بیان سے

تھوڑی حیرت ہوئی تھی۔

چند ساعت ڈاکٹر خاموش رہا۔ بائیں کی پرچھا میں اس

کے چہرے پر تھی۔ ”دو برطانوی محققین ٹم ڈنڈلی کی او

مورس برٹن نے خاصی تحقیق کی نہیں جمیل پر۔ انہوں نے کئی

کہانیاں لکھیں، مضبوط دلائل دیے، مگر میرے لیے ان کے

دلائل اہم نہیں۔ اس جمیل میں کسی مخلوق کی موجودگی کے

امکانات اسی لیے قوی ہیں کیونکہ... وہ بے حد پراسرار ہے۔

اتنی خاموش کہ شک ہوتا ہے کہ وہ بالکل خالی ہے۔“

☆☆☆

”آہ... کتنی تازگی ہے۔“ یہ پہلا جملہ تھا جو انور نیس

ایئر پورٹ سے باہر آنے کے بعد کولس کی زبان سے نکلا۔

جیکولن مسکرائی۔ ”ہوا اُس کی زلفوں سے کھیل رہی

تھی۔“

”درست کہا دوست۔“ کیری چپکا۔ ”واقعی اسکاٹ

لینڈ کی فضا شان دار ہے۔“

کولس مسکرایا۔ کیری اور اُس کی اب اچھی بیٹھ گئی

تھی۔ وہ اس سے حسد محسوس نہیں کرتا تھا کیونکہ وہ اُس کا

رقیب نہیں تھا... جیکولن فقط اس کی ہے۔

ایئر پورٹ سے انہوں نے جپ کرائے پر لی۔ منزل

ڈرمیڈر وینڈ کا قصبہ تھا۔ جمیل کے بحر میں جہازیں تریا

اور محققین اسی قصبے کا رخ کرتے تھے۔ وہاں ”نئس جمیل سینٹر“

نامی ایک سرکاری ادارہ قائم تھا جو جمیل کی دیکھ رکھ کے علاوہ

اس کی گہرائیوں میں مقیم عفریت پر ریسرچ کا بھی مرکز تھا۔

سیاحوں کے قیام و طعام کا وہاں مناسب انتظام تھا۔ چھوٹی

بڑی کشتیاں، ٹیویٹ خوری کا سامان، ویڈیو کمرے اور دیگر

اشیاء آسانی مل جاتیں۔

قصبہ انور نیس سے 37 کلومیٹر دور تھا۔ گفتگو کے لیے

ان کے پاس خاصا وقت تھا۔

آج بولنے کی باری کیری کی تھی جو خاصا پرجوش تھا۔ وہ

جمیل نیس کے عفریت کی بابت ہونے والی اب تک کی

تحقیقات سے انہیں آگاہ کرنے لگا۔ بات تصاویر سے شروع

ہوئی اور پھر اُس پراسرار مخلوق کی ان ویڈیوز تک جا پہنچی جن کی

تعداد ایکڑوں میں ہے۔

”چند سائنس دانوں نے ان تصاویر اور ویڈیوز کو قبول

کیا تو چند نے رد۔ مگر ناقدین ان ویڈیوز کے محرک کو کم کرنے

میں ناکام رہے۔ عام افراد انہیں ناقابل تردید ثبوت تصور

کرتے ہیں۔“ کیری نے کہا۔

”کیا آپ کو مارکیز اٹکلسن کی سولر تصویر کا علم ہے

جناب؟“

جیب کے ڈرائیور کی زبان سے ادا ہونے والے الفاظ

نے انہیں چونکا دیا۔

”مجھے اندازہ نہیں تھا کہ آپ بھی اس موضوع میں اتنی

دلچسپی لے رہے ہیں۔“ کیری مسکرایا۔ ”نہیں، اُس تصویر

کے بارے میں نہیں علم نہیں۔ براہ مہربانی کچھ بتائیے۔“

”ضرور جناب۔“ ڈرائیور مسکرایا۔ ”یہ تازہ موضوع

ہے۔ مارکیز کی سوانح سے متعلق خبر کئی ہی اخبار کی زینت

بنی ہے۔ اس کا دعویٰ ہے کہ چند روز قبل جمیل سے گزرتے

ہوئے اُس نے اپنے آلات پر ایک جانور کو حرکت کرتے

ہوئے دیکھا جو شاید کئی کا قاتل کر رہا تھا۔“

”دلچسپ۔“ کولس نے گہرا سانس لیا۔ ”مگر دیگر

تصاویر کے مانند شاید اسے بھی ثبوت کے طور پر قبول نہ کیا

جائے۔ میرے خیال میں کئی نامی گرامی محققین نے بھی اس

جمیل کا رخ کیا ہوگا۔ کیا تمہارے پاس ان کی تفصیلات

ہیں؟“

”بالکل۔“ کیری لپ ٹاپ گوڈ میں لے بیٹھا تھا۔

مختلف ویب سائنس متعلقہ معلومات فراہم کر رہی تھیں۔

ان جھلک اور چیتانی مہمات کا آغاز برطانوی ماہر سر

ایڈورڈ ماؤنٹ کی کوششوں سے ہوا۔ پھر 1962 میں قائم

ہونے والے The Loch Ness Phenomena Investigation Bureau

(LNPIB) کا ذکر آیا، جن کے اشتراک سے یونیورسٹی

برسٹم کے ایک استاد پروفیسر ڈی کوڈن تھیک نے جدید

آلات کی مدد سے عفریت کی تلاش شروع کی۔ پروفیسر کے

سولر آلات ایک قوی الجیہ مخلوق کی موجودگی کے ہم شاہد پیش

کرنے میں کامیاب رہے۔ 1970 میں یونیورسٹی آف

شکاگو کے ایک استاد رائے مائیکل نے زیر آب آوازیں

ریکارڈ کرنے والے ایک سسٹم کے ساتھ اسکاٹ لینڈ کا رخ

کیا۔ ہم کے اختتام پر اُس نے چند انتہائی پراسرار آوازیں

ریکارڈ کرنے کا دعویٰ کیا۔

کھڑکی سے آنے والی ہوا کیری کے بالوں سے کھیل

رہی تھی۔ نظریں مائیکل پر لگی تھیں۔ وہ کسی بحر کے زیر اثر تھا۔

اب وہ انہیں ڈاکٹر رابرٹ رائن کی سربراہی میں اس

جمیل کا رخ کرنے والے امریکی محققین کے متعلق بتانے

لگا جن کے آلات نے ایک ایسی زیر آب مخلوق کی نشان دہی

کی جو کسی ڈریگن کے مانند تھی۔ پھر رابرٹ رائن کی خلاصہ

کوششوں کا ذکر ہوا۔ جو 35 برس تک اس عفریت کی تلاش

میں جہاز رہا...

جیب کھٹے درختوں کے درمیان دوڑ رہی تھی۔ سڑک

کے قریب درختوں کے ساتھ چشمہ بہتا تھا۔

گیری کا جوش اٹھا کو چھوڑا تھا۔ وہ بے مکان بول رہا تھا۔ اس نے نکولس اور جیکولن کو ڈسکوری ٹینک اور ٹینک جو کرا ٹک کی تحقیقات سے آگاہ کیا، جس کے بعد بی بی سی کی کوششیں موضوع بن گئیں۔ ”2003 میں بی بی سی نے اس عفریت کی تلاش شروع کی۔ انہوں نے سولر ٹیکنالوجی کے علاوہ سیٹلائٹ ٹیکنیک سسٹم بھی استعمال کیا۔ بی بی سی کی ٹیم نے کئی دن یہاں گزارے۔ لوٹنے کے بعد انہوں نے اس عفریت کو ایک واہمہ قرار دے دیا۔ یعنی...“ گیری سانس لینے کے لیے رکا۔ ”عفریت انہیں بھی چمکا دے گیا۔ بڑا شاطر واقع ہوا ہے۔“

”نہیں جناب۔“ ڈرائیور نے بات کاٹی۔ ”وہ شاطر نہیں۔ وہ تو ایک پُرکون مخلوق ہے، جو انسانوں سے دور رہنا پسند کرتی ہے۔“

جیکولن دیر سے مسکرائی۔ گیری نے لیپ ٹاپ بند کر دیا اور نشست کی پشت سے ٹیک لگائی۔ نکولس بھی کڑی سے باہر دیکھنے لگا۔ وہ قہقہے سے چند میل دور تھے۔ منزل قریب آئی جا رہی تھی اور محسوس بڑھ رہا تھا۔

اچانک ہارن کی پچھاڑکوں سے ٹکرائی۔ ایک بھری ہوئی ویگن پیچھے سے برآمد ہوئی۔ لہراتے ہوئے اس نے جب ٹکا دوڑ ٹیک کیا۔

وہ ایک خطرناک لمحہ تھا۔ حادثہ ٹالنے کے لیے ڈرائیور نے اسٹیئرنگ گھما یا۔ بریک چرچاے۔ جب بے قابو ہونے لگی۔ سانچے بہ حد نزدیک تھا، مگر ڈرائیور کی مہارت نے اسے ٹال دیا۔ لمبے پھر بعد جب دوبارہ مرک پڑ گئی۔

ڈرائیور آئرش میں نہ جانے کیا بڑبڑاتا رہا۔ ویگن فراسے بھرتے ہوئے غائب ہوئی۔

جیکولن اور گیری کے چہرے پر بھی تناؤ آ گیا تھا جو آہستہ آہستہ دھیمپا پڑنے لگا، مگر نکولس... اس کے دل میں اندیشے پھپھپ رہے تھے۔ کیونکہ اس نے ویگن کے ڈرائیور کو پہچان لیا تھا۔

وہ وہی آدمی... جس نے آڈیو ریم میں ڈاکٹر اینگلز پر حملہ کیا تھا۔

☆☆☆

جب آبادی کے آثار ظاہر ہوئے، سورج مغرب کی سمت سفر شروع کر چکا تھا۔ ڈرمینڈ روڈ پر جھیل کے مغربی کنارے پر واقع ایک چھوٹا سا حسین قصبہ تھا۔

ان کی رہائش کا انتظام ایک صاف ستھری سرائے میں تھا۔ کچھ دیر انہوں نے آرام کیا۔ شام کی چائے پینے کے بعد وہ چہل قدمی کے لیے نکل گئے۔

جس پہلی شے نے نکولس کا متاثر کیا، وہ قہقہے کی فضا میں تیرتا سکون اور خاموشی تھی۔ مقامی افراد نے انہیں دیکھ کر سر کے اشارے سے سلام کیا۔ ان کے چہرے اطمینان اور قناعت کے عکاس تھے۔

وہ قہقہے کے مسکرون ماحول پر گفتگو کرتے ہوئے ”نہیں جھیل سینئر“ کی سمت بڑھ رہے تھے۔ جب وہ نہیٹا اونچے علاقے سے گزرے، تب پراسرار جھیل کی پہلی جھلک نظر آئی جس کی گہرائی میں ایک راز چھپا تھا۔

گیری نے دو درہن آنکھوں پر لگا لی۔ ”وہ دیکھو“ وہ مشرق کی سمت اشارہ کر رہا تھا۔ جھیل کے کنارے کسی کھنڈر کے آثار تھے۔ ”قلعہ یوروک ہارٹ۔“ اس نے دو درہن جیکولن کو دیتے ہوئے کہا۔ ”اسے 13 ویں صدی میں تعمیر کیا گیا تھا۔ اسکاٹ لینڈ کی جنگ آزادی میں اس شاہی قلعے کو خصوصی اہمیت حاصل تھی۔ ایک عرصے تک یہ طاقت کا سرچشمہ رہا، مگر...“ اس نے جملہ اجورا چھوڑ دیا۔

”مگر اب یہ ماضی کے مزار کی صورت، باقی رہ گیا ہے۔“ نکولس نے جملہ مکمل کیا۔

گیری مسکرا دیا۔ ”درست کہا۔ واقعی وقت ظالم ہے۔“ وہ کچھ دیر بعد سینئر پہنچ گئے کوئی چوکیدار نہیں تھا۔ دروازہ کھلا تھا۔ تینوں اندر داخل ہوئے۔

وہ پانچ کمروں پر مشتمل ایک صاف ستھری عمارت تھی، جہاں اس وقت مکمل سناٹا تھا۔

دفعتاً ایک کلک ہوا۔ کونے والے کمرے سے ایک بوڑھا شخص برآمد ہوا اور انہیں دیکھ کر ٹھٹھک گیا۔

”میں تمہاری کیا مدد کر سکتا ہوں جو جوانو۔“ لہجہ آئرش تھا، جس میں روا بیتی دیکھی غلطیوں تھا۔

”جناب ہم جھیل کی سیر کا ارادہ رکھتے ہیں۔ لاچ اور دیگر آلات کی ضرورت ہے۔ اور ہاں ایک جہاز راں بھی چاہیے، جو جھیل کے بارے میں معلومات رکھتا ہو۔“

”حیرت ہے۔“ آدمی بڑبڑایا۔ پھر کرسی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”بیٹھے۔“

کچھ دیر فائل کے ورق پلٹا رہا۔ پھر گویا ہوا۔ ”ٹھیک ہے۔ منگل کی صبح آپ کو لاچ اور تمام ضروری سامان مل جائے گا۔ آڈیو ریم اینڈ اس ادا کرنی ہوگی، آڈیو لوٹنے کے بعد۔“

”منگل؟“ نکولس نے آگے جھٹکتے ہوئے کہا۔ ”آج اتوار ہے جناب۔ اور ہم کل صبح سیر کا ارادہ رکھتے ہیں۔“ آدمی کے ماتھے پر ہل پڑ گئے۔ ”حیرت ہے۔“ وہ پھر بڑبڑایا۔ چند ساعت خاموشی چھائی رہی۔ پھر اس نے گہرا سانس لیا۔ ”نوجوانو، ضرور پر غائب کا کوئی مرکزی شہر تمہارا مسکن ہے اور تم اس دورا قیادہ قہقہے کی بابت زیادہ نہیں جانتے۔ انور میں میں فردری کے پہلے سوموار کو چھٹی ہوئی ہے اور کل سوموار ہے۔“

”مگر ہم کل کا دن ضائع نہیں کر سکتے۔“ گیری کے لیے میں خفیف سا احتجاج تھا۔

”میں سمجھ سکتا ہوں۔“ اس نے ہاتھ سے شانت رہنے کا اشارہ کیا۔ ”آپ کو لاچ مل جائے گی۔ آلات بھی۔ مگر لاچ آپ کو خود ہی چلائی پڑے گی۔ سرکاری اہلکار کل چھٹی پر ہیں۔“

چند لمبے خاموشی چھائی رہی۔ ”کیا کوئی نئی جینی ہماری مدد کر سکتی ہے؟“ بالآخر گیری نے کہا۔

”اس وقت تم ایک چھوٹے سے قہقہے میں ہوو جوان۔ جہاں کے باقی فردری کی پہلی سوموار چھٹی مانتے ہیں۔ ویسے...“ وہ سانس لینے کو رکا۔ ”ہمارا پیدا جارج ایڈورڈ اپنی چھٹی ہوئی لاچ کے ساتھ شاید جھیل پر موجود ہو۔ کام کے معاملے میں پورا امریکی ہے۔ مگر وہ ہماری مدد نہیں کر سکے گا۔ اس نے فون پر مطلع کیا تھا کہ اس کے لیے کوئی بنگ نہیں کی جائے۔ وہ مصروف ہے۔“

”یہ تو پریشان کن معاملہ ہے۔“ نکولس نے کہا۔ ”آدمی نے کاغذ سے اچکائے۔“ بوڑھا ہرکولس شاید تمہاری مدد کر سکے، مگر...“ وہ گہرا۔ ”اس کی کئی زیادہ بڑی نہیں۔ میرا تو یہی مشورہ ہے کہ آپ لاچ کرائے پر لے لیں، اگر آپ میں سے کوئی اسے چلانا جانتا ہو۔“

”میں سنبا لوں گا۔“ گیری نے کہا۔ ”کوئی مسئلہ نہیں۔“ ”خوب! یہ تو اچھی بات ہے۔“ اس نے چند کاغذات نکالے۔ ان پر کچھ لکھا۔ پھر دستخط کر دیے۔ ”یہاں سے چند میٹر دور انہیں جانب ہمارا آفس ہے۔ گو شام ہو چکی ہے مگر وہاں ضرور کوئی نہ کوئی ہوگا۔ کوئی اور ہونہ ہو بوڑھا ہرکولس تو دیکھیں ہوگا۔ وہ آپ کو سب سمجھا دے گا۔“

”بوڑھا ہرکولس۔“ جیکولن نے ذہن پر زور دیا۔ ”یہ وہی آدمی ہے ناں، جسے سب جھیل کا راز داں کہتے ہیں۔ میں نے

اپنے والد سے اس کا ذکر سنا تھا۔ مگر کیا وہ اب تک زندہ ہے؟“ ”ہاں۔“ آدمی کے چہرے پر ایک خاص نوع کی خوشی تھی۔ ”وہ کل کی طرح آج بھی چاق و چوبند ہے۔ مجھے تو لگتا ہے کہ وہ میرے پوتے کی شادی میں بھی شریک ہوگا۔“ ”شکر یہ جناب۔“ وہ تینوں کھڑے ہو گئے۔

جب وہ دروازے پر پہنچے، انہیں آئرش کی آواز سنائی دی۔ ”مجھے امید ہے کہ آپ کل تنہا نہیں ہوں گے۔ کوئی اور صاحب بھی آئے تھے لندن سے۔ انہوں نے بھی کل کے لیے لاچ لی ہے۔ توقع ہے کہ اچھے دوستوں کی طرح کل کا نظہر انا آپ ساتھ کریں گے۔“ اس نے ایک پرانی آئرش کہاوت کہی۔

جیکولن اور گیری نے تو زیادہ توجہ نہیں دی، مگر نکولس کا ہاتھ ٹھکا۔

”ایک اور صاحب؟“ وہ بڑبڑایا۔

☆☆☆

”تو میرے بچے، تم لوگوں نے کل کا دن چننا ہے۔ کوئی مضائقہ نہیں۔ اچھا ہے۔“

بوڑھا سامنے کھڑا تھا۔ ایک توانا اور ہوشیار شخص کے مانند۔ فقط جیسا عمر کی چٹلی کھاتی تھیں، ورنہ وہ اتنا چوس اور صحت مند تھا کہ کوئی اس کی عمر کا اندازہ نہیں لگا سکتا۔

وہ جھیل کے کنارے ایک چھوٹے سے کھج میں کھڑے تھے، جس کے نزدیک چند لاچ اور چھوٹی کشتیاں کھڑی تھیں۔ جھیل پر بحر انگیز خاموشی چھائی تھی، جسے بوڑھے کی بھید بھری مسکراہٹ ہمیز کرتی۔

”کل صبح تم مجھے یہیں پاؤ گے۔ لاچ، دیگر اشیا، سب تمہیں مل جائے گا میرے بچے۔ دوران سفر بھی شاید ہماری ملاقات ہو جائے۔ میں دن کا حصہ جھیل ہی میں گزارتا ہوں۔ اس نے کنارے پر لگی چھوٹی سے کشتی کی جانب اشارہ کیا۔

”شکر یہ۔“ جیکولن نے کہا۔ ”کیا ہم آپ کا کچھ وقت لے سکتے ہیں؟“

”ضرور میرے بچے، میرا وقت تمہارے لیے ہی تو ہے۔“ ”لوگ آپ کو جھیل کا راز داں کہتے ہیں۔“ جیکولن نے بات شروع کی۔ ”آپ ضرور اس کے بارے میں بہت کچھ جانتے ہوں گے؟“

”ہاں۔“ وہ ہنسا۔ ”دراصل جھیل میری دوست ہے۔ وہ مجھے باتیں کرتی ہے اور جھیل رازوں کی امین ہوتی ہیں۔“

”تو آپ عفریت کی بابت بھی جانتے ہوں گے؟“
 گیری نے فوراً کہا۔
 ”عفریت۔“ بوڑھے نے دھیرے سے کہا۔
 ”کتنا عجیب لفظ ہے یہ۔ انتہائی درشت۔“ اس کی نظر میں جمیل
 پر نکلی تھیں۔ ”یہ جمیل بہت ہی شانت ہے بچہ۔ پرسکون اور
 خاموش۔ بلا کی حسین۔“

”آپ برسوں سے یہاں ہیں۔ کیا آپ نے کبھی کچھ
 عجیب دیکھا ہو؟ کوئی نر سراسر مخلوق؟“
 سامنے سے ایک لالچ گزری۔ عرشے پر کھڑے
 جارج ایڈورڈ نے بوڑھے کو دیکھ کر ہاتھ بلایا۔ کچھ ساعت
 خاموشی چھائی رہی۔

”واقعہ!۔“ بالآخر بوڑھے نے خاموشی توڑی۔ ”نہیں
 میرے بچے، کبھی نہیں۔ یہاں تو بس میں نے محبت کا تجربہ کیا۔
 البتہ...“ اس نے ایک نظر تینوں پر ڈالی۔ ”میں نہیں ایک واقعہ
 ضرور سنا سکتا ہوں۔ صدیوں پرانا واقعہ۔ کیا سننا چاہو گے؟“
 ”بالکل۔“ جیکولن نے گردن ہلائی۔

”یہ پچھٹی صدی عیسوی کا واقعہ ہے۔ لیکن اس کا احوال
 سو سال بعد قلم بند کیا گیا۔“ بوڑھے نے کسی داستان کو کی شکل
 اختیار کر لی۔ ”تم نے سینٹ کولمبیا کا نام سنا ہوگا بچہ۔ خدا کا
 نیک بندہ۔ آئیانا کے ایک صوفی آدوئن نے اس کے حالات
 زندگی مرتب کیے۔ اس انسان کی زینت عجیب تھی۔ صدیوں
 قبل وہ یہاں... اس جمیل کے نزدیک خدا کا پیغام لے کر پہنچا
 تھا۔“ اس نے محبت کی نظر جمیل پر ڈالی۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ
 خود سینٹ کولمبیا کے دور میں پہنچ چکا ہو۔ ”یہ علاقہ اس وقت
 ویرانہ تھا۔ وحشت رقص کرتی تھی یہاں۔ چند ہی نفوس تھے۔
 مگر انسان کو راہ نجات بتانے کے لیے وہ نیک شخص یہاں چلا
 آیا۔ اور یہاں ٹھیک اس مقام پر جہاں ہم موجود ہیں، ایک
 پراسرار واقعہ پیش آیا۔“

تینوں دم سادھے بیٹھے تھے۔ بوڑھے کی آواز سحر انگیز تھی۔
 ”اس کی سوانح عمری میں ایک پراسرار مخلوق کا تذکرہ
 ملتا ہے۔ ہاں یہ سچ ہے بچہ۔ جب وہ نیک نام شخص یہاں سے
 گزرا تو قیامی گیرمہ کے لیے نیکارے ہوئے آگے بڑھے۔
 اس کا دامن پکڑ لیا۔ اور فریاد کی۔ درویش کے استفسار پر
 انہوں نے بتایا کہ ان کے ساتھی جمیل کے عفریت نے اپنے
 دانتوں سے اڈیفیر کر ہلاک کر دیا ہے۔ سینٹ کولمبیا نے اپنے
 ایک شاگرد کو اشارہ کیا، جو فوراً جمیل میں اتر گیا۔ وہ کسی مشاق
 تیراک کی طرح تیز رہا تھا۔ اور تب ایک عفریت برآمد ہوا۔“

سانپ سی گردن، قبل از تاریخ کے جانور سامنے۔ وہ پھانکار
 تھا۔ وہ شاگرد پر چھٹا... جب درویش نے ہاتھ اٹھایا اور اس
 میں سے روشنی پھوٹی۔ اس نے عفریت پر نگاہ کی، جس میں
 جلال تھا اور حکم دیا۔ ٹھہر جا...۔ عفریت جیسے اچانک گل
 تویم کے زیر اثر آ گیا ہو... وہ ٹھہر گیا۔ اور درویش نے کہا۔
 لوٹ جا، فوراً اور پھر کسی اس سمت نہیں آنا کہ یہاں خدا کے
 بندے رزق ڈھونڈتے ہیں۔ بس وہ عفریت پانی میں غائب
 ہو گیا اور پھر کسی خشکی پر ظاہر نہیں ہوا۔ کبھی نہیں۔“

بوڑھا خاموش ہو گیا۔ مشرق سے چلنے والی ہوا اس کے
 چہرے سے ٹکراتی تھی، جو جمیل سا گہرا تھا اور جمیل کی طرح
 پرسکون تھا۔

☆☆☆

حیرت نے کولس کو آلیا۔ ایسی حیرت جس کی تہ میں
 اندیشے حرکت کرتے۔
 چند پلوں قبل ہی وہ تینوں بیک اٹھائے سرائے سے
 باہر آئے تھے۔ جمیل تک جانے سے قبل ارادہ مقامی
 ریسٹورنٹ میں ناشتا کرنے کا تھا۔ ابھی وہ سڑک پر پہنچے ہی
 تھے کہ ایک فرارے بھرتی وین پہلو سے گزری اور دھول اڑائی
 ہوئی غائب ہوئی۔

گیری نے وین کے ڈرائیور کو صلو اتیں سنائی شروع
 کر دیں۔ مگر کولس خاموش رہا۔ بالکل خاموش۔ وہ ڈرائیور کو
 پہچانتا تھا اور اس شخص کی یہاں موجودگی اسے پریشان کر رہی
 تھی، تقاضا کر رہی تھی کہ وہ اس شخص کے بارے میں حقیقت
 تک رسائی حاصل کرے۔

ناشتے کے دوران بھی وہ خاموش رہا۔ جب وہ اٹھے
 لگے تو کولس نے جیکولن کو مخاطب کیا۔ ”تم دونوں چلو، مجھے
 ایک ضروری کام ہے۔ کسی کو یوں کرنا ہے۔“

جیکولن کے چہرے پر حیرت ابھری۔ گیری نے معنی خیز
 نظروں سے اسے دیکھا۔ پھر کھٹکھار کر گلا صاف کیا۔ ”جیسے
 آپ کی مرضی جناب، لیکن جلدی لوٹ آئیے گا۔ یہ یسٹن کا
 حکم ہے۔ ورنہ تیر کو لاچنگ تک پہنچنا پڑے گا۔“
 کچھ دیر بعد کولس ایک پرانی وسیع کے ٹیلی فون تھم میں
 کھڑا تھا۔ اس نے نمبر ڈائل کیا۔ تیل جاتی رہی۔ پھر کسی کی
 آواز سنائی دی۔ ”ہیلو۔“

”ہیلو ڈاکٹر ایکنگز! میں کولس بول رہا ہوں۔ آپ کو
 یاد ہوگا، ہم ملے تھے۔“
 چند ساعت خاموشی چھائی رہی۔ پھر ڈاکٹر چکا۔ ”ہیلو

کیٹین، کیسے مزاح ہیں۔ تمہاری آواز بہت دور سے آتی
 معلوم ہوئی ہے۔ لندن میں ہو یا اسکاٹ لینڈ پہنچ گئے؟“
 وہ ڈاکٹر کی یادداشت کی داوڑیے بغیر نہیں رہ سکا۔
 ”اسکاٹ لینڈ میں ہوں ڈاکٹر۔ نیس جمیل کے پاس۔ دراصل
 میں نے آپ سے کچھ پوچھنے کے لیے فون کیا تھا۔“
 ”پوچھو، کہاں پوچھا ہے۔“ لہجہ دوستانہ تھا۔
 ”وہ...“ کولس متذبذب تھا۔ ”سیسینار والے روز
 آڈیو ریم میں ایک شخص نے آپ پر حملہ کیا تھا... کیا آپ اسے
 جانتے ہیں؟“

فون کی دوسری طرف گہری خاموشی تھی۔ چند پلوں
 بعد ڈاکٹر کی ٹھہری ہوئی آواز سنائی دی۔ ”غالبا تم ایک
 جنونی کی بابت پوچھ رہے ہو۔ ایک بدعاش، بزن کوب
 کا خود ساختہ بیٹا۔“

”جون کوب۔“ کولس بڑبڑایا۔ ”وہی معروف رینک
 ڈرائیور، جو ایک رینکارڈ کے تعاقب میں اپنی جان گنوا بیٹھا تھا۔“
 ”ہاں۔“ ڈاکٹر نے کہا۔ ”اور یہ واقعہ نیس جمیل میں
 پیش آیا تھا۔“
 ”مگر اس جنونی شخص کا آپ سے کیا تعلق ہے؟ اس
 نے آپ پر حملہ کیوں کیا؟“

”تعلق ہے۔“ ڈاکٹر نے گہرا سانس لیا۔ ”یہ تیس برس
 پرانا واقعہ ہے۔ اس وقت میں ریسرچ انسٹی ٹیوٹ آف لندن
 سے منسلک تھا۔ ایک روز الیکٹریٹر کوب نامی ایک مضطرب
 نوجوان کئی تصاویر اور ویڈیوز لیے مجھ سے ملنے آیا، جن کا تعلق
 نیس جمیل کے عفریت سے تھا۔ اس نے خاصی تحقیق کی تھی۔
 اس کا دعویٰ تھا کہ وہ جمیل میں عفریت کی موجودگی ثابت کر سکتا
 ہے۔ سچ کہوں تو وہ تصاویر اور ویڈیوز واقعی حیران کن تھیں۔
 میں نے عیسی سے متعلق آج تک اتنے واضح ثبوت نہیں
 دیکھے۔ وہ چاہتا تھا کہ میں ان ثبوت کی بنیاد پر ایک رپورٹ
 مرتب کروں۔ اور میں نے رپورٹ تیار بھی کر لی، مگر پھر مجھے
 اس منصوبے سے پچھتاہٹا پڑا۔“

”ایسا کون سا واقعہ پیش آیا ڈاکٹر کہ آپ ثبوتوں کے
 باوجود پیچھے ہٹ گئے؟“ کولس نے فوراً سوال کیا۔

”اس کا سبب اس کا ایک تقاضا تھا، جو خاصا پریشان
 کن تھا۔“ ڈاکٹر نے جواب دیا۔ ”اس کی خواہش تھی کہ میں
 انچار رپورٹ میں یہ تجویز شامل کروں کہ عیسی کھلانے والی یہ
 مخلوق انسانوں کے لیے خطرے کی علامت ہے، اسے فی
 الفور ختم کر دیا جائے۔ ظاہری بات ہے کہ میں ایسا نہیں کر سکتا

آز

حضرت ابراہیمؑ کے والد کا نام، جو بت
 تراش، بت فروش اور بت پرست تھا۔ قرآن میں
 ہے ”اور یاد کر جب کہا ابراہیمؑ نے اپنے باپ آزر
 سے، کیا تو مورتیوں کو خدا بناتا ہے۔ میں دیکھتا ہوں
 کہ تو اور تیری قوم صریح گمراہی میں ہے۔“ (سورہ
 انعام۔ آیت 74) توریت میں حضرت ابراہیمؑ
 کے والد کا نام تارخ (تارخ) بتایا گیا ہے۔ بعض
 علماء کے مطابق آزر تارخ کا معرب ہے۔
 مرسلہ: شکلیہ پروین، سرگودھا

تھا۔ کیونکہ تارخ میں عفریت کی جانب سے کسی پر حملے یا کسی کو
 ہلاک کرنے کا کوئی واقعہ نہیں ملتا۔
 ”ماسوائے سینٹ کولمبیا کی سوانح عمری کے، جب
 عفریت نے ایک ماہی گیر کو قتل کر دیا تھا۔“ کولس کے ذہن
 میں بوڑھے کی سنائی ہوئی کہانی گھوم رہی تھی۔

”وہ دیگر معاملہ تھا۔ ایک قدیم قصہ۔ ایک اساطیر۔“
 ڈاکٹر نے فوراً کہا۔ ”جدید دور میں اس قسم کا کوئی واقعہ نہیں
 ملتا۔ جب میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی، تو وہ مجھے سے
 اکھڑ گیا۔ اور تب اس نے عالم جنون میں جون کوب کی
 پراسرار موت کا ذکر کیا، جس کے لیے وہ نیس جمیل کے عفریت
 کو قصور گردانتا تھا۔ اس کے اس دعویٰ نے مجھے درط حیرت
 میں ڈال دیا کہ وہ مرحوم کوب کا بیٹا ہے۔ تب مجھے سمجھ میں آیا
 کہ وہ انتہائی جذبے کے تحت یہ سب گہرا تھا۔ میں نے احتیاطاً
 انورس کی انتظامیہ سے رابطہ کیا، جہاں سے پتا چلا کہ ایک
 نوجوان کو جمیل کے اطراف فائرنگ کرنے کے الزام میں چند
 برس قبل شہر بدر کر دیا گیا تھا۔“

ڈاکٹر خاموش ہو گیا۔ کولس کے دل میں اضطراب نے
 جنبش کی۔ ”پھر کیا ہوا ڈاکٹر؟“

”میں نے اس پر معذرت کر لی۔“ ڈاکٹر بولا۔ ”اس
 نے دستاویزات اٹھائے اور کف اڑاتا ہوا میرے دفتر
 سے چلا گیا۔ چند برس بعد مجھے پتا چلا کہ کسی شخص نے آزاد
 حیثیت میں نیس جمیل کے حوالے سے اپنی تحقیق انسٹی
 ٹیوٹ کو ارسال کی ہے۔ ساتھ ہی یہ درخواست کی کہ اس
 عفریت کے خاتمے کے لیے اسکاٹ لینڈ انتظامیہ پر دباؤ

ڈالا جائے۔ شواہد کا جائزہ لینے کے لیے ایک کمیٹی بنائی گئی، جس میں میں بھی شامل تھا۔ تصاویر پر نظر ڈالتے ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ یہ شواہد الیگزینڈر ہی نے ارسال کیے ہیں۔ خیر، کمیٹی نے توقع کے عین مطابق انہیں رد کر دیا۔ اس واقعے کے چند روز بعد مجھے ایک فون کال موصول ہوئی۔ دوسرے طرف الیگزینڈر تھا، جو یہ یقین کیے بیٹھا تھا کہ کمیٹی نے میرے دباؤ پر اس کے خلاف فیصلہ دیا۔ اس نے دھمکی دی کہ میں نتائج جھٹکتے کے لیے تیار ہوں۔

”کولس نے گہرا سانس لیا۔ ”کیا آپ کا اس سے پھر سامنا ہوا؟“

”نہیں۔“ ڈاکٹر نے دھیرے سے کہا۔ ”برسوں تک وہ مجھے دکھائی نہیں دیا۔ پھر اس روز آڈینوریم میں اجانک میں نے اسے اپنے روبرو پایا۔ میں اسے پہچان نہیں پاتا، اگر کبری نظر اس کے دائیں گال پر موجود نشان پر نہیں پڑ جاتی۔ مجھے بعد میں پتا چلا کہ وہ لندن کے ایک ریٹائرڈ میں ملازمت کر رہا تھا۔“

چند ساعت خاموش رہی۔ پھر کولس کی آواز فون بوتھ میں گونجی۔ ”ایک سوال اور ڈاکٹر۔ آپ نے اس کے لیے جون کوب کا خود ساختہ بیٹا کے الفاظ استعمال کیے۔ اس سے کیا مراد ہے؟“

”میری کہانی ہے۔“ ڈاکٹر نے گہرا سانس لیا۔ ”الیگزینڈر کا دعویٰ ہے کہ وہ کوب کا بیٹا ہے، مگر یہ حقیقت نہیں۔ لیکن ڈی ریجر کے دوران میں نے اسے تلاش کرنے کی کوشش کی۔ جون کوب کے خاندان سے بھی رابطہ کیا۔ اور تب یہ انکشاف ہوا کہ الیگزینڈر اس کی اولاد نہیں۔ دراصل کوب کے محلے میں ایک جنونی شخص رہا کرتا تھا، جس نے ایک طوفانی رات اپنی بیوی اور دو بچوں کو بے دردی سے قتل کر دیا۔ اس کا ایک بیٹا مجزائی طور پر محفوظ رہا۔ قاتل کو گرفتار کر لیا گیا۔ شخص سے پتا چلا کہ وہ نفسیاتی مریض ہے۔ اسے علاج کے لیے اسپتال میں داخل کر دیا گیا۔ کیونکہ واقعہ کوب کے محلے میں پیش آیا تھا، اس لیے میڈیا نے اسے خصوصی اہمیت دی۔ کوب نے بھی ایک نیک انسان کی حیثیت سے اس کی کفالت کی ذمہ داری لے لی۔ چند برس وہ بچہ اس کے گھر رہا، مگر کوب کی پراسرار موت کے بعد اسے جیم خانے میں داخل کر دیا گیا، جہاں سے چند برس بعد وہ فرار ہو گیا۔ الیگزینڈر دراصل وہی بچہ ہے۔ اور اس واقعے کا سب سے پریشان کن پہلو یہ ہے کہ... چند برس بعد اسپتال میں زیر علاج

ایک نفسیاتی مریض کو باغ میں چھل قدمی کرتے ہوئے کسی نے قتل کر دیا۔“

”اوہ۔“ کولس کے منہ سے نکلا۔ ”اپنے باپ کو ٹھکانے لگانے کے بعد اب وہ حسن کی موت انتقام لیتا چاہتا ہے۔ عجیب!“

”عجیب ضرور ہے، مگر میرے نزدیک یہی حقیقت ہے۔“ ڈاکٹر نے گہرا سانس لیا۔ ”اس کا باپ نفسیاتی مرض تھا۔ ہم جانتے ہیں کہ نفسیاتی امراض وراثت میں منتقل ہوتے ہیں۔ کوب اس کے لیے کسی سبب کے مانند تھا۔ اپنی ماں اور بھائیوں کے بہیمانہ قتل، کوب کی پراسرار موت اور اذیت ناک بچپن نے اسے نفسیاتی پیچیدگیوں کی اتھاہ گہرائی میں دھکیل دیا، جہاں سے انتقام کا عقربیت برآمد ہوا۔ بس یہی کل کہانی ہے میرے دوست۔ مگر... تم اس شخص میں اتنی دلچسپی کیوں لے رہے ہو؟ سب ٹھیک تو ہے!“

”اوہ ہاں۔“ کولس جیسے خواب سے جاگا۔ ”سب ٹھیک ہے۔ شکریہ۔“

اس نے ریسوررکھ دیا۔ وہ فون بوتھ میں کھڑا تھا۔ جمیل کی سطح پر اضطراب کی لہر اس خیم لے رہی تھیں۔

☆☆☆

کوئی اس کا تعاقب کر رہا تھا۔ اس نے مڑ کر دیکھا۔ سیاہ دھیر بادل آسمان پر چھائے تھے۔ سورج کی روشنی مٹنے لگی تھی۔

”ہوا کا رنگ بدل گیا ہے۔“ ایک آواز کانوں سے نکرائی۔ بوڑھا اپنی کشتی کے نزدیک کھڑا تھا ہلا رہا تھا۔ کولس تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا اس تک پہنچ گیا۔ ”کیا طوفان آنے والا ہے؟“ لہجے میں اندیشہ تھے۔

بوڑھے نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ جمیل کی سمت دیکھ رہا تھا۔ چند کلو میٹر دور بیٹا گھر سے پانی میں ایک لالچ کھڑی تھی۔ ”تمہارے دوستوں کو تمہارا انتظار کرنا چاہیے تھا۔“ بوڑھے نے دھیرے سے کہا۔ ”وہ تمہارا رک جاتے تو بہتر تھا۔“ خیر میں تمہیں لالچ تک چھوڑ دوں گا۔ کوئی مسئلہ نہیں۔“

جب وہ بوڑھے کی کشتی کی جانب بڑھ رہا تھا، جارج ایڈورڈ اپنی لالچ کے عرصے پر بیٹھا تھا کہ ایک کمرہ تھا۔

کچھ دیر بعد کشتی لالچ کی سمت بڑھ رہی تھی۔ چند کلیومیٹر کا فاصلہ طے کرنے کے بعد کشتی ایک ٹیلے کے نزدیک سے گزری جہاں ایک چھوٹی لالچ بچھو کے کھا رہی تھی۔ عرش خالی تھا۔ بوڑھے کے چہرے پر پریشانی کی لہر ابھری، مگر وہ خاموش رہا۔

چند منٹ بعد وہ اس لالچ کے قریب پہنچ گئے جس پر کبری اور جیکولین سوار تھے۔

کبری ریٹنگ کے پاس کھڑا تھا۔ اس نے ہاتھ ہلا کر بوڑھے کو سلام کیا۔ کشتی لالچ سے جا لگی۔ کولس اس میں سوار ہو گیا۔

”گھر سے جے میں نہ جاؤ تو بہتر ہے بچو۔“ بوڑھے نے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”وہ کشتی مسئلہ نہیں۔ میں موجود ہوں۔“ وہ خود کھائی کے عمل سے گزر رہا تھا۔ کچھ دیر بعد کشتی جھاگ چھوڑتے ہوئے اٹھنے پانی میں چلی گئی۔

کولس کبری کی جانب متوجہ ہوا، جو ویڈیو کیسرا تھا سے کھڑا تھا۔

”جیکولین کہاں ہے؟“ اس نے سوال کیا۔ ”تمہارے پیچھے۔“ اسے جیکولین کی شریر آواز سنائی دی۔ وہ مڑا۔ اس کی محبوبہ دل میں کسراہٹ لیے کھڑی تھی۔

”یہاں کھڑے رہنا بے کار ہے۔ چلو دوست، اسٹرینگ سنبالنے کا وقت آن پہنچا ہے۔ کسبین میں چلتے ہیں۔“ کبری کی آواز میں جوش تھا۔ ”تب تم میری مہارت دیکھو گے۔“

وہ کبری کے پیچھے چلتے ہوئے کسبین میں داخل ہوئے۔

کبری بوڑھے سے آگے کے سامنے جا کر رکا، جو زیر آب ہونے والی حرکات و سکنات پر نظر رکھے ہوئے تھا۔ بائیں جانب سور تصاویر اتارنے والا آلہ نصب تھا۔ اسٹرینگ کے ساتھ کیاس لگا تھا۔

کبری نے اسٹرینگ سنبال لیا۔ ”ہمیں آگے بڑھنا ہوگا دوست۔“

کولس نے کنٹرول روم کے دبیز شیشے سے جھانکا۔ آسمان پر سیاہ بادل تیر رہے تھے۔

”موسم اچھا نہیں۔ ہمیں احتیاط برتنی چاہیے۔“ کولس نے دھیرے سے کہا۔

”بے فکر رہو۔“ کبری مسکرایا۔ ”جلد بادل چھٹ جائیں گے۔ عیسیٰ کی تلاش میں ہمیں جمیل کے گھر سے جے میں جانا ہوگا۔“

وہ جیکولین کی جانب مڑا، جس کے چہرے پر اطمینان تھا۔ ”تم لوگوں کو میرا انتظار کرنا چاہیے تھا۔“ اس نے شکوہ کیا۔ ”ارادہ تو تمہیں تھا، لیکن کبری بہت بڑبڑاتی تھی۔“ جیکولین نے

کہا۔ ”اور پھر ہمیں وہ صاحب مل گئے۔“ ”کون صاحب؟“ اس کا ہاتھ ٹھکا۔

”شاید میرا ذریعہ خیر ہو رہا ہے۔“ اُسے پشت سے ایک دہلی ہوئی آواز سنائی دی۔

وہ مڑا۔ ایک شخص اس کے سامنے کھڑا تھا۔ مضبوط شانوں پر جمھولتے اس کے بالوں میں سفیدی تھی۔ شیوہ بھی ہوئی۔ آنکھوں میں اضطراب اور چہرے پر رخسار کا نشان۔ ”الیگزینڈر کوب۔“ کولس کے دل میں سرگوشی ہوئی۔ ”ہیلو، میرا نام جبری گیم ہے۔“ اُس نے ہاتھ آگے بڑھایا۔

کولس کے ذہن میں آمدنی چلنے لگی۔ وہ انہیں دھوکا دے رہا تھا۔

”مسٹر جبری کی لالچ خراب ہو گئی تھی تو ہم نے انہیں لفت دے دی۔“ کبری کی آواز اسے کچھ حال میں لے آئی۔ اس نے مصلحتی کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ اس شخص کا ہاتھ کرجت تھا۔

کبری نے بات جاری رکھی۔ ”مسٹر جبری لندن سے ہیں۔ شوقیہ تحقیق۔ ہماری طرح انہیں بھی تیشی میں دلچسپی ہے۔ پہلے بھی وہ یہاں آتے رہے ہیں۔ میں نے سوچا ان کا ساتھ ہمارے لیے سودمند ہوگا۔“

”میں اس جمیل، اس کے جغرافیے اور یہاں کے موسم سے اچھی طرح واقف ہوں۔“ اُس نے کھولتی آواز میں کہا۔ ”اچھا ساتھ رہے گا۔“

کولس شدید اذیت میں تھا۔ ڈاکٹر اینگلز سے ہونے والی گفتگو کے بعد یہ عیاں ہو چکا تھا کہ اس کے سامنے ایک جنونی، ایک قاتل کھڑا ہے، جو انتقامی جذبے سے سلگ رہا ہے۔ وہ ان کی زندگیوں کی خطرے میں ڈال سکتا ہے۔

”ہمیں مغرب کی طرف بڑھنا ہوگا۔ وہ جمیل کا عیق ترین حصہ ہے۔ امید ہے، وہاں آپ کو اس عفریت کی ایک جھلک مل جائے۔“ خود کو جبری بتانے والے شخص نے عفریت کا لفظ چپاتے ہوئے کہا۔

”ضرور۔“ یہ کہتے ہوئے کبری اسٹرینگ گھمانے لگا۔ ”میں کافی کا انتظام کرتی ہوں۔“ جیکولین نے کہا اور باہر چلی گئی۔ کولس وہیں کھڑا اس شخص کو کھورتا رہا۔ آدی نے اس عمل کو محسوس کیا، مگر خاموشی سے آلات پر نظریں جماتے رہیں۔

لالچ تیزی سے آگے بڑھ رہی تھی۔ بادل اب سورج

پر غالب آگئے تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے شام وصل پہنچی ہو۔
”کیا ہم پہلے لپکے چکے ہیں مسٹر جیری؟“ بالآخر نکولس نے خاموشی توڑی۔
”نہیں۔“ لمبے کے ہزاروں حصے میں اُس نے جواب دیا۔

نیکولن کافی کے گگ لیے کسین میں داخل ہوئی۔ وہ خاموشی سے کافی پینے لگے۔ لالچ آگے بڑھتی رہی۔ کافی ختم کر کے وہ غصہ کھڑا ہو گیا۔ ”میں ذرا کھرا لے آؤں۔“

وہ باہر نکل گیا۔ چند لمحہ خاموشی چھائی رہی، پھر نکولس کی مضطرب آواز گونجی۔ ”میرے خیال میں ہمیں آگے نہیں جانا چاہیے۔“ نکولس نے کہا۔ ”موسم ٹھیک نہیں۔“

”چلو بھی نکولس۔“ کیری مسکرایا۔ ”یہ جھیل ہے کوئی سمندر نہیں۔ اگر بارش ہوئی تو لطف دو بالا ہو جائے گا۔“ ”تم مجھے نہیں رہے یہ شخص۔“ وہ کچھ کہنا چاہتا تھا کہ اُسے قدموں کی آواز سنائی دی۔ آدی ساٹ چہرہ لیے دروازے میں کھڑا تھا۔ چند ساعت نکولس اور وہ ایک دوسرے کو گھورتے رہے۔

”وہ دیکھو۔“ اچانک کیری چلا یا۔ اُنہوں نے جھیل کی سمت دیکھا۔ پراسرار انداز میں لہریں جنم لے رہی تھیں۔ یوں لگ رہا تھا جیسے زیر آب کوئی شے حرکت کر رہی ہے۔

جنس انہیں عرشے پر لے آیا نظریں لہروں پر پڑی تھیں، جو اب دھیرے دھیرے مٹ رہی تھیں۔ چند لمحوں بعد سچ آب پر سکون چھایا رہا۔ مگر پھر... ان کے بائیں جانب جھاگ جنم لینے لگے۔ کچھ ابھرا اور فوراً ہی غائب ہو گیا۔

”ہمیں اسی سمت آگے بڑھنا ہوگا۔“ آدی چلا یا اور... کسین کی سمت دوڑا۔ وہ تینوں اُسے کھڑکی سے دیکھ سکتے تھے۔ اس کی حرکات میں اضطراب تھا۔

اچانک بادل گرے۔ اُنہوں نے آسمان کی سمت دیکھا۔ سیاہی گہری ہو رہی تھی۔ اگلے ہی پل بجلی چمکی اور پراسرار نیل روشنی جھیل پر پھیل گئی۔

”بارش ہونے والی ہے۔“ نیکولن نے زینے کی طرف جاتے ہوئے کہا۔ ”میں برساتی لاتی ہوں۔“ ”نکولس اس کے پیچھے ہولیا۔“

ٹیمسٹ میں جانے والا زینہ کسین کی پچھلی طرف تھا۔ وہاں سے لالچ کا عرشہ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ نکولس نے تیزی سے زینہ عبور کیا۔ اس سے قبل وہ جیکولن تک پہنچ پاتا، اُس کی نظر ایک کسین پر پڑی، جس کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ اندر سامان بھرا تھا۔ جس کا ساپ اس کے دل میں پھینکا رہا۔ نکولس کسین میں داخل ہوا۔ عجیب سی بو اس کے نچھوڑے نکل گئی۔ وہاں کی بوسیدہ بیک بڑے تھے، مزے تک بھرے ہوئے۔ کچھ آلات بھی پڑے تھے۔ ابھی وہ ان بیگوں کو کھنگالنے کا ارادہ ہی بائندھ رہا تھا کہ بادل پھر گرے۔

اچانک اُسے عرشے پر کسی کے دوڑنے کی آواز سنائی دی۔ کیری کے الفاظ کا نونوں سے ٹکرائے۔ ”وہ دیکھو۔ وہ سانسے!“

غصیل بادل پھر گرے۔ بجلی چمکی۔ کسین کی چھوٹی سی کھڑکی سے نکولس نے باہر دیکھا۔ جھیل پر سیاہی چھائی رہی تھی۔ دبیز بادل سورج پر قبضہ کر چکے تھے۔ آسمان تیار تھا اور اگلے ہی پل وہ برس پڑا۔ پوری قوت سے۔ کسی غصیل عفریت کے مانند۔

طوفانی ہوائیں لالچ سے ٹکرا رہی تھیں۔ پراسرار لہروں کا جنم ہو چکا تھا۔ اچانک ٹیمسٹ کی روشنیاں ماند پڑنے لگیں۔

”تم یہاں کیا رہے ہو؟“ ایک آواز اس کے کانوں سے نکلائی۔ جیکولن سامنے کھڑی تھی۔ اس نے برساتی پائین رکھی تھی۔

”یہ لو۔“ اس نے برساتی اس کی سمت بڑھائی۔ ”بارش تیز ہو گئی ہے لگتا ہے ہم طوفان میں پھنس گئے ہیں۔“ یہ کہتے ہوئے وہ زینے کی سمت دوڑی۔

چہرے پر تذبذب لیے نکولس آگے بڑھا۔ دفعتاً اس کی نظر ایک عجیب سے دستے پر پڑی، جو بیگوں کے نیچے سے جھانک رہا تھا۔

حیرت کے زیر اثر وہ جھکا۔ بیک اٹھاتے ہی خوف کی سرد لہر ریڑھ کی ہڈی میں دوڑ گئی۔ ایک شوٹ مگن اس کے سامنے تھی۔

ابھی وہ اسی حیرت سے مقابلہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ بستر کے نیچے چھپائے گئے ایک چھوٹے سے بیک نے اس کی توجہ جذب کر لی۔ اس نے بیک پہنچا۔ زپ کھولتے ہوئے وہ دہل گیا۔ بیک

میں جاہلی مکمل سامان تھا۔ اس میں چادر تکی بھر رکھے تھے۔ ”طوفان آ رہا ہے۔“ عرشے سے ابھرنے والی کیری کی آواز کانوں سے ٹکرائی، جس سے گھبراہٹ عیاں تھی۔ ”ہمیں لوٹنا چاہیے۔“

”نہیں۔“ ایک مکروہ آواز بلند ہوئی، جو ایک قاتل کی تھی، ایک جنونی کی تھی۔ ”وہ نہیں ہے۔“ ”ہم مارے جا میں گئے۔“ کیری چلا یا۔

غصیل بادل زور سے گرے۔ بجلی ترپتی۔ انجن رک گیا۔ لالچ کی ٹیمسٹ تاریکی میں ڈوب گئی۔ اندھیرا چھا گیا۔ خوف اور خطرے کے احساس نے نکولس کو آن لیا۔ وہ ٹوٹا ہوا کسین سے باہر آیا اور تاریکی کو پھلانگتے ہوئے زینہ کی سمت بڑھنے لگا۔ اور تب... عرشے سے ایک جیج بلند ہوئی۔ اُس نے پہ مشکل زینہ عبور کیا۔ عرشے پر پہنچنے سے ایک وحشت ناک منظر اس کی آنکھوں سے ٹکرایا۔

ایک بڑی سی لہر لالچ کی سمت بڑھ رہی تھی۔ لہر پوری قوت سے ٹکرائی۔ لالچ کو شدید جھکا لگا۔ نکولس پورا بجھ گیا۔

کسین کی جانب سے اُسے قدموں کی آواز سنائی دی۔ ایک سایہ برآمد ہو جو تیزی سے لالچ کے اگلے حصے کی سمت بڑھ رہا تھا۔

اس سے قبل کہ نکولس کچھ سمجھ پاتا، ایک اور لہر لالچ سے ٹکرائی۔ ایک باپھر بادل گرے۔ وہ لالچ کے اگلے حصے میں پہنچنے ہی کو تھا کہ فائر کی کریمہ آواز گونجی۔ جس کے فوراً بعد ایک زوردار دھماکا ہوا۔

نکولس لرز گیا۔ احتیاط کے ساتھ آگے بڑھا۔ عرشہ تاریکی میں ڈوبا تھا۔ آسمان پوری قوت سے برس رہا تھا۔ رائیگ کے پاس کیری اوندھا پڑا تھا۔ اس کے کاندھے سے خون بہہ رہا تھا۔ جیکولن اس کے نزدیک کھڑی تھی۔ وہ خوف سے سفید پڑ چکی تھی۔

اس کے قدم جیکولن کی سمت بڑھے۔ اچانک کوئی بھاری شے سر سے ٹکرائی۔ حملہ انتہائی شدید تھا۔ وہ چکرا کر گر پڑا۔ آنکھیں بند ہونے لگیں۔

منظر صحتا لارہا تھا... جو اس گم ہوتے جا رہے تھے اور جھیل میں تلاطم تھا۔ خوابانہ کی کیفیت غالب آنے لگی۔ اور تب پانی پر چھائے کمرے سے کچھ ابھرا۔ کوئی اٹھ رہا تھا... سامنے آ رہا تھا۔

سانپ جیسی لمبی گردنوں، ڈرگین ساسر۔ چمکتی ہوئی زرد آنکھیں۔ اور پھر ایک فائر ہوا... ڈھس۔ نکولس اٹھا گھبراہٹ میں اتر گیا۔ کنارے پر موجود بوڑھے کی نظر میں جھیل پر پڑی تھیں۔ جھیل... جو شدید غصے میں تھی۔

☆☆☆

گھبراہٹ اندھیرا تھا۔ اسرا تھا۔ آسمان مسلسل برس رہا تھا اور لالچ جھکولے کھا رہی تھی۔ خواب کے اختتام پر حقیقت نے کروٹ لی۔ نکولس رائیگ سے لگا بیٹھا تھا۔ سر میں درد کی ٹپٹیں اٹھ رہی تھیں۔ نقابہت بدن میں جاگزیں تھی اور خطرے کی بو تنہوں میں گھس رہی تھی۔

اس نے بائیں سمت دیکھا۔ زخمی کیری لالچ کے عرشے پر پڑا تھا۔ پھر اسے رائیگ کے آخری کونے پر ایک سایہ نظر آیا۔ جیکولن... جس کے سایہ بال ہار رہے تھے۔ اس نے آگے بڑھنے... کی کوشش کی، مگر نقابہت آڑے آگئی۔

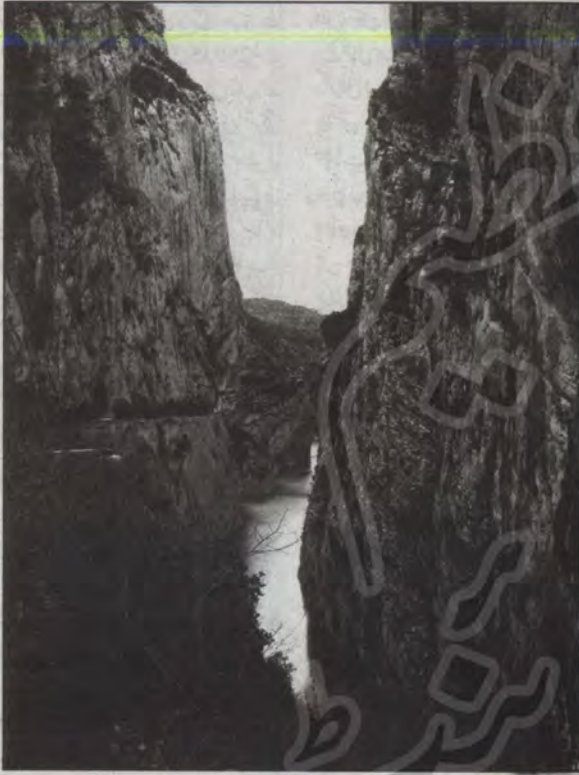
”جیکولن۔“ اُس نے اپنی محبوبہ کو پکارا۔ وہ یوں ہی کھڑی رہی۔ اُس کی نظر میں جھیل پر گڑی تھیں، جہاں تاریکی اور لہروں کے درمیان کوئی حرکت کر رہا تھا۔ جیکولن مہبوت ہو کر اُسے دیکھ رہی تھی۔ آنکھوں میں غیر یقینی تھی۔

نکولس کو قدموں کی آواز سنائی دی۔ اُس نے اندھیرے میں نظر اٹھا لیا۔ کسین سے ایک لڑکھڑاتا ہوا سایہ برآمد ہوا۔ ایک خاص مقام پر پہنچا۔ وہ رک گیا۔ اس کے ہاتھ میں بندوق تھی۔

نکولس کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ ”جیکولن۔“ وہ چلا یا۔ آواز قلع ہی میں کہیں اٹک گئی۔ پراسرار سانس نے بندوق سیڑھی کی۔ رخ جیکولن کی جانب تھا۔ بجلی کرجی۔ نیلی روشنی کا جنم ہوا اور تب نکولس کی نظر اس مکروہ چہرے پر پڑی، جس پر زخم کا نشان تھا۔

اس نے قوت جمع کی اور الیکٹریٹر کی سمت دوڑ پڑا۔ اس سے قبل کہ قاتل کی انگلی ٹیکر دباتی، نکولس حملہ کر چکا تھا۔ بندوق اس کے ہاتھ سے گر گئی اور رائیگ سے جا کر ٹکرائی۔

اب وہ دونوں عرشے پر تھے۔ ایک دوسرے سے متحکم گھٹا۔ ایک دوسرے پر غلبہ پانے کی کوششوں میں مصروف۔ اور جھیل کی سطح پر کوئی پھٹکار رہا تھا۔



بلند حوصلہ

طارق عزیز خاں

انسان اشرف المخلوقات ہے۔ کتنے ہی مشکل مراحل سے گزرنا پڑے وہ انہیں سرکری ہی لیتا ہے۔ یہ اونچے اونچے فلک بوس بلند وبالا پہاڑ جن سے ٹکرا کر ہوائیں بھی جم جاتی ہیں۔ جن کی چوٹیاں ہمہ وقت ہرف سے ڈھکی رہتی ہیں ان کو بھی عبور کر کے ثابت کر دیتے ہیں کہ انسان سے زیادہ با حوصلہ کوئی نہیں۔

معلومات کے شائقین کی مدارات، انمول سوغات

کوہ ہمالیہ اپنے ذیلی پہاڑی سلسلوں کوہ پامیر، کوہ ہندو کش اور کوہ قراقرم کے ساتھ دنیا کا بلند ترین پہاڑی سلسلہ ہے۔ یہ مشرق پاکستان اور مغرب میں وسط ایشیا کے میدان واقع ہیں۔ ہمالیہ میں واقع دنیا کے 30 بلند ترین پہاڑوں کی

وہ حیرت اور وحشت کے زیر اثر وہاں کھڑا رہا، یہاں تک کہ اسے جیکولن کا ہاتھ اپنے کاندھے پر محسوس ہوا۔ ”ہمیں گیری کی مدد کرنی ہوگی۔“ اس نے آہستگی سے کہا۔ کچھ دیر بعد گیری کسی بن کے فرش پر لیٹا تھا۔ خوش قسمتی سے دُخم زیادہ گہرا نہیں تھا۔ گولی کاندھے کو چھوٹے ہوئے گزرتی تھی۔ نکولس اسے فوراً طبی امداد دینے لگا۔ فرسٹ ایڈ باکس میں در در فح کرنے والے اشیائیں تھیں، جن کا سیال اُس نے گیری کے جسم میں داخل کر دیا۔

جیکولن اور نکولس اپنے دوست پر جھکے تھے۔ وہ اُس کی جان بچانا چاہتے تھے اور تب وقت نے ایک پراسرار کر دت لی۔ کہیں دور، افق پر روشنی کی ایک کرن نمودار ہوئی۔ نکولس نے سراٹھایا۔ حیرت نے اُسے آن لیا۔ بارش ختم ہو چکی تھی۔ بادل دور ہونے لگے۔ سورج کی روشنی جگہ بنانے لگی۔ جمیل شانت ہو چکی تھی۔

انہوں نے گیری کو اٹھا کر ایک کاؤچ پر لٹا دیا اور عرصے پر آگئے۔ مغرب کا حصہ روشن تھا۔ بادل جس رفتار سے آئے تھے، اسی رفتار سے لوٹ گئے۔ جمیل ویسی تھی جیسے کل تھی۔ پراسون۔

نکولس کو دور ایک دھبہ دکھائی دیا، جو دیر سے دھیرے بڑا ہو رہا تھا۔ وہ ایک خوشی تھی، جو تجزی سے لایج کی سمت آ رہی تھی۔

کچھ دیر بعد انہیں ایک مانوس چہرہ دکھائی دیا۔ ایک شفیق آواز نے ساعتوں میں رس مھولا۔

”پیرے بچو، تمہیں خیریت سے پا کر خوشی ہوئی۔ طوفان واقعی بھیانک تھا۔“ بوڑھا مطمئن تھا۔ ”تمہارا تیسرا ساتھی کہاں ہے؟“

کچھ دیر بعد وہ کشتی میں سوار کنارے کی سمت بڑھ رہے تھے، جہاں زندگی تمام گھنٹیوں کے ساتھ ان کی منتظر تھی۔ بوڑھا خاموش تھا۔ اس نے گیری کے زخمی ہونے سے متعلق کوئی سوال نہیں پوچھا۔ اور نہ اس کا گلے کے غائب ہونے پر کوئی سوال کیا۔

یہ راز آج بھی راز ہے کہ کسی میں کبھی کبھی نظر آنے والی مخلوق کس نسل کی ہے کیونکہ wild Life والے اس تلاش میں مسلسل رکاوٹ پیدا کر رہے ہیں۔ اب تو کیر اور بندوق لے کر جانا جرم بن گیا ہے۔ پکڑے جانے پر 2500 یورو جرمانہ ہے۔



نکولس اس پر چڑھا ہوا تھا، مگر سر کی چوٹ اب تک حواس معطل کیے ہوئے تھی۔ اسے ملتی محسوس ہوتی تھی۔ ریڈنگ کے پاس جیکولن خاموش کھڑی تھی۔ وہ کسی منتر کے زیر اثر تھی۔

جنونی الیگزینڈر حیران کن حد تک توانا تھا۔ اس نے نکولس کو ایک جھٹکے سے پرے پھینک دیا۔ اس سے قبل وہ سنبھل پاتا، الیگزینڈر بندوق اٹھا چکا تھا۔

وہ دیوار کا سہارا لے کر کھڑا تھا۔ الیگزینڈر سامنے موجود تھا۔ ایک مکروہ مسکراہٹ اس کے چہرے پر تھی۔ اس نے بندوق تان رکھی تھی۔ لکڑی مرگ آن پہنچا تھا۔

اُسے اپنے پیچھے قدموں کی آواز سنائی دی۔ جیکولن اس کے پسپوں میں آ کر رک گئی۔ چہرہ پراسون تھا۔ اس نے نکولس کا ہاتھ تھام لیا۔

الیگزینڈر کی مسکراہٹ گہری ہو گئی۔ ”خوب! دو محبت کرنے والوں کو ایک دوسرے کی بانہوں ہی میں دم توڑنا چاہیے۔ تمہاری کہانی رہتی دنیا تک یاد رکھی جائے گی۔“ ایک دشمنی قہقہہ بلند ہوا۔

جیکولن اور نکولس ایک دوسرے کو تھامے کھڑے تھے۔ بندوق کا رخ ان کی جانب تھا۔ موت کا لمحہ سانس لے رہا تھا۔ ٹریگر پر الیگزینڈر کی انگلی کا دباؤ بڑھنے لگا اور تب... نکولس کے چہرے پر حیرت ابھری، جس نے خوف کو زائل کر دیا۔ ہر احساس سے ماور کر دیا۔

نکولس کے بدلے تاثرات نے الیگزینڈر کو چونکا دیا۔ اُسے بے چینی کا احساس ہوا۔ اپنی پشت پر پھسکار سنائی دی۔ خوف سے چہرہ سفید پڑ گیا۔ وہ پلٹا۔ ایک سی کروں پر دکا سر... سر میں پیوست دوزر آ گئیں۔

وحشت کے زیر اثر وہ پوری قوت سے چلا یا۔ بندوق کا رخ جمیل کی سمت موڑ لیا۔ یہی موقع تھا... قیمتی موقع... نکولس تیزی سے آگے بڑھا۔

اس سے پہلے کہ الیگزینڈر فائر کرتا، وہ پوری قوت سے اس سے کرایا۔ الیگزینڈر کا توازن بگڑ گیا۔ وہ جمیل میں جا گرا۔ اس سے قبل کہ وہ خود کو سنبھال پاتا... کسی پراسرار وجود نے سرعت سے اُسے نیچے گھٹک لیا۔

ایک چیخ بلند ہوئی۔ نکولس نے جمیل کی سمت دیکھا، جس کے ایک حصے پر پیمان برپا تھا۔ کچھ دیر... وہاں جھاگ جنم لیتے رہے۔ اور پھر... خاموشی چھا گئی۔ وہ گئیں تو بس لہریں۔

اونچائی 25 ہزار فٹ سے زیادہ ہے۔ یہاں واقع سب سے بلند چوٹی ماؤنٹ ایورسٹ ہے، جس کی بلندی 29035 فٹ (8850 میٹر) ہے۔ یہ بلند پہاڑ شمال مغربی نیپال میں خط استواء سے 27.59 ڈگری شمال اور 86.55 ڈگری مشرق کے خط پر چین کی سرحد کے قریب واقع ہے۔ ایورسٹ کی چوٹی کے جنوب میں واقع علاقہ نیپال جبکہ چند میٹر نیچے شمالی ڈھلان چین کا حصہ ہے۔ ایورسٹ کو نیپالی لوگ ”ساگر ماتھا“ (Sagarmatha) کہتے ہیں جس کا مطلب ”آسمان میں واقع پیشانی“ ہے، جبکہ شمالی نیپال سے تعلق رکھنے والے شیرپا قبائل اسے ”چومولنگ ما“ (Chomolungma) کے نام سے پکارتے ہیں جس کا مطلب ”دنیا کی عظیم ماں“ ہے۔

ہمالیہ کی بلندی کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ اس سلسلے کے باہر جنوبی امریکا کے سلسلہ اڈینڈ میں واقع بلند ترین چوٹی کی اونچائی 22834 فٹ (6960 میٹر) ہے دنیا کے چند نمایاں دریا ہمالیہ کی برف پوش چوٹیوں سے نکلے ہیں جن میں سندھ، برہم پتر، گنگا، یاگنسی، میکا نگ، زرد جنوں اور شیر دریا شامل ہیں۔ جنوب مغربی ایشیا، چین اور وسط ایشیا میں واقع ان دریاؤں کی وادیوں میں دنیا کے ایک چوتھائی یعنی تین ارب انسان بستے ہیں۔ ہمالیہ کی بلند ترین چوٹیوں کا برصغیر کی تہذیب پر خاصا گہرا اثر ہے۔ اس کی اکثر چوٹیاں ہندومت، بدھ مت اور سکھ مت میں مقدس مانی جاتی ہیں۔ کوہ ہمالیہ کا حجم 30 سے 35 ملین سال پہلے برصغیر کے ایشیائے مکرانے کے نتیجے میں ہوا۔ یہ ٹکراتی شدید میٹروکروٹوں بڑے خطہ زمین کے درمیان واقع قدیم سمندر ریٹس (Tethys Sea) صفحہ ہستی سے غائب ہو گیا اور دونوں علاقوں کی سرحد پر ہمالیہ نام کا بلند علاقہ ظاہر ہونا شروع ہوا۔ ماہرین ارضیات کے مطابق برصغیر کا ایشیائے ہونے والا سنگم آج بھی جاری ہے جس کی وجہ سے ہمالیہ میں واقع پہاڑوں کی بلندی میں بتدریج اضافہ ہو رہا ہے۔

انگریز ماہر ارضیات سر جارج ایورسٹ (Sir George Everest) (1790-1866) نے 1830 سے 1843 تک برطانوی ہندوستان کے وسیع علاقے کا سروے کیا۔ اس نے 1834ء میں شمالی بھارت کی سروے سے متعلق دستاویزات پر ماؤنٹ ایورسٹ کی ”پہاڑی نمبر 15“ کے نام سے نشاندہی کی۔ 1843ء میں جارج ایورسٹ ریٹائر ہوا، تاہم وہ 1846-47ء میں ایسٹ

انڈیا کمپنی کی درخواست پر ایک بار پھر نیپال پہنچا، جہاں اس نے شمالی بھارت اور نیپال کے سروے کی عمرانی کی۔ اس کی گمرانی اور مشاورت سے 1850ء میں پہاڑی نمبر 15 کی پیشکش کے لیے چھ الگ الگ مہمات روانہ کی گئیں۔ ان مہمات کے نتیجے میں ایورسٹ کی بلندی 29002 فٹ طے ہوئی۔ 1856ء میں انگریز سرور، ایڈریو واؤ (Andrew Waugh) نے ٹکلتے میں منعقد ایشین سوسائٹی کے اجلاس میں ہندوستان کے شمالی علاقوں کا نقشہ پیش کیا جس میں پہاڑی نمبر 15 کو جارج ایورسٹ کے اعزاز میں ”ماؤنٹ ایورسٹ“ کے نام سے ظاہر کیا گیا تھا۔ 20 ویں صدی کے دوران ماؤنٹ ایورسٹ کی بلندی کا معاملہ متنازعہ بنا رہا۔ ماہرین کے اختلاف کی وجہ پہاڑوں کی بلندی میں ہر سال چند ملی میٹر کی رفتار سے ہونے والا اضافہ ہے۔ اس اضافے کی شرح تھوڑے بہت فرق کے ساتھ مختلف مقامات پر مختلف ہوتی ہے۔ یہی وجہ تھی کہ کئی عشروں تک بعض ذرائع کے ٹوجہ بعض چین جنگ کا ماؤنٹ ایورسٹ سے بلند ٹکلتے رہے۔ 1990ء میں ”زمین پر واقع مقامات کے تعین اور پیشکش“ Global Positioning System کا اطلاق ماؤنٹ ایورسٹ سمیت کوہ ہمالیہ کے وسیع حصے پر کیا گیا۔ اس نظام کے نتیجے میں ماؤنٹ ایورسٹ کی بلندی 29035 فٹ (8850 میٹر) کے، ٹو 28251 فٹ اور چین جنگ کی بلندی 28209 فٹ تسلیم کر لی گئی۔ 20 ویں صدی کی تیسری دہائی میں ماؤنٹ ایورسٹ کو سر کرنے کے لیے کوہ پیماؤں کی تینیں نیپال پہنچنا شروع ہوئیں۔ 1921ء اور 1922ء میں انگریز کوہ پیما، جارج لیف میلوری (George Leigh Mallory) کی قیادت میں ماؤنٹ ایورسٹ سر کرنے کی پہلی کوشش ناکام ہوئی۔ میلوری نے 1924ء میں تیسری کوشش کی جس میں وہ اپنے ساتھیوں سمیت جان سے ہاتھ دھو بیٹھا۔ 1937ء میں ایک برطانوی ہم 27 ہزار فٹ کی بلندی تک پہنچی لیکن خراب موسمی حالات کی وجہ سے انہیں واپس نیچے اترنا پڑا۔ جنگ عظیم دوم کے بعد 1951ء میں قابل رسائی مقامات کے تعین کے لیے ماؤنٹ ایورسٹ کے علاقے کا از سر نو سروے کیا گیا۔ 1952ء میں سوئس ہم بھی موسم کی بے اعتباری کا شکار ہوئی جس کے بعد نیوزی لینڈ سے تعلق رکھنے والے کوہ پیما سر ایڈمنڈ ہلاری (Sir Edmund Percival Hillary) نے ماؤنٹ ایورسٹ کا چیلنج قبول کرنے کا اعلان کیا۔

ایڈمنڈ ہلاری 20 جولائی 1919ء کو نیوزی لینڈ کے شہر ٹاک ایڈمنڈ میں پیدا ہوا۔ اس نے ٹوآکاؤ (Tuakau) پرائمری اسکول اور آک لینڈ گرامر اسکول سے تعلیم حاصل کی۔ وہ 16 سال کی عمر میں اسکول ٹرپ کے ساتھ واپست ہو کر نیوزی لینڈ کے شمالی جزیرے پر واقع ماؤنٹ Ruapehu (بلندی 9177 فٹ) سیر کر گیا۔ درحقیقت اس سیر کے دوران نوجوان ہلاری کی پہاڑوں پر چڑھنے سے متعلق صلاحیتیں اجاگر ہوئیں۔ وہ کھٹکٹوں تک کی باندھے ماؤنٹ روپو کی برف سے ڈھکی بلند چوٹی کو دیکھتا رہا۔ اسے اپنا آپ بلندی کی طرف کھینچتا ہوا محسوس ہوا۔ ہلاری خود پر قابو نہ رہ سکا۔ اس نے اس سیر کے دوران برف کی کم بلند عمودی چٹانوں پر چڑھنے کا شاندار مظاہرہ کیا۔ کسی مناسب تربیت کے بغیر محسوس برف کی عمودی چٹانوں پر چڑھنا کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ ہلاری کے ان کارناموں سے اسے اسکول کی سطح پر شہرت حاصل ہوئی۔ آک لینڈ واپس پہنچ کر اس نے پہلا کام یہ کیا کہ ایک مقامی ماؤنٹین کلب کی رکنیت اختیار کر لی۔ ہلاری نے بڑھائی کے ساتھ ساتھ پہاڑوں پر چڑھائی کا مشغلہ بھی جاری رکھا۔ اس کا ہر دو ایک ایڈ کلب کے بڑے بڑے ساتھیوں کے ساتھ آک لینڈ کے گرد و نواح میں واقع چٹانوں پر گزرتا۔ اس نے 1937ء کی گرمیوں کے دوران آک لینڈ کے مغرب میں واقع پہاڑی سلسلے کورومینڈل (Coromandel Range) کی بیشتر چوٹیوں کو تسخیر کیا۔ آنے والے مہینوں کے دوران ہلاری کے کارناموں کی فہرست طویل ہوتی گئی۔ یہاں تک کہ اس نے 1939ء میں نیوزی لینڈ کے جنوبی جزیرے پر واقع کوہ آلپس (Alps) کی چوٹی ماؤنٹ اوپور (بلندی 6342 فٹ) کو سر کیا۔ یہ بطور کوہ پیما اس کی پہلی نمایاں کامیابی تھی۔

ہلاری نے 1940ء کی شروعات میں نیوزی لینڈ کی رائل ایئر فورس میں شمولیت اختیار کی۔ وہ جنگ عظیم دوم کی وجہ سے کوہ پیما کی کڑیادہ وقت درندے پایا۔ تاہم جنگ کے فوری بعد اس نے ایئر فورس کو خیر باد کہا اور یورپ پہنچ گیا۔ آنے والے سالوں کے دوران ہلاری نے آئی، سوئٹزر لینڈ، فرانس اور آسٹریلیا میں واقع نامی گرامی چوٹیوں کو سر کیا۔ اب اس کی نظر کوہ ہمالیہ پر پڑی جسے دنیا کی چھت کہا جاتا ہے۔ ہر کوہ پیما کی طرح اس کا خواب تھا کہ وہ کوہ ہمالیہ میں واقع دنیا کی بلند ترین چوٹی ماؤنٹ ایورسٹ کو سر کرے۔ اس کا موقع بھی اسے جلد ہی مل گیا۔ ہلاری کی خوش قسمتی تھی کہ اسے 1951ء کی

ایڈمنڈ ہلاری کے نام سے منسوب مقامات اور اعزازات

جون 1953ء میں برطانوی ملکہ الزبتھ دوم نے ایڈمنڈ ہلاری اور ہم کے لیڈر جون ہنٹ کو ”سر“ کا خطاب دیا۔ 1953ء میں برطانوی حکومت کی طرف سے ہلاری سمیت پوری برطانوی ٹیم کو ”ملکہ الزبتھ دوم کورونیشن میڈل“ دیا گیا۔ 1953ء میں نیپالی حکومت نے ”آرڈر آف دی گورکھا“ ایوارڈ سے نوازا۔

جون 1953ء میں برطانوی حکومت کی طرف سے ہلاری کے ساتھی ٹین زنگ نورگے کو ”برٹش ایمپائر میڈل“ اور ”جارج میڈل“ دیا گیا۔ 1995ء میں نیوزی لینڈ حکومت کی طرف سے Knight of the Order of the Garter کا اعزاز ملا۔

”Hellary Step“ ماؤنٹ ایورسٹ پر واقع مقام کا نام ایڈمنڈ ہلاری پرائمری اسکول (نیوزی لینڈ کے شہر پاپاکورا (Papakura) میں قائم درس گاہ) ہلاری کالج (نیوزی لینڈ کے شہر اوٹارامی قائم درس گاہ) نیوزی لینڈ کے 5 ڈالر کے نوٹ کی پشت پر ہلاری کی تصویر۔

2001ء میں نیویارک کے ٹائم میگزین نے ایڈمنڈ ہلاری کو 20 ویں صدی کی 100 اثر دار ترین شخصیات میں سے ایک قرار دیا۔

2007ء میں برطانوی حکومت نے Polar Medal دیا۔ 23 اکتوبر 2008ء کو ”ڈیوک آف ایڈنبرگ ایوارڈ“ دیا گیا۔ 2008ء میں بھارتی حکومت نے Padma Vibhushan ایوارڈ دیا۔

نوٹ: برطانوی حکومت 1953ء میں نیپالی کوہ پیما ٹین زنگ نورگے کو ”سر“ کا خطاب دینا چاہتی تھی لیکن اس وقت کے بھارتی وزیر اعظم جواہر لعل نہرو کے اعتراض کے بعد نورگے کو یہ اعزاز نہیں دیا گیا۔

شروعات میں ماؤنٹ ایورسٹ کو سر کرنے کے لیے تشکیل دی گئی برطانوی گھوٹیاؤں کی ٹیم میں شامل کر لیا گیا۔ اس ٹیم کی قیادت جون ہنٹ کے پاس تھی۔ ٹیم کے کل ارکان کی تعداد ڈیڑھ درجن تھی جن میں جون ہنٹ اور ہلاری کے علاوہ ٹوم بورڈیلان، چارلس ایوز فوٹوگرافر، الفریڈ ریکوری اور ہلاری کا دوست جارج لوئے نمایاں تھے۔ اس زمانے میں چین کے سیاسی حالات کی وجہ سے تبت کی طرف سے ماؤنٹ ایورسٹ پر چڑھنے کی اجازت نہیں تھی، یہی وجہ تھی کہ برطانوی ٹیم نے چوٹی سر کرنے کے لیے نیپال کا انتخاب کیا۔ وہ لوگ مارچ 1951ء میں کلکتہ پہنچے، جہاں سے مقامیوں کی راہنمائی میں برطانوی ٹیم نے کھنڈوکا پیدل راستہ اختیار کیا۔ کھنڈوک میں دو ہفتے کے آرام کے بعد وہ لوگ شمال کی طرف روانہ ہوئے۔ ہلاری نے اپنی ٹیم کے ساتھ مل کر 52-1951ء کی گرمیوں کے دوران نیپال اور چین کے سرحدی علاقے میں مشق کے لیے چند آسان چڑھایاں چڑھیں جس سے اس تجربے میں اضافہ ہوا۔ اس دوران برطانوی ٹیم میں شیر پا قبائل سے تعلق رکھنے والے مقامی کوہ پیما ٹین زنگ نورگے (1914-1986) نے شمولیت اختیار کی۔ نورگے وہ شخص تھا جس نے 1952ء کی گرمیوں میں سونز لینڈ کی کوہ پیما ٹیم کے ساتھ ماؤنٹ ایورسٹ سر کرنے کی کوشش کی تھی۔ برطانوی ٹیم نے ماؤنٹ ایورسٹ سر کرنے کے لیے 1953ء کی گرمیوں کا انتخاب کیا۔ انہوں نے چوٹی کی طرف پیدل مارچ کرتے ہوئے مارچ 1953ء میں کھنڈوک سے 150 کلومیٹر مغرب اور ماؤنٹ ایورسٹ سے 25 کلومیٹر جنوب مشرق میں واقع پہاڑی قصبے ہم جگ میں اپنا پہلا بڑا ڈکڑا کیا۔ اس وقت ٹیم میں 362 مقامی مزدور، 20 شیر پا قبائلی راہنما، ایک شیر پانیالی کوہ پیما اور 17 یورپین (ہلاری سمیت) شامل تھے۔ ٹیم کو دو درجن کے قریب ٹٹوں اور گدھوں کی مدد بھی حاصل تھی جن پر قریب 10 ہزار پاؤنڈ وزن کے برابر ضروری سامان اور آلات لدے ہوئے تھے۔ ٹیم جگ میں مختلف ممالک سے تعلق رکھنے والے کوہ پیماؤں کی ٹیمیں قیام پذیر تھیں۔ مختلف اقوام سے تعلق رکھنے والے کوہ پیماؤں کے لیے قصبے سے ایورسٹ کی برف پوش چوٹی کا نظارہ ہو جوش تھا۔ انہیں ایورسٹ کی چوٹی اپنی طرف بلاتی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ ایک دوسرے کی کامیابی کے لیے دعا گو تھے، تاہم ہر ایک کی یہی خواہش تھی کہ اسے سب سے پہلے اپنے وطن کا پرچم دنیا کے بلند ترین مقام پر لہرانے کا موقع ملے۔

جون ہنٹ کی ٹیم نے اپریل کے وسط میں ماؤنٹ ایورسٹ کی طرف پیش قدمی شروع کی۔ انہوں نے 17600 فٹ (5360 میٹر) بلند بھوگلیشیر (Khumbu Glacier) پر اپنا ٹیم کیمپ قائم کیا۔ اس مقام پر بیشتر مزدور اور جانور کیمپ ہی میں رک گئے۔ برطانوی ٹیم نے مئی کے پہلے عشرے کے دوران 19600 فٹ (5970 میٹر) کی بلندی پر کیمپ ون لگایا اور وہاں کچھ وقت گزارا۔ انہوں نے دوسرا کیمپ 21300 فٹ (6500 میٹر) اور تیسرا کیمپ 24500 فٹ (7450 میٹر) کی بلندی پر قائم کیا۔ ان کی اگلی منزل ایورسٹ اور اس کے جنوب میں واقع چوٹی ماؤنٹ Lhotse کی 26100 فٹ (7950 میٹر) بلند ڈھلان تھی جہاں وہ مئی کے تیسرے عشرے کے دوران پہنچے۔ انہوں وہاں کیمپ نمبر چار قائم کیا۔ یہ ایورسٹ کی چوٹی سے پہلے لگا گیا ان کا آخری کیمپ تھا۔ اس مقام سے دنیا کے بلند ترین مقام پر جانے والا راستہ جنوبی کول (South Col) کہلاتا ہے۔ جون ہنٹ نے کیمپ نمبر چار میں قیام کے دوران ایورسٹ تک رسائی کے لیے دو دو کوہ پیماؤں پر مشتمل دو ٹیمیں تشکیل دیں۔ پہلی ٹیم میں ٹوم بورڈیلان، چارلس ایوز جگہ دوسری ٹیم میں ایڈمنڈ ہلاری اور نیپالی کوہ پیما ٹین زنگ نورگے شامل تھے۔

برطانوی شہری ہونے کی وجہ سے چوٹی تک رسائی پہلا تین بورڈیلان اور ایوز کی ٹیم کو دیا گیا۔ ان دونوں نے 26 مئی کی صبح ماؤنٹ ایورسٹ تک رسائی کی کوشش شروع کی تاہم ایوز کے آکسیجن سسٹم میں خرابی ہو جانے کی وجہ سے وہ اپر بڑھ کر اسے اور اسی دن شام کے وقت کیمپ نمبر چار واپس آ گئے۔ اگلے دو دن کے دوران چلنے والی تیز سرد ہواؤں نے کوہ پیماؤں کو کیمپ تک محدود رکھا جس کے بعد جون ہنٹ نے ہلاری اور نورگے پر مشتمل ٹیم کو ایورسٹ پر چڑھنے کا حکم دیا۔

28 مئی کی صبح ایڈمنڈ ہلاری اور ٹین زنگ نورگے تین مددگاروں جارج لوئے، فوٹوگرافر الفریڈ ریکوری اور ایک مقامی مزدور اینگ نیا (Ang Nyima) کے ساتھ اپنی آخری منزل کی طرف بڑھے۔ ہلاری کی قیادت میں ایک ہی رسی سے بندھے دو لوگ پھوٹک پھوٹک قدم بڑھاتے آئے بڑھتے رہے۔ گوکہ اس وقت سورج پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا، تاہم درجہ حرارت نقطہ انجماد سے گرا ہوا تھا۔ سرسراہٹ ہی ہوا بڑیوں کو چیرتی محسوس ہو رہی تھی۔ شام تک سب کچھ معمول کے مطابق رہا، یہاں تک کہ

27900 فٹ کی اونچائی پر واقع ایک پتھر جلی ڈھلان کے قریب پہنچ گئے۔ اس مقام پر مددگار گروپ واپس کیمپ نمبر چار کی طرف روانہ ہو گیا جس کے بعد ہلاری نے رات گزارنے کے لیے وہاں ایک چھوٹا خیمہ نصب کیا۔ اگلی صبح ہلاری کو خیمے کے باہر اپنے بچے ہوئے بوتلوں کی جوڑی ملی، جو اس کی بے پروائی سے باہر بڑی رہ گئی تھی۔ اس نے دو کھنڈے کی محنت کے بعد اکڑے ہوئے جوتوں کو سیدھا اپنا سامان سمیٹا اور مہم کے آخری مرحلے کا آغاز کیا۔ دونوں ساتھی مونے گرم لباس میں ملیں تھے اور ان میں سے ہر ایک کی کمر سے 14 کلو وزنی سامان لدا ہوا تھا۔ وہ ہاتھوں میں آکس آکس چکڑے، بے تلمے قدم اٹھاتے بلندی کی طرف گامزن رہے، یہاں تک کہ ایک 40 فٹ اونچی چٹان نے ان کا راستہ روک لیا۔ کسی پہرے دار کی طرح سیدھے کھڑی کے دو چٹان ان کے اور ماؤنٹ ایورسٹ کی چوٹی کے درمیان آخری بڑی رکاوٹ تھی۔ ہلاری نے حواس برقرار رکھے اور اپنے پورے تجربے کو بروئے کار لاتے ہوئے چٹان پر اپنا پہلا قدم رکھا۔ آج یہ تاریخی مقام ”ہلاری کا قدم“ (Hellary Step) کے نام سے جانا جاتا ہے۔

ہلاری نے فورگے کو پیچھے آنے کا اشارہ کیا اور میٹھیں گاڑتے دھیرے دھیرے اوپر چڑھنا شروع کیا۔ وہ کچھ دیر کی جدوجہد کے بعد بالآخر چٹان پر چڑھ گیا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر نورگے کو اوپر آنے میں مدد دی۔ دونوں ساتھیوں نے سکون کا سانس لیا اور چند میٹر دوری پر واقع ایورسٹ کی چوٹی کی طرف دیکھا جس تک رسائی اب آسان تھی۔ ہلاری، نورگے سے سینئر تھا اور ٹیم کی قیادت کرتا آیا تھا۔ وہ چاہتا تو ماؤنٹ ایورسٹ پر پہلا قدم رکھ سکتا تھا، تاہم اس نے فراخ دلی کا ثبوت دیا اور نورگے کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر اپنی آخری منزل کی طرف بڑھا۔ انہوں نے 29 مئی 1953ء کے دن 11 بجکر 30 منٹ پر دنیا کے سب سے بلند مقام ماؤنٹ ایورسٹ کی چوٹی پر ایک ساتھ اپنے تاریخی قدم رکھے لیکن یورپین ذرائع ہلاری کو چوٹی تک رسائی حاصل کرنا والا اولین فرد مانتے ہیں لیکن ہلاری کے مطابق اس نے اپنے نیپالی ساتھی کے ساتھ قدم ملا کر یہ کارنامہ سرانجام دیا تھا۔ ایڈمنڈ ہلاری نے چوٹی پر برطانیہ، نیوزی لینڈ اور نیپال کے پرچم لہرائے۔ اس نے آکس آکس ہاتھ چکڑے ہوئے نورگے کی یادگار تصویر کھینچی، جو آج ایک تاریخی تصویر کی حیثیت رکھتی ہے ہلاری کے مطابق ایورسٹ پر مختصر قیام اس کی زندگی کے انمول ترین لمحے تھے۔ اس نے چوٹی سے نیپال اور چین کے

ماؤنٹ ایورسٹ کی تسخیر سے متعلق چند اہم واقعات

- 22-1921ء میں انگریز کوہ پیما جان لینفیلڈ کی طرف سے ایورسٹ سر کرنے کی ابتدائی کوششیں ناکام ہو گئیں۔
- 1924ء میں جان لینفیلڈ نے تیسری کوشش کی جس میں وہ اپنے ساتھیوں سمیت جان سے جا دو ہو بیٹھا۔
- 1937ء میں ایک برطانوی ٹیم 27 ہزار فٹ کی بلندی سے ناکام واپس لوٹی۔
- 1951ء میں ایک برطانوی ٹیم نے ماؤنٹ ایورسٹ کا سروے کیا۔
- 29 مئی 1953ء کو نیوزی لینڈ سے تعلق رکھنے والے کوہ پیما ایڈمنڈ ہلاری نے اپنے نیپالی ساتھی ٹین زنگ نورگے کے ساتھ مل کر ماؤنٹ ایورسٹ سر کی۔
- 8 مئی 1978ء ماٹاؤلی کوہ پیما رینہولڈ میسنر (Reinhold Messner) نے اپنے آسٹریائی ساتھی پیٹر ہبلر (Peter Habeler) کے ساتھ بغیر آکسیجن سلنڈر استعمال کیے ماؤنٹ ایورسٹ کو سر کیا۔
- 1980ء میں پولینڈ سے تعلق رکھنے والے کوہ پیما لیزک چیچی (Leszek Cichy) نے اپنے ساتھی کریز زوف ویلیکی (Krzysztof Wielicki) کے ساتھ لکرمو سرما کے دوران ماؤنٹ ایورسٹ کو سر کرنے کی اولین مہم سرانجام دی۔
- 1996ء میں ماؤنٹ ایورسٹ پر چڑھنے والے مختلف ممالک کے 15 کوہ پیما ہلاک ہو گئے۔
- 17 مئی 2000ء کو کامرا، آسٹریا، کینیڈا کی مشرقی ٹیم کے رکن کے طور پر ناصر صابر، ماؤنٹ ایورسٹ سر کرنے والا پہلا پاکستانی تھا۔
- 14 مئی 2005ء میں ایک فرانسیسی ہواباز ڈیڈیو ڈیل سالے (Didier Delsalle) نے اپنے ہیلی کاپٹر Eurocopter AS 350 B3 کے ساتھ ماؤنٹ ایورسٹ پر کامیاب لینڈنگ کی اس نے وہاں چند منٹ گزارے اور کامیاب واپس لوٹ آیا۔
- 25 مئی 2008ء میں نیپالی کوہ پیما مین بہادر شیرچن (Min Bahadur Sherchan) 76 سال کی عمر میں ماؤنٹ ایورسٹ سر کرنے والا دنیا کا سب سے معمر انسان تھا۔
- 20 مئی 2009ء انگریز پرچم جوہر رالف فیئس نے 65 سال کی عمر میں ماؤنٹ ایورسٹ سر کی۔
- مئی 2010ء میں جوردن رومیرو (Jordan Romero) 13 سال کی عمر میں ماؤنٹ ایورسٹ سر کرنے والا دنیا کا کم عمر ترین انسان تھا۔
- نیپالی کوہ پیما آپا شیرپا (Apa Sherpa) نے مئی 2010ء تک 20 مرتبہ ماؤنٹ ایورسٹ سر کرنے کا ریکارڈ قائم کیا۔
- جولائی 2010ء تک ماؤنٹ ایورسٹ سر کرنے والے کامیاب کوہ پیماؤں کی تعداد 2700 تھی۔

”سر“ کے خطاب سے نوازا۔

سر ایڈمنڈ ہلاری نے 3 ستمبر 1953ء کو نیوزی لینڈ میں لوی میری روز سے شادی کی جس سے اس کا ایک بیٹا پیٹر (1954) سارہ (1955) اور ہینڈا (1959) ہوئے۔ اس نے نیوزی لینڈ کی طرف سے 1955ء میں دائرہ قطب شمالی میں مطالعاتی مہم سرانجام دی۔ اس کے ساتھ اس مہم میں انگریز ماہر ارضیات ویوین ای فلوچر (Vivian E Fuchs) بھی شریک تھا۔ 1960ء میں ہلاری کی کوششوں کے نتیجے میں ماؤنٹ ایورسٹ کے قریب شیرپا قبائل کے قبے کھم جنگ میں چھوٹے بچوں کے لیے جدید اسکول قائم ہوا۔ اس نے بعد میں نیپال کی تعلیمی پسماندگی دور کرنے کے لیے ”ہمالیہ ٹرسٹ“ قائم کیا، جس کے تحت 2010ء تک نیپال میں 30 کے لگ بھگ تعلیمی ادارے قائم کر دیے گئے تھے۔ 1975ء میں ہلاری کی بیوی اور بیٹی ہینڈا ایک ہوائی حادثے کے نتیجے میں ہلاک ہو گئیں۔ اسی سال ہلاری کی مہماتی زندگی سے متعلق کتاب Nothing Venture Nothing Win اور 1999ء میں the Summit شائع ہوئی۔ 1986ء میں ہلاری کے نیپالی ساتھی ٹین زیگ نورگے کا انتقال ہوا۔ ہلاری نے 21 دسمبر 1989ء کو ایک بیوہ خاتون سے دوسری شادی کی۔

قارئین کی دلچسپی کے لیے بتاتے چلیں کہ ایڈمنڈ ہلاری کا بیٹا پیٹر اور ٹین زیگ نورگے کا بیٹا جیم لنک (Jamling) بھی کوہ پیما ہیں۔ پیٹر نے 1990ء میں اپنے باپ کے نقش قدم پر چلتے ہوئے پہلی بار ماؤنٹ ایورسٹ سر کی۔ 2003ء میں نیپال میں ماؤنٹ ایورسٹ سر کرنے کی پچاس سالہ تقریبات منائی گئیں۔ ان تقریبات کا شاندار آغاز اس وقت ہوا جب ہلاری کے بیٹے پیٹر اور نورگے کے بیٹے جیم لنک نے ایک مشترکہ مہم کے دوران اپریل 2003ء میں ماؤنٹ ایورسٹ کو سر کیا۔ اسی سال مئی کے دوران ایڈمنڈ ہلاری کو نیپال کی اعزازی شہریت دی گئی۔ اس نے جنوری 2007ء میں انٹارکٹیکا میں قطب جنوبی کی دریافت کے حوالے سے منعقدہ تقریبات میں شرکت کی۔ وہ اپریل میں اپنے آخری دورے پر ٹھنڈو گیا۔ وہ نیپال سے نیوزی لینڈ واپس پہنچا تو اسے دل کی تکلیف شروع ہوئی۔ ہلاری اگلے چند ماہ بیمار رہا یہاں تک کہ 11 جنوری 2008ء میں اس بلند حوصلہ انسان کا آک لینڈ (نیوزی لینڈ) میں انتقال ہو گیا۔

جولائی 2013ء

نیسٹ میچ

کھیلوں کی اصطلاح۔ جب کسی ملک کی ٹیم دوسرے ملک کا دورہ کرتی ہے تو ٹی ٹی ٹی میچ کھیتی ہے۔ ان میں سے کچھ تو علاقائی ٹیموں کے خلاف ہوتے ہیں اور کچھ میزبان ملک کی قومی ٹیم کے خلاف، یہ ٹی ٹی ٹی میچ کہلاتے ہیں، کیونکہ ان میں دو ملکوں کی قومی ٹیمیں ایک دوسرے کے خلاف صف آرا ہوتی ہیں۔ ایک دورے میں ٹی ٹی ٹی میچ ہو سکتے ہیں۔ دورے کے ختم ہونے پر جو ملک زیادہ نیسٹ میچ جیتا ہو وہ مقابلہ جیت جاتا ہے۔ یوں تو نیسٹ میچ کی اصطلاح ہر کھیل کے لیے استعمال کی جاتی ہے، لیکن خصوصاً کرکٹ کے لیے استعمال ہوتی ہے۔ ایک دورے کے درمیان عموماً (اس میں کمی ہو سکتی ہے) پانچ نیسٹ میچ کھیلے جاتے ہیں۔ ان کو دوسرے بچوں کی نسبت زیادہ اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ کرکٹ نیسٹ میچ تین سے لے کر پانچ روز تک کھیلے جاتے ہیں۔

مرسلہ: شاہین ممتاز، سید آباد

سرحدی علاقوں کا نظارہ کیا۔ ہلاری کو اس مقام سے دنیا بہت چھوٹی دکھائی دی، اسے لگا جیسے وہ تھوڑا سا آسمان چھو سکتا ہے۔ ہلاری اور نورگے نے ماؤنٹ ایورسٹ پر 15 منٹ گزارے۔ اور پھر نیچے اتر آئے۔ کمپ نمبر چار کی طرف بڑھتے ہوئے ہلاری کی پہلی ملاقات خیمے کے باہر بے چینی سے ٹپکتے اپنے دوست جارج لوئے سے ہوئی، وہ لوئے پر نظر پڑتے ہی چلا یا۔

"Well, George, we knocked the bastard off"

کمپ نمبر چار میں ہلاری کا پر تپاک استقبال کیا گیا۔ جون وینٹ نے ہلاری اور نورگے کو مبارکباد پیش کی اور مہم کی تکمیل کا اعلان کیا۔ وہ اپنی ٹیم کو لے کر ٹھنڈو پہنچا جہاں اس نے ایک پرچم پر پریس کانفرنس میں اپنی کامیابی کا اعلان کیا۔ ایڈمنڈ ہلاری اور اس کی ٹیم جون کے وسط میں لندن پہنچی جہاں ان کا شاہان شان استقبال کیا گیا۔ برطانیہ کی نئی حکمران ملکہ الزبتھ دوم جس کی تاجپوشی 2 جون 1953ء کو ہوئی تھی، نے مہم کی کامیابی کو اپنی مملکت اور تاج کے لیے نیک شگون قرار دیا۔ ملکہ نے ہلاری کے اعزاز میں منعقدہ تقریب سے خطاب کرتے ہوئے اس کے شاندار کارنامے کو سراہا اور اسے

ماہنامہ سرگزشت

ماہنامہ سرگزشت



عزم و حوصلے کی نئی تاریخ مرتب کرنے والی روداد

ہمت مردان

امجد رئیس

زندگی اور موت کے درمیان ایک کشمکش تھی۔ وہ تو پرواز سے واپس آ رہا تھا کہ اس کے ساتھ ایسا حادثہ رونما ہو گیا مگر اس نے حوصلے کا دامن نہ چھوڑا بالآخر موت کو بھی پیچھے ہٹنا پڑا۔

37 سالہ والٹر وائٹ جونیر، دواجن کے بیج کرائٹ (Beechcraft) میں سفر کر رہا تھا۔ بارش تیز تھی اور وہ بے چینی کے عالم میں آبی چادر کے پار میاں کو تلاش کر رہا تھا۔

نساؤس چوروں نے اس کے متعدد نیوی کیشن آلات چرائے اور اس کی خبر تبت ہوئی مگر جب وہ اڑان بھر چکا تھا۔ اس حالت میں بخوبی پرواز تھا کہ اس کے پاس محض کپاس اور ہاتھ میں ریڈیو تھا۔ وائٹ کا رخ گھری جانب تھا۔

اس نے اینڈروس کے جزیروں کو پار کیا تو تین ہزار پانچ سو فٹ کی بلندی سے لہروں کو چٹانوں سے سر جھٹکے دیکھا۔ اسے اندازہ ہوا کہ وہ "Bimini" کے قریب ہے۔ تاہم بمبئی کے آگارا سے کہیں نظر نہیں آئے۔ اسے اندازہ بھی نہیں ہوا پار ہوا تھا کہ وہ اس وقت کس مقام پر ہے۔

وائٹ نے وائرلیس کے ذریعے ڈے کا پیغام ارسال کیا۔ یعنی ہنگامی مدد فراہم کی جائے۔ سیامی کی اتر جہا سے جواب آیا..... انہوں نے وائٹ کا پیغام کوٹ گاڑ کو روانہ کر دیا تھا۔ کوٹ گاڑ حرکت میں آئی فوراً ہی ایک فالکن جیٹ لٹھا میں بلند ہوا جو امدادی کارروائیوں کے لیے مخصوص تھا۔

سفید اور نارنجی رنگ کا جیٹ سیاہ بادلوں سے نمودار ہوا تو خاصا وقت گزر چکا تھا۔ وائٹ کے جہاز کا دایاں انجن پھڑپھڑانے لگا تھا تازی تیزی سے قریب تر ہو رہی تھی۔ "ہم تمہیں پہ آسانی پہنچے اتاریں گے۔" فالکن کے کمانڈر لیفٹیننٹ اسٹیونس بلینکن شپ نے وائٹ کو تسلی دی۔ "جنوب مغرب سمت "کے سال" میں ایمر جیٹ لینڈنگ اسٹریٹ ہے۔" اس نے وائٹ کو بتایا اور پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔

"مجھے رہو، والٹر، بلینکن شپ نے پھر کہا۔ "چھ میل رہ گئے پھر محفوظ ہو گے۔"

"اسی وقت وائٹ کے جہاز کا دایاں انجن آخری بار کھانا اور بایاں فیول ٹینک بھی خشک ہو گیا۔ خشک ایندھن کی ٹینکی نے دوسرے انجن کی سانس بھی روک لی اور جہاز کا رخ پانی کی جانب کر دیا۔ وائٹ نے رفتار کم سے کم کرنے کی کوشش کی اور چلا یا "میں پانی میں جا رہا ہوں۔"

بلینکن کی سانس پھول گئی جب اس نے وائٹ کے جہاز کو سمندر سے ٹکراتے اور غائب ہوتے دیکھا۔ اس نے کم بلندی پر جانے کا واقعہ پر چکر لگایا لیکن مشین اور انسان دونوں غائب تھے۔

علاقہ میں موجود ایئر فورس سی-130 ٹرانسپورٹ نے پیراشوٹ سمیت امدادی اشیاء پھینکیں۔ تاہم فالکن کے عملے کو کچھ دکھائی نہیں دیا۔ لائف رافٹ بھی نظر نہیں آئی۔ نہ کسی قسم کی ایمر جیٹ ٹرانسمیشن۔ انہیں محسوس ہوا کہ وائٹ ہلاک ہو چکا ہے۔ کو پائلٹ، مائیک فلاپر پی نے ایندھن کی جانب توجہ دلائی۔ ایندھن کی سوئی اختتام کے قریب تھی۔ چھ بجے وہ "کی ویسٹ" کی جانب مڑ گئے۔

"ہم نے کوشش کی، بلینکن شپ نے بد مزگی کہا۔ "ہم ایندھن لے کر دوبارہ آئیں گے۔"

☆☆☆

جہاز سمندر سے ٹکرایا تو وائٹ کا سراسر منٹ پینر سے ٹکرایا گیا۔ وائٹ نے دو فلپر دیوچے اور لائف ویسٹ پھلانے کے لیے ٹیگ کھینچ لیا۔ کوٹ گاڑ جیٹ کی تیز روشنی پانی کے اندر آ رہی تھی۔ اس نے ایک فلپر روشن کیا جبکہ دوسرے ہاتھوں میں ہی دو توڑ گیا۔ جہاز کو ڈوبنے میں چند سیکنڈ تھے۔ وائٹ کو "سی سروائیول" کی تربیت حاصل تھی۔ وہ بروقت ڈوبتے ہوئے جہاز سے نکل گیا۔ اسے اپنی توانائی کو محفوظ رکھنے کی اشد ضرورت تھی۔ لیکن 30 منٹ بعد اس نے کپکپاتا شروع کر دیا۔ وہ ابھی تک سطح آب سے نیچے تھا اور جانتا تھا کہ ڈھونڈنے والے اسے دیکھ نہیں سکتے۔ سطح آب کے اوپر نیچے ہوتے ہوئے اس نے "کے سال" کی جانب تیرنا شروع کیا۔

اگلے 6 منٹ میں اس کی ہمت جواب دے گئی اور امید نے تیزی سے دم توڑنا شروع کر دیا تھا۔ معاً اس کی جیٹ کا بایاں جیبر نرم پڑنے لگا۔ وہاں سے جیلے خارج ہو رہے تھے۔ سچ بند کرنے سے جیبر جیٹ کا بایاں حصہ بے کار ہو گیا۔ وائٹ نے سوراخ پر منہ رکھ کر ہوا بھری اور سوراخ بند کرنے کے لیے انگلی کا استعمال کیا۔

پانی بے انتہا سرد تھا۔ اس کی پیشانی کا خون شارک کو متوجہ کر سکتا تھا۔ بہر حال اسے آخری دم تک لڑنا تھا۔ ہاتھ بڑا ڈالنا صریحاً خودکشی تھی۔

"اگر یہ میرا آخری وقت ہے، خدایا! اس نے آخری اور عظیم ترین طاقت کو پکارا "میں دعا کرتا ہوں کہ مرنے سے قبل میرے گناہوں کو معاف کر دینا۔"

لائف جیٹ کے بغیر وہ زیادہ پر جدوجہد نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے اتر لائن کا شاختی بیج شرت پر سے اتارا اور جیٹ کے سوراخ پر چپکایا۔ اسے ٹریشا یاد آئی۔ بارہ سالہ جیف اور دس سالہ والٹر یاد آیا۔ گوکہ ٹریشا سے علیحدگی ہو گئی تھی اور بچے ماں کے ساتھ ہیسی میں رہتے تھے۔

اس نے بیج کو جیٹ پر چپاں کیا اور اسے وہیں لگائے رکھنے کی کوشش کی۔ تاکہ ہوا کا اخراج بند رہے۔ گھڑی دیکھی آٹھ بج رہے تھے۔ اسے امید تھی کہ وہ دنا بجے تک جدوجہد جاری رکھ سکتا تھا۔

دفعتاً اس کے پیروں سے کوئی ٹھوس متحرک جسم ٹکرایا۔

شارک! اسے خیال آیا۔ انہوں نے مجھے تلاش کر لیا ہے۔ اس نے سوچا اور وہ واپس آئیں گی۔

دس بجے اس نے ہتھیار ڈالنے کے بجائے درمیانی شپ کا ٹارگٹ منتخب کیا۔ مسئلہ یہ تھا کہ جیٹ پھر ایک ہوری تھی اور ہوا بھرنے کی ٹیوب بھی الگ ہو گئی تھی۔ وائٹ نے منہ سے پھر ہوا بھری اور سوراخ پر انگلی رکھ دی۔ سراسر نے سطح آب سے اوپر کھٹکا۔ بارش اب بھی جاری تھی۔ وہ سطح آب پر پشت کے بل لیٹ گیا۔ بارش کا پانی اس کی سوجی ہوئی زبان اور جلتی آنکھوں کو بھگور رہا تھا۔

جب بادلوں نے ذرا بکھر کر آسمان کا چہرہ دکھایا تو وائٹ کو ایک چمکتا ستارہ دوسروں سے الگ نظر آیا۔ اس کی نگاہ ستارے پر جم گئی۔ شاید یہ مجھے لینے آیا ہے۔ یہ مجھے میری منزل تک پہنچا دے گا۔ اس نے سوچا اور دعا کی "پلیز گاڈ....."

☆☆☆

بلینکن شپ نے "کے ویسٹ" سے ایندھن لیا اور دوبارہ "کے سال" کی جانب روانہ ہوا۔ اس بار اس کے ہمراہ ایک قبیلے کا بیڑ بھی تھا۔ یہ بیڑی کا بلی کا بیڑ تھا اور اسپاٹ لائٹ کی مدد سے تلاش میں آسانی فراہم کر سکتا تھا۔ وہ اندازے سے جانے کا واقعہ پر پہنچے تو کا پڑی روشنی طوفانی بارش، گرجتی موجوں اور تاراجی کو شکست دینے میں ناکام رہی۔ گرج چمک اضافی تھی اور نگاہ کی رسائی تقریباً صفر ہو گئی تھی۔ جیٹ نے کا پڑ کو اشارہ دیا اور وہ ناکام واپس چل پڑے۔ اب انہیں صبح آتا تھا۔ کیا اس وقت تک بہت دیر نہیں ہو جائے گی۔ لیفٹیننٹ نے سوچا۔

یہ سمندر میں وائٹ کے بدن میں جان نہیں تھی لیکن اس کی قوت ارادی اور جینے کی امنگ جواں تھی۔ آدھی رات گزری تو اس نے صبح تک کوشش جاری رکھنے کا فیصلہ کیا۔ وہ بار بار منہ کے لیے تیار نہیں تھا۔ مسلسل کوشاں تھا کہ اس کی ٹانگوں سے شارک ٹکرائی قبیلے طور پر اس نے ہلاکت خیز سمندری عفریت کو لگ بھری۔ اس کوشش میں اس کا ہاتھ جیٹ سے بہت گیا اور پانی اندر جانے لگا۔ اس نے جیٹ کو الگ کرنے کا فیصلہ کیا۔ جیٹ اس کے بدن سے الگ ہو کر گہرائی کی طرف جانے لگی۔ اس نے غوطہ لگا کر اسے تھانے کی کوشش کی..... اس کی آنکھوں نے ربر کو چھوا اور وہ لائف ویسٹ کے ساتھ دوبارہ سطح آب پر آ گیا۔ نیم ناکارہ جیٹ اس کے ایک ہاتھ میں تھی۔ وائٹ نے گہرا سانس لے کر

چہرہ پانی میں ڈوب دیا۔ بازو پھیلا دیے اور خود کو آگے دھکیلا..... سر باہر نکال کر سانس باہر پھینکی..... گہری سانس لے کر دوبارہ سر پانی میں ڈال دیا۔

وائٹ "فلوٹ۔ اینڈرک" کی تکنیک استعمال کر رہا تھا۔ اس طرح وہ ایک گھنٹا اور نکال سکتا تھا۔

جب اسے کچھ اطمینان ہوا تو اس نے جیٹ میں پھر ہوا بھری اور اس کے اوپر لیٹ گیا۔ اس نے لہروں کا جائزہ لیتے ہوئے آگے کی جانب سرفٹنگ شروع کر دی۔ اصل خطرہ شارک کا تھا۔

☆☆☆

افق پر آفتاب نے کرنیں کھیریں تو امید کی مدھم کرن نے انگڑائی لی۔ وائٹ نے آنکھیں کھینچ کر آسمان کو دیکھا۔ تاہم اسے کوئی اثر کرافٹ دکھائی نہیں دیا۔ اس نے واپس سمندر کی جانب نگاہ کی تو اسے اپنے سانس لہروں کے



SOLE DISTRIBUTOR
of U. A. E

WELCOME BOOK SHOP

JASOOSI SUSPENSE PAKEEZA SARGUZASHT

P.O.Box 27869 Karama, Dubai Tel: 04-3961016
Fax: 04-3961015 Mobile: 050-6245817
E-mail: welbooks@emirates.net.ae

Best Export From, Pakistan

WELCOME BOOK PORT
Publisher, Exporter, Distributor

All kinds of Magazines, General Books
and Educational Books

Main Urdu Bazar, Karachi Pakistan
Tel: (92-21) 32633151, 32639581 Fax: (92-21) 32638086
Email: welbooks@hotmail.com
Website: www.welbooks.com

اوپر شارک کی پشت کا مخصوص کوہان نظر آیا۔ وہ چاقو کی مانند لہروں کو کاٹتا آرہا تھا۔ پھر اس کی بائیں مہنی سے شارک نکرائی۔ اس کی جج نکل گئی۔ وہ تپ کر ایک طرف ہٹا۔ اسی دوران دوسری شارک اس کے قریب سے گزری۔

وائٹ شارکوں کے نرٹے میں آچکا تھا۔ اس نے پہلو بدلا اور پیٹ کے بل ہو گیا۔ معانی کی نیلی جادر میں سے اس نے بل شارک کو نمودار ہوتے دیکھا جو سیدھی اس کی جانب آرہی تھی۔ معانی نے غوطہ لگایا اور نیچے کی جانب سے وائٹ کی ٹانگوں پر حملہ کیا۔ وائٹ نے ٹیک ٹانگ اوپر اٹھائی اور دوسری ٹانگ کی ایڑی شارک کی دونوں آنکھوں کے درمیان جھپے پر ماری۔ شارک پیچھے ہٹی اور 20 فٹ کے دائرے میں اس کے گرد چکر کاٹنے لگی۔

دو مزید شارک اس کی طرف آئیں تاہم وائٹ کی ٹانگوں کی جونی حرکت کی وجہ سے انہوں نے قریب آنے سے گریز کیا۔

وائٹ کے لیے نہایت حوصلہ شکن صورت حال تھی۔ طویل اور ناقابل یقین جدوجہد کے بعد بھی وہ قاتل شارکوں کے غول میں پھنس گیا تھا۔ اگلی بار کا حملہ بڑا رواں تھا۔ وائٹ کی لائٹ اس کی تنہائی کو کس کرتی ہوئی کوہان سے نکرائی اور وہ اس مرتبہ بھی بچ گیا۔ لیکن اگلا منٹ بھیا نک تھا اسے ”ماکو شارک“ کی چمکتی ہوئی نیلی دم نظر آئی۔ اس کی رفتار 90 میل فی گھنٹا ہوتی ہے۔

شارک گویا سمندر کو پھاڑتی ہوئی نکلی تھی۔ اس کی سرور اور بے حرکت آنکھیں وائٹ کی آنکھوں میں گڑی ہوئی تھیں۔ حیرت انگیز طور پر جس سرعت سے نمودار ہوئی تھی اسی برق رفتاری سے وہ غائب ہو گئی۔

وائٹ کی ہمت جواب دے رہی تھی۔ آبی شکاریوں نے اس کی کمزوری کو سمجھ لیا تھا، اس کے جسم میں ایک کرٹ لگنے کی دیرھی اور پھر ان خون آشام بلاؤں کو روکنا ممکن نہیں تھا۔ بھی دور سے اسے انٹر کرافٹ کی آواز سنائی دی۔ وہ چونک پڑا۔ جیکٹ غائب تھی۔ وائٹ نے ادھر ادھر دیکھا۔ پھر جیکٹ طیارے کو دیکھا۔ تاہم جیکٹ پھر نظر سے اوجھل ہو گیا۔ اگلے ہی منٹ وہ پھر نمودار ہوا۔ وہ آگے پیچھے ہو کر وائٹ کو ڈھونڈ رہا تھا۔ اسی وقت وائٹ کی نظر کچھ دوری پر بہتی جیکٹ پر پڑی۔ اس نے تاریخی رنگ کی جیکٹ کو پھر پالیا تھا۔ جب کوسٹ گارڈ جیکٹ نصف میل کے فاصلہ پر نظر آیا تو اس نے دیوانہ وار جیکٹ کو لہرا کر شروع کیا۔ کچھ دیر بعد ہی

جیٹ اس کے سر پر تھا۔

وائٹ نے اپنا نصف کے قریب جسم پانی سے اوپر کر لیا۔ ”وہ آخر مجھے کیوں نہیں دیکھ پارہے ہیں۔“ وہ چنبرہ جہاز میں ”بلینکن شپ“ پیچھے دیکھ رہا تھا۔ اسے امید تھی کہ وہ وائٹ کے جہاز کے ملے کو پالے گا۔ اچانک اسے لگا کہ کوئی انسان نظر آیا ہے جو کوئی چیز لہرا رہا ہے۔

اس نے فوراً کمپیوٹر پر ہاتھ مارا اور پوزیشن محفوظ کی۔ جیٹ آگے نکل گیا تھا۔ ”وہ زندہ ہے۔“ اس نے کوسٹ گارڈ کو ریڈیو پر بتایا۔ ”جیکٹ پارک“ سے بارہ منٹ کے فاصلے پر۔۔۔۔۔ کوپالٹ نے وائٹ کے عقب میں شارک کو بھی دیکھ لیا تھا۔ ”جلدی کرو۔“ وہ چلا یا۔ ”شارک اس کے پیچھے ہے۔“ اس نے دھوئیں کا گولا فائر کیا۔ اور ایک کنٹرولر سمندر میں گرا دیا۔

وائٹ کنٹرول کی جانب تیرتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ انہوں نے لائف رافٹ کیوں نہیں بھیجی؟ جلد ہی اسے جواب مل گیا۔

ایک چمکتی سفید بوٹ پانی کو چیرتی ہوئی نمودار ہوئی۔ پھر سیدھی کرائی گئی اور وائٹ نے اسے تمام لیا۔ لیکن وہ اوپر چڑھنے کے قابل نہیں تھا۔

”ہے۔۔۔۔۔ جیکٹ پیچھے دو۔۔۔۔۔“ کسی نے کہا۔ وائٹ ریٹنگ تک پہنچ کر بوٹ میں جا گرا۔ وہ شیم بے ہوشی کی کیفیت میں تھا۔ جدوجہد ختم ہوتے ہی اس کے حواس ساتھ چھوڑنے لگے تھے۔ آخری کام اس نے جو کیا وہ بوٹ کے ڈیک کو چومنا تھا۔

صبح کے 9 بج چکے تھے۔ وہ پندرہ گھنٹے سے زیادہ تیرتا رہا تھا۔ اوپر جیٹ فضا میں میڈلا رہا تھا۔ کوپالٹ نے اپنے کمانڈر کی پشت پر ہاتھ مارا اور بلینکن کن شپ کے وائٹ نکل آئے۔

اگلے روز وائٹ ”کی ویسٹ“ اسپتال میں تھا۔ اس کے والدین پہنچ چکے تھے۔ ٹریٹمنٹ گھنٹے سے اس کے پاس تھی۔

”مجھے یقین نہیں آ رہا کہ میں زندہ ہوں۔“ وہ بار بار یہی بات کہہ رہا تھا۔ پھر وہ ہینڈ کی آغوش میں چلا گیا۔ ٹریٹمنٹ اس کا ہاتھ تھامے بیٹھی تھی۔ کانسٹیبل پر والٹ وائٹ کی جیکٹ پڑی تھی جسے اس نے بوٹ پر چڑھتے وقت پیچھنے سے انکار کر دیا تھا۔



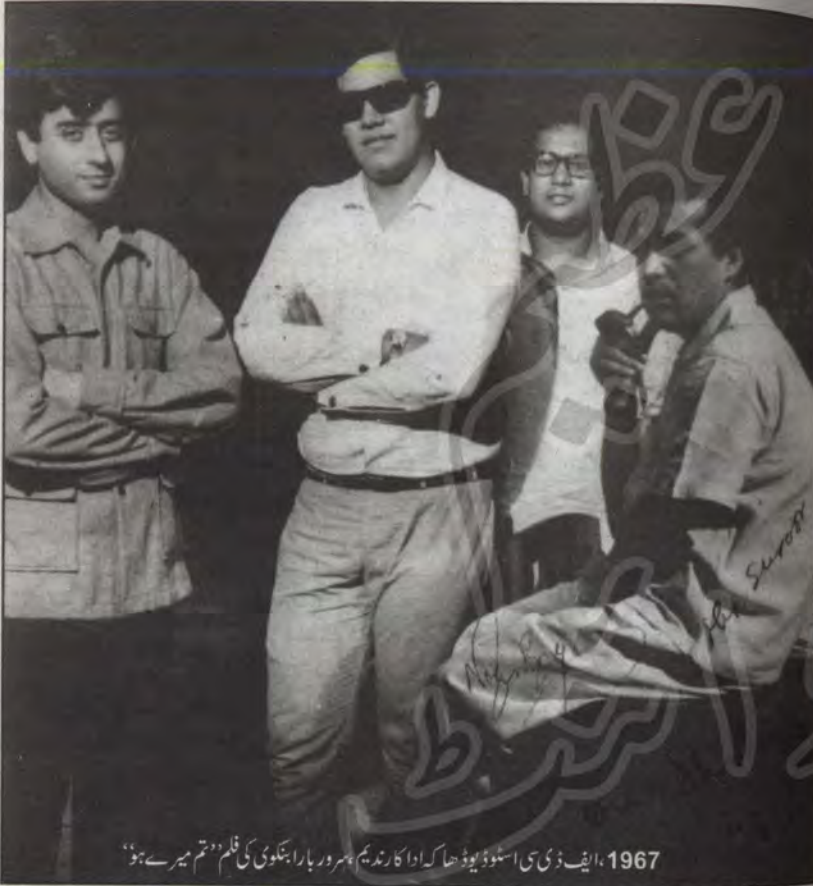
اجنبی سی منزلیں اور رفتاں کی یاد
تنہائیوں کا زہر ہے اور ہم ہیں دوستو!
آنکھوں میں اڑ رہی ہے لٹی محفلوں کی دھول
عبرت سرائے دہر ہے اور ہم ہیں دوستو!

ایسے ناد روزگار خال خال ہی نظر آتے ہیں۔ جو نصف صدی سے علم و ادب، صحافت و فلم کے میدان میں سرگرم عمل ہوں اور اپنے روزاؤل کی طرح خازنہ دم بھی۔ ان کے ذہن رسا کی پرواز میں کوئی کمی واقع ہو، نہ ان کا قلم کبھی تھکن کا شکار نظر آئے۔ آفاقی صاحب ہمارے ایسے ہی جوان فکر و بلند حوصلہ بزرگ ہیں۔ وہ جس شعبے سے بھی وابستہ رہے، اپنی نمایاں حیثیت کی نشان اس کی پیشانی پر ثبت کر دے۔ مختلف شعبہ ہائے زندگی سے وابستگی کے دوران میں ادیبوں اپنے عہد کی ہر قابل ذکر شخصیت سے ملنے اور اس کے بارے میں آگاہی کا موقع بھی ملا۔ دید و شنید اور میل ملاقات کا یہ سلسلہ خاصا طولانی اور بہت زیادہ قابل رشک ہے۔ آئیے ہم بھی ان کے وسیلے سے اپنے زمانے کی نامور شخصیات سے ملاقات کریں اور اس عہد کا نظارہ کریں جو آج خواب معلوم ہوتا ہے۔

ادب و صحافت سے قلمی دنیا تک دراز ایک داستاں دردِ استاں سرگزشت

21775

وہ پیار سے بابو صادق کہلاتے تھے۔ جب ہمارا قلمی صحافت اور قلمی دنیا سے تعلق ہوا تو لاہور کے ہفت روزہ ”نور“ میں پریس کمیٹی جابا ہوں چند فلمیں خریدی ہیں۔ بابو صادق کو پکڑ کر ساتھ لے جاؤں گا تو اچھا سودا ہو جائے گا۔“



1967ء، ایف ڈی سی اسٹوڈیوڈھا کا اداکار ندیم ہرور بارانکوی کی فلم ”تم میرے ہو“

میں ان کا دل نہیں لگا۔ فلموں میں دلچسپی رکھنے والے اور مصنف کا دل ایسے کاموں میں بھلا کب لگ سکتا تھا۔ آخر دل نہ لگا تو تین سال بعد واپس لاہور آ گئے۔ لاہور میں انہوں نے اے آر کاردار کے فلمی ادارے میں کام کرنا شروع کر دیا۔ اس کام میں ان کا دل لگتا تھا۔ لوگ جانے پہچانے اور دیکھے بھالے تھے اور پھر ان کا اپنا لاہور شہر تھا جس کے بغیر انہوں نے جنوبی افریقہ میں تین بے مزہ سال گزارے تھے۔

بابو صادق 1930ء میں لاہور واپس آئے تھے۔ کاردار صاحب نے اس وقت لاہور میں ایک فلم ساز کمپنی قائم کر لی تھی۔ کاردار صاحب کو آغاز ہی سے فلموں سے دیوانگی کی حد تک وابستگی تھی۔ انہوں نے فلم پروڈکشن کی

بابو صادق اس وقت تو عمر تھے۔ میٹرک پاس لو کے کی عمر ہی کیا ہوتی ہے۔ اس زمانے میں پندرہ سولہ سال کی عمر میں میٹرک پاس کر لیا جاتا تھا۔

جنوبی افریقہ جاتے ہوئے انہیں بہت سے لوگوں سے ملنے، بات چیت کرنے اور ان سے دنیا کے باہر میں چلنے کا موقع ملا جو آئندہ زندگی میں ان کے لیے بے حد مفید اور کارآمد ثابت ہوا، مشاہدہ وسیع ہوا، معلومات میں اضافہ ہوا۔ نتیجہ یہ کہ وہ گھر سے جانے کے غم کو بھول بیٹھے۔ بحری جہاز اور سمندری بی انہیں وہ تربیت دی جس کے باعث ایک دن وہ معروف مصنف اور ہدایت کار بن گئے۔ افریقا جاکر انہوں نے روزی کمانے کے لیے انگریزی کینی میں ٹیلی فون آپریٹر کی حیثیت سے تین سال کام کیا لیکن اس کام

تھی۔ فلم مکمل ہوئی تو کوئی تقسیم کار اس کو خریدنے کے لیے تیار نہ تھا۔ سب کہتے تھے کہ یہ ایک فلاب فلم ہے مگر فلم کی بے پناہ کامیابی نے سب کو حیران کر دیا۔ فلم کی کامیابی میں بہت بڑا حصہ نوشاد کا تھا جس کی موسیقی نے سارے ہندوستان پر جادو کر دیا تھا۔ یہ گانے تو شاید آپ کو آج بھی یاد ہوں گے۔

ساون کے دادلو
ان سے یہ جا بگو
تقدیر میں یہی تھا
ساجن میرے نہ رو۔ ساون کے دادلو

مل کے بچھڑ گئیں انکھیاں
ہائے رام مل کے بچھڑ گئیں انکھیاں

انکھیاں ملا کے
جیا دھڑکا کے
چلے نہیں جانا

اے آر کاردار کو ایم صادق اپنا استاد اور محسن تسلیم کرتے تھے۔ اس زمانے میں لاہور فن کاروں کا مرکز تھا۔ یہ غالباً 1930ء کی دہائی کا زمانہ تھا جب لاہور میں فن کاروں کے ایک گروپ نے وحوم مجادی تھی۔ اس گروپ میں اداکار ندیر، لالہ یعقوب، ہیرا لعل، ایم اساعیل، ماسٹر غلام قادر اور لالہ یعقوب کی نیگم خورشید بانو بھی شامل تھیں۔ ان کے علاوہ بی این بانی، فضل شاہ، ماسٹر غلام قادر بھی اس کا حصہ تھے۔ اس گروپ کے روح رواں اے آر کاردار تھے جن کا پورا نام میاں عبدالرشید کاردار تھا مگر فلموں میں وہ اے آر کاردار کے نام سے بلند یوں پر پہنچے تھے۔ ان فن کاروں کے علاوہ ایم صادق، بے کے نندیا بھی شامل تھے۔ ان سرپرستوں نے جو جوانوں کے شوق اور جذبے نے فلمی دنیا میں بہت گہرا اثر چھوڑا اور ابھی نے نام پیدا کیا۔

ایم صادق لاہور کے بھائی دروازے میں پیدا ہوئے تھے۔ وہ بہت اچھے اسکرپٹ رائٹر تھے۔ بعد میں فلم ساز اور ہدایت کاری کی حیثیت سے بھی بہت نام کمایا۔ لاہور سے 1927ء میں میٹرک کرنے کے بعد انہیں خدا جانے کیا سوچھی کہ لاہور سے اٹھے اور جنوبی افریقا چلے گئے۔ اس زمانے میں بحری سفر کا رواج تھا جو بہت طویل وقت لیتا تھا لیکن سمندر کی تازہ اور میٹھی ہوئی ہوا اور مختلف قسم اور مختلف ملکوں کے مسافروں سے مل کر بہت اچھا وقت گزر جاتا تھا۔

ہم کہتے تھے کہ شاید بابو صادق فلموں کے سوسے کراتے ہیں۔ رفتہ رفتہ معلوم ہوا کہ بابو صادق دراصل ایک فلم ڈائریکٹر ہیں۔ فلمی دنیا میں ہدایت کاری کی حیثیت سے وہ ایم صادق کے نام سے مشہور تھے۔ دراصل وہ اے آر کاردار کے اسٹنٹ تھے اور اسٹنٹ بھی بہت پرانے۔ جب ان کے بارے میں معلوم ہوا تو ہم نے ان کی فلمیں بھی دیکھیں جو بہت کامیاب تھیں۔ انہوں نے چند یادگار فلمیں بھی بنائی تھیں۔ مثلاً وہ ”فلم ”نستے“ کے شریک ہدایت کار تھے جو بہت کامیاب اور دلچسپ فلم تھی۔ وہ رومانی، نغماتی، ڈرامائی ہر قسم کی فلمیں بناتے تھے اور کامیابی ان کے قدم چومتی تھی۔ شاید آپ کو یاد نہ ہوگا کہ اپنے زمانے کی سپر ہٹ فلم ”رتن“ کے ہدایت کار بھی ایم صادق ہی تھے۔ نوشاد اس فلم کے موسیقار تھے۔

رتن کی خوبی یہ تھی کہ اس کے بھی گانے بہت ہوئے تھے اور اس فلم نے ایم صادق اور نوشاد کے لیے دولت اور شہرت کے دروازے کھول دیئے تھے۔ یہ ایک ڈرامائی کہانی تھی۔ فلم ”رتن“ ایم صادق نے اپنے محسن اور استاد اے آر کاردار کی منظوری حاصل کرنے کے بعد بنائی تھی۔ وہ مصنف بھی تھے اس لیے ان کی فلموں میں گہرائی اور حقیقت نظر آتی ہے۔ رتن نے مقبولیت کے جو ریکارڈ قائم کیے تھے وہ سالہا سال تک کوئی اور فلم نہیں توڑ سکا۔ اپنے شاگرد کی اس کامیابی پر اے آر کاردار بھی خوش اور فخر سے بھوئے نہیں ساتے تھے۔ جتنی دیوان اس کے فلم ساز تھے نوشاد بھی اس زمانے میں کاردار فلمز کے ملازم تھے اور ”رتن“ کی موسیقی ترتیب دینے کی بھی انہوں نے کاردار صاحب سے اجازت لی تھی۔

اس فلم کی کہانی ایک نوجوان لڑکے اور ایک نوجوان لڑکی کے گرد گھومتی تھی۔ ہیرو کا نام گوڈنوارو ہیروئن کا گوری تھا۔ فلم کے ہیرو کرن دیوان گوڈنوارو الہ میں پیدا ہوئے تھے۔ بعد میں انہوں نے صحافی کی حیثیت سے لاہور میں کچھ عرصے کام کیا۔ سورن لاسا فلم کی ہیروئن تھیں جس نے انہیں شہرت کی بلند یوں پر پہنچا دیا تھا۔ فلم کا مرکز خیال محبت کے گرد گھومتا تھا جو عشق کی حیثیت اختیار کر چکا تھا۔ برصغیر کی فلموں کے رواج کے مطابق گوڈنوارو اپنی محبت کو حاصل کرنے میں ناکام رہا اور گوری کی شادی زبردستی کسی اور سے کر دی گئی۔

فلم رتن اس زمانے میں صرف ستر ہزار روپے کی لاگت سے بنائی گئی تھی جو کہ اس زمانے میں بہت بڑی رقم



پہلی فلم ”بہار“ تھی۔ اس کے بعد انہوں نے ”چون“ کی ہدایت کاری کے فرائض سرانجام دیے۔ اسی سال 1944ء میں بابو صادق نے اپنی ذاتی فلم رتن، بنانے کی اجازت حاصل کی جو برصغیر کی مقبول ترین فلموں میں شمار کی جاتی ہے۔ اس کے بارے میں پہلے بتا جا چکا ہے۔ لیکن قسمت ان کے ساتھ ایک اور ٹیکل کھیلنا چاہتی تھی۔ جب آ کر کاردار نے فلم ”سیاں“ بنانے ارادہ کیا تو اس فلم کے حوالے سے میاں کاردار اور بابو صادق میں اختلاف رائے پیدا ہو گیا۔ یہ اختلاف اتنا بڑا گیا کہ سولہ سال کے طویل ساتھ کے بعد بابو صادق میاں کاردار سے علیحدہ ہو گئے۔ بابو صادق کو اپنے ساتھی کی کینہی اور ساتھ چھوڑنے کا بہت حد مرہ تھا۔

میاں کاردار سے علیحدہ ہونے کے بعد انہوں نے پہلی فلم جگ جی ڈائریکٹ کی۔ انہوں نے ملکہ پھرراج کی فلم ڈاک بنگلہ بھی ڈائریکٹ کی جو ایک کامیاب فلم تھی اس کے بعد بابو صادق نے کئی فلمیں پیش کیں جن میں ”کاجل“ چار دن شامل ہیں۔

آزادانہ طور پر فلمیں بنانے کے بعد بابو صادق میں اعتماد آ گیا اور انہوں نے 1949ء میں اپنی فلم ساز کمپنی بنائی۔ اس کمپنی کے لیے انہوں نے بہت اچھی اور کامیاب فلمیں بنائیں۔ ان میں سبق، سیاں، شباب، ماہ خانہ، چھوٹتر، دنیا رنگ ریلی، مانی باپ اور کھوٹا سکہ جیسی فلمیں بنائیں۔ جنہوں نے بابو صادق کو ایک مستند فلم ساز کی ہدایت کار اور مصنف کی حیثیت سے مشہور کر دیا۔

1950ء میں انہوں نے دیوان پچھڑ کے لیے فلم ”انمول رتن“ لکھی اور ڈائریکٹ کی۔ اس کے بعد کامیاب فلموں کا ایک اور سلسلہ شروع ہو گیا۔ قسمت ان پر مہربان تھی۔ فلم بین ان کے نام سے بخوبی آشنا تھے۔ فلم سازوں کی کمی تھی نہ خود ذاتی فلم بنانے میں کوئی رکاوٹ، ان فلموں میں خزانہ، پردیس، انجمن، پونم، جوانی کی ہوا، جیسی کامیاب فلمیں بنا کر اپنے ذاتی فلم ساز ادارے کو بند کر دیا۔ اس کے بعد وہ صرف مصنف اور ہدایت کار کے طور پر فلمیں بناتے

اپنا کوٹ، پتلون، قمیص یہاں تک کہ بنیان تک دے دیا اور محض جالنگیہ پہنے ہوئے سڑکوں سے گزرتا ہوا اپنے گھر چلا گیا۔

ایک روز اس نے دیکھا کہ ایک غریب آدمی ذرا پتھر پر بیٹھا مارونیم بجا رہا ہے۔ اس کے سامنے ایک کپڑا بچھا ہوا ہے مگر کسی کو اس کا گناہ نہیں آتا اور کوئی اسے ایک پیسا تک نہیں دے رہا تھا۔ موتی لعل جیتی سوٹ کا خیال کیے بغیر فنٹ پتھر پر اس کی جگہ بیٹھ کر مارونیم بجاتا اور گاتا ہے۔ گانا سن کر درجنوں لوگ اکٹھے ہو جاتے ہیں۔ گانے کو پسند کرتے ہیں اور اس کے سامنے بھیجے ہوئے پٹے پر پیسوں اور نوٹوں کا ڈھیر لگ جاتا ہے۔ موتی لعل ساری رقم گانے والے کو دے کر چلا جاتا ہے۔

اس کے بددیانت رشتے دار جو اس کی دولت مندی سے جلتے ہیں عدالت میں درخواست دیتے ہیں کہ یہ شخص پاگل ہو چکا ہے لہذا اسے پاگل خانے میں داخل کیا جائے اور اس کی جائداد اور دولت ہر رشتے داروں میں تقسیم کر دی جائے۔ مقدمہ چلتا ہے تو اس کے مخالف اس کی ہمدردی اور رخصتی کے واقعات سن کر گواہ پیش کرتے ہیں جو یہ گواہی دیتے ہیں کہ اپنے پڑے دوسروں کو دے کر صرف جالنگیہ بن کر گھومتا ہے۔ سڑکوں پر گانے گا کر بیک بٹلنگا ہے، وغیرہ وغیرہ۔ آخر میں موتی لعل جیتی لعل انسان ثابت ہوتا ہے اور عدالت اس کی انسان دوستی کی تعریف کر کے اس کو بے قصور قرار دے کر اسے آزاد کر دیتی ہے اور اس کے دعوے باز لاٹھی رشتے داروں کو جیل بھیج دیتی ہے۔ اس زمانے میں اس قسم کی اصلاحی اور با مقصد فلمیں بنا کر کتنی تھیں جو دلچسپ بھی ہوتی تھیں اور فلم بین کو سوچنے پر مجبور کر دیتی تھیں۔

بابو صادق نے محض کاردار ہی کی فلموں کی کہانیاں نہیں لکھیں بلکہ دوسرے ہدایت کاروں کی فلموں کی کہانیاں اور اسکرپٹ بھی لکھے۔ کیدار شرما جو بذات خود بہت اچھے مصنف اور ہدایت کار تھے ان کی فلم ”نئی دنیا“ کے مکالمے لکھے۔

1943ء میں کاردار نے اپنا ذاتی فلم ساز ادارہ کاردار پروڈکشنز بمبئی میں قائم کیا تو انہوں نے تمام ذمے داریاں اپنے دست راست اور قابل اعتماد معاون بابو صادق کو سونپ دیں۔ کاردار نے جب فلم ”نستے“ بنائی تو نہ صرف بابو صادق اس کے مصنف تھے بلکہ وہ کاردار کے شریک ہدایت کار بھی تھے۔ مکمل ہدایت کار کے طور پر ان کی

دیکھ بھال کی ذمہ داری ان کے سپرد کر دی تھی۔ یہ کام زیادہ عرصے تک نہ چل سکا کیونکہ کاردار صاحب نے لاہور سے کلکتہ میں جا کر کام کرنے کا ارادہ کر لیا تھا۔ ان دنوں فلمیں لاہور میں بنی تو تھیں مگر ان کے لیے سرمایہ کلکتہ کے سیٹھ ہی فراہم کرتے تھے۔ کاردار صاحب بوقت فلم بنانا چاہتے تھے جن کے لیے کلکتہ میں سہولتیں موجود تھیں۔ لاہور میں انہوں نے خاموش فلمیں بھی بنائی تھیں۔ کتنی بد قسمتی کی بات ہے کہ انڈیا والوں نے آج اے آر کاردار کو فراموش کر دیا ہے اور ابتدائی فلمیں بنانے والوں میں بھی ان کا تذکرہ نہیں کیا جاتا۔ لاہور اور پاکستان والے انہیں ویسے ہی بھلا چکے ہیں کیونکہ انہوں نے بمبئی میں بسرا کر لیا تھا۔ کاردار صاحب بابو صادق پر بہت بھروسہ کرتے تھے بلکہ یہ ان کے دست راست ہی تھے۔ 1935ء میں کاردار صاحب نے اپنی سپر ہٹ اور بے پناہ کامیاب فلم ”باغی سپاہی“ بنائی تھی جس نے پورے برصغیر میں ایک نیا جوش اور ولولہ پیدا کر دیا تھا۔ جیسا کہ بیان کیا گیا بابو صادق ایک باصلاحیت مصنف بھی تھے۔ کاردار صاحب کے ساتھ رہ کر انہوں نے فلموں کی کہانیاں، اسکرین پلے اور مکالمے لکھنے کا ہنر سیکھا جس کا نتیجہ ”باغی سپاہی“ کی صورت میں سامنے تھا۔ انہوں نے مصنف کی حیثیت سے ملاپ اور مندر کی کہانیاں بھی لکھیں جن کے ہدایت کار کاردار صاحب تھے۔ کاردار صاحب نے کلکتہ سے بمبئی جا کر فلمیں بنانے کا ارادہ کیا تو بابو صادق بھی ان کے ”ضروری سامان“ میں شامل تھے۔

بمبئی میں کاردار صاحب بحیثیت ہدایت کار ریجنٹ مووی ٹون سے وابستہ تھے جو اس وقت ایک بہت بڑا فلم ساز ادارہ تھا۔ اس کمپنی کے لیے کاردار صاحب نے جن فلموں میں ہدایت کاری کی تھی ان میں شوکر، ہولی اور پاگل جیسی کامیاب اور مقبول فلمیں بھی شامل تھیں۔ پاگل ہم نے بھی بمبئی میں دیکھی تھی۔ یہ بڑی با مقصد اور دلچسپ فلم تھی۔ کہانی کا موضوع یہ تھا کہ ایک دولت مند شخص (اس زمانے کا سپر اسٹار موتی لعل) غریبوں کا بہت ہمدرد ہے۔ ان کی حالت زار دیکھ کر وہ بے چین ہو جاتا تھا۔ غریب پروری میں وہ عجیب و غریب حرکتیں کرتا تھا۔ مثلاً ایک روز جاڑے کے دن تھے، بارش ہو رہی تھی، ایک شخص برائے نام لباس پہنے سردی میں ٹھٹھرتا جا رہا ہے، موتی لعل اپنا جیتی اور کوٹ اتار کر اس کو دے دیتا ہے اور خود بھیٹکا ہوا گھرنچ جاتا ہے۔ ایک بار تو اس نے کپڑوں سے تقریباً محروم ایک شخص کو

رہے۔ بہونیم، نور بہاں اور ساجل اسی دور کی فلمیں ہیں۔ بابو صادق کی کامیابی کا راز یہ تھا کہ وہ ہمیشہ اپنے استاد کی تربیت کے مطابق فلمیں بناتے رہے۔ وہ کلکتہ اور بمبئی کے دوسرے ہدایت کاروں سے بھی متاثر تھے مگر میاں کاردار ہی کے نقش قدم پر چلتے تھے۔ انہوں نے فلموں کے لیے جو کہانیاں لکھیں ان میں سوشل مسائل کے علاوہ نظام حکومت سے عوام کی باپوسی کا عنصر بھی نمایاں رہا۔ ہدایت کار کی حیثیت سے وہ ایک مکمل ٹیکنک کار تھے۔ طبقاتی فرق اور امیر غریب کا فرق ان کی فلموں کی پہچان تھا۔ ان کی فلموں میں تہذیب، شائستگی نمایاں تھی۔ ان کا خیال بہت بلند تھا۔ مشاہدہ بھی گہرا تھا جو ایک ہدایت کار کی کامیابی کا راز ہوتا ہے۔ انہیں موسیقی اور عکاسی کا بھی شعور تھا۔ وہ حقیقت پسندی پر یقین رکھتے تھے اور روشنیوں اور اندھیروں کے استرجاع سے اپنی فلموں میں اک خوبصورت رومانی اور حقیقی ماحول پیدا کرتے تھے۔

جس فلم پر بابو صادق کو اپنے استاد مکرم اور محسن سے اختلاف ہوا اور جو بعد میں سولہ سال کے طویل عرصے بعد علیحدگی کا سبب بنا دراصل وہ فلم ”سیاں“ تھی۔ بابو صادق اس وقت کامیابیوں اور کامرائیوں کے جھولے پر سوار تھے۔ ان میں خود اعتمادی بھی پیدا ہو چکی تھی۔ ”سیاں“ کی کہانی اور موضوع بابو صادق کی دوسری فلموں سے قدرے



کی شوٹنگ کا آغاز کیا۔ لاہور کے فلم ساز، ہدایت کار اور فلمی دنیا سے تعلق رکھنے والے ان کی ہدایت کاری کے انداز کو دیکھنے کے لیے اکثر ان کے سیٹ پر موجود ہوتے تھے، بد قسمتی سے ہمیں یہ شرف حاصل نہ ہوا۔ کاجس کی وجہ یہ تھی کہ 1970ء میں ہم دو فلموں کے اسکرپٹ لکھنے میں مصروف تھے۔ دوستی اور میرے ہم سفر۔ اس کے بعد ہم یونٹ کے ساتھ یورپ چلے گئے۔ واپس آئے تو خبر ملی کہ ہارٹ فیل ہو جانے کے باعث بابو صادق کا انتقال ہو گیا اور وہ اپنی ہی مٹی میں دفن کیے گئے۔

پہنچی وہیں یہ خاک جہاں کا خیر تھا
اس شعر کو غلط معنی میں نہ لیں۔ مطلب یہ ہے کہ وہ بالآخر اپنے وطن کی مٹی میں دفن ہویں۔

لاہور ان کا امن پسند شہر تھا۔ دنیا بھر کی خاک چھاننے کے بعد لاہور کی مٹی بالآخر انہیں پہنچ کر واپس لاہور لے آئی۔ ان کا انتقال لاہور میں 6 ستمبر 1971ء کو ہوا۔ اس کے بعد مسئلہ یہ درپیش تھا کہ ان کی نامکمل فلم کو مکمل کس ڈائریکٹر سے کرایا جائے۔ قرعہ قائل اس وقت کے نامور ہدایت کار حسن طارق کے نام نکلا۔ طارق صاحب کے لیے یہ ایک فخر کا مقام بھی تھا اور پریشانی کا سبب بھی۔ انہیں کچھ معلوم نہیں تھا کہ مصنف اور ہدایت کار کی حیثیت سے بابو

غلام نہ ہوگا کہ استاد نے انہیں جو کچھ سکھایا انہوں نے اس سے بھی زیادہ سکھا اور ان کی فلمیں ایک تربیت کی حیثیت رکھتی ہیں جن سے فلم کی ہدایت کاری کرنے والوں کو بہت کچھ سکھانا چاہیے۔

1970ء میں اچانک غلغلہ مچ گیا کہ بابو صادق انڈیا سے واپس لاہور آ رہے ہیں۔ لاہور جو کہ ان کی جنم بھومی تھا جہاں انہوں نے بچپن اور لڑکپن گزارا تھا، جہاں کے گلی کو سچے وہ کبھی فراموش نہ کر سکے تھے۔

لاہور میں انہوں نے صادق آرٹ پروڈکشنز کے نام سے اپنا ذاتی فلم ساز ادارہ قائم کیا اور پاکستان میں اپنی پہلی فلم ”بہار پھول برسائے“ کا آغاز کیا۔ اسی زمانے میں ہماری جی ٹی ان سے ملاقات ہوئی۔ وہ بھاری بھر کم جسم اور خفیت چہرے کے مالک تھے۔ ان سے بات کر کے محسوس نہیں ہوتا تھا کہ اس شخص نے برصغیر کی فلمی دنیا میں کیسے کیسے کارنامے سرانجام دیے ہیں۔ اس وقت ہم بھی فلمی مصروفیات کی وجہ سے ان سے زیادہ ملاقاتیں نہ کر سکے لیکن لاہور میں ان کے پرانے دوست احباب اور مداح ان کی آمد پر بے حد خوش تھے۔ ”بہاروں پھول برسائے“ ایک معاشرتی لیکن بنیادی طور پر رومانی فلم تھی جیسا کہ اس کے نام ہی سے ظاہر ہوتا ہے۔ بابو صادق نے بڑی دلچسپی سے فلم

والوں کی شہسواری قابل تعریف تھی۔

بالآخر باب کے ہر کارے اس کو گھیر لیتے ہیں۔ باپ بھی پہنچ جاتا ہے۔ گستاخ اور نافرمان بیٹے کو برا بھلا کہتا ہے کہ لڑکی کو فوراً میرے حوالے کر دو۔ لیکن بیٹا انکار کر دیتا ہے۔ گولیوں کا تبادلہ شروع ہو جاتا ہے۔ جن کی نشاندہ بازی سے سردار کے اہلکار ہلاک اور زخمی ہوتے ہیں۔ جن کو بھی گولیاں لگتی ہیں۔ برقی گولیوں کی بارش میں جن پہاڑی کی اوٹ سے فائرنگ کرتا ہوا ہر نکل آتا ہے۔ اس کو بے شمار گولیاں لگتی ہیں۔ ہیروئن، بے اختیار اس کے پیچھے جاتی ہے اور گولیوں کا نشانہ بن جاتی ہے۔ فائرنگ بند ہو جاتی ہے۔ پہاڑوں کے دامن میں جن اور ہیروئن زخمی حالت میں زمین پر سرسک رہے ہیں۔ اس موقع پر ہیروئن کو احساس ہوتا ہے کہ وہ دراصل جن سے محبت کرتی ہے۔ یہ دونوں ایک دوسرے سے کافی فاصلے پر ہیں مگر گھٹنٹے ہوئے ایک دوسرے کی جانب بڑھتے ہیں۔ یہ بہت پر اثر اور خوبصورت منظر تھا جو آج بھی آنکھوں میں محوم رہا ہے۔

بڑی کوشش اور جدوجہد کے بعد ہیرو اور ہیروئن ایک دوسرے کے نزدیک پہنچ جاتے ہیں اور ایک دوسرے کا ہاتھ تھام کر دم توڑ دیتے ہیں۔ جن کا باپ بڑا بھائی اور دوسرے مسلح افراد جب موقع پر پہنچتے ہیں تو دونوں محبت کرنے والے جان سے گزر چکے ہیں۔

فلم ”سیاں“ کی کہانی سے متاثر ہو کر انڈیا اور پاکستان میں اور بھی فلمیں بنائی گئیں مگر ”سیاں“ کے معیار کو نہ پہنچ سکیں۔ ہم نے لڑکپن میں یہ فلم دیکھی تھی اور چپ کر دیکھی تھی مگر آج تک اس کے مناظر آنکھوں کے سامنے گھومتے رہتے ہیں۔ فلم کی مکمل کہانی ہمیں یاد نہیں ہے لیکن پھر بھی یہ ہمارے دل اور ذہن سے نہیں نکل سکی۔

اداکار جن ہمارے محبوب ترین اداکار تھے مگر پھر جس طرح اچانک فلمی افق پر غوردار ہوئے تھے اسی طرح غائب ہو گئے۔ یہ فلم تو بے حد کامیاب ہوئی تھی۔ موسیقی بھی بہت اچھی تھی لیکن اس فلم نے بابو صادق اور ان کے گرو محمد اور مددگار رے آرکاردار کو ان سے دور کر دیا۔

بابو صادق اس کے بعد بھی فلمیں بناتے رہے جن میں سے بیشتر بہت کامیاب ثابت ہوئیں۔ اس حقیقت کو سب تسلیم کرتے ہیں کہ وہ ایک ماہر اسکرین پلے اور ڈائلاگ رائٹر اور بہت ہنرمند ہدایت کار تھے۔ تکنیک کے اعتبار سے ان کی فلمیں بے عیب ہوتی تھیں۔ یہ کہا جائے تو

مختلف تھا۔ وہ رومانی اور معاشرتی فلمیں بناتے تھے جن میں اصلاح کا پہلو نمایاں ہوتا تھا۔ ”سیاں“ ایک مختلف انداز کی فلم تھی۔ موضوع یہ تھا کہ دو بھائی ایک ہی لڑکی سے محبت کرتے ہیں جو غالباً کسی غریب رشتے دار کی بیٹی ہے۔ بڑا بھائی ایک شریف انش اور بہت بااخلاق اور شائستہ انسان ہے جبکہ چھوٹا بھائی شوخ و شریر، چلبلا، آزادی کا دلدادہ اور فلٹ قسم کا ہے۔ بڑے بھائی کا کردار اجیت نے بہت خوبصورتی سے نبھایا تھا۔ چھوٹے بھائی کا کردار جن کو سونپا گیا تھا۔ وہ اس زمانے میں زیادہ مقبول اور معروف اداکار نہیں تھا اور اس کی فلمیں زیادہ تعداد میں ریلیز نہیں ہوتی تھیں۔ ”سیاں“ میں قدرتی ادب سے ساختہ اداکاری نے اسے راتوں رات شہرت سے ہم کنار کر دیا لیکن المیہ یہ ہوا کہ جس طرح وہ ”سیاں“ کی وجہ سے عروج کو پہنچا تھا دیکھتے ہی دیکھتے فلمی دنیا سے غائب ہو گیا۔ شاید اس لیے کہ وہ اپنی زندگی کا بہترین کردار ادا کر چکا تھا۔

”سیاں“ میں بڑا بھائی شرمیلا ہے اور اپنی محبت کا اظہار کرنے کی اس میں جرأت نہ تھی لیکن چھوٹا بھائی منہ پھٹ تھا۔ لڑکی سے چھیڑ چھاڑ کرتا رہتا تھا جسے وہ پسند نہیں کرتی تھی۔ اس نے اپنے من مندر میں بڑے بھائی کی تصویر سچا رکھی تھی لیکن اس زمانے کے فلمی دستور کے مطابق اظہار نہیں کر سکتی تھی۔

باپ بڑے بیٹے کی شادی ہیروئن سے کرنا چاہتا تھا لیکن ضدی اور ہٹ دھرم چھوٹا بھائی رکاوٹ بن کر سامنے آ گیا اور باپ سے کہا کہ اس لڑکی کو میں پسند کرتا ہوں۔ اگر اس کی شادی ہوگی تو مجھے ہی سے ورنہ نہیں ہوگی۔ باپ بھی اکھڑا کہ بہت دھرم آدمی ہے۔ وہ بیٹے کو ڈانٹ دیتا ہے اور بڑے بیٹے سے ہیروئن کی شادی طے کر دیتا ہے جس روز ہیروئن ذہن بن کر شادی کے لیے تیار بیٹھی ہے جن پچھلے دروازے سے اس کے کمرے میں داخل ہو جاتا ہے اور اس کو کہتا ہے کہ میری زندگی میں تم کسی اور کی نہیں ہو سکتیں۔ ہیروئن کے سمجھانے کا اس پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ وہ زبردستی اس کو اٹھا کر گھوڑے پر بٹھا کر لے جاتا ہے۔ باپ کو غم ہوتا ہے تو وہ آگ بگولہ ہو جاتا ہے اور اپنے سب کارندوں کے ہمراہ تعاقب میں نکل جاتا ہے۔ جن ہیروئن کو کم سے کم وقت میں بہت دور لے جانا چاہتا ہے اور سر پٹ کھوڑا دوڑاتا ہوا جنگلوں میں پہاڑوں سے گزرتا ہے۔ یہ بہت خوبصورت مناظر تھے۔ خصوصاً جن، اس کے والد اور تعاقب کرنے

صادق نے فلم بندی کے بارے میں کیا سوچا تھا۔ بہر حال، پرچہ یادگار کہہ کر انہوں نے اس فلم کو مکمل کرنے کا بیڑا اٹھایا اور پایہ تکمیل تک پہنچایا۔ اس طرح لاہور کے بھائی دروازے سے شروع ہونے والا بابو صادق کا سفر لاہور ہی پہنچ کر ختم ہوا۔

پنجاب خصوصاً لاہور فلم سازوں، ہدایت کاروں، موسیقاروں اور اداکاروں کے علاوہ گلوکاروں کی نہایت زرخیز جگہ رہی ہے۔ انڈین فلموں کی تاریخ اٹھارہ دیکھیں تو لاہور کے ہندو اور مسلمان فن کاروں کی ایک طویل قطار نظر آتی ہے لیکن اب نہ جانے یہ زرخیز سرزمین بھڑکیوں ہو گئی۔ لاہور قیام پاکستان سے پہلے اور بعد میں بھی فلم سازی کا مرکز رہا ہے۔ بھارتی فلموں کی درآمد کے بعد پاکستان کی فلمی صنعت نے بہت تیزی سے ترقی کی یہاں تک کہ کم سرمائے اور لاگت کے باوجود پاکستانی فلمیں انڈین فلموں کے معیار سے کم نہ تھیں۔ ہر طرف فلمی گہما گہما تھی۔ ہزاروں افراد کے انکسوں اہل خاندان فلمی صنعت سے روزی حاصل کر رہے تھے۔ خوشحالی کا دور دورہ تھا، لاہور میں سات فلم اسٹوڈیو تھے جن میں ایورینو اسٹوڈیو اور شاہ نور اسٹوڈیو ممتاز تھے اور بھارتی فلم اسٹوڈیو سے کہیں زیادہ خوبصورت اور معروف تھے۔ جب فلموں کی تعداد میں اضافہ ہوا تو سنیما گھروں کی تعداد کم پڑ گئی۔ ہر شہر میں سیکڑوں معیاری سنیما گھر تعمیر ہو گئے جہاں ہر وقت فلم بینوں کا ہجوم رہتا تھا اور یہ بھی فلموں کی تعداد کے اعتبار سے کم پڑ گئے تھے، فلمی صنعت کے علاوہ ارد گرد بھی بہت رونمائی تھی۔

پرانے لاہور کے دو علاقے فن کار اور ہنرمند پیدا کرنے کے لیے مشہور ہیں۔ ایک بھائی دروازہ اور دوسرا موچی دروازہ۔ ان علاقوں نے بے شمار فلمی شخصیات، دانشوروں، مورخوں، مصوروں اور صحافیوں کو جنم دیا۔ فلمیں لاہور والوں کی مرغوب اور سستی ترین تفریح تھیں۔ لاہور پر صغیر کا ثقافتی مرکز تھا۔ لیکن اب یہ سب خوبیاں کہاں چلی گئیں؟ لاہور نے مایہ ناز فن کار، گلوکار، ہدایت کار، ادیب، مصنف اور شاعر پیدا کرنے کیوں بند کر دیے۔ ذرا سوچیے اور پرانے ماضی کو زندہ رکھنے کے لیے عملی اقدامات اٹھائیے۔ ورنہ آج کل تو قبول غالب یہ حال ہو گیا ہے کہ یا صبح دم جو دیکھتے آکر تو بزم میں نہ وہ سرور شوق نہ جوش خروش ہے داغ فراق رونق شب کی جلی ہوئی

اک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی خوش ہے پاکستان کی یاد رکھنے والی فلمیں لوگ بھول چکے ہیں۔ شاید ان لوگوں کو یاد ہوں جنہوں نے جوانی میں یہ فلمیں دیکھی ہوں۔ آئیے۔ آج آپ کو کراچی میں بننے والی ایک فلم کی داستان سناتے ہیں جو موضوع کے اعتبار سے انوکھی اور تحریر و پیشگی کے اعتبار سے قابل تعریف تھی۔ دراصل لاہور اس زمانے میں فلم کا سب سے بڑا مرکز تھا۔ کراچی کے جوش کار، فلم کار، شاعر لاہور آکر بس گئے انہوں نے بہت شہرت اور دولت پائی لیکن جو لوگ کراچی ہی کو لاہور جیسا فلمی مرکز بنانے کی خواہش میں اپنا شہر چھوڑ کر لاہور کی فلم فلم میں نہ آئے انہیں وہ شہرت نہ مل سکی جس کے وہ شمع معنوں میں حقدار تھے۔

ایسے ہی صاحب کمال لوگوں میں دانش دریدی بھی تھے۔ اول تو ان کا نام ہی کچھ نیا نیا اور انوکھا سا تھا دوسرے ”ویریڈی“ نے انہیں کھنے میں مزید دیر کر دی۔ مگر کراچی کی سرزمین کو نہ چھوڑنے والے تخلیق کاروں میں دانش دریدی ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے۔ ہم بھی جب کراچی جاتے ایسٹرن فلم اسٹوڈیو یا جائے خانوں اور فلمی دفتروں میں ان سے ملاقات ہو جاتی تھی۔ وہ ایک ہنس کھکھ، ملنسار اور انکسار سے بھر پور انسان تھے۔ صحافی بھی تھے اور فلمی جرائد میں وہ ”کلیئر آف فیر“ کے نام سے طنزیہ کالم لکھتے۔ تہ گمران کا پہلا اور آخری شوق یا جوش فلم تھا۔ وہ بہت اچھے اسکرپٹ رائٹر تھے۔ کالم بھی سادہ اور پراثر لکھتے تھے۔ انہوں نے کراچی میں قیام کے دوران میں بچپن کے قریب فلمیں لکھیں۔ ان میں سے دو فلمیں ان کی ذاتی بھی تھیں۔

اس وقت پرانی یادیں تازہ کرنے کے لیے ہم جس فلم کا تذکرہ کر رہے ہیں اس کا نام ”لاڈلا“ تھا۔ اس زمانے میں کچھ عجیب سا نام تھا مگر فلم دیکھنے کے بعد اس کی مقبولیت کا احساس ہوتا تھا۔ یہ فلم ایسٹرن کچنرز کے سینر کے نیچے بنائی گئی تھی۔ فلم کی کہانی، اسکرین پلے، مکالمے سب دانش دریدی نے لکھے تھے۔ وہ ان چند لکھنے والوں میں شامل تھے جنہیں اسکرین پلے لکھنے کا ڈھنگ آتا تھا۔

اس فلم میں مرکزی کردار شبنم اور وحید نے ادا کیے تھے۔ اس سے پہلے ان فن کاروں نے صرف دو فلموں میں کام کیا تھا لیکن یوں لگتا تھا جیسے فلموں کے لیے یہ نہایت موزوں جوڑی ہے۔ ان کی اداکاری میں بناوٹ نہیں حقیقت نظر آتی تھی۔ اس فلم میں گیارہ نغمات تھے جو سب

کے سب مقبول ہوئے۔ خصوصاً تنویر نقوی کی لکھی ہوئی اور رونائیلی کی آواز میں گائی ہوئی لوری نے بہت شہرت حاصل کی جو صبیحہ خانم پر فلما کی گئی تھی۔

یہ گیت ”موسو چا تھا پیار نہ کریں گے۔ اب نہ کسی پہ مرے گئے“ احمد رشدی اس کے گلوکار تھے۔ یہ شبنم اور وحید مراد پر فلما گیا تھا۔

میری فریادیں میرے مشکل کشا

ترے سوا ہے کون مرا۔

رونائیلی نے گایا تھا جبکہ

سجان اللہ یہ چہرہ

اس زلفوں کا پھرہ

رونائیلی کا گایا ہوا تھا احمد رشدی بھی اس دوگانے

میں شامل تھے۔ ایک اور گیت بہت پسند کیا گیا تھا۔

ساتھی رہے۔ تیری یادوں سے ہر دم کھلیں

میرے پتھوں کی کھلیاں

وحید اور شبنم پر فلم بند ہوا تھا۔ رونائیلی گلوکارہ تھیں۔

فلم کی کہانی بیان کرنے سے پہلے ہم دوسرے قصے

لے بیٹھے۔ دراصل وجہ یہ ہے کہ فلم سب لوگوں کی مشترکہ

کوشش کا نتیجہ ہوتی ہے مگر اداکار و ہدایت کار اور موسیقار

کے سوا کسی نام کو نمایاں نہیں کیا جاتا حالانکہ یہ ان کا حق ہے۔

اس فلم کے نغمات تنویر نقوی، صہبا اختر، کیفی رضوانی،

مسرور نور اور عبدالمنان نے لکھے تھے۔ ہدایت کار اے ایچ

مدنی تھے۔ عکاسی سلیم اللہ نے کی تھی۔

آئیے۔ اب چلے ہیں فلم کی کہانی کی طرف مگر اس

سے پہلے یہ بتانا ضروری ہے کہ جب ہم نے فلم

”سزا“ 1970ء میں شریعی کی تھی تو کیریکٹر ایکٹرز کے طور پر

سنو شمس کار اور صبیحہ خانم سے بات طے ہو چکی تھی لیکن ہوا یہ

کہ ہمارا رشتہ لگنے لگا مگر یہ دونوں کراچی سے واپس آنے کا

نام نہیں لے رہے تھے ہم نے فون پر بہت تقاضے کیے۔ سنو شمس

صاحب اپنی عادت کے مطابق کہہ دیتے تھے۔ مولانا بس ہم

دونوں آنے والے ہیں مگر یہ فلم آخری مراحل میں ہے، اسے

مکمل کرنا ضروری ہے۔ آخر کار ہم نے پریشانی میں درپن

صاحب اور تنویر بھائی کو ملیدہ کر کے ان سے بات کی۔

درپن صاحب بولے ”آفاقی صاحب، بھائی جان

بہت ناراض ہوں گے۔ میں کیسے ان کی جگہ کام کروں۔“

بھائی جان تنویر سلطانہ کا معاملہ یہ تھا کہ وہ اداکاری ترک

کر چکی تھیں۔ ہم نے بہت منت سماجت سے انہیں رضامند

ثانی (Tie)

کھیلوں کی اصطلاح، عام معنوں میں یہ لفظ میچ یا مقابلے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ دو ٹیموں کے میچ کو ٹائی کہتے ہیں۔ کرکٹ میں یہ لفظ خاص معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ اگر دونوں ٹیموں کی دونوں انگلڑاں مجموعہ برابر ہو تو میچ ٹائی کہلاتا ہے۔ کرکٹ کی تاریخ میں 1960-61ء آسٹریلیا اور غرب الہند کے درمیان بربین کا ٹیسٹ میچ ٹائی پر ختم ہوا۔ دونوں ٹیموں کا اسکور بالکل برابر (سات سو سیستیس رنز) تھا۔ ایک روزہ کرکٹ میچوں میں تو اس لفظ کا استعمال معمول بن گیا ہے۔

مرسلہ: نعمان شیخ، کمال پور

کیا اور ان ہی کے گھر سے سنو شمس صاحب کو فون کر کے بتایا کہ ”سزا“ کی شوٹنگ شروع ہو رہی ہے۔ آپ دونوں کے بعد درپن صاحب اور تنویر بھائی ہی موزوں ہیں مگر وہ آپ کا کردار قبول کرنے پر تیار نہیں ہیں۔ سنو شمس صاحب بولے۔ ”مولانا۔ یہ معمولی فلم نہیں لاڈلا ہے۔ ہم آج کل اپنے لاڈلے کر رہے ہیں۔“

ہم نے کہا۔ ”تو پھر درپن صاحب اور تنویر بھائی کو آپ خود کہہ دیں کہ وہ ہماری شوٹنگ کرا دیں ورنہ ہم ترین کے نیچے کو کر جان دے دیں گے۔“

وہ بولے ”مولانا۔ یہ بہت غلط طریقہ ہے فرین اکثر لیٹ ہو جاتی ہے۔ جان دینے کے اور بھی کئی معقول طریقے ہیں۔ میں آپ کو بتا دوں گا۔“

ہم نے کہا۔ ”پہلے تو آپ درپن صاحب سے بات کریں۔“ اور فون درپن صاحب کو کھتا دیا۔ یہ ایک وضدار خاندان تھا۔ بڑے چھوٹے کا لیا نکا کیا جاتا تھا۔ مختصر یہ کہ درپن صاحب نے ساری ذمہ داری ہم پر ڈال دی اور کہا کہ جب تک میں ہاں نہیں کروں گا یہ میرے گھر پر دھرتا دیے بیٹھے رہیں گے۔“

سنو شمس صاحب بولے ”فون آفاقی صاحب کو دو۔“ ہم نے فون پر بات کی تو بولے کہ مولانا آپ فلم ساز

ہیں یا غنڈے بد معاش، اگر میرے ”ہاں“ کہنے سے آپ کا مسئلہ حل ہوتا ہے تو سو بار ہاں۔ میرا خیال ہے کہ میرے بھائی کو مزید زیر بار نہ کریں اور دھرتا اپنے گھر جا کر دیں۔“ یہ واقعہ پہلے بھی بیان کر چکے ہیں مگر اس وقت اس کا تذکرہ برقی تھا اس لیے ”تکرار“ عرض کر دیا۔

لاڈلا دانش دیرو کی دوسری ذاتی فلم تھی۔ اس سے پہلے انہوں نے ایک فلم ”اور بھی تم ہیں“ بنائی تھی۔ یہ انتہائی معیاری فلم تھی جس کو صدر ایوب نے بھی دیکھا اور پسند کیا تھا۔ اس فلم پر دانش صاحب کو صدارتی ایوارڈ بھی دیا گیا تھا۔ اس کے بعد انہیں مغربی فن کار کو کی سے بھی نوازا گیا۔ (اس سے بڑی بد قسمتی اور کیا ہوگی کہ دانش دیروی نے وہ تنخواہ اپنے بیٹے ممتاز دانش جو آج کل ٹی وی کراچی میں انجینئر ہیں۔ ان کے بورڈ کی فیس جمع کرانے کے لیے اس گولڈ میڈل کو سٹار کے پاس بیٹھا تھا، مدیر سرگزشت) یہ مقام افسوس نہیں تو اور کیا ہے کہ ایسے دانش واد رہے بہا مصنف اور ہدایت کار کو آج کوئی یاد تک نہیں کرتا۔ مگر دانش صاحب اپنے حصے کا کام کر کے جا چکے ہیں۔ ان کے گنتی کے قدردان اس وقت بھی موجود ہیں اپنی ہی چوڑی تنہید سے شاید آپ آگے ہوں گے۔ آپ کے صبر کا مزید امتحان لینے کی بجائے اب فلم ”لاڈلا“ کا ذکر کرنے۔

لاڈلا کا موضوع اور پیش واپس لکھی تھی۔ مختصر خلاصہ یہ ہے کہ یہ ایک بیٹے اور اس کی دو ماؤں کی کہانی ہے۔ ایک سگی ماں جس نے اس کو جنم دیا مگر مجبوراً اسے چھوڑ کر ملک سے باہر چلی گئی۔ دوسری ماں وہ ہے جس نے اس بچے کو تمام تر مشکلات کے باوجود پال پوس کر جوان کیا اور اس پر اپنی جان نچھاور کر دی ہے۔ یہ کردار صبیحہ خانم نے بہت خوبصورتی سے نبھایا تھا۔ دوسری ماں کے کردار میں طلعت صدیقی جلوہ گر تھیں۔ وہ ایک دولت مند، خود غرض اور مغرور عورت ہیں حالانکہ صبیحہ خانم کی بہن ہیں۔ بیٹے کے گئے ماں باپ بیس سال بعد پاکستان آتے ہیں تو پالنے والی ماں بہت پریشان ہوتی ہے، وہ اپنی بہن اور بہنوں کو اپنے گھر کی جگہ کسی اور جگہ ٹھہراتی ہے۔ اس کی کوشش ہوتی ہے کہ بیٹا گئے ماں باپ کے سامنے نہ آئے ورنہ ان کی محبت تازہ ہو جائے گی۔ وہ گئے ماں باپ کے سامنے ان کے بیٹے کا ذکر تک نہیں کرتی لیکن تقدیر ایک روز بیٹے کو گئے ماں باپ کے سامنے لے آتی ہے۔ بیٹے کو یہ علم نہیں ہے کہ پالنے والی عورت اس کی حقیقی ماں نہیں ہے۔ پالنے والی ماں اپنی ہزار کوششوں کے

باوجود بیٹے کو اس کے حقیقی ماں باپ کی نظروں سے اوجھل نہیں رکھ سکتی۔ پالنے والی ماں کی حرکتوں کی بدولت بیٹے کا باپ مر جاتا ہے۔ بیٹا ایک دن اپنی حقیقی ماں کو شوہر کی قبر پر روتا اور فریاد کرتا ہوا دیکھتا ہے تو جان لیتا ہے کہ معاملہ کیا ہے اور اس کے حقیقی ماں باپ کون ہیں۔ وہ روتی ہوئی ماں کے پاس جا کر اسے ”ماں“ کہہ کر مخاطب کرتا ہے مگر وہ اس کو پہچاننے کے لیے تیار نہیں ہے۔ بیٹا خون کے رشتے کی وجہ سے مجبور ہے اور اپنی سگی ماں کو منہ کر اپنے ساتھ لے جاتا ہے۔ یہ غم پالنے والی ماں کو نیم پاگل کر دیتا ہے۔

فلم کا اختتام یہ ہے کہ ستوش کمار بیٹے اور سگی ماں کو لے کر طلعت صدیقی کے گھر جاتے ہیں اور سمجھاتے ہیں کہ انسان کو اتنا خود غرض نہیں ہونا چاہیے۔ وہ طلعت صدیقی کو سمجھاتا ہے کہ اگر تم حقیقت بیٹے کو بتا دیتیں اور سگی ماں کے آنے پر بیٹے سے اس کو محروم رکھنے کی کوشش نہ کریں تو یہ صورت حال پیدا نہیں ہوتی۔ دونوں بہنیں گئے مل کر روتی ہیں جبکہ بیٹا خوش ہے کہ اسے دو ماںیں مل گئی ہیں اور اب وہ ان دونوں کا لاڈلا ہے۔ اس طرح کافی اتار چڑھاؤ کے بعد کہانی انجام کو پہنچ جاتی ہے۔ درمیان میں بہت جذباتی، حقیقی اور خوبصورت مناظر بھی دیکھنے کو ملتے ہیں۔ پالنے والی ماں اور جنم دینے والی ماں کے مناظر بہت پراثر اور ڈرامائی ہیں۔ بعض جگہ تو دیکھنے والوں کی آنکھیں نم ہو جاتی ہیں کیونکہ دونوں ماںیں صرف محبت کی خاطر یہ سب کچھ کرتی ہیں۔ فلم کے مکالمے دل پر اثر کرنے والے اور بہت جذباتی لیکن حقیقت سے قریب ہیں۔ بلا وہ تحیر نیکل انداز پیدا کرنے سے گریز کیا گیا ہے۔ یہ فلم باکس آفس پہ بھی کامیاب رہی تھی۔

اس فلم میں رومانی کردار وحید مراد اور شبنم نے بہت خوبصورتی سے نبھائے تھے۔ موسیقی بہت اچھی تھی۔ وحید مراد کو ڈانس کرنے کے مواقع بھی ملے جن کے ساتھ انہوں نے پورا انصاف کیا۔ یہ وہ دور تھا جب ابھی انڈین فلموں میں بھی ہیرو کے رقص کارواج نہیں ہوا تھا۔ کئی مشہور ہیرو تو ایسے تھے کہ رقص کرتے ہی نہیں سکتے تھے۔ البتہ جیتندر ڈاس کر لیتے تھے مگر وحید مراد والی بات کہاں سے لاتے۔

جب فلم ”نیادور“ میں دلپ کمار نے دیہاتی رقص کیا تو فلم بین خوشی اور حیرت سے پاگل ہو گئے۔ اس کے بعد تو رفتہ رفتہ وہاں ہیرو کا ناچنا معمول بن گیا مگر وحید مراد جیسا کوئی ہیرو سانس نہیں آیا۔

فلم میں ”لاڈلا“ کا مرکزی کردار وحید مراد نے بہت خوبصورتی سے ادا کیا تھا۔ ایک مشکل اور نفسیاتی کردار تھا۔ مگر وحید مراد نے ہر منظر میں انصاف کیا تھا اور دو ماؤں میں بنے ہوئے بیٹے کا کردار حقیقت پسند انداز میں نبھایا تھا۔ اس فلم کی عکاسی نے فلم کی کشش اور تاثر میں اضافہ کر دیا تھا۔ افسوس کہ فلم کے کیرئیر میں محبوب علی جیسا عکاس لاہور نہ آیا ورنہ لاہور میں وہ بہت نام اور اونچا مقام پیدا کرتے۔ صبیحہ خانم، ستوش کمار، طلعت صدیقی اور وحید مراد ہی دراصل اس فلم کے مرکزی کردار تھے۔ انہوں نے اپنے اپنے کرداروں کے ساتھ پورا انصاف کیا تھا۔

لاڈلا، غالباً 1970-71ء میں نمائش کے لیے پیش کی گئی تھی۔ اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ کسی زمانے میں پاکستان میں کتنی معیاری اور با مقصد فلمیں بنائی جاتی تھیں۔ مصنف اور ہدایت کار نے نئے اور با مقصد موضوعات کی تلاش میں رہتے تھے اور پھر بہنوں اسکرپٹ پر بحث کرنے کے بعد فلم فیٹ پر جاتی تھی۔

”لاڈلا“ کے تذکرے میں ہم نے اپنی فلم ”سزا“ کا واقعہ بھی بیان کیا ہے۔ دراصل سزا اور لاڈلا بنیادی طور پر ایک ہی موضوع پر بنائی گئی تھیں لیکن کہانیوں کا انداز مختلف تھا۔ عجیب اتفاق ہے کہ دونوں فلموں میں مرکزی خیال ایک ہی جیسا تھا مگر کافی مختلف بھی تھا۔ ”لاڈلا“ کی کہانی آپ سن چکے۔ اب فلم ”سزا“ کا مختصر خلاصہ بھی بیان کیا جا رہا ہے۔

اس فلم کی کہانی ہندوستان سے شروع ہوتی ہے جب فسادات میں لاکھوں افراد شہید ہوئے اور بے شمار گھر اجڑ گئے۔ سزا میں ہیرو (نیر سلطانہ) کا بھائی طاہش ایک ابن الوقت قسم کا آدمی ہے۔ پاکستان آ کر وہ فرضی غذاغات کی بنیاد پر جاغداد وغیرہ حاصل کر کے دولت مند ہو جاتا ہے۔ پھر اس کو سیاست کا شوق پیدا ہو جاتا ہے اور وہ نام نہاد خود غرض اور جھوٹا سیاستدان بن کر عوام کی آنکھوں میں دھول بھونکتا ہے۔

اس کی جوان بہن فسادات کے زمانے میں لاپتا ہو گئی ہے۔ چند ماہ بعد باز یافتہ انخوا تین کے دفتر سے اس کو فون موصول ہوتا ہے کہ اس کی بہن کو بازیاب کر لیا جا چکا ہے۔ بجائے خوش ہونے کے طاہش اور اس کی بیوی کو فکر پڑ جاتی ہے کہ جب ہم بتائیں گے کہ طاہش کی بہن انخوا ہونے کے بعد بازیاب ہو چکی ہے تو ہماری ساری عزت خاک میں مل جائے گی اور بدنامی بھی ہوگی۔ مگر تم کیا نہ کرتا ہے صدقات



آغا جانی شیری فلم ”نیر سلطانہ“

طاہش بہن کو لینے جاتا ہے۔ بہن بھائی کو دیکھ کر خوشی سے پاگل ہو جاتی ہے مگر طاہش، جھگ رہا ہے۔ بہن کہتی ہے کہ آپ کے لیے ایک تحفہ بھی لائی ہوں۔ گود میں چند ماہ کے بچے کو لے آئی ہے تو بھائی اور بھی زیادہ پریشان ہو جاتا ہے۔ بہن اور بھائی کو لے کر جاتا ہے مگر بھائی اور بھانجی نیر سلطانہ کو سمجھاتے ہیں کہ اول تو تم انخوا ہو چکی ہو۔ اب یہ بچہ دیکھ کر لوگ کہیں گے کہ یہ ہندو دیکھ کر کچھ ہے۔

بہن کہتی ہے کہ بھائی تم تو جانتے تھے کہ میں ماں بننے والی تھی۔ بھانجی کہتی ہے کہ ہاں میں تو جانتی ہوں مگر دنیا والے یقین نہیں کریں گے۔ بھائی سمجھتا ہے کہ میں اس کی پرورش کا کہیں اور بندوبست کر دیتا ہوں۔ وہ اسی شہر میں رہے گا۔ ملتی رہنا، مناسب وقت آنے پر چائی بتا دیں گے۔ اس طرح یہ بچہ ایک غریب عورت کے گھر پرورش پاتا ہے جس کا اپنا ایک بچہ (قوی) بھی ہے۔ غریب عورت کو کالی روپیا اور کالی دے کر یہ لوگ اپنے گھر چلے جاتے ہیں مگر ماں کا دل بے قرار ہے۔ وہ موع پاکر کھولنے اور کھنے کے لیے بیٹے کے پاس جاتی ہے جس سے بھائی فگر مند ہوتا ہے کہ کہیں اس آمد و رفت سے راز کھل نہ جائے۔

بھائی چالاک اور خود غرض ہے۔ جب ایک نو جوان (درپن) کا ان کے گھر آنا جانا ہوتا ہے تو بھائی کی خواہش ہوتی ہے کہ اس کی بہن کی شادی درپن سے ہو جائے جو ہیر شری کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے لندن جانے والا ہے۔ وہ بہن سے کہتا ہے کہ یہ بہت اچھا رشتہ ہے۔ وہ بھی یہی چاہتا ہے۔ تم شادی کر کے لندن چلی جاؤ۔ واپس آؤ گی



ایورنیا اسٹوڈیو

ہندوستان آئیں اور ہندوستانی مسلمانوں کے لیے ایک علیحدہ ملک قائم کرنے کے لیے ماحول سازگار کریں۔ اس بات سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ہم اقبال کا کلام و پیغام کی کتنی قدر کرتے ہیں۔ سیالکوٹ کا یہ مکان ان کا آبائی مکان ہے۔ ان کے جدِ امجد جب کشمیر سے ہجرت کر کے ہندوستان آئے تو سیالکوٹ ہی ان کا پہلا پڑاؤ تھا۔ انہوں نے سب سے پہلے

سیالکوٹ شہر کے ایک محلے میں رہائش اختیار کی اور کافی عرصے تک اس کرائے کے گھر میں قیام پذیر رہے۔ علامہ اقبال کے دادا محمد رفیق نے سیالکوٹ کے محلہ چوڑی گراں میں اپنا ذاتی مکان خریدا تھا جو آج بھی اقبال منزل کہلاتا ہے۔ یہ جان کر آپ کو حیرت ہوگی کہ یہ دو منزلہ اور صاف سترا مکان شیخ محمد رفیق نے صرف 150 روپے میں خریدا تھا۔ وہ ستاڑھ ماہہ تھا۔ ہر چیز سستی تھی لیکن مسلمان اس قدر سستی اور کم قیمت کا جائیداد بھی خریدنے کی توفیق نہیں رکھتے تھے۔

شیخ محمد رفیق کے دو بیٹے تھے۔ ایک شیخ نور محمد اور دوسرے شیخ غلام۔ اس زمانے میں پیدائش کا حساب رکھنے کا دستور نہیں تھا لیکن اندازہ یہ ہے کہ شیخ نور محمد 1840ء میں پیدا ہوئے تھے۔ وہ ایک خوش شکل انسان تھے۔ ان کی شادی ضلع سیالکوٹ کے ایک کشمیری گھرانے میں ہوئی تھی جو جوہر پٹریاں میں واقع تھا۔ کہتے ہیں کہ شیخ نور محمد سے پہلے ان کے دس بیٹے پیدا ہوئے ہی وفات پا گئے تھے اسی لیے نوکری کے طور پر ان کی ناک چھدوا کر اس میں تھپہ باندی کی تھی جس کی وجہ سے وہ بچپن میں تھوکھلاتے تھے۔ ان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ خود تو تعلیم یافتہ نہیں تھے لیکن پڑھے لکھے لوگوں کی صحبت میں رہ کر ان کی طبیعت دین اور روحانیت کی طرف مائل ہو گئی تھی اور وہ صاحبِ فہم اور صاحبِ رائے بھی بن گئے تھے۔ وہ بہت پارسا اور نیک انسان تھے۔ تصوف کی طرف مائل ہونے کے بعد ان کی طبیعت میں مذہبی رجحان کا اضافہ ہو گیا تھا، شیخ نور محمد کی شادی امام بی بی سے ہوئی تھی۔

ہو۔ مگر جیل صاف انکار کر دیتا ہے اور کہتا ہے کہ جس میری ماں نے زندگی بھر دنیا سے چھپایا اگر میں بیان کر دوں تو میری ماں کے ساتھ بہن کی بھی بدنامی ہوگی۔ میری زندگی تو بے مقصد ہے مگر میں اپنی ماں اور بہن کی عزت اور خوش برپادہیں کر سکتا۔

درہن یہ گفتگو سن لیتا ہے اور اس دلیل پر جیل معاف کر دیا جاتا ہے۔ درہن اپنی بیوی سے شکایت کرتا ہے کہ اگر تم پہلے ہی مجھے حقیقت بتا دیتیں تو کتنا اچھا ہوتا اور سب کتنی نکالیت سے بچ جاتے۔

اس فلم کا ایک منظر دہرا نا جاتا ہوں۔ ماں اپنی تصویر بنوانے کے لیے بیل کے پاس جاتی ہے اور ہتی ہے کہ میں سے ماں اور اماتا کی تصویر بنوانا چاہتی ہوں۔

جواب میں وہ کہتا ہے۔ جو چیز میں نے کبھی دیکھی نہیں اس کی تصویر کیسے بنا سکتا ہوں۔ یہ دونوں ماں اور بیوی کی ہی کہانیاں ہیں مگر قطعاً مختلف ”سزا“ کی اعتبار سے ایک ایسا موضوع تھا جسے فلسفے کا ڈیویوڈ احمد صاحب نے ہمیں مشورہ دیا تھا کہ ہم بعد تھے سزا کو بہت کامیابی کی نظر لیکن ہمیں کچھ نہ ملا۔ اور یہ سب ہمارے دوستوں نے کیا۔ بہر حال اسی کا نام دینا ہے۔

21 اپریل 2013ء کو شاعر مشرق، مفکر اسلام، علامہ اقبال کا 75 واں یوم وفات تھا۔ علامہ اقبال ایک انوکھی شخصیت تھے جن کے کلام نے ہم ہندوستانی مسلمانوں پر کوئی خاص اثر نہیں کیا حالانکہ اقبال کے عاشقوں اور مداحوں کی کمی نہیں ہے جو اٹھتے بیٹھتے اقبال کے اشعار پڑھتے اور سر دھنتے رہتے ہیں۔ پاپیچر ریڈیو پاکستان سے اقبال کا کلام باقاعدگی سے نشر کیا جاتا ہے لیکن اقبال کو عام لوگوں تک پہنچانے میں سب سے زیادہ خدمات قوالوں نے سر انجام دی ہیں۔ علامہ کا احترام بھی ہم سب مسلمان کرتے ہیں اور ان سے دلی عقیدت بھی رکھتے ہیں۔ لیکن جہاں تک ان کے کلام اور فلسفے کو زندگی میں اپنانے کا تعلق ہے اس معاملے میں ہم سب صفر ہیں۔ علامہ اقبال کے پرانے دیرینہ مکان کے بارے میں پچھلے دنوں نے خبر آئی تھی کہ ان کی حالت ناگفتہ بہ ہے۔ ان کے زیر استعمال رہنے والا مکان کماؤ خانہ بن گیا۔ خود اس مکان کو دیکھ کر یہ اندازہ نہیں ہو کہ یہ مشرق کے عظیم ترین شاعر کی رہائش گاہ رہی ہے جس نے پاکستان کا تصور پیش کیا تھا اور قائد اعظم کو اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ انگلستان میں اپنی کامیاب و کالت چھوڑ کر

تو ہم تمہارے شوہر کو حقیقت بتا دیں گے اور بیٹا تمہارے ساتھ ہی رہے گا۔ تیر کتنی ہے کہ درہن کو دھوکے میں رکھنا ٹھیک نہیں ہے۔ پہلے اس کو ساری حقیقت بتا دیں۔ بھائی سمجھتا ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ انسان بھی بدل جاتا ہے۔ تعلیم سے فارغ ہو کر وہ آجائے گا تو اطمینان سے اس کو بتا دیں گے۔ غرضیکہ مجبور کر کے بہن کی شادی کر کے اس کو لندن رخصت کر دیتا ہے۔ بھائی اطمینان کی سانس لیتا ہے۔ ایک مہینہ گزرنے کے بعد جب غریب عورت خرچے کی رقم لینے آتی ہے تو بھائی کہتا ہے کہ دیکھو بھئی۔ ہمارا اس بچے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ صرف رحمہی اور انسان دوستی کی خاطر ایسا کیا تھا۔ ہم اب کچھ نہیں دے سکتے تم اس کو پالو یا یتیم خانے میں داخل کر دو۔

دراصل طالش کو یہ اندیشہ بھی ہے کہ اگر اس عورت سے جان نہ چھڑائی تو کسی وقت بھی راز فاش ہو سکتا ہے۔

غریب عورت جواب میں کہتی ہے کہ بیٹھ صاحب۔ اب وہ میرا بچہ ہے۔ جہاں ایک بیٹے کو دال دیکھ لاکر پالتی ہوں دوسرے کو بھی پا سکتی ہوں۔ عورت چلی جاتی ہے اور طالش بھی اطمینان کی سانس لیتا ہے۔

غریب عورت بچوں کو تعلیم تو دے نہیں سکتی البتہ انہیں جیسے جیسے پالتی ہے۔ دونوں میں بھائیوں کی طرح پیار ہے۔ قوی بیک مالٹا اپنا پیشہ بنالیتا ہے۔ نیر کا بیٹا جیل مصور بن جاتا ہے مگر گزرا ہ نہیں ہوتا۔ تیر تین سال بعد واپس آتی ہے تو بھائی سے اپنے بچے کے بارے میں پوچھتی ہے۔ وہ رونا سا منہ بنا کر کہتا ہے کہ وہ عورت بہت لاچر لگی۔ بے بی کو لے کر غائب ہو گئی۔ اس نے یہ شہر بھی چھوڑ دیا ہے۔

نیر کی بے بسی اور غم کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ اس کا شوہر درہن بہت اچھا انسان ہے۔ اس کا لقر رنج کی حیثیت سے ہو جاتا ہے۔ ان دونوں کی ایک بچی بھی ہے، بیل اپنی ماں اور بہن سے ملتا تو ہے مگر حقیقت سے بے خبر ہے۔ ایک دن اس کو حقیقت معلوم ہو جاتی ہے کہ یہ امیر عورت ہی اس کی حقیقی ماں ہے۔ وہ اس سے نفرت کرنے لگتا ہے اس کے آگے کہانی چلتی رہتی ہے۔

بیل کو اپنی چھوٹی بہن سے بے پناہ پیار ہے۔ ایک بار اس کی عزت کی حفاظت کرتے ہوئے بیل سے ایک قتل ہو جاتا ہے۔ قوی اس کو سمجھاتا ہے کہ اگر تم عدالت میں کہہ دو کہ یہ لڑکی تمہاری بہن ہے اور اس کی عزت بچانے کے لیے تمہارے ہاتھ سے ان جانے میں یہ قتل ہو گیا تو تم بچ سکتے

سیالکوٹ میں ڈپٹی وزیر علی بلگرامی کافی عرصے تک مقیم رہے۔ شیخ نور محمد نے تحصیل روزگار کے لیے ڈپٹی وزیر علی بلگرامی کے ہاں کپڑے سینے کی ملازمت کر لی تھی، ان کی بیگم کے خیال میں یہ رزق حلال نہ تھا اس لیے وہ ان کی ڈیڑھ سو روپے ماہوار کی تنخواہ میں سے ایک پیسہ بھی خرچ نہیں کرتی تھیں۔ اس لیے شیخ نور محمد نے کپڑے سینے کی ملازمت ترک کر کے خود ہی کرتے بنانے شروع کر دیے۔ وہ خود بھی کرتے بہت پسند کیے جاتے تھے۔ عام طور پر خیال کیا جاتا تھا کہ شیخ نور محمد کا سیاہوا پڑا اپنے والے بچے خوش قسمت ہوتے تھے۔

شیخ نور محمد نے اپنے کاروبار کو پھیلانے کے لیے برقعوں کی ٹوپیاں بنانا شروع کر دیں۔ یہ کاروبار اتنا کامیاب ہوا کہ بہت جلد دکان میں کئی ملازم بھی رکھ لیے گئے۔ یہ کاروبار وہ اپنے مکان ہی کے ایک حصے میں کیا کرتے تھے۔ انہیں برقعوں کی ٹوپی بنانے کا موجد کہا جاتا تھا۔

یہ پس منظر اس مقصد سے بیان کیا جا رہا ہے کہ علامہ اقبال کے خاندان کے کچھ گوشے بھی سامنے آجائیں جو کہ عام لوگوں کی نظروں سے اوجھل ہیں۔

شیخ نور محمد کا والد تعالیٰ نے پانچ اولادیں عطا کی تھیں۔ دو بیٹے شیخ عطاء محمد اور شیخ محمد اقبال، شیخ محمد اقبال اپنے بھائی سے سات سال چھوٹے تھے۔

شیخ محمد اقبال کی پیدائش سے قبل ہی کچھ ایسی علامات ظاہر ہونے لگی تھیں جن سے اندازہ ہوتا تھا کہ ان کا دنیا میں



دانش وریدی، پرویز بگلرانی اور امجد اسلام امجد

تھی جسے اردو میں قلبایا جاسکے۔ اس مقصد کے لیے انہوں نے بنگلہ زبان کے ایک ناول کا انتخاب کیا۔ اب سوال یہ تھا کہ اس ناول کا اردو میں کون ترجمہ کرے؟ اردو رائٹرز اور شاعروں کی اس وقت ڈھاکا میں قلت تھی۔ انہوں نے کلکتہ یونیورسٹی کے ایک پروفیسر سے ناول کا ترجمہ کرایا جو بے بی اسلام کو پسند نہیں آیا کیونکہ انہیں فلم کا اسکرین پلے وغیرہ لکھنے کا کوئی تجربہ نہ تھا۔

خوش قسمتی سے ان ہی دنوں معروف شاعر سرور بارہ بنگوی بھی ڈھاکا پہنچ گئے۔ اگر سرور بارہ بنگوی کو مشرقی پاکستان کی اردو فلموں کے لیے ”آسجین“ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ وہ بہت اچھے مصنف بھی تھے اور ان کی شاعری کے بارے میں تو دور رائے ہوتی نہیں سکتیں۔ سرور بارہ بنگوی ایک گورے چٹے، خوب رو اور انتہائی شائستہ انسان تھے۔ انہوں نے بہت جلد مشرقی پاکستان کی فلمی صنعت میں اپنے قدم جما لیے کیونکہ ایک اچھا شاعر اور ادیب مشرقی پاکستان کو مل گیا تھا۔ درحقیقت یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ سرور بارہ بنگوی نے ڈھاکا کے بنگالی فنکاروں کو نہ صرف اردو سکھائی بلکہ انہیں اردو کے صحیح تلفظ سے بھی آگاہ کیا۔ سوائے اداکار ہارون کے ڈھاکا کا کوئی اردو فلموں میں کام کرنے والا فن کار یہ نہیں کہہ سکتا کہ ان کی تعلیم اور تربیت میں سرور بارہ بنگوی کا نمایاں حصہ نہیں ہے، شتم جو ایک زمانے میں اردو سمجھ تک نہیں سکتی تھیں، سرور بارہ بنگوی نے کچھ عرصے کی تربیت کے بعد انہیں اردو پڑھنا اور صحیح تلفظ کے ساتھ مکالموں کی ادائیگی کر سکا تھا۔ یاد گلوکاروں کو انہوں نے اردو کے صحیح تلفظ سے آگاہ کیا۔ اداکاروں کو اردو فقروں کی

میں بھی دیکھی جاتی ہیں اور اردو فلم سازی ان کے لیے زیادہ مناسب بن گئی۔

لیکن مشرقی پاکستان میں اردو فلموں کی تیاری اور پھر ان کے فروغ میں سرفہرست قیام پاکستان کے بعد کلکتہ سے آنے والے وہ لوگ ہیں جو ڈھاکا میں اردو فلم سازی کا آغاز کرنے کے خواہش مند تھے۔ ان میں ایک نمایاں نام ہارون کا بھی ہے۔ ہارون ایک خوب رو اور شائستہ نوجوان تھے۔ تعلیم یافتہ بھی تھے۔ ان کا تعلق کلکتہ کے ایک دولت مند گھرانے سے تھا جن کا وسیع کاروبار تھا۔

ڈھاکا میں اردو زبان میں بنائی جانے والی پہلی فلم ”جاگو ہوسو“ تھی جو اختر کاردار نے بنائی تھی اور اس فلم نے دنیا بھر کے فلم میلوں میں کئی ایوارڈز بھی حاصل کیے تھے۔ دنیا بھر میں اس فلم کی شہرت سے متاثر ہو کر مشرقی پاکستان میں اردو فلمیں بنانے کے تصور نے جنم لیا۔

کلکتہ سے فلم سے وابستہ جو لوگ ڈھاکا آئے تھے ان میں ہارون اور ان کا خاندان بھی شامل تھا۔ ہارون کا اس وقت تک فلمی دنیا سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ نہ لالاسلام کے علاوہ ایک بہتر مندرجہ بی بی اسلام بھی ڈھاکا آئے تھے۔ جب ان سے کچھ فلم سازوں نے بنگلہ بنانے کی خواہش کا اظہار کیا تو انہوں نے صاف کہہ دیا کہ میں اردو فلم بنانا چاہتا ہوں جسے سارے پاکستان میں دیکھا جائے۔ بی بی اسلام کلکتہ میں بھی فلمی صنعت سے وابستہ تھے اور ان کا کافی نام بھی تھا۔ ڈھاکا کے فلم ساز بی بی اسلام سے فلم بنوانے پر بعد تھے۔ انہوں نے بی بی اسلام کی خواہش کے مطابق اردو فلم بنانے کا فیصلہ کر لیا۔ سب سے پہلے ایک کہانی کی ضرورت

اس کے خاندان والوں نے بتایا کہ وہ اس کا علاج کرنا کے لیے ہی پنجاب آئے ہیں۔

والد نے وہاں پہنچتے ہی بیمار کے پاس جانے کی خواہش کی۔ مریض کے پاس گئے تو دیکھا کہ مریض کے اعضا بری طرح متاثر ہوئے ہیں۔ یہ دیکھ کر والد صاحب نے جیب سے ایک پڑیا نکالی جس میں کوئی پوڈر بھی چڑھی۔ مریض کے اعضا بالکل مغل چکے تھے۔ وہ پوڈر یا راکم انہوں نے مریض کے متاثرہ اعضا پر مل دی اور کہا کہ خدا کے فضل سے مریض کو جلد شفا ہو جائے گی۔ ان لوگوں نے والد کی خدمت میں کچھ پیش کیا جو انہوں نے قبول نہیں کیا۔ چند روز بعد وہ لوگ سیالکوٹ آئے اور بتایا کہ خدا کے فضل سے مریض صحت مند ہو چکا ہے۔

اقبال کے والد ”میاں جی“ کے نام سے مشہور تھے۔ ان کی دیانت داری اور ایمانداری پر سب یقین کرتے تھے۔ اقبال نے اپنے والدین کی آغوش میں اور ایک پاکیزہ ماحول میں پرورش پائی تھی۔ ایسے پاکیزہ ماحول میں پرورش پانے والا بچہ جب بہترین دینی اور دنیاوی تعلیم سے بہرہ ور ہو اور صاحب علم اساتذہ سے تعلیم حاصل کی ہو تو وہ بچہ بڑا ہو کر اقبال نہ ہوگا تو اور کیا ہوگا۔

اقبال کی فارسی شاعری کا شہرہ ساری دنیا میں ہے۔ اہل ایران اقبال کو فارسی زبان کے نامور شاعروں کی صف میں شامل کرتے ہیں۔ اقبال کا کلام ایران میں عام ہے بلکہ پاکستان سے زیادہ مقبول ہے اور ایرانی اقبال کو اپنا ہی شاعر سمجھتے ہیں۔ کاش ہماری قوم بھی ریڈیو کے ذریعے نغمات اور قوالیوں کی باندیاں فتح کر کے اقبال کے کلام کی روح کو سمجھے اور اللہ تعالیٰ اس کو اقبال کے کلام سے فیض یاب ہونے کی توفیق عطا فرمائے آمین۔

☆☆☆

مشرقی پاکستان اب بنگلہ دیش بن چکا ہے۔ اس کی وجوہات کیا ہیں۔ تصور وار کون ہے؟ اس تفصیل میں جاننا ضروری نہیں کیونکہ اب اس کہانی کا ہر پہلو منظر عام پر آچکا ہے۔

مشرقی پاکستان میں فلم سازی کا آغاز بنگلہ فلم سازی سے ہوا تھا۔ بنگالیوں نے لاہور اور کراچی کے فلمی نگار خانوں میں تعلیم و تربیت حاصل کی اور چھوٹے پیمانے پر بنگلہ فلمیں بنانے کا آغاز کیا۔ اس طرح ان کی فلم سازی نے قدم لیا اور جب انہوں نے دیکھا کہ اردو فلمیں مشرقی پاکستان

آنے والا بچہ خصوصی صلاحیتوں کا حامل ہوگا۔ ایک ایسا واقعہ علامہ اقبال نے خود نذرِ نیاز کی کوسنایا تھا۔

انہوں نے بتایا کہ ایک روز میرے والد کچھ مٹھائی لے کر گھر آرہے تھے۔ راستے میں انہوں نے دیکھا کہ ایک کتا بھوک سے بے تاب ہے اور اگر اسے فوری طور پر کھانا نہ ملا تو یہ مر جائے گا۔ والد نے ساری مٹھائی کتے کو کھلا دی اور بعد میں اس کو پانی بھی پلایا۔ اس رات ان کے والد نے خواب میں دیکھا کہ ایک مکان میں مٹھائی کے طباق رکھے ہوئے ہیں۔ اس خواب سے انہیں یقین ہو گیا کہ ہمارے دن بچھرنے والے ہیں۔

اس زمانے میں کشمیر کے بنے ہوئے دھتوں کی بہت مانگ تھی جو سردیوں میں استعمال کیے جاتے تھے۔ اس زمانے میں ایک دھتے کی قیمت دو روپے تھی۔ والد نے تین چار سو دھتے تیار کرائے جن پر فی دھتہ صرف آٹھ آنے لگت آتی تھی۔ یہ دھتے انہوں نے دو روپے فی دھتہ فروخت کیے جس سے انہیں کافی منافع حاصل ہوا اسی زمانے میں علامہ اقبال کے بڑے بھائی بھی برسرِ روزگار ہو گئے اور گھر میں خوشحالی پیدا ہو گئی۔

علامہ اقبال کو بچپن ہی سے یہ احساس تھا کہ ان کے والد صاحب کشف و کرامات بزرگ ہیں۔ ایک بار انہوں نے اپنے ایک بے تکلف دوست کو بتایا کہ میری والدہ نے ایک بار سنایا کہ تاریک کمرے میں اچانک ایک نور ظاہر ہوا اور یوں محسوس ہوا جیسے کمرے میں سورج نکل آیا ہے۔

مولانا عبدالمجید سالک نے بھی اپنی کتاب ”ذکر اقبال“ میں ایک واقعہ درج کیا ہے۔ اقبال نے بتایا کہ دس گیارہ برس کی عمر میں رات کے وقت اچانک میری آنکھ کھلی تو میں نے دیکھا کہ میری والدہ میز چھوٹے سے نیچے اتر رہی تھیں۔ میں بھی ان کے پیچھے پیچھے چل پڑا۔ میں نے دیکھا کہ والد صاحب مکان کے تن میں بیٹھے ہوئے ہیں اور ان کے ارد گرد نور کا ہالا ہے۔ صبح میں نے والدہ سے اس بارے میں دریافت کیا۔ اس وقت والد صاحب انہیں اپنا خواب سنارہے تھے جو انہوں نے یہ حالت بیداری دیکھا تھا۔ انہوں نے خواب میں دیکھا کہ کابل سے ایک قافلہ آیا ہوا ہے۔ قافلے میں ایک شخص بہت بیمار ہے۔ یہ سن کر کچھ ضرورت کی چیزیں ناکے میں رکھ کر قافلے کی طرف گیا۔ ہم نے دیکھا کہ وہ شخص واقعی بہت بیمار ہے اور صاحبِ ثروت بھی ہے۔



علامہ محمد اقبال اپنے والدین کے ہمراہ (تخلیقی تصویر)

مکالے نہیں لکھے۔ لیکن سب دوستوں کے اصرار پر سرور صاحب نے ”تہا“ کا اسکرپٹ اور نغمات لکھے۔ کاغذی تیاریاں مکمل ہونے کے بعد اداکاروں کے انتخاب کا مسئلہ تھا۔ کلکتہ سے جو اردو بولنے والے ڈھا کا آئے تھے ان میں ایسے لوگ کافی تھے جو بہت اچھی اردو بول سکتے تھے۔ دراصل کلکتہ ایک بہت بڑا شہر تھا جس میں سارے ہندوستان بھر کے لوگ سامنے ہوئے تھے۔ دراصل قائد اعظم کے منصوبے کے مطابق کلکتہ کو پاکستان میں شامل ہونا تھا۔ کیونکہ ابتدائی پلان کے مطابق اکثریت والے پورے صوبے پاکستان یا ہندوستان میں شامل ہونے تھے لیکن پٹنہ نہرو نے عین وقت صوبوں اور ضلعوں کی تقسیم کا بھی مطالبہ کر دیا۔ کچھ لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ قائد اعظم نے یہ لولا ٹکڑا پاکستان قبول ہی کیوں کیا تھا۔ انہیں یہ تجویز مسترد کر دینی چاہیے تھی مگر قائد اعظم جانتے تھے کہ انگریز حکومت نے برصغیر سے رخصت ہونے کا فیصلہ کر لیا ہے اور وہ جلد سے جلد ہندوستان سے رخصت ہونا چاہتے ہیں۔ اگر قائد اعظم اپنی بات پر اڑ جاتے تو یہ مسئلہ انک کر رہ جاتا اور انگریزوں کے پاس مزید مذاکرات کرنے کا وقت اور مہلت نہ تھی۔ یوں تو فلم اسکرپٹ سرور بارہ بنکوی نے لکھا تھا مگر چونکہ وہ فلم کی ٹیکنیک سے بخوبی واقف نہ تھے اور اسکرپٹ لکھنے کا ان کے لیے پہلا موقع تھا اس لیے بے بی اسلام نے اسکرپٹ پر بذات خود نظر ثانی کی اور فلم کا منظر نامہ اور

ویسے بھی بھارتی نواز عوامی لیگ کی حکومت میں اردو کو اس سرزمین سے دیس نکالا لے چکا ہے۔ ذکر ہو رہا تھا مشرقی پاکستان میں بنائی جانے والی پہلی اردو فلم کا۔۔۔ بے بی اسلام جو کہ کلکتہ میں ایک تجربہ کار فلم ایڈیٹر تھے وہی اس فلم کی ہدایت کاری کے لیے منتخب کیے گئے تھے اور ان ہی کا اصرار تھا کہ اگر وہ فلم بنائیں گے تو اردو میں۔ بے بی اسلام نے ڈھا کا یونیورسٹی کے پروفیسر صلاح الدین محمد سے اس سلسلے میں تعاون کی درخواست کی۔ پروفیسر صلاح الدین اردو اور بنگلہ دونوں زبانوں پر عبور رکھتے تھے مگر پھر وہی مسئلہ کہ فلم کا منظر نامہ اور اسکرپٹ لکھنے کے ہنر سے ناواقف تھے۔ بے بی اسلام نے اس کا حل یہ نکالا کہ پروفیسر صاحب ناول کا اردو میں ترجمہ کر دیں باقی ٹیکنیکل کام وہ خود دوسروں کی مدد سے کریں گے۔ خوش قسمتی سے ان ہی دنوں سرور بارہ بنکوی کا ڈھا کا جانا ہوا۔ وہ ڈھا کا ہی میں رہائش پذیر ہو چکے تھے۔ ان کا مقصد مشرقی پاکستان فلم انڈسٹریز کو مقبول اور ترقی دینا تھا۔ ڈھا کا کے علمی اور شاعرانہ مکتوں میں ان کی رسائی ہو چکی تھی۔ پروفیسر صلاح الدین محمد نے بنگلہ ناول کو اردو میں بہت اچھا ترجمہ کیا تھا۔ ان ہی کے مشورے پر اس فلم کے گانے اسکرین لے اور مکالے لکھنے کی ذمہ داری سرور بارہ بنکوی کو سونپ دی گئی۔ فلم کا نام ”تہا“ منتخب کیا گیا۔ ان کا نظریاتی مبنی تھا کہ میں نے کبھی فلم کا اسکرپٹ نغمات اور

تو سرور صاحب کھڑے مکرار ہے تھے۔

”ارے آپ ڈھا کا سے کب آئے؟“

وہ بولے۔ ”ڈھا کا سے بھی ہوا آئے اور اسلام آباد سے بھی۔ آفاقی صاحب آپ کو معلوم ہے مجھے مشترکہ فلم بنانے کی اجازت مل گئی۔“

”یہ تو آپ نے بہت بڑی خوش خبری سنائی۔ اللہ مبارک کرے۔“

”بس اب میں آج کل میں ڈھا کا جا رہا ہوں تاکہ ضروری انتظامات مکمل کر لوں۔ واپس آکر لاہور میں فلم کی شوٹنگ کا آغاز کروں گا۔“

”مگر اتنی جلدی کیا ہے۔ آئیے کسی ریسٹوران میں چل کر کھانا کھاتے ہیں۔“

وہ مکرارے ”اتفاق سے میں ایک ڈنر پر ہی جا رہا ہوں۔ چلیے ڈھا کا سے واپسی پر آپ کے ساتھ کھانا کھاؤں گے۔ وعدہ رہا۔ بھائی بھی اس وعدے کی گواہ ہیں۔“

وہ بہت جلدی میں تھے۔ گلے لے لے اور رخصت ہو گئے۔ اپنے تمباکو کی خوشبو وہیں چھوڑ گئے۔ سرور صاحب پائپ پیا کرتے تھے۔ پچھتے کیا تھے بس پائپ چسپنی کی طرح ہر وقت ان کے منہ میں نظر آتا تھا۔ شاید وہ آج ایک پائپ میں تمباکو بھرتے ہوں گے۔ اس کے بعد بس پائپ کو جلاتے رہتے تھے جو فوراً ہی بجھ جایا کرتا تھا۔ دراصل وہ پائپ کے کش نہیں لیتے تھے۔ دراصل انہیں آئرن مور تمباکو کی خوشبو بہت پسند تھی۔ ہم نے بھی آئرن مور کی خوشبو کے شوق میں ہی پائپ پینا شروع کیا تھا مگر ہم جب ایک بار پائپ سلگاتے تھے تو اس کو رکھ کر کے ہی چھوڑتے تھے، حالانکہ ہم تمباکو نوشی کی طرح دھوئیں کو کھینچ کر پیچھے دھون میں نہیں لے جاتے تھے، ہمارے دوست کہا کرتے تھے کہ آپ تو صرف منہ سے دھواں نکالنے کے لیے پائپ اور سگار پینے ہیں۔

اگلے دن ہم نے اخبار میں خبر پڑھی کہ مشہور شاعر، مصنف اور نغمہ نگار سرور بارہ بنکوی پارٹ فیل ہونے کی وجہ سے وفات پا گئے۔ یہ اس شخص کی کہانی ہے جس نے مشرقی پاکستان کے بنگالی فنکاروں کو اردو بولنا اور لکھنا سکھایا تھا۔ ہر بنگالی فنکار دول سے ان کی عزت کرتا تھا اور انہیں اپنا استاد تسلیم کرتا تھا۔ وہ ایک نیک دل، مخلص اور دھن کے بے انسان تھے۔ افسوس کہ ان کی اتنی بڑی خدمت اور ریاضت کا اعتراف نہ تو پاکستان میں کیا گیا اور نہ ہی بنگلہ دیش میں

ادائیگی کے ساتھ اردو تلفظ میں اردو بولنا اور پڑھنا سکھایا ورنہ اس سے پہلے یہ ہوتا تھا کہ وہ لوگ بنگلہ بولنے میں اردو کے مکالے بولتے تھے۔ سرور بارہ بنکوی نے ڈھا کا میں اردو فلمیں بھی بنائیں۔ ایک فلم بنانے کے لیے وہ لاہور بھی آئے تھے۔ انہوں نے ایک بہت حقیقت پسند فلم بنائی تھی۔ شبنم نے اس فلم میں بہت اچھی اداکاری کی تھی جس پر انہیں ایوارڈ بھی ملا تھا۔

بہر حال مشرقی پاکستان کی فلمی صنعت کا تذکرہ ہوا اور سرور بارہ بنکوی کا نام نہ آئے یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے۔ چلتے چلتے ایک بات اور بتا دوں سرور صاحب ڈھا کا میں بے حد مقبول تھے۔ بنگلہ دیش کی فلمی صنعت کے لوگ سرور بارہ بنکوی کے احسان مند بھی تھے اور ان سے بہت محبت بھی کرتے تھے۔ بنگلہ دیش بن جانے کے بعد سرور صاحب ڈھا کا گئے تو سب نے انہیں ہاتھوں ہاتھ لیا اور بہت گرجوئی کا مظاہرہ کیا۔ انہوں نے سرور صاحب سے کہا کہ آپ بنگلہ دیش کے ساتھ مشترکہ فلم سازی کیوں نہیں کرتے۔ یہاں کے نامور اداکار آپ کے ساتھ مل کر کام کریں گے۔ فلم میں پاکستان اور مشرقی پاکستان کے مقبول فن کار کام کریں گے اور آپ کے ساتھ مل کر تعاون کریں گے۔

اس زمانے میں بنگلہ دیش کے ساتھ پاکستان کی مشترکہ فلم سازی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا لیکن بنگلہ دیشی دوستوں نے ان کی بہت مدد کی اور انہیں اپنی حکومت سے اجازت بھی دلا دی۔ سرور صاحب اس فلم کی ابتدائی تیاریوں کے لیے لاہور آئے اور اسلام آباد میں متعلقہ حکام سے بھی ملاقاتیں کیں۔ اس زمانے میں بڑے بڑے شاعر فلموں سے وابستہ تھے اور آئے دن کسی نہ کسی کے گھر مشاعرہ ہوا کرتا تھا۔ حمایت علی شاعر، سرور بارہ بنکوی، مسرور انور، کلیم عثمانی وغیرہ ان مشاعروں میں شرکت کرتے تھے۔

یہ تو ہم جانتے تھے کہ سرور بارہ بنکوی بنگلہ دیش کے ساتھ مشترکہ فلم سازی کے پروگرام بنارہے ہیں لیکن دوسروں کی طرح ہمیں بھی یقین نہیں تھا کہ ان کا یہ منصوبہ پایہ تکمیل تک پہنچ سکتا ہے۔ ایک دن شام کو ہم مال روڈ کی ایک دکان میں کھڑے تھے۔ لٹنی بھی ہمارے ساتھ ہی تھیں۔ اچانک پائپ کے تمباکو آئرن مور کی خوشبو آئی اور اس کے بعد کسی نے پیچھے سے ہماری آنکھوں پر ہاتھ رکھ دیے۔ نرم اور پر گوشت انگلیاں اور آئرن مور کی خوشبو، ہم سمجھ گئے کہ یہ سرور بارہ بنکوی کے سوا کوئی اور نہیں ہو سکتا۔ پلٹ کر دیکھا

مکالے خود لکھے۔ سرور صاحب ایک صاحب علم اور ذہین انسان تھے اس لیے بہت جلد انہوں نے فلم کے اسکرپٹ لکھنے پر عبور حاصل کر لیا بلکہ ”استاد“ کہلائے جانے لگے۔ اداکاروں کے انتخاب کا مرحلہ آیا تو سرور صاحب ہارون کو ہیرو کے طور پر کاسٹ کرنے کے حق میں تھے۔ ہارون میں فلمی ہیرو والی تمام خوبیاں تھیں۔ وہ خوبصورت مرد اور دلکش شخصیت کا مالک تھا۔ مسکراتا ہوا مختلف چہرہ۔ بہت اچھا ناک نقشہ، کھلتا ہوا رنگ۔ بات کرنے کا انداز بھی بہت اچھا تھا اور پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ اردو زبان پر عبور حاصل تھا۔ اس وقت فلم ”تہا“ کے لیے ہارون سے بہتر اداکار دستیاب نہیں تھا۔ سرور صاحب کے کلکتہ کے زمانے سے ہارون اور اس کے خاندان کے ساتھ بہت مراسم تھے۔ کلکتہ میں ہارون کے والد کا اسٹیل کا بہت وسیع کاروبار تھا۔ جب وہ ڈھاکا آئے تو اسی کاروبار سے وابستہ رہے۔ ڈھاکا میں انہیں ”آئرن لنگ“ کہا جاتا تھا۔ بے پناہ دولت مند اور بہت وسیع تعلقات رکھنے والے بااخلاق انسان تھے۔

سرور صاحب نے جب ہارون کے سامنے فلم کا تذکرہ چھیڑا اور اس کو فلم کا ہیرو بننے کی دعوت دی تو ہارون نے انکار کر دیا۔ اس کا کہنا تھا کہ اس کے والد اور گھر والے رضامند نہ ہوں گے۔ دوسرے یہ کہ وہ اپنے کاروبار میں بہت زیادہ مصروف تھا چونکہ ڈھاکا میں نئے سرے سے اسٹیل انڈسٹری قائم کرنی تھی لیکن سرور صاحب کہاں ماننے والے تھے۔ اپنی پرکشش گفتگو اور گھریلو مراسم کے ذریعے انہوں نے ہارون کو بالآخر فلم ”تہا“ کا ہیرو بننے پر رضامند کر لیا۔ جس وقت مشرقی پاکستانی فلموں کی تاریخ لکھی جائے گی تو وہاں کی پہلی اردو فلم ”تہا“ کے ہیرو کے طور پر ہارون ہی کا نام لکھا جائے گا۔

فلم کی ہیروئن کے لیے سرور صاحب نے شمیم آرا کو رضا مند کر لیا۔ وہ ان دنوں لاہور کی فلموں میں بہت مصروف تھیں مگر سرور صاحب کی خوش بیانی نے انہیں بھی شے میں اتار لیا۔ کراچی سے اداکار (اور ہدایت کار) شیخ حسن اور فینا کا انتخاب کیا۔ دیگر فن کار ڈھاکا ہی سے لیے گئے تھے۔ کہنے کو تو تہا کے مصنف اور ہدایت کار بے بی اسلام تھے لیکن مشورے سرور بارہ بنکوی کے چلتے تھے۔ ہم ان دنوں شمیم آرا کی ایک فلم کا اسکرپٹ لکھ رہے تھے اس لیے ہم بھی ڈھاکا جا کر شاہ باغ ہوٹل میں ٹھہر گئے۔ شمیم آرا

صبح سے رات تک فلم کی شوٹنگ میں مصروف رہتی تھیں اور ہم ہوٹل میں بیٹھے اسکرپٹ لکھتے رہتے یا پھر ادیبوں، شاعروں اور صحافیوں کے ساتھ گپ شپ لگاتے رہتے تھے۔ بنگالی صحافیوں اور ادیبوں سے ہمارے گہرے مراسم ہو گئے تھے۔ فلمی حلقوں میں بھی کافی دوستیاں ہوئی تھیں۔ وقت بہت اچھا گزر رہا تھا۔ شام کو شمیم آرا شوٹنگ سے فارغ ہو کر آتیں تو فلمی شخصیات کی جانب سے دعوتوں کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔ تنہا کی شوٹنگ میں توقع سے زیادہ وقت لگ گیا تھا۔ اس لیے فلم کے بارے میں لوگوں کی دلچسپی کم ہو گئی تھی۔ ”تہا“ ایک ترقی پسند خیال پر بنائی گئی تھی۔ اس زمانے میں ترقی پسندوں کو عموماً پسند نہیں کیا جاتا تھا۔ یہ شہرت بھی ”تہا“ کے لیے کارگر ثابت نہ ہوئی۔ اس سے پہلے ڈھاکا میں اسے ”جے کاردار کی فلم“ ”جاگو ہوا سویرا“ ”بن کر دنیا بھر میں مشہور ہو چکی تھی اور فلم کے مکالمے اور نغمات (غالباً صرف دو گانے تھے) فیض صاحب نے ہی لکھے تھے لیکن ”جاگو ہوا سویرا“ دراصل مغربی پاکستان کی فلم تھی۔ فن کار دونوں جگہوں کے اس میں شامل تھے۔ یہ ٹھیکریوں کی زندگی، غربت اور مجبور یوں کے بارے میں تھی۔ فلم کے برطانوی کیراٹین نے عکاسی بھی بہت اچھی کی تھی اور صحیح معنوں میں ایک عالمی معیار کی فلم تھی۔ لیکن مشرقی پاکستان کی پہلی اردو فلم کا اعزاز ”تہا“ کو ہی حاصل ہے۔ اس فلم کے آغاز سے حوصلہ پا کر کلکتہ سے ڈھاکا آنے والے دوسرے تجربے کار اور بہتر مندوں نے بھی فلم سازی شروع کر دی۔ ظہیر ریحان کی رنگین فلم ”سنگم“، تہا سے پہلے ہی نمائش کے لیے پیش کی جا چکی تھی مگر اولیت کا اعزاز ”تہا“ کو ہی حاصل ہوا۔ اسی دور میں نذر اللہ اسلام اور دوسرے تجربے کار لوگ بھی ڈھاکا پہنچ چکے تھے اور اردو فلمیں بنانے کی تیاریوں میں مصروف تھے۔ ہارون اپنی کاروباری مصروفیات اور عدم دلچسپی کے باعث زیادہ عرصے تک فلموں میں اداکاری نہ کر سکے۔ ”تہا“ نے درمیانی برس کیا تھا۔ ہارون نے ڈھاکا میں پانچ فلموں میں اداکاری کرنے کے بعد اداکاری کو خیر باد کہا۔ ہارون کی فلموں میں ”یہ بھی ایک کہانی“ اور کاروان بھی شامل ہیں۔ پہلی فلم تو ناکام ہوئی مگر فلم ”کاروان“ کی شوٹنگ نیپال میں کی گئی تھی اس لیے پسند کی گئی۔ ہارون کی آخری فلم ”آخری اسٹیشن“ تھی جس میں شبنم نے ایک بنگالی لڑکی کا کردار بہت ہی خوبصورتی سے ادا کیا تھا۔ یہ فلم صحیح معنوں میں بین الاقوامی معیار کی فلم تھی اس

سے فلم سازوں میں سرور بارہ بنکوی، خان عطا الرحمن، ایم ایم حسن شامل تھے۔ آخری اسٹیشن، کی کہانی اردو کی معروف ناول نویس ہاجرہ سرور کے ناول ”آخری اسٹیشن“ سے اخذ کی گئی تھی۔ آخری اسٹیشن، 1965ء میں ریلیز ہوئی تھی۔ آخری اسٹیشن میں رومانی کردار رانی اور ہارون نے ادا کیے تھے لیکن فلم کی کہانی کے مرکزی کردار شبنم اور بنگال کے اداکار اکبر تھے۔ انہوں نے یہ ہے کہ اتنے عرصے قبل ایک انوکھے موضوع پر فلم بنانے والے سرور بارہ بنکوی کے اس کارنامے کو سراہائیں گیا۔ جیسا کہ بتایا گیا ہے کہ فلم حقیقت پسندی جس میں بنگلہ دیش کی حقیقی زندگی کی عکاسی کی گئی تھی۔ ملک کی بدنامی کے بہانے اس فلم کو سنسنے کاٹ چھانٹ کر اس کا حلیہ بگاڑ دیا تھا۔ اس سلسلے میں ہماری حکومت اور سنسور بورڈ کی پالیسی ہمیشہ ناقابل فہم رہی ہے۔ ریاض شاہد نے ”اسن“ کے نام سے مقبوضہ کشمیر کے بد نصیب اور مظلوم لوگوں کے حق میں فلم بنائی تو سنسنے اس پر باندی عائد کر دی۔ کافی قطع برید کے بعد اس فلم کو ”یہ اسن“ کے نام سے پیش کیا گیا مگر اس فلم کی روح نکل چکی تھی۔ سرور بارہ بنکوی کی فلم ”آخری اسٹیشن“ کے ساتھ بھی یہی سلوک کیا گیا۔ سوال یہ ہے کہ پھر جاگو ہوا سویرا، کونسٹر کے بغیر پاس کیوں کر دیا گیا۔ یہ کہانی بھی پاکستان میں غربت کی داستان تھی مگر اسے عالمی میلوں میں شرف سے پیش کیا گیا۔

اداکارہ بشری انصاری کے والد ادیب اور صحافی احمد بشیر نے ممتاز رفیقی کی کہانی پر مشتمل فلم ”نیلا برت“ بنائی تھی۔ اس فلم پر فحاشی کے علاوہ اور بھی الزامات لگا کر چار بار سنسور کیا گیا اور اس کا حلیہ بدل دیا گیا۔ اس فلم میں محمد علی، حسہ، کمال ایرانی اور آغا طاٹھ شامل تھے لیکن دراصل فلم کا مرکزی کردار آغا طاٹھ تھے جنہوں نے فلم میں لا جواب اداکاری کی تھی۔

ہم ہماری حکومتی اور سنسور پالیسی کو جو بے ہی کہہ سکتے ہیں۔ سنسور کے اس رویے کے باعث پاکستانی فلم سازوں نے مختلف اور حساس موضوعات پر فلمیں بنانے سے توبہ کر لی۔ اس کے برعکس انڈیا میں پاکستان کے خلاف حکم کھلا پروپیگنڈا اور ناقابل اعتراض فلمیں بنی رہیں مگر ہماری حکومت نے اپنی پالیسی نہیں بدلی۔ اس سے پہلے حلیہ نصیر کی فلم ”فرنگی شہید“ پر بھی بہت اعتراضات کیے گئے تھے۔ اعتراض یہ تھے کہ ان فلموں کی وجہ سے پاکستان کے خارجہ



سرور بارہ بنکوی

تعلقات برطانوی حکومت کے ساتھ خراب ہو جائیں گے۔ کتنی ستم ظریفی کی بات ہے کہ پاکستانی فلم سازوں، ہدایت کاروں اور لکھنے والوں کو اپنے جذبات کے اظہار کا موقع ہی نہیں دیا گیا۔

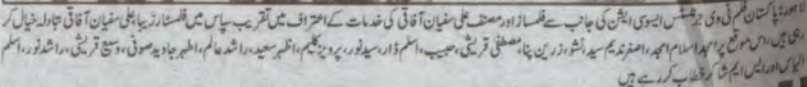
☆☆☆

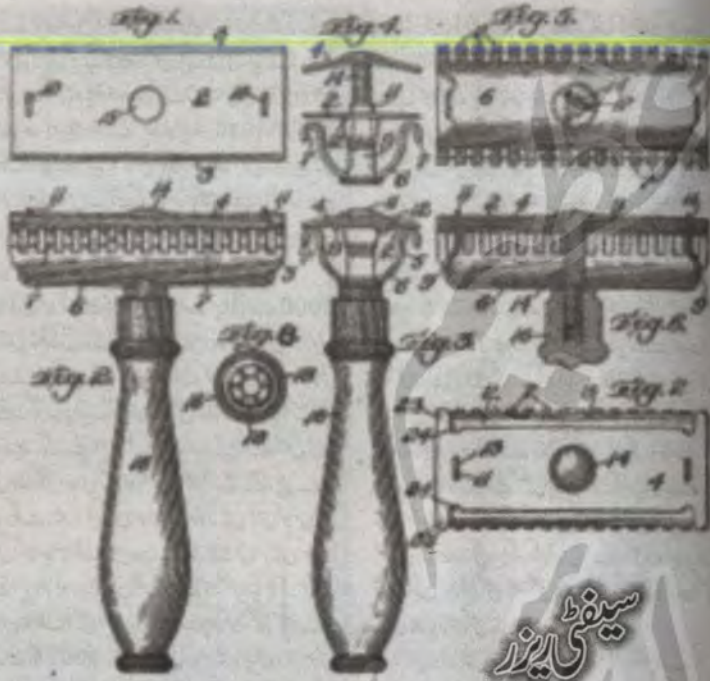
آج کل جبکہ کلاسیک موسیقی اور سازندے ناپید ہوتے جا رہے ہیں استاد فقیر حسین سارنگی نواز کا دم غنیمت ہے۔ ناصر کاظمی نے کہا تھا

ہم نہ ہوں گے کوئی ہم سا ہوگا ناصر کاظمی کے زمانے میں یہ ممکن تھا لیکن آج کے دور میں کسی ہنرمند، فن کار اور شاعر ادیب کے جانے کے بعد اس کا نعم البدل ہی نظر نہیں آتا۔ یہ ایک مسئلہ بن چکا ہے۔ ایک تصور ہے کہ کسی شخص کے چلے جانے سے کوئی فرق نہیں پڑتا کیونکہ کوئی اور اس کی جگہ لے لیتا ہے۔ جو لوگ خود کو ناکزیر سمجھتے اور کہتے ہیں وہ غلطی کا شکار ہیں۔ ایک فلسفی نے کہا تھا کہ ناکزیر لوگوں سے دنیا کے قبرستان بھرے ہوئے ہیں اور دنیا کا کاروبار اسی طرح چل رہا ہے۔

استاد فقیر حسین ریڈیو پاکستان کے کلارک پرگرام "آجک خسروی" میں حصہ لے کر نمایاں ہوئے۔ سارنگی ایک مختصر سی گردن رکھنے والا ساز ہے لیکن اس چھوٹے سے ساز کو جب کوئی ہنرمند استعمال کرتا ہے تو سننے والوں پر بحر طاری کر دیتا ہے۔ سارنگی دراصل مشرق اور جنوبی ایشیا کا ساز ہے۔ مثلاً نیپال، پاکستان، ہندوستان میں اسے بہت پسند کیا جاتا ہے اور کئی ہندوستانی اور پاکستانی سارنگی نوازوں نے عالمی شہرت پائی اور بہت عزت حاصل کی۔ سارنگی میں تار ہوتے ہیں جنہیں انگلیوں سے چھیڑ کر سارنگی نواز مختلف قسم کی موسیقی پیدا کرتا ہے۔ پاکستان اس لحاظ سے خوش قسمت ہے کہ یہاں متعدد نامور اور ہنرمند سارنگی نوازوں نے جنم لیا جن میں استاد نبی بخش خاں، استاد تھو خاں، استاد غلام محمد خاں، استاد ناظم علی خاں، استاد وحید رحش مالوے خاں، استاد شرف الدین خاں، استاد غلام حسین جو کچھ عرصہ قبل ڈھاکہ میں انتقال کر گئے جہاں وہ نقاریب میں حصہ لینے گئے تھے۔ استاد بھیرو خاں، استاد نوازی کرتے ہیں) استاد بندو خاں وغیرہ۔ مذکورہ بالا سارنگی نوازوں نے اس فن کے ماہرین کی حیثیت سے نام پیدا کیا۔ ان سب کا انداز مختلف تھا۔ استاد غلام محمد کی سارنگی میں بہت زیادہ مٹھاس تھی۔ ان سب سارنگی نوازوں نے ملکہ موسیقی روشن آرا بیگم کے ساتھ سنگت کی ہے۔ استاد نزاکت علی خاں، سلامت علی خاں کے ساتھ بھی نامور سارنگی نوازوں نے سارنگی کا جادو چلایا۔

سارنگی ہندوستان کا ساز ہے۔ ہندوؤں کے عقیدے کے مطابق سارنگی راوان کے زمانے میں ایجاد ہوئی تھی۔ راوان شیو دیوتا کا بہت عقیدت مند اور پجاری تھا۔ راوان نے جوش عقیدت میں اپنے جسم کی رگوں کی مدد سے سارنگی بنائی تھی۔ وہ شیو دیوتا کو خوش کرنے کے لیے جو جوش گاتا تھا اس میں سارنگی کو ساز کے طور پر استعمال کرتا تھا۔ اس کے برعکس مسلمانوں کا کہنا ہے کہ سارنگی ایک خالص اسلامی ساز ہے جس کی ایجاد بھی مسلمانوں ہی نے کی ہے۔ دیکھا جائے تو ہندوؤں کے دوسرے عقیدوں کے مطابق سارنگی کو راوان سے منسوب کرنا کچھ عجیب سی بات لگتی ہے۔ ایک طرف تو ہندو راوان سے اتنی نفرت کرتے ہیں کہ اس کے پتلے چلانے میں کونیکھ خود ہندو عقیدے کے مطابق راوان ہی رام چندر جی کی محبوب بیوی سیتا کو بھگا کر لے گیا تھا۔ سیتا کو ساہا سال راوان کے ساتھ رہنا پڑا لیکن ہندوؤں کا عقیدہ ہے کہ

[illegible]



سیتار

اختر شہاب

یہ ایک ایسا آلہ ہے جو آج بہت زیادہ گھروں میں استعمال ہو رہا ہے۔ ہر بڑی کمپنی کروڑوں کی تعداد میں ایسے ریزرو زانہ کی بنیاد پر تیار کر کے بازار... میں بھیجتی ہیں۔ اس قسم کے آلے کی کیا تاریخ ہے۔ ایک مختصر سا جائزہ۔

ایک دلچسپ تحقیقی تحریر قصہ دل پذیر

بلیڈ والا ریزرفوژن محض دو مہینوں میں یورپین اور آسٹریلیان مارکیٹ میں لایج کر کے بہت بڑا جوا کھیلنا تھا مگر عوام کی طرف سے اسے بھرپور پذیرائی ملی۔ شیونگ کی گلوبل مارکیٹ ایک اندازے کے مطابق 9 ملین ڈالرز سے زائد ہے اور انڈیا اور چائنا میں اس مارکیٹ میں مزید اضافے کا امکان ہے۔

کھلی داس نے جو کھنی کی گلوبل کیونیکیشن کی ڈائریکٹر ہیں انہوں نے ہمیں بتایا کہ ہماری کھنی میں ملازموں کو نوکری سے جلد فارغ کرنے کا رواج نہیں ہے۔ آپ کی جس سے بھی ملاقات ہوگی وہ یہاں کے پرانے ملازم ہوں گے۔ 895 ملازموں نے زندگی کے 13800 سال اس کھنی کو دیے ہیں۔

شیونگ میٹرل بنانے والی دنیا کی بڑی اور اولین کمپنیوں میں سے ایک کمپنی میں صحافیوں کی ایک جماعت کے ہمراہ میں بھی آئی تھی اور ہمیں جو معلومات دی جارہی تھیں بلکہ یوں کہنا چاہے کہ معلومات کا جو ایک دریابہا یا جارہا تھا وہ ہمیں جو حیرت کر رہا تھا۔ یہ معلومات اس کمپنی کا نامزدہ ہمیں دے رہا تھا جس کے لیے اس کی صنعتی معلومات کی تجزی یا اس کے راز افشا ہونا اس کمپنی کے لیے ایسی حیلے سے بھی زیادہ خطرناک تھا۔ لیکن اس کے باوجود وہ لوگ ہمیں معلومات فراہم کر رہے تھے۔ یہ الگ بات تھی کہ یہ وہ معلومات تھیں جن کے افشا ہونے سے ان کے کاروبار پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ 2006ء کے آخر میں اس کمپنی نے 5

ایک قصہ پارینہ بن چکی ہے۔ ٹیلی ویژن اور ریڈیو نے اس کو بالکل نظر انداز کر دیا ہے۔ ہمارا بی بی وی جو کہ قومی ادارہ ہے اس نے کلاسیکی اور اسی موسیقی کا بائیکاٹ کر دیا ہے۔ اب تو ایسا لگتا ہے جیسے کہ پوپ میوزک ہی ہماری قومی موسیقی ہے۔ دن رات اوٹ پناٹنگ پوپ گانے اور گانے والوں کی اچھل کود بڑے اہتمام سے پیش کی جاتی ہے۔ اگر کلاسیکی موسیقی پیش بھی کی جاتی ہے تو بہت رات گئے۔ شاید اس لیے تاکہ عوام اس سے لطف اندوز نہ ہو سکیں اور رفتہ رفتہ اس کو فراموش ہی کر دیں۔ کلاسیکی موسیقی کو نظر انداز کرنے کے اس زمانے میں استاد فقیر کا دم بہت غصیت ہے۔ انہوں نے استاد غلام شبیر سے تربیت حاصل کی تھی۔ وہ بہت سے راگوں کے ماہر ہیں۔ استاد فقیر کے والد بھی ایک سارنگی نواز تھے۔ ان کا نام خیر دین تھا۔ استاد خیر دین کے والد یعنی فقیر الدین کے دادا بھی سارنگی نواز تھے۔ استاد فقیر دین نے غیر ممالک میں بھی اپنے فن کا مظاہرہ کیا ہے۔ انہوں نے چین، سنگاپور، جاپان، اور ایشیا میں بھی پروگراموں میں حصہ لیا اور داد و تحسین حاصل کی۔

اگر کوئی ہم سے پوچھے تو یوں تو کبھی ساز میٹھے اور رکش ہوتے ہیں لیکن ستار، سارنگی اور بانسری کی بات ہی الگ ہے۔ آپ نے سنا ہوگا کہ کوئی موسیقار جب اپنی طرز میں ستار، سارنگی یا بانسری کی آواز شامل کر دیتا ہے تو اس کی دلکشی میں مزید اضافہ ہو جاتا ہے۔ یوں تو کبھی نامور موسیقاروں نے ان سازوں کو اپنی طرزوں میں استعمال کیا ہے لیکن خواجہ خواجہ نور نے نمبر 1 کا استعمال مکمل اور نہایت حسین انداز میں کیا ہے، وہ اچھوتا ہے۔

ہندوستان کے سارنگی نواز نواز بسم اللہ خان کی سارے زمانے میں دھوم تھی۔ وہ بنارس کے رہنے والے تھے اور بنارس کے لوگ ان پر فخر کرتے تھے۔ انہوں نے ساری دنیا میں سارنگی نوازی کا مظاہرہ کیا اور داد پائی۔ گزشتہ سال جب ان کا انتقال ہوا تو سارے ہندوستان میں ان کا سوگ منایا گیا۔ بنارس میں تو تین دن تک ہڑتال کی گئی۔ ان کی تدفین کے موقع پر مسلمان اور ہندو سب ہی شریک تھے۔ افسوس کہ سارنگی اور دوسرے کانوں کو بھلے لگنے والے سبھی ساز اور کلاسیکی موسیقی ایک جانے بوجھے منصوبے کے تحت ختم کی جا رہی ہے اور ہم خاموش تماشائی ہیں۔

جاری ہے

راون کے پاس رہ کر بھی سیتا یا کیزہ اور پار سارہی تھی۔ یہ بات ناقابل فہم ہے کہ کسی اور شخص کی بیوی کو کوئی اس کے شوہر سے چھین کر لے اڑے مگر اس کی جسمانی رعنائی اور خوبصورتی کے باوجود اس کو ہاتھ بھی نہ لگائے۔ تو پھر راون کو سیتا کو کھجکا کر لے جانے کا مقصد کیا تھا۔ اگر اسے دیوی سمجھ کر سیتا کی پوجا بھی کرنی تھی تو اس کو کھجکا کر لے جانے کی کیا ضرورت تھی۔ ہندو مذہبی کتابوں میں درج واقعات اور داستانوں کی طرح یہ بھی ایک ناقابل یقین کہانی ہے۔ راون کو ہندوؤں اور شیطان صفت انسان سمجھتے ہیں جبکہ سری لنکا والوں کے نزدیک راون ان کا ہیرو ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ سیتا جی اپنی مرضی سے راون کے ساتھ گئی تھیں۔ اتنی مدت تک جنگلوں اور پہاڑوں میں رہنے کے بعد بھی ان دونوں کا رشتہ پاکیزہ اور بے داغ کیسے ہو سکتا تھا۔ سری لنکا کی آبادی کی اکثریت سیتا کی قوم پر مشتمل ہے۔ عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ سری لنکا کے باشندے بھی ہندو ہیں حالانکہ یہ درست بات نہیں ہے۔ سری لنکا والوں سے بھارت کی نفرت اور دشمنی بھی کوئی پوشیدہ راز نہیں ہے۔ سری لنکا اور بھارتی صوبے تامل ناڈو کے درمیان ایک مقام پر صرف 25 میل کا فاصلہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب سری لنکا میں تاملوں نے بغاوت کی تو انہیں اسلحہ اور فوجی امداد تامل ناڈو سے ہی فراہم کی جاتی تھی۔ بعد میں باغیوں کو کچلنے کے بہانے ہندوستان کی فوج نے سری لنکا میں مقامی آبادی پر بہت ظلم ڈھائے تھے۔ بہر حال یہ ایک علیحدہ کہانی ہے۔

دراصل سارنگی کی دریافت ایران میں ہوئی تھی۔ دوسرے اسلامی ملکوں میں بھی سارنگی استعمال کی جاتی تھی۔ آغاز میں اس کو استادوں کا استاد ساز کہا جاتا تھا۔ سارنگی بھی ستار کی طرح ایک بہت شیریں آواز والا ساز ہے۔ ستار کی ایجاد کو حضرت امیر خسرو سے بھی منسوب کیا جاتا ہے جو موسیقی سے بہت زیادہ دلچسپی رکھتے تھے اور بہت اچھے شاعر بھی تھے۔ انہوں نے کئی ساز اور راگ بھی ایجاد کیے تھے۔ زمانے کے ساتھ ساتھ جب ہندوستانی اور پاکستانی سازندے اور موسیقاروں نے یورپ جانا شروع کیا تو ان کی موسیقی کو بہت پسند کیا گیا۔ پاکستانی فنکاروں نے یورپ اور امریکا میں بہت شہرت اور مقبولیت حاصل کی برطانوی خصوصاً برصغیر کی موسیقی کے بہت دلدادہ تھے۔ راگ، تان، طبلہ، سارنگی اور ستار اگر یزود کو بہت مرغوب تھے۔ اب تو کلاسیکی موسیقی

ان میں سے بہت سوں کو 1975ء سے 1987ء تک کے وہ سیاہ دان بھی یاد ہیں جب ڈسپوزیبل بلیڈوں کی اچانک آمد نے کپنی کی شہرت کو گہنا دیا تھا اور مارکیٹ میں اس کی برتری کو 45 فیصد کم کر دیا تھا لیکن پھر ہم نے سنبھال لیا اور 1990ء میں سترہواں بلڈ متعارف کرایا جو دو بلڈ کا حامل پہلا ریزر تھا جس کے بیڈ میں اچرنگ موجود تھا۔ اس نے شیونگ کی دنیا میں ایک نیا ٹریڈ سیٹ کر دیا۔ ایک بزنس تجزیہ نگار نے سنسکی لائچ کو کاروبار کی دنیا کی تاریخ میں سب سے کامیاب پیش کش قرار دیا۔

داؤمی موڈ سے کئی تاریخ بہت پرانی ہے 3000 قبل مسیح میں چھتاق کے تیز پتھر اور تیز دھار سپہاں مردوں کے چہرے اور جسم کے بال صاف کرنے میں استعمال ہوتے تھے۔ گو کہ یہ ایک تکلیف دہ عمل تھا مگر لوگ جاذب نظر دکھائی دینے کے لیے اس عمل کو انجام دیتے تھے جس سے چہرے کی جلد چمک جاتی تھی اور نشوز ابھر آتے تھے، چہرے پر خون کی رنگت ابھر آتی تھی اور اس دور میں اس کو مردانہ خوبصورتی کہا جاتا تھا۔ اسی وجہ سے 323 ق م میں سکندر اعظم نے اپنی فوجوں کو کلین شیونگ کرنے کا حکم دیا تاکہ جنگ کے دوران مخالف فوجی انہیں داؤمی سے بکر نہ کر سکیں۔ یہ فیشن ہونے لگا تو 300 قبل مسیح میں روم میں پیشور و چھاموں نے لڑائی دکانیں کھول لیں۔ وقت کے ساتھ ساتھ آلات بھی بدلتے رہے تیز دھار والے پتھروں اور سپیوں کی جگہ تیز چاقوؤں نے لے لی۔

1762ء میں فرانسیسی حجام جین جنکس بیریت نے پہلا سیفٹی گارڈ ریزر متعارف کرایا۔ جسے عرف عام میں ہم استرا کہہ سکتے ہیں مگر اس کی دھار تیز رکھنے کا راز صرف اس کے خاندان تک محدود تھا 1847ء میں ویلیم ایس ہنسن نے سکھائی کے داؤتوں جیسی پکڑ والے آلے کی ایجاد کر کے اسے رجسٹرڈ کرایا۔ ان داؤتوں کے درمیان تیز دھار تھی پھنسی جاسکتی تھی اسے سیفٹی ریزر کا نام دیا۔ پھر 1880ء میں مزید ایک قدم بڑھا، مئی 1880ء میں فیڈرک اور اوٹو کمن آف پروٹیکٹن نے اسے مزید بہتر بنا کر پیش کیا۔ پھر 1801ء میں وکس سوڈ جسے شیک بھی کہا جاتا تھا۔ شاہ جارج سوم کو تیز دھار شیونگ فراہم کر کے شیونگ میٹرٹیل سلائی کرنے والے پہلے سوداگر کا اعزاز حاصل کر لیا مگر اب بھی شیونگ ایک تکلیف دہ عمل تھا، جلد چمک جاتی تھی، نشوز ابھر آتے تھے۔ پھر کسی نہ معلوم شخص نے جھاگ لگا کر شیونگ کرنے کا تجربہ کیا اور یہ تجربہ ہر دل عزیز ہو گیا۔ 1870ء تک شیونگ

صابن اور آفٹر شیو لوشن گھر گھر استعمال ہونے لگے تھے۔ 1878ء تک تیز دھار کی ایسی پتی (بلیڈ) استعمال ہو رہی تھی جسے بار بار بدلنا پڑتا تھا۔ اسی دوران امریکن ایورڈی کمپنی نے ایسی پتی پیش کی جس کی دھار دیر پا تھی۔ جیم ٹکری کمپنی نے ”جیم“ کے نام سے مزید دیر پا دھار کی پتی ایجاد کر لی۔ اسی دوران فیک ریزر کمپنی نے 1920ء کو شو سے بدلنے والا بلیڈ ایجاد کر لیا جس کے دونوں طرف دھار تھی۔

1895ء میں امریکا میں سلفری سٹیز مین لنگس کمپ جلیٹ نے ایک ڈسپوزیبل ریزر بنایا جسے بہت مقبولیت حاصل ہوئی۔ اسی تجربے کی بنیاد پر 1920ء میں جرمنی میں جھاموں نے شیونگ سوپ میں نیو ایکریم ملا کر شیونگ کا شروع کیا۔ انہوں نے اسے روٹزر اس شیونگ کا نام دیا تھا جو صرف امراء کے لیے مختص تھا وہ لنگس کمپ جلیٹ کے ریزر ہی استعمال کرتے تھے۔ اس کمپنی کے ریزر پوری دنیا میں مقبول تھے۔ کئی دیگر کمپنیوں نے بھی ریزر بنانے کی شروعات کر دی تھی پھر بھی اس کمپنی کی مقبولیت کسی طور کم نہیں ہو پا رہی تھی۔

بازار میں مقابلہ شروع ہوا تو کمپنی نے تجربات کا دائرہ بڑھا دیا۔ کئی ایک قسم کے ریزر بنائے مگر اسٹین لیس اسٹیل بلیڈ اپنی افادیت کی وجہ سے جزائفتک رہا۔ ان تجربات کو کامیابی عطا کرنے کے لیے 1932ء میں اس نے نیلے رنگ کا پالتو ریزر متعارف کرایا جس نے خریداروں کو مداح بنالیا پھر 1956ء میں اسٹین لیس اسٹیل بلیڈ متعارف کرایا پھر 1970ء میں دیر پا ٹنگس بلیڈ متعارف کرایا پھر 1971ء میں GII ریزر متعارف کرایا۔ 1977ء میں کمپنی نے کنٹور نامی پہلا دھرے والے بلیڈ مارکیٹ میں لا کر دھوم مچادی اور 1990ء میں جلیٹ ستر متعارف ہونے سے ماڈرن شیونگ کا دور شروع ہوا۔ 1992ء میں شیک نے پروٹیکٹو نامی ریزر لائچ کیا اور 1995ء میں جلیٹ نے مارخ 3 لائچ کیا پھر 2000ء میں جلیٹ نے فیوژن متعارف کرایا۔ اس طرح جلیٹ نے اپنا کھو ہوا اعزاز پھر سے حاصل کر لیا۔ جلیٹ ہر سال اور بھی کئی سال میں کئی کئی بار صاف کو بلا کر پریس شوکا انعقاد کرتی ہے۔ اس بار میں بھی شو میں شریک ہونے کے لیے اپنے اخبار کی طرف سے آئی تھی۔

☆☆☆

شیونگ کمپنی کے مرکزی ہال میں داخل ہونا اور اس میں بیٹھنا ایسا ہی ہے جیسے آپ ٹی وی کے ”دن میں شو“ کے اشتاعتوں میں شامل ہوں۔ آدھے گھنٹے کے اسلڈ کامیڈی پروگرام میں انہوں نے عورتوں کی بجائے مردوں کو ہی تنقید کا نشانہ بنایا۔ اس کے بعد ہمیں بہت تیزی سے ٹیلیزی کے اسٹیل کی دیواروں سے گھرے ہوئے ایک سیشن میں لے جایا گیا تاکہ ہم سب سے زیادہ بکے والے ریزر کو بننا ہوا دیکھ سکیں۔ مارخ 3 مارکیٹ میں لائچ ہونے کے بعد صرف 7 سالوں میں 9 بلین ڈالر سے زائد میں فروخت ہوا۔

کا سٹرونے ہمیں بتایا ”جلیٹ کمپنی ہر سال اسٹیل کے اتنے لچے استعمال کرتی ہے جسے کرہ ارض کے گرد 20 مرتبہ لپٹا جاسکتا ہے۔“ اس کے بعد ہمیں وہاں لے جایا گیا جہاں ہاتھ روز میں اچھے صحت مند میٹرز حضرات صابن لگاتے مٹھکے خیز شکیں بناتے دو انجمن ریزروں سے شیونگ کر رہے تھے تاکہ وہ ان کی کوئی کو جاکھیں۔ ایک اچھے ریزر میں 60 کے قریب خوبیاں ہونی چاہئیں مثلاً ریزر گارڈوں پر آرام سے پھلتا ہوا چلے، شیونگ بلیڈ کا سرا آرام اور تیزی سے حرکت کرے، چہرے کی ناہوار جگہوں پر کٹ لگائے بغیر شیونگ کر سکے، شیونگ کے بعد چہرے پر ہاتھ بھیرنے سے چہرہ کلین محسوس ہو اور بال کی تختی غائب ہو وغیرہ وغیرہ۔ یہ تمام میٹرز حضرات شیونگ کے بعد اس ریزر کی خوبیوں اور خامیوں کو سامنے رکھے کمپیوٹر میں فیڈ بھی کر رہے تھے۔ کمپنی نے ان ماہرین سے 9000 سے زائد میٹ کرانے اور ان ماہرین نے فیوژن پر مارخ 3 کو ترجیح دی۔

ڈاکٹر ہرڈ چک جو جلیٹ شیونگ ٹیکنالوجی میں وائس پریزیڈنٹ ہیں اور ان کے پاس مکینیکل اور میکینیکل انجینئرنگ کی ڈگری ہے۔ اس وقت تازہ تازہ شیونگ کر کے آئے ہوئے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ ریزر کی کارکردگی محض بلیڈوں کی تعداد پر منحصر نہیں ہوتی اس کی چند اور بھی وجوہات ہیں۔ وہ کیا وجوہات ہیں انہوں نے یہ راز ظاہر کرنے سے گریز کیا۔ انہوں نے ہمیں 1930ء کی ایک لمبی بلیڈ ریزر کی تصویر دکھاتے ہوئے کہا ”فیوژن ٹیکنالوجی کو 70 سے زائد میٹ سے محفوظ کیا گیا ہے ان میں سے کچھ منظور ہو گئے ہیں اور کچھ زیر غور ہیں۔“

”آپ شاید سمجھ رہے ہیں کہ پانچ بلیڈ کا ریزر کوئی نئی بات ہے۔ نہیں جی نہیں! یہ کوئی نیا آئیڈیا نہیں ہے۔“ ہرڈ چک

ماہنامہ ایسٹرن گزٹ

سنگل بلیڈ: آج کل ڈسپوزیبل میں ملتا ہے۔ بہت جلدی کند ہو جاتا ہے۔ حساس جلد والوں کو کٹنی شیونی ہے۔ ڈبل بلیڈ: برطانیہ کے اخبارات میں آیا ہے کہ 93 سالہ جارج ملر جلیٹ کا 1929ء کا بنایا ہوا سیفٹی ریزر ابھی تک استعمال کر رہا ہے۔ یعنی قابل اعتماد ہے۔ ٹین بلیڈ: مارخ 3 پہلا بلیڈ ہے جس میں تیز دھار والی پٹیاں استعمال ہوتی ہیں۔ بلیڈ کا دھرا اس کے نیچے حصے میں ہے جو بلیڈ کو پینٹ برش کی طرح استعمال کرنے پر مجبور کرتا ہے۔ جس سے بہتر نتائج حاصل ہوتے ہیں۔ چار بلیڈ: کو اٹرا اور شک کمپنی کے بلیڈوں کی فروخت 800 ملین ڈالر تک پہنچ گئی ہے۔ ہائی بلیڈ: اس میں مارخ 3 کی نسبت 30 فیصد نزدیک بلیڈ لگایا گیا ہے بلیڈوں کے نزدیک ہونے کے سبب شیونگ کرتے وقت شیونگ کی طاقت برابر تقسیم ہوتی ہے۔ اس کے نیچے ایک چھٹا بلیڈ بھی ہے جو رواں صاف کرنے کے کام آتا ہے۔

☆☆☆

o عام آدمی اپنی زندگی میں 20,000 مرتبہ شیونگ کرتا ہے۔ یوں وہ آئینے کے سامنے 3000 گھنٹے کھڑا ہوتا ہے۔

o 90 فیصد سے زائد نوجوان چہرے پر آنے والے بالوں کو تراشتے رہتے ہیں۔ خواہ موچیں ہوں، ٹیوڈی یا گال کے بال ہوں یا ٹیوڈی اور ہونٹوں کے درمیان والی جگہ کے بال ہوں۔

o مرد سالانہ 90 بلین ڈالر شیونگ پر خرچ کرتے ہیں۔

o اپنی پوری زندگی میں انسان چہرے کے جو بال صاف کرتا ہے اگر ان کی لمبائی تانی جائے تو وہ 8 میٹر طویل ہوگی۔

o امریکا میں سب سے زیادہ چوری جلیٹ کے مارخ 3 بلیڈ کی ہوتی ہے۔

☆☆☆

نے بتایا ”ہم اس ٹیکنالوجی پر تقریباً 10 سال سے کام کر رہے ہیں۔ اس کی تیاری اور اسے 2006ء میں امریکا میں لانچ کرنے میں 1 ملین ڈالر خرچ ہوئے ہیں۔ اور اسے ساری دنیا میں پھیلانے میں 18 ماہ لگے۔“

جب جلیٹ نے یہ اعلان کیا کہ ہم مارکیٹ میں 5 بلینڈوں والا ریزر لارہ ہے ہیں تو میڈیا نے نہ صرف اس کا مذاق اڑایا بلکہ اسے پاگل پن سے بھی تعبیر کیا۔ اس بارے میں اکنٹاک میگزین نے لکھا کہ اگر اسی طرح بلینڈوں کی تعداد بڑھتی رہتی تو 2100ء تک مرد حضرات 14 بلینڈوں والا ریزر استعمال کر رہے ہوں گے۔

ایک اور امریکی صفائی اینڈریو سارن نے کچھ اس طرح تنقید کی کہ میرا خیال ہے پہلے دو بلینڈ پال کو کھینچنے اور پال کی گائٹھ کو کھانے کے لیے ہیں جبکہ باقی دو غیر متوقع بالوں کی صفائی کے لیے مگر پانچویں بلینڈ کا آخر کیا مصرف ہے یہ بات کسی کی بھی سمجھ میں نہیں آتی۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ پانچواں بلینڈ ماحولیاتی اثر کے بیان کو لکھنے کے لیے استعمال ہوا ہو۔

اسی قسم کے ری ایکشن کا سامنا جلیٹ کبھی پچھلے تیس سالوں سے کر رہی ہے۔ ایسی ہی تنقید امریکی کامیڈی شوئیر ڈے ٹائٹ میں 1975ء میں بھی ہوئی تھی جب جلیٹ نے 2 بلینڈ کاریزر مارکیٹ میں ڈالا تھا۔ انہوں نے کہا کہ 2 بلینڈوں کے بعد اب 3 بلینڈ والا ریزر بھی آئے گا، اور ہم نے مارخ 3 لانچ کر کے ان کا منہ بند کر دیا۔ ان تھاؤں کا کیا ہے وہ تو کہتے ہی رہتے ہیں۔ ہمیں تو صارفین کا رد عمل دیکھنا ہے اور انہوں نے 2006ء میں فیوژن کے مارکیٹ میں آنے کے بعد جب اس کا تجربہ کیا تو انہوں نے اپنے بوؤں کا منہ کھول دیا۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ اپنے بوؤں سے ہمارے حق میں ووٹ ڈال کر اس کا جواب دیا اور پہلے سات ماہ میں 220 ملین ڈالرز کی بکری ہوئی۔

بہت سے تھاؤ جلیٹ کو ”معمولی تبدیلی سے کمائی“ کا لازم قرار دیتے ہیں۔ معمولی تبدیلی سے کمائی، ایک اصطلاح ہے جو سب سے پہلے جوتے بنانے والی انڈسٹری میں متعارف ہوئی جنہوں نے اسپورٹس شوز میں محض معمولی سی تبدیلیاں کیں اور ان کا بڑھا چڑھا کر پروپیگنڈا کرنے کے بعد جوتوں کی قیمتوں میں ہوشربا اضافہ کر دیا۔

”لیکن جلیٹ میں ایسا نہیں ہے“ ہرزڈ چک بولا ”مردوں کے لیے شیوگ بہت سی تیشات میں سے ایک

ہے۔ ہم نے فیوژن میں بلینڈ کو مارخ 3 کی نسبت 045 ملی میٹر قریب لگایا ہے۔ جس سے شیو کرتے وقت بالوں پر پڑنے والے دباؤ میں تقریباً 40 فیصد کمی ہوئی ہے جس سے شیو کرنے میں مزہ آنے لگا ہے۔ ویسے بھی ریزر بلینڈ انسانی ٹشو پر بالوں کو کاٹنے والی نازک ترین چیز ہے۔ اس میں معمولی سی ایئس بین کی بیشی چہرے کو زخمی کر سکتی ہے۔ ہم بار بار تبدیلیاں نہیں کرتے اور نہ ہی کوئی نیا بلینڈ لانچ کرنے یا پرانے میں تبدیلی کے کام کو ہلکے طور پر لیتے ہیں۔ ہم یہ کام پوری احتیاط اور دیانتداری سے کرتے ہیں اور ہم نے فیوژن میں 5 بلینڈ لگائے ہیں ان میں کوئی بھی اضافی ٹیکنالوجی ہے بلکہ ہر ایک کا اپنی جگہ ایک اہم رول ہے۔“

تھاؤں کا یہ بھی کہنا ہے کہ جلیٹ نے جب مارخ 3 لانچ کیا تو اس بات کی پہلی میں لاکھوں ڈالر صرف کیے کہ ”مارخ 3 بہترین ہے“ وہی جلیٹ اب فیوژن کو بہترین کہہ رہی ہے۔ جلیٹ کی دونوں باتوں میں سے کس کوئی سمجھا جائے اور آیا کہ جلیٹ جب کوئی نیا بلینڈ لانچ کرے تو وہ اس کو بھی بہترین قرار دے گی سو جلیٹ کی کس بات کو بچ مانا جائے۔ چپ برن جو گلوبل پرنس کرومنگ نامی ایسوسی ایشن کے صدر ہیں کہتے ہیں کہ ہمارا مانو ہے کہ ہمیں بہتر سے بہترین شیو کی طرف جانا ہے۔ تھاؤں کی اس تنقید کا جواب یہ ہے کہ فیوژن کے آنے تک مارخ 3 ہی بہترین تھا اب اور اگر ہمیں شیو کرنے کا کوئی بہتر طریقہ نظر آتا ہے۔ جو ظاہر ہے کہ نہیں نہ کہیں موجود ہے تو ہمیں اسے ڈھونڈنے اور اسے کام میں لانے میں کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہیے۔ اور اگر یہ کام فیوژن یا کوئی اور ریزر کر رہا ہے تو یہ تو اچھی بات ہے۔

یہ بات تو فیوژن نے ثابت کر دی ہے کہ شیوگ ان چند ایک کاروباروں میں سے ہے جن میں مہنگی ترین پروڈکٹ بیسٹ سیکر ہوتی ہیں۔ اس کے علاوہ جلیٹ والوں کا کہنا ہے کہ ہم اس وقت تک اپنی کوئی نئی پروڈکٹ مارکیٹ میں نہیں لاتے جب تک اس کی قائم مقام پروڈکٹ کو اپنے ابتدائی مراحل میں لانا شروع نہ کر دیں۔ ہرزڈ چک نے سنی پروڈکٹ کا آئیڈیا دینے ہوئے کہا کہ میں اس سے زیادہ آپ کو نہیں بتا سکتا کہ ایک نئی ٹیکنالوجی متعارف کرانے میں اور بھی عوامل ہوتے ہیں محض بلینڈوں کی تعداد ہی کافی نہیں ہوتی۔

www.fox.com

13 دسمبر 2006ء کی ایک خوش گوار صبح تھی۔ بین الاقوامی شہرت یافتہ امریکی ایٹھلیٹ ڈینیئل بیٹی اپنے لیپ ٹاپ میں مصروف تھی اور کچھ ضروری خطوط کا جواب دے رہی تھی۔ اس کی عمر صرف تیس سال تھی اور غیر شادی شدہ تھی۔ اس کا معمول تھا کہ وہ علی الصباح بیدار ہوتی، اپنی ڈاک دیکھتی، ضروری خطوط کے جوابات دیتی، پھر اپنے پالتو گتے نیر کے ساتھ جامنگ کے لیے نکل جاتی۔

اس دن موسم خاصا خوش گوار تھا۔ ڈینیئل نے سوچا کہ

بے زبالی ہمدرد

امیمہ سلیم

وہ ہر روز چہل قدمی کی خاطر گھر سے نکلتی تھی، اس دن بھی اپنے عزیز ارجان کتے کے ساتھ نکلی تھی۔ اسے کیا پتا تھا کہ اس کی زندگی میں ایک بہت بڑی تبدیلی آنے والی ہے۔ وہ ایک بڑے حادثے کا شکار ہونے والی ہے۔

اگر اس روز اس کے ساتھ کتا نہ رہتا تو.....



منٹ مبر کرو، میں اس خط کا جواب تو مکمل کر لوں۔“
”بھوں... بھوں...“ فیروز نے پھر اس کی آستین پکڑ کر
کہنچی۔

”فیروز؟“ ڈینیل نے مصنوعی ہنسی سے کہا۔ ”میرے
کام لو۔ میں نے کہا، ابھی چلتے ہیں۔“
فیروز گویا اس کی بات سمجھ گیا اور خاموشی سے ایک طرف
بیٹھ گیا۔
ڈینیل نے ای میل کا جواب مکمل کیا اور لپ ٹاپ بند
کردیا۔

فیروز ایک مرتبہ پھر بے چینی سے پکر لگانے لگا۔
ڈینیل نے پیار سے اس کے سر پہ ہاتھ پھیرا اور
بولی۔ ”فیروز! آج ہم کسی سیر پر جائیں گے۔ یوں بھی آج کل
چشیاں ہیں۔“
فیروز نے پھر بے چینی کا مظاہرہ کیا۔
”اچھا بابا، پہلے مجھے کچھ کھاتو لینے دو۔“ ڈینیل
مسکرائی۔

اس نے اپنے ہاتھ میں ایک سینڈویچ پکڑا، اپنی
پینٹ کی چمکی جیب میں جو اس کے گھٹنے کے پاس تھی، اس
میں پانی کی ایک بوتل رکھی۔ لیتے ضروری سامان اس کی
گاڑی میں تھا۔
اس نے گاڑی کی چابیاں اٹھاتے ہوئے کہا۔ ”چلو
فیروز!“

فیروز اس سے پہلے ہی گاڑی تک پہنچ گیا تھا۔ ڈینیل
نے اس کے لیے پنجر سیٹ کا دروازہ کھولا اور خود ڈرائیونگ
سیٹ پر بیٹھ گئی۔
وہ ڈرائیونگ کے ساتھ ساتھ سینڈویچ بھی کھا رہی
تھی۔ فیروز بھی اس سینڈویچ میں اس کا حصہ دار تھا۔
جلدی ہی وہ چھوٹی بڑی بے شمار پہاڑیوں سے گھرے
ہوئے کنیسن کے ریگستانی علاقے میں پہنچ گئے۔ وہ پہاڑی
سلسلہ بھی عجیب تھا۔ اس کے چاروں طرف چھوٹی بڑی بے شمار
بھوری بھوری چٹانیں تھیں اور درمیان میں نرم اور کھیں کھیں
سے رہتی زمین تھی۔

گاڑی ایک جگہ روک کر ڈینیل گاڑی سے اتری تو
اس کے پیچھے پیچھے فیروز بھی چھلانگ لگا کر باہر آ گیا۔
ڈینیل نے فیروز کو ایک پیٹ ہاؤس سے اس وقت خریدا
تھا جب وہ محض چند ہفتے کا پلا تھا۔ اب وہی اس کی تنہائی کا
ساتھی اور اس کا سب سے بہترین دوست تھا۔

گاڑی سے نکلے ہوئے ڈینیل نے احتیاطاً اپنی
جری بھی لے لی تھی لیکن اسے پہننے کے بجائے گھر سے
باندھ لیا تھا۔

پھر اس نے معمول کے مطابق جاگنگ شروع کر دی۔
ڈینیل عالمی شہرت یافتہ ایتھلیٹ تھی اور کئی بین
الاقوامی مقابلوں میں انعامات حاصل کر چکی تھی۔ اس لحاظ
سے وہ نہ صرف اپنی ریاست بلکہ ملک بھر میں معروف تھی۔
اس نے لمبی رفتار سے دوڑتے ہوئے کہا۔ ”آؤ فیروز!
آج دوڑنے کا مقابلہ ہو جائے؟“

گتے نے ہلکی سی ”بھوں“ سے اس کی بات کا جواب دیا
اور گولی کی طرح وہاں سے نکل گیا۔
وہ بہت تیز رفتاری سے دوڑ رہا تھا۔ ڈینیل جانتی تھی
کہ جس طرف فیروز جا رہا ہے، وہ خاصا مخدوش پہاڑی سلسلہ
ہے۔ اس طرف تو وہ خود بھی آتے ہوئے احتیاط کرتی تھی۔
اس نے چیخ کر فیروز کو آواز دی۔ ”فیروز! آگے مت
جاؤ۔“

لیکن کتا اس کی نظروں سے اوجھل ہو چکا تھا۔ اس نے
شاید اس کی آواز ہی نہیں سنی تھی۔
ڈینیل ایک مرتبہ پھر چیختی۔ ”فیروز! واپس
آ جاؤ۔“

اجانک اس کے کانوں میں چھوٹے چھوٹے پتھروں
کے لڑھکنے کی آواز آئی۔ وہ پوری قوت سے چیختی۔ ”فیروز! اور
دیوانہ وار اس طرف بھاگی جدر سے آواز آئی تھی۔
اجانک اسے فیروز نظر آ گیا۔ وہ ایک پہاڑی سے
دوسری پہاڑی پر چب لگا رہا تھا۔

ڈینیل کا دل اچھل کر گویا حلق میں آ گیا۔ اس نے زور
دار انداز میں آواز دی۔ ”فیروز! اور اس طرف بھاگی۔
اجانک اس کا پاؤں پھسلا لیکن اس نے فوراً ہی اپنا
توازن بحال کیا اور رک کر فیروز کو پھر آواز دی۔ اس بھاگ
دوڑ میں اس کی سانس بری طرح پھول گئی تھی۔

اس مرتبہ گتے نے اس کی آواز سن لی اور وہ تیزی سے
اس کی طرف آ گیا۔ اس کے آنے سے پھر پہاڑیوں سے چٹ
پتھر لڑھکنے لگے۔ فیروز اچھلتا کودتا اس تک پہنچ گیا اور اس کے
قدموں میں لوٹنے لگا۔
”تم بہت برے گتے ہو۔“ ڈینیل نے ناراضی سے
کہا۔ ”میں کب سے تمہیں آواز دے رہی ہوں۔ تم میری
آواز نہیں سن رہے تھے؟“

فیروز یوں سر جھکائے بیٹھا تھا جیسے ڈینیل کی بات سمجھ رہا
ہو اور اپنے کیے پر شرمندہ ہو۔ وہ ایک مرتبہ پھر اس کے
قدموں میں لوٹنے لگا۔ یہ گویا اس بات کا اظہار تھا کہ فیروز
اپنے کیے پر شرمندہ ہے۔
”چلو، اب دوسرے راستے پر چلو!“ ڈینیل نے
کہا۔ ”بے وقوف ایہ علاقہ بندوش ہے۔“

کتا اچھلتا ہوا واپس بھاگا۔ ڈینیل نے بھی واپسی کا
رخ کیا اور ابھی چند ہی قدم بھاگی تھی کہ اس کے قدموں کے
نیچے سے زمین نکل گئی۔ اس کے پاؤں کے نیچے آنے والا
ایک پتھر اس طرح پھسلا تھا کہ ڈینیل اپنا توازن برقرار نہ رکھ
سکی۔ اس نے ارد گرد کی چٹانوں کو پکڑنے کی کوشش کی لیکن
کامیاب نہ ہو سکی۔

اس کے نتیجے میں وہ ایک بلند پہاڑی چوٹی سے کچھ
دور تک نیچے کی طرف ہل سکتی گئی۔ اس پہاڑی چوٹی کی بناوٹ
ایسی تھی کہ اس کی ڈھلان کچھ میٹر بعد اچانک ختم ہو گئی اور
ڈینیل لمبے بھڑکے ہوا میں مل گئی۔ اس نے ہاتھ پاؤں
مارے لیکن دوسرے ہی لمحے وہ تقریباً ساٹھ فٹ کی بلندی
سے دھڑام سے زمین پر جا گری۔

اس کے حلق سے ایک دل خراش چیخ نکلی اور وہ چند لمحوں
کو ہوش و حواس کھو بیٹھی۔ لیکن صرف چند لمحے بعد ہی اسے شدید
تکلیف کا احساس ہوا۔ اس کی کمر اور جسم کے نیچے حصے میں
شدید تکلیف ہو رہی تھی۔ اس نے کراہتے ہوئے آنکھ کی کوشش
کی لیکن وہ شدت کرب سے چیختی ہوئی پھر زمین پر گر پڑی۔
ڈینیل خاصی مضبوط قوت ارادی کی حوصلہ مند لڑکی تھی۔
ایتھلیٹ کی حیثیت سے اس نے اپنا نام یوں ہی نہیں کمایا تھا۔

اس نے چند گہری گہری سانسیں لے کر اپنے جسم کی
قوت کو پہنچ کیا اور ارد گرد کا جائزہ لیا۔ دور دور تک بے آب و
میکہ اچانک پھیلی ہوئی تھیں اور وہاں چند جیلوں اور
دیر سے پرندوں کے علاوہ کسی تنفس کا وجود بھی نہیں تھا۔ اس
کا تائیز بھی اوپر ہی نہیں رہ گیا تھا۔

ڈینیل نے جسم کی پوری قوت مجتمع کر کے ایک مرتبہ پھر
اپنے کی کوشش کی لیکن کرب ناک انداز میں چیختی ہوئی پھر
زمین پر گر گئی۔ اس کا پتلا جسم تقریباً بے جان ہو رہا تھا۔ اس
کے ہر حرکت تو کر رہے تھے لیکن اس کے جسم کا بوجھ اٹھانے
کے قابل نہیں تھے۔ وہ تو یہ بھی نہیں دیکھ چکی تھی کہ اس کے جسم
پر کھال اور کس قسم کی چوٹ آئی ہے۔ خاص طور پر اس کی کمر کا
بالاں حصہ اور بالیاں پاؤں تو تقریباً مفلوج ہو رہے تھے۔

اس نے زمین سے سرٹکا کر اپنی ہمت ایک مرتبہ پھر
مجموع کی اور خود کلائی کے انداز میں کہا۔ ”ہمت کرو ڈینیل!
کسی کو بھی علم نہیں ہے کہ تم کنیسن کے اس پہاڑی سلسلے کی
طرف آئی ہو۔ ہمت کرو اور کسی نہ کی طرح اپنی گاڑی تک
پہنچنے کی کوشش کرو۔“

اس کے انداز کے مطابق اس کی گاڑی وہاں سے
تقریباً تین چار کلومیٹر کے فاصلے پر تھی لیکن خاصی بلندی پر
تھی۔ اسی وقت فیروز اسے ڈھونڈتا ہوا دوسرے راستے سے
وہاں تک آ گیا اور دیوانہ وار اس کے ہاتھ اور منہ چومنے لگا۔
”میری مدد کر فیروز!“ ڈینیل نے گتے سے زیادہ خود
سے کہا۔ ”مجھے ہر حال میں رات ہونے سے پہلے یہاں سے
نکلنا ہے۔ پلیز میری مدد کرو، مجھے راستہ بتاؤ۔“

گتے اس کے اشارے پر ایک طرف بھاگنے لگا۔ اس
بے زبان کو کب خبر تھی کہ اس کی میلوں تک بے مکان دوڑنے
والی مالکہ اس وقت اپنے پیروں پر کھڑی ہونے سے بھی
محذور ہے۔

وہ کچھ دور تک دوڑتا ہوا گیا لیکن جب اس نے یہ
دیکھا کہ ڈینیل اس کے پیچھے نہیں آ رہی ہے تو وہ واپس آ گیا
اور اس کے نزدیک ہی منڈلانا لگا۔

”اس کا مطلب یہ ہے کہ مجھے یہ فاصلہ گھٹ گھٹ
کر طے کرنا پڑے گا۔“ ڈینیل نے خود کلائی کے انداز میں
کہا۔ ”لیکن میں کتنی دور تک گھٹ گھٹ سکوں گی اور کب
تک..... سورج غروب ہونے سے پہلے تو میں کسی بھی حال
میں اپنی گاڑی تک نہیں پہنچ سکوں گی۔“ ڈینیل نے مایوسی
سے سوچا۔ ”اور اگر میں گاڑی تک پہنچ بھی گئی تو اسے ڈرائیونگ
کیسے کروں گی؟ نہیں ڈینیل ایہ ناممکن ہے۔“

”یہ ناممکن نہیں ہے۔“ ڈینیل اپنی بات کے جواب پر
خود ہی چیختی۔ ”میں گاڑی تک ضرور پہنچوں گی۔ یہ میں کیسی
مایوسی کی باتیں کر رہی ہوں۔ ایک مرتبہ ٹارگٹ تک پہنچ
جاؤں پھر کچھ اور سوچوں گی۔“

فیروز بہت غور سے اپنی مالکہ کو دیکھ رہا تھا۔ اس کی
باتیں سن رہا تھا۔ اسے بھی احساس ہو گیا تھا کہ اس کی
مالکہ اپنے قدموں پر کھڑی نہیں ہو سکتی، اور سمیٹ یا کی
کیفیت میں مبتلا ہے۔

اس وقت اس پہاڑی سلسلے کنیسن کا درجہ حرارت چھبیس
ڈگری سینٹی گریڈ تھا۔ دھوپ میں اتنی تپش تو نہیں لیکن ڈینیل کو
تکلیف کے باعث سورج کی وہ گرمی بھی گراں گزار رہی تھی۔

اس نے جسم کا سارا زور لگایا اور کسی نہ کسی طرح اوندری ہونے میں کامیاب ہوئی۔ ایسا کرتے ہوئے اسے شدید تکلیف کا احساس ہوا لیکن اس نے اپنی جیچوں اور کراہوں کو اپنے حلق میں گھونٹ لیا۔ اب وہ سینے اور پیٹ کے بل گھسنے کو تیار تھی۔

فیروز خور سے اس کی تمام حرکات دیکھ رہا تھا۔ اگر ڈینیل کے پاس ایک رسی ہوتی تو شاید فیروز اسے کسی نہ کسی طرح پھینچ کر گاڑی تک پہنچا دیتا۔

اس نے ایک ایک انچ کر کے آگے بڑھنا شروع کر دیا۔ ایسا کرتے ہوئے اسے شدید تکلیف محسوس ہوتی لیکن یہ تکلیف بہر حال اس دیرانے میں بے یار و مددگار مرنے سے کہیں بہتر تھی۔

ایک ایک انچ کر کے سر کٹے ہوئے اس نے بہ مشکل تمام دو ڈھانکی سو میٹر کا فاصلہ طے کیا ہوگا۔

سورج اب مغرب کی طرف جگ گیا تھا اور دھوپ کی تمازت ختم ہو چکی تھی۔

ڈینیل نے ایک مناسب جگہ دیکھ کر خود کو پھر سیدھا کیا اور بری طرح ہانپنے لگی۔ اس مشقت میں اس کے نچلے جسم میں تو شدید تکلیف ہو رہی تھی، اس کی کہنیاں اور بازو بھی اڑھڑ گئے تھے۔

اسے شدید پیاس کا احساس ہو رہا تھا۔ اچانک اسے خیال آیا کہ اس کی ہڈی پاؤں تک پیٹ میں گھسنے کی جیب میں پانی کی بوتل تھی۔ اگر اس کے گرنے میں وہ بوتل اس کی جیب سے نکلی نہیں ہوگی تو اب بھی اس کی جیب میں موجود ہوگی۔

اس کا ہاتھ تو جیب تک نہیں پہنچ سکتا تھا۔ اس کے لیے اسے خاصا آگے جھکنا پڑتا۔ اس نے ایک مرتبہ کوشش کی بھی لیکن اتنی شدید تکلیف ہوئی کہ وہ بری طرح غڑھال ہو گئی۔

خوش قسمتی سے اس کا دایاں پاؤں اتنا ناکارہ نہیں ہوا تھا۔ اس نے پاؤں اٹھانے کی کوشش کی، اسے تکلیف کا احساس ہوا لیکن وہ تکلیف کی پروا کیے بغیر پاؤں کو اوپر اٹھاتی رہی لیکن پھر اس کی قوت برداشت جواب دے گئی۔ پانی کی بوتل اس کی جیب میں پھنسی ہوئی تھی۔ اگر جیب ڈھیلی ہوتی تو وہ بوتل پھسل کر نیچے گر جاتی۔ یہ بھی قسمت تھا کہ پانی کی بوتل کا اوپر کی حصہ جیب سے باہر تھا۔

اس نے دائیں پاؤں کا گھٹنا دوسری مرتبہ موڑنے کی کوشش کی لیکن ایسا کرنے کی وجہ سے اس کی جینیں نکل گئیں اور آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

فیروز اس کی طرف دوڑا اور اپنی زبان سے اس کے آنر اور چہرہ چاٹنے لگا اور اپنی بے قراری کا اظہار کرنے لگا۔

اس دیرانے اور تنہائی میں اس کتے کا دم بھی نمیٹ تھا۔ فیروز کے ہمدردانہ رویے سے ڈینیل کو دلی سکون ملا۔

پھر اچانک ہی گویا مجھڑ ہو گیا۔ اس نے اپنا دائیں پاؤں سیدھا کیا تو پانی کی بوتل پاؤں سے نکل آئی اور رخصتی ہوئی اس کے ہاتھ کے نزدیک پہنچ گئی۔

ڈینیل نے دیوانہ وار بوتل کو ہاتھ لیا اور مارے خوشی کے اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ انسان جب کسی انتظار اور مصیبت میں ہوتا ہے تو چھوٹی چھوٹی باتیں بھی اسے بہت حوصلہ دیتی ہیں اور اسے ان چیزوں کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے جو عام زندگی میں کسی بھی طور نہیں ہوسکتی۔

ڈینیل نے پانی کی بوتل کھولی اور اس کے کئی گھونٹ ایک ساتھ چڑھا گئی۔

اچانک اس نے خود کھلائی کے انداز میں کہا۔ ”بس کر، ڈینیل! تمہارے پاس پانی کی یہی مقدار ہے اور ابھی تمہیں تقریباً چھوڑے کلومیٹر تک پیٹ اور سینے کے بل گھسنا ہے۔

پانی پیئے پیئے ڈینیل رک گئی۔ اس نے بہ مشکل تمام خود پر قابو پایا تھا اور خود کو مزید پانی پینے سے باز رکھا تھا۔ اس نے بوتل کا ڈھکن مضبوطی سے بند کیا اور اس مرتبہ اسے اپنے ہاتھوں میں تمام لیا۔

پانی پینے سے اسے اپنے جسم میں ایک نئی توانائی کا احساس ہوا تھا۔ وہ ایک مرتبہ پھر اپنے ”سفر“ پر روانہ ہونے کے لیے ہمت جمع کر رہی تھی۔

وہ جسم کی پوری قوت جمع کر کے ایک مرتبہ پھر اوندری ہوئی۔ چند لمحے تک تکلیف کی شدت پر قابو پائی رہی، پھر ایک ایک انچ کر کے آگے سر کٹے گئی۔ وہ سر کٹے سر کٹے سر اٹھا کر یہ بھی دیکھتی تھی کہ ابھی کتنا فاصلہ باقی ہے؟

سورج غروب ہونے کی تیاری کر رہا تھا اور فضا میں ٹنگی بڑھ رہی تھی۔ وہ دھیر کا دھیر دھیر تھا لیکن سینیں میں امریکا کے دوسرے علاقوں کے مقابلے میں انتہائی سردی مگھ رہی تھی۔

وہ دم لے کر ایک مرتبہ پھر بہت آہستگی سے آگے کھینکے گئی۔ اس کی رفتار تو پچھوے اور چھوٹی کی رفتار سے بھی کم تھی۔

یہ سوچ کر اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے کہ دنیا کی پانی ہوئی ایتھلیٹ جو سو میٹر کا فاصلہ سینکڑوں میل طے کر لیتی تھی، آج کس کسمپرسی کے عالم میں اپا جوں کی طرح زمین پر گھسے

برہمچور ہے۔ ”رونے اور آنسوؤں کرنے سے کچھ نہیں ہوگا ڈینیل!“ اس نے خود کھلائی کے انداز میں کہا۔ ”تمہیں بہر حال میں اپنی گاڑی تک پہنچنا ہے۔

اب اسے جھوک بھی لگ رہی تھی لیکن اس بے آب و گیاہ علاقے میں پانی تو میسر تھا نہیں، کھانے کو کہاں سے ملے۔ ڈینیل کی گاڑی میں البتہ... کھانے کی باسکٹ موجود تھی لیکن وہاں تک پہنچنا ہی تو ایک مسئلہ تھا۔

سورج بالآخر آہستہ آہستہ غروب ہو گیا اور ہر طرف جیڑی سے اندھیرا پھیلنے لگا۔ اس کے ساتھ ہی سردی میں بھی اچانک اضافہ ہو گیا۔ اتنی شدید سردی تھی کہ کتنی کڑی مشقت کے باوجود ڈینیل سردی کے باعث جتنے گئی۔

اچانک اسے اس سوئزر کا خیال آیا جو اس نے اپنی کمر کے گرد باندھ رکھا تھا۔ اس نے جسم کو تھوڑا سا اوپر اٹھا کر سوئزر کی گرہ کھولی اور اسے اپنے پیٹ کے نیچے سے نکالنے کے بعد آگے کی طرف نکلی۔ وہ ان کا پوری آستین کا خاصا گرم سوئزر تھا۔ ڈینیل نے کسی نہ کسی طرح وہ سوئزر پہن لیا۔ سوئزر پہن کر اسے خاصی طمانیت کا احساس ہوا اور ہڈیوں میں ہوسٹ ہونے والی سردی چند لمحے کو رک گئی اور وہ دوبارہ آگے کی طرف کھینکے گئی۔

فیروز اس کے ساتھ تھا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ ڈینیل کو اٹھا کر گاڑی تک لے جائے۔ وہ بار بار جانے والے راستے پر جاتا تھا اور پھر واپس آ جاتا تھا۔ گویا ڈینیل کو بتا رہا ہو کہ اس طرف جانا ہے۔

پھر رفتہ رفتہ ہر طرف تاریکی پھیل گئی۔ ڈینیل اب تکلیف کی شدت سے نڈھال ہو چکی تھی۔ اسے تو یہ بھی علم نہیں تھا کہ اس کا زخم کس نوعیت کا ہے؟ البتہ اس کے جسم سے خون نکل نکلا تھا۔ ڈینیل کے خیال میں یہ زیادہ خطرناک تھا۔ اس کے زخمی جسم سے خون بہہ کر اندر ہی نہیں جمع ہو رہا تھا۔ اس نے ہمت نہیں ہاری اور ایک ایک انچ سرکرتی رہی۔

پھر سردی کی شدت میں مزید اضافہ ہو گیا۔ ڈینیل کو اس بات کا احساس اس وقت ہوا جب اس کی بوتل کا پانی جم گیا۔ گویا درجہ حرارت صفر ڈگری سینٹی گریڈ سے بھی گر گیا تھا۔ سردی سے بچاؤ کے لیے اس کے جسم پر ناکافی کپڑے تھے۔ اس کی پیٹ بھی زیادہ گرم نہیں تھی اور فی شرت اور سوئزر بھی اس بلا تیز سردی کو روکنے میں ناکام تھا۔ سردی اتنی بڑھی کہ نہ صرف ڈینیل کا جسم لگا چٹنے لگا بلکہ اس

کے دانت بھی بجنے لگے۔

اس میں اب مزید آگے بڑھنے کی ہمت ہی نہیں تھی اور اس پختوند کی طاری ہو رہی تھی۔ ”کیا میں مر رہی ہوں؟“ اس نے خود سے سوال کیا۔ ”یہ ایسے ہو رہی ہے؟“

موت تو دونوں صورتوں میں جیتی تھی۔ ڈینیل نے سفر کا ارادہ ملتوی کر دیا اور کھینکتی ہوئی ایک چٹان کی آڑ میں چلی گئی لیکن سردی نے وہاں بھی اس کا پیچھا نہ چھوڑا۔ اسے اب یہ خطرہ پیدا ہو گیا کہ اگر درجہ حرارت مزید گر گیا تو اس کے جسم میں دوڑنا ہوا خون آہستہ آہستہ ٹھمد ہو جائے گا۔ پھر اس نے زمین پر سر ڈال دیا اور سوچا کہ اگر زندگی رہی تو بقیہ سفر صبح دن کے اچالے میں طے کرے گی۔

فیروز بھی اس کے ساتھ ہی بیٹھ گیا۔ کتے اور انسان کے جسم کی حرارت نے گویا اس سردی کو شکست دے دی۔ صبح کے آثار نمودار ہونے تو ڈینیل کا جوڑ جوڑ دکھ رہا تھا۔ اس میں سر اٹھانے کی بھی ہمت نہیں تھی لیکن وہ اتنی آسانی سے ہار ماننے والی نہیں تھی۔ اس نے بہ مشکل تمام اپنے ہاتھوں کو اوپر اٹھایا تو اسے خوشی ہوئی کہ اس کا دوران خون ٹھمد نہیں ہوا ہے۔ اس کے جوڑ بھی کام کر رہے تھے۔

اس نے کئی دفعہ اپنی ہاتھوں کو گردش دی اور اسے ہر مرتبہ زندگی کا احساس ہوا لیکن ابھی اس میں آگے بڑھنے کی ہمت نہیں تھی۔ وہ بری طرح ٹھکی ہوئی وہاں بے جان لاش کی طرح پڑی رہی۔ یہ بھی قسمت ہے کہ اس علاقے میں جنگلی جانور اور حشرات الارض نہیں تھے ورنہ اب تک ڈینیل کی زندگی کا خاتمہ ہو جاتا۔

ایسے علاقے میں عموماً بھیڑیے اور گیدڑ وغیرہ ہوتے ہیں لیکن وہاں ایسا کوئی جانور نہیں تھا ورنہ اسے بچانے میں فیروز بھی اپنی جان سے جاتا۔ حشرات الارض اس سے بھی زیادہ خطرناک ہوتے۔ اندھیرے میں کوئی سانپ یا بچھو اسے بہت آسانی سے ڈس سکتا تھا۔

جب سورج مزید کچھ اوپر آیا تو درجہ حرارت بھی بڑھنے لگا اور ڈینیل کو کبھی دھوپ کی تمازت سے توانائی کا احساس ہونے لگا۔

اس نے ایک مرتبہ پھر اپنا وہ سفر شروع کر دیا جسے دنیا کا سب سے ست رفتار سفر کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ وہ ایک ایک انچ سرک رہی تھی لیکن ابھی اس کا حوصلہ جوان تھا۔ اس نے پیچھے مڑ کر اس لیے نہیں دیکھا کہ اسے یہ احساس نہ ہو جائے کہ اس نے اب تک کتنا سفر طے کیا ہے،

اس نے دن بھر میں برائے نام سفر طے کیا تھا لیکن اسے امید تھی کہ آج کے دن وہ اپنی ہمت اور قوتِ ارادی کے بل پر گاڑی تک ضرور پہنچ جائے گی۔

وہ صبح بھر رہی، سورج سر پر آیا تو اس کی تمازت سے اس کے جسم میں مزید توانائی بھر گئی۔ اس کے ہاتھ میں جو بوتل تھی اس کا پانی جو عرف بن چکا تھا ایک مرتبہ پھر پانی میں تبدیل ہو گیا۔

اب تک شدید خواہش کے باوجود اس نے پانی نہیں پیا تھا۔ دو پہر تک وہ بری طرح غمگین ہو گئی اور جسم سے پسینا بہنے لگا۔ اس کے حلق میں کانٹے سے پڑنے لگے اور اس نے سوچا کہ اب مجھے چند گھنٹہ پانی پی لینا چاہیے۔

پانی پینے کے لیے وہ ہمت کر کے ایک مرتبہ پھر سیدھی ہوئی اور ایک چٹان سے سر ٹکا دیا۔ چند لمحے تک وہ اپنی سانسیں درست کرتی ہی، اوندھا اور سیدھا ہونے میں اسے شدید تکلیف ہوتی تھی لیکن اس کا جسم شاید اس تکلیف کا عادی ہو گیا تھا۔

وہ سیدھی ہو کر لٹی تو اسے محسوس ہوا کہ اس کا پیٹ کچھ بھاری بھاری ہو رہا ہے۔ پیٹ پر ہاتھ بھرنے کے بعد اسے محسوس ہوا کہ اس کا پیٹ اچانک بڑھ گیا، وہ انتہائی اسارت اور ورزشِ جسم کی مالک تھی، انتہائیت قویوں بھی اسارت ہی ہوتے ہیں، پھر اس کا پیٹ کیوں بڑھ رہا تھا؟

اچانک اس کے ذہن میں ایک ہولناک خیال آیا، کہیں میرے جسم کے ذہنی حصے سے خون بہہ کر میرے پیٹ میں جمع تو نہیں ہو رہا؟ یہ خیال آتے ہی وہ کانپ کر رہ گئی۔ اگر ایسا تھا تو یہ صورت حال بہت خوف ناک تھی، خون کے لوتھڑے جسم میں جمع ہو کر انسان کے اعضائے رئیسہ کو شدید نقصان پہنچا سکتے ہیں۔ اگر خون کا کوئی چھوٹا سا لوتھڑا بھی اس کی شریان میں داخل ہو جاتا تو چند ہی لمحوں میں حرکتِ قلب بند ہونے سے اس کی موت واقع ہو سکتی تھی۔

اس نے ان تمام خیالات کو اپنے ذہن سے جھٹک دیا اور خود سے کہا۔ ”مجھے ابھی زندہ رہنا ہے، مجھے آخری لمحے تک موت سے لڑنا ہے۔ ہاں، اگر اس ویرانے میں موت میرا مقدر ہے تو اسے کوئی نہیں ٹال سکتا۔“ اس نے سوچا، ”میں نے آخر ایسا کون سا گناہ کیا تھا جس کے پاداش میں مجھے اس قسم کی موت دی جا رہی ہے۔“

اس نے بوتل کھول کر منہ سے لگائی اور پانی پینے لگی۔ دھوپ کی تمازت اور کڑی مشقت کی وجہ سے اسے اتنی شدید

پیارا سا احساس ہو رہا تھا کہ وہ پانی پیتی ہی چلی گئی۔ اسے خیال تو اس وقت آیا جب اس نے پانی کی بوتل کا آخری قطرہ بھی نچوڑ لیا۔

اسے اچانک اپنی غلطی کا احساس ہوا، ابھی اسے پانی بچا کر رکھنا چاہیے تھا۔ ابھی کئی کلو میٹر کا سفر باقی تھا جو اسے ایک ایک انچ ریک کر طے کرنا تھا لیکن اب کیا ہو سکتا تھا۔ غلطی تو اس سے ہو چکی تھی۔ اس نے پانی کی بوتل بھینچنے کا

ارادہ کیا، پھر یہ سوچ کر اپنے ارادے سے باز رہی کہ ممکن ہے آگے کہیں پانی کا کوئی چشمہ ہو؟ ویسے یہ اس کی خام خیالی ہی تھی۔ صحرا میں بھٹکنے والوں کو بھی سراب دکھائی دیتے ہیں۔ اس طرح اسے بھی پانی کے چشمے کا خیال آ رہا تھا۔ وہ ابھی طرح جانتی تھی کہ اس بے آب و گیاہ علاقے میں پانی نہیں ہے ورنہ کوئی درخت، کوئی خورد و پودا تو ہوتا۔

اس نے ہمت کر کے ایک مرتبہ پھر خود کو اوندھا کیا اور اپنا سانس بحال کرنے کے بعد پھر آگے کی طرف کھٹکے لگی۔

ایک گھنٹے تک کھٹکنے کے بعد اسے پھر شدید پیاس کا احساس ہوا۔ کڑی مشقت سے پسینا پانی کی طرح اس کے جسم سے بہہ رہا تھا۔ اس کے جسم میں تیزی سے پانی کی کمی واقع ہو رہی تھی۔ اسے یقین ہو گیا کہ اگر میں گاڑی تک پہنچنے میں کامیاب نہ ہوئی تو یا تو ڈی ہائیڈریشن (پانی کی کمی) سے مر جاؤں گی یا پھر شدید سردی میں میرا خون ٹھمد ہو جائے گا۔ موت دونوں صورتوں میں مقدر تھی۔

اس نے سوچا اگر مرنا ہی ہے تو پھر اس وقت تک کوشش کرنا چاہیے جب تک میرا سانس باقی ہے یا جب تک مجھ میں زمین پر کھٹکنے کی سکت ہے۔

وہ ایک نئے دلو لے اور جوصلے سے آگے کھٹکنے لگی۔ تیر کبھی اس کے نزدیک آ جاتا تھا، کبھی اس سے کچھ فاصلے پر چلا جاتا تھا۔ جیسے وہ اپنی مالکن کی بھی خود بد کرنا چاہتا ہو۔ تیر دوڑتے دوڑتے دوڑتے اچانک رک گیا اور ایک گڑھے سے پانی پینے لگا۔

پانی کا وہ گڑھا ڈیڑھ فٹ سے چند منٹ کے فاصلے پر تھا۔ پانی دیکھ کر اس کے جسم میں ایک نئی توانائی آ گئی اور وہ اس گڑھے کی طرف کھٹکے لگی جس میں کبھی بارش کا پانی جمع ہو گیا ہوگا۔

گڑھے کے نزدیک پہنچ کر اسے شدید مایوسی ہوئی۔ گڑھے کا پانی انتہائی گدلا تھا اور وہ انسان تو انسان کسی جانور کے پینے کے قابل بھی نہیں تھا لیکن پیاس کی

شدت سے ڈھیل کے حلق میں کاٹنے سے بڑھ رہے تھے۔ اس نے ہاتھ میں پکڑی ہوئی پانی کی بوتل اس گڑھے میں ڈال کر بھری۔ گڑھے میں پانی بہتی بہتی کم تھا اس لیے بوتل آدھی سے زیادہ نہیں بھری لیکن اس کا پانی دیکھ کر ڈھیل کو توانائی آگئی۔ وہ انتہائی گدلا اور بدبودار پانی تھا۔ مرتا پکانہ کرتا کہ صدق اس نے بوتل ہونٹوں سے لگائی اور پانی کے چند گھونٹ پی لیے۔

اسے بہت زور سے ابائی آئی لیکن اس نے خود پر قابو پالیا۔ اس سے اتنا ہوا کہ اس کی کھونٹی ہوئی توانائی فوری طور پر بحال ہونے لگی اور وہ ایک مرتبہ پھر ایک ایک انچ کر کے آگے بڑھنے لگی۔

سورج آہستہ آہستہ اپنا سفر طے کر کے غروب ہونے کی تیاری کر رہا تھا اور فضا میں ایک مرتبہ پھر خنکی بڑھتی جا رہی تھی۔

ڈھیل نے سر اٹھا کر دیکھا، اسے ایسا لگا جیسے اس کی منزل اب بھی اتنی ہی دور ہو جتنی کل تھی۔ اس نے دور دراز میں یہ مشکل سوئیٹر کا قافلہ طے کیا ہوگا۔

سورج آہستہ آہستہ غروب ہو گیا اور اس کے ساتھ ہی ڈھیل کی مایوسی بھی بڑھ گئی۔ اب اس نے سنجیدگی سے غور کیا کہ اگر آج رات بھی مجھے اس سردی کا سامنا کرنا پڑا تو شاید صبح تک میں زندہ نہ رہ سکوں۔

دن بھر کی مشقت کے بعد وہ بری طرح ٹھہرا ہوا تھی۔ آج دوسرا دن بھی گزر گیا تھا اور اس کے منہ میں غذا کا ایک دانہ بھی نہیں کیا تھا۔

اس نے پانی کی بوتل سے ہی کچھ پانی پیا اور سر زمین پر ٹیک دیا۔

سردی کی شدتیں لمحہ بہ لمحہ اضافہ ہو رہی تھیں اور ڈھیل کا پتہ نہیں رہا۔ اس کے دانت سردی کی شدت سے بج رہے تھے۔ اسے یقین ہو گیا کہ آج ضرور میرے جسم میں خون جمے ہو جائے گا۔ اس نے آخری بار آسمان کو دیکھا اور آنکھیں موند لیں۔ سردی کی شدت اس کی ہر تکلیف پر چاوی آگئی تھی۔

اس وقت بھی تیز اس کے پاس بیٹھا تھا اور ڈھیل کو اس جانور کے جسم کی حرارت سے کچھ سکون کا احساس ہو رہا تھا۔

رات یوں ہی سوتے جا گئے بلکہ نیم غشی کی حالت میں گزر گئی۔

صبح کا اجالا پھیلا تو اسے یقین نہیں آیا کہ وہ اب تک زندہ ہے۔ یہ بھی گویا اس کی قوت ارادی کا کمال تھا یا پھر قدرت کا کوئی معجزہ کہ انتہائی شدید سردی کے باوجود اس کے جسم کا خون جم نہ ہوا تھا۔

اس نے آہستہ آہستہ اپنا ایک ہاتھ اٹھا یا پھر دوسرا اٹھا یا اور باری باری دونوں ہاتھوں کو اٹھا کر اس بات کا یقین کرنے لگی کہ میں نہ صرف زندہ ہوں بلکہ میرے جسم کا اوپری حصہ اب بھی فعال ہے۔

اچانک اس کے سر کے اوپر سے کوئی ہوائی جہاز گزرا۔ وہ پاگلوں کی طرح چیخنے۔ بچاؤ..... بچاؤ.....

اس کے ساتھ ہی تیز بھی زور زور سے چوکنے لگا لیکن ہزاروں فٹ کی بلندی پر پرواز کرنے والے ہوائی جہاز کے مسافری اعلیٰ سے بھلا کیسے دیکھ سکتا تھا۔

اس نے ایک دفعہ پھر خود کو بھینسنے کی کوشش کی لیکن اس کے ہڈ حال جسم نے مزید مشقت سے انکار کر دیا اور وہ باوجود کوشش کے ایک انچ بھی آگے نہ بڑھ سکی۔

اس کی مایوسی انتہائی پہنچ گئی اور اس نے اپنا جسم سیدھا کر کے سر زمین پر لگا دیا۔ دور سے دیکھنے پر وہ کوئی لاش ہی لگ رہی تھی۔ بس سانسوں کی آمد و رفت سے اندازہ ہو رہا تھا کہ اس کے جسم میں ابھی زندگی کی رت باقی ہے۔

☆☆☆

اس کے چند دوستوں نے اس کے گھر میں فون کیا، اس کے سیل فون پر کال کی لیکن جواب نہیں ملا۔ ایسا گزشتہ دو دن سے ہو رہا تھا۔ ان ہی میں سے کسی نے پولیس میں اس کی گمشدگی کی رپورٹ درج کروادی۔

ڈھیل خاصی معروف شخصیت تھی۔ یوں بھی امریکن پولیس ہر قسم کے معاملات کو سنجیدگی سے لیتی ہے۔

سار جنت نے فوراً تمام ایجنٹوں کو اس کی گمشدگی کی رپورٹ دی اور ساتھ ہی ریسیو کے عمل کو بھی اطلاع دے دی۔

اس کے چند دوستوں کو اندازہ تھا کہ ڈھیل آکسفورڈ کے علاقے میں جاتی ہے۔

ریسیو کے عمل کے سربراہ جان مارشل نے فوری طور پر سرچ ٹیم تشکیل دی اور بہت تیزی سے ڈھیل کی تلاش شروع کر دی گئی۔

ریسیو ٹیم کا پہلا ہدف کیسنین کے علاقے کا وہ پہاڑی سلسلہ تھا جہاں ڈھیل کے دوستوں کے مطابق وہ اکثر جایا کرتی تھی۔

کرتی تھی۔ ایک گھنٹے کے اندر اندر وہ لوگ ڈھیل کی کار تک پہنچ گئے۔

وہاں پہنچ کر انہوں نے ارد گرد کا جائزہ لیا اور ٹیم کے ایک سینئر ممبر گمن برٹ نے کہا۔ ”یہ پہاڑی سلسلہ میں گلو مرتل میٹر پر محیط ہے۔ اسے تلاش کرنے میں کئی گھنٹے لگ سکتے ہیں۔ اگر اسے کوئی حادثہ پیش آیا ہے اور یقیناً ایسا ہی ہے تو ہمیں دعا کرنا چاہیے کہ ہم بروقت اس تک پہنچ سکیں۔“

اس کے پاس پہاڑی علاقوں میں چلنے والی مخصوص گاڑی تھی۔ اس نے دور بین سے ارد گرد کا ماحول جائزہ لیا۔ پھر جان مارشل سے کہا۔ ”میں اس طرف جا رہا ہوں۔ جنہیں اگر ڈھیل کا کوئی سراغ ملے تو تم مجھے وائرلیس پر اطلاع دے دینا۔“

ٹیم کے دوسرے ممبر مختلف سمتوں میں چلے گئے۔ گمن برٹ کا رخ اس طرف تھا جہاں ڈھیل بڑی ہوئی تھی لیکن وہ ابھی وہاں سے چند کلومیٹر کی دوری پر تھا اور گمن برٹ کے پاس جو گاڑی تھی اس کی رفتار اتنی نہیں تھی کہ وہ جلد وہاں پہنچ سکے۔

☆☆☆

اسی وقت ڈھیل کو پھر ہوائی جہاز دکھائی دیا وہ بے اختیار چیخنے۔ ہیلپ..... ہیلپ..... بچاؤ..... بچاؤ..... اس کی آواز کی بازگشت فضاؤں سے ٹکرا کر واپس آگئی۔

اس نے مایوسی کے عالم میں اپنے کتے تیز سے کہا۔ ”ٹیز! پلیز جاؤ اور میرے لیے مدد لے کر آؤ۔“

پلیز جاؤ۔“

تیز کتا اس کا اشارہ سمجھ گیا اور سرت روی سے ایک طرف روانہ ہوا پھر اس کی طرف پلٹ آیا گویا وہ اپنی مالک کو اس عالم میں تنہا نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔

ڈھیل اس دفعہ غصے میں چبھتی۔ ”ٹیز! جاؤ!“

ٹیز نے ایک نظر اسے دیکھا، پھر تیزی سے ایک طرف روانہ ہو گیا۔

تیز کے جانے کے بعد ڈھیل پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اس نے اپنے ایک ہمدم اور دوسرا کچی روانہ کر دیا تھا، کتے کو بھیجے کے بعد اسے شدید افسوس ہوا کہ اس کی موت کے وقت اس کا چہرہ تیز بھی اس کے پاس نہیں ہوگا۔ وہ بے چارہ تو اس کے کہنے پر وہاں سے چلا گیا تھا ورنہ اگر مدد ملتا اس کے بس میں ہوتا تو وہ دو دن پہلے ہی لاچکا ہوتا۔

ڈھیل نے جذباتی انداز میں ٹیز کو آواز دیں۔ ٹیز..... ٹیز..... واپس آ جاؤ پلیز..... واپس آ جاؤ..... میں تمہا نہیں مرنے چاہتی..... تم تو میرے سب سے بہترین دوست ہو۔ میں نے تمہیں بھی خود سے دور کر دیا۔“ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

اب اس سے فضا بہت اور ڈی ہائیز ریشن کے باعث آنکھیں کھولنا بھی مشکل ہو رہا تھا۔ اس کے پاؤں پہلے ہی جواب دے چکے تھے اب ہاتھ بھی جواب دے رہے تھے۔ اس نے ہاتھ ہلانے کی کوشش کی لیکن ناکام رہی۔ اس نے مایوس ہو کر پھر زمین پر سر ڈال دیا۔

☆☆☆

جان مارشل نے دور بین سے دیکھا کہ بہت دور کوئی چیز حرکت کر رہی ہے۔ اس نے اپنے ساتھی سے کہا۔ ”دیکھنا، مجھے کوئی چیز حرکت کرنی نظر آ رہی ہے۔“

اس کے ساتھی نے دور بین آنکھوں سے لگائی اور بولا۔ ”آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں سر! مجھے بھی کوئی چیز دکھائی دے رہی ہے لیکن یہ اندازہ نہیں ہو رہا کہ وہاں کیا ہے؟“

چند منٹ بعد جان مارشل نے اس حرکت کرتی ہوئی چیز کو نوٹس کرنے کے بعد کہا۔ ”مجھے تو کوئی کتا لگ رہا ہے جو تیز رفتار سے ادھر ہی آ رہا ہے۔“

اس کے ساتھی سائمن نے بھی دور بین کو نوٹس کیا اور کہا۔ ”جی سر! وہ لائٹ براؤن ٹرک کا کتا ہے۔ بہت تیز رفتار سے ادھر آ رہا ہے۔“

جان مارشل نے چند منٹ کے بعد واضح انداز میں کتے کو دیکھا اور وائرلیس پر گمن برٹ کو پیغام دیا۔ ”سینئر گمن! تم جس طرف جا رہے ہو، اس طرف سے مجھے ایک کتا اپنی طرف آتا دکھائی دے رہا ہے۔ اس کتے کا دھیان رکھنا۔“

”سر! مجھے بھی ڈھیل کے دوستوں سے معلوم ہوا ہے کہ ڈھیل نے ایک کتا بھی پال رکھا تھا جو ہر وقت اس کے ساتھ رہتا تھا۔ کاش یہ ڈھیل ہی کا کتا ہو اور ہمیں کوئی نشان دہی کر سکے۔“

”گمن برٹ نے اپنی کارٹ (خصوصی گاڑی) کی رفتار کچھ بڑھادی اور دور بین آنکھوں سے لگائی۔ ایک موٹر سڑے سے اسے کتا نظر آیا جو بہت تیزی سے اوپر کی سمت جا رہا تھا۔

”اے..... ڈاگ“ گمن برٹ چیخا لیکن کتا اس پہ دھیان دینے بغیر بہت تیز رفتار سے آگے نکل گیا۔

دھیان دینے بغیر بہت تیز رفتار سے آگے نکل گیا۔

ترکی نامی نام

علی سفیان آفاقی



سرگزشت کا خاصہ ہے کہ دلچسپ اور انفرادیت کے حامل سفرنامے پیش کرتا ہے۔ جو صرف سفرنامہ نہیں معلومات کا خزانہ بھی ثابت ہوتا ہے۔ سرگزشت کے مستقل قلمکاروں میں علی سفیان آفاقی جیسے کہنہ مشوق قلمکار بھی ہیں۔ عرصے سے قارئین اصرار کننا تھے کہ ان کے سفرنامے دوبارہ پیش کیے جائیں۔ پاک فلم نگری کو جب عروج حاصل تھا اور علی سفیان آفاقی فلم یونٹ کے ساتھ ملکوں ملکوں جایا کرتے تھے اس دور کے قصے تو وہ بیان کر ہی چکے ہیں لیکن جب جب سفر برائے شوق کیا اس دور کے قصے بھی کم دلچسپ نہیں، وہی کچھ وہ سنار ہے ہیں۔ الفاظ کی نشست و برخاست، جملوں کی خوبصورت ادائیگی اور روانی بہت کچھ آپ اس سفر کہانی میں پائیں گے۔

بٹ صاحب پوئے۔ ”ہاشمہ میرا خدا کے فضل سے بہت اچھا ہے۔ یہ ہم کشمیریوں پر اللہ کی طرف سے خاص عنایت ہے۔ دراصل میں بورہور ہا ہوں۔“

سب حیران رہ گئے۔ شعیب مرزا نے کہا۔ ”آپ

ناشتے سے فارغ ہونے کے بعد بٹ صاحب بے چین ہو کر چائے کڑے ہو گئے اور کھلے گئے۔

”بٹ صاحب کیا زیادہ ناشتا کر لیا ہے

تمہیں کھانے کی پراہم درپیش ہے۔“

نے کہا۔ ”اگر یہ نہ ہوتا تو ہم اتنی جلدی تمہارا سراغ نہ لگا سکتے۔ جب تک ہم سراغ لگاتے بہت دیر ہو چکی ہوتی۔“

مکین برٹ نے پیار سے کتے کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

پھر اس نے وائزلیس پر جان مارشل کو رپورٹ دی کہ مجھے ڈینیل مل گئی ہے لیکن وہ شدید زخمی ہے، بغیر اسٹریچر کے یہاں سے نہیں لے جانی جاسکتی۔

”اوکے میں فوری ایمبولینس اور اسٹریچر لے کر آ رہا ہوں۔“

آدھے گھنٹے بعد جان مارشل اپنی ٹیم کے ساتھ وہاں پہنچ گیا۔ اس دوران ہی مکین برٹ، ڈینیل... کو پانی پلا چکا تھا اور اب اس کے جسم میں خاصی توانائی دکھائی دے رہی تھی۔

فوراً ہی ڈینیل کو اسٹریچر پر منتقل کر دیا گیا۔ جان مارشل نے کہا۔ ”میں تمہاری ہمت اور حوصلے کی داد دیتا ہوں۔ سختی صفر درجے کی گریڈ میں اتنی زخمی حالت میں زندہ رہنا اور آگے بڑھنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔“

”سٹرا مارشل!“ ڈینیل نے کہا۔ ”میں ایتھلیٹ ہوں اور ایتھلیٹ آخری وقت تک جیتنے کی کوشش کرتا ہے۔“

☆☆☆

فوراً ہی ڈینیل کو اسپتال منتقل کر دیا گیا۔ وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ گرنے سے نہ صرف ڈینیل کی ریڑھ کی ہڈی متاثر ہوئی ہے بلکہ اس کے بائیں کوہنے کی ہڈی بھی ٹوٹ گئی ہے۔

تین ماہ اسپتال میں رہنے کے بعد ڈینیل کو وہاں سے فارغ کر دیا گیا لیکن ڈاکٹر نے بتا دیا کہ ممکن ہے ڈینیل کو اب بقیہ زندگی ویل چیئر پر گزارنا پڑے۔

ڈینیل ہارنسنے والی نہیں تھی، اس نے چھ ماہ کے اندر اندر اپنے پیروں پر کھڑا ہونا شروع کر دیا۔

اور چھ ماہ گزرنے کے بعد وہ بہت آسانی سے اپنے پیروں پر چلنے لگی۔

ڈینیل اب بھی جا لگ کرتی ہے۔ وہ اب ایتھلیٹ تو نہیں ہے لیکن ایک عام آدمی سے بہتر زندگی گزار رہی ہے۔ اس کے دو پیارے پیارے بچے اور محبت کرنے والا شوہر ہے اور سب سے بڑھ کر اس کا دوست اور ہم درہم ریز ہے جو آج بھی ڈینیل کے ساتھ سائے کی طرح رہتا ہے۔ اس نے واقعی اس محاورے کو درست ثابت کر دیا ہے کہ کتنا اہم گھوڑا انسان کے بہترین دوست ہیں۔

مکین برٹ نے وائزلیس پر جان مارشل کو بتایا۔ ”سرا! ایک لائٹ براؤن کتا میرے سامنے سے گزرا ہے لیکن اس نے مجھے نہیں دیکھا۔ ڈینیل کے دوستوں نے اس کتے کا نام بھی بتایا تھا جو میرے ذہن سے نکل گیا ہے۔“

”اگر یہ ڈینیل کا کتا ہے تو اس کا نام ٹیز ہے۔ تم کتے کا پیچھا کرو اور اسے آواز دو۔“

مکین برٹ نے اپنی کارٹ کا رخ اس سمت موڑ دیا جدھر کتا جا رہا تھا، جلد ہی کتا اسے نظر آ گیا۔ مکین برٹ پوری قوت سے چیخا۔ ”ٹیز! ٹیز!“

کتا اپنا نام سن کر رکا اور تیزی سے مکین برٹ کی طرف آنے لگا۔

وہ مکین برٹ کے نزدیک آ گیا اور واپس اس سمت ہولیا جدھر وہ آ رہا تھا۔ مکین برٹ نے اپنی کارٹ اس کے پیچھے لگا دی، مشکل یہ تھی کہ کتے کی رفتار بہت تیز تھی۔ مکین برٹ کی کارٹ اس رفتار کا ساتھ نہیں دے پا رہی تھی لیکن اس کی کوشش تھی کہ کتے کو اپنی نظر میں رکھے۔

کتا خود بھی رک کر اس کا انتظار کرتا تھا، پھر تیزی سے دوڑنے لگتا تھا۔

☆☆☆

ڈینیل نے پہلے کتے کے بھونکنے کی آواز سنی، وہ بے تابی سے ڈینیل کے ارد گرد پھرکاٹ رہا تھا۔ پھر اس کے کانوں میں مکین برٹ کی مخصوص گاڑی کی آواز آئی۔ وہ جسم کی پوری قوت جمع کر کے چیخا۔ ”ہیلپ... ہیلپ...“

مکین برٹ نے اس کی آواز نہیں سنی۔ اس کے ساتھ ہی کتا زور زور سے بھونکنے لگا۔ اس کی آواز مکین برٹ کے کانوں میں آ گئی۔ اس نے اپنی کارٹ کا رخ اسی جانب موڑ دیا۔

ڈینیل ایک مرتبہ پھر چیخا۔ ”ہیلپ... ہیلپ...“

پچاؤ... پچاؤ... کوئی ہے، مجھے پچاؤ پلایز!“

اس مرتبہ مکین برٹ کو کتا اور ڈینیل دونوں دکھائی دے گئے۔ وہ اپنی کارٹ دوڑاتا ہوا ڈینیل کے پاس پہنچ گیا۔

ڈینیل کے جسم میں گویا نئی زندگی دوڑ گئی۔ اس نے بے اختیار کتے کو چوما اور بولی۔ ”تم ایک بہت سچے دوست ہو، شکر یہ دوست، تم نے میری جان بچائی۔“ اس کے ساتھ ہی اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

”ٹیز واقعی بہت بہترین دوست ہے۔“ مکین برٹ

مکین برٹ نے وائزلیس پر جان مارشل کو بتایا۔ ”سرا! ایک لائٹ براؤن کتا میرے سامنے سے گزرا ہے لیکن اس نے مجھے نہیں دیکھا۔ ڈینیل کے دوستوں نے اس کتے کا نام بھی بتایا تھا جو میرے ذہن سے نکل گیا ہے۔“

”اگر یہ ڈینیل کا کتا ہے تو اس کا نام ٹیز ہے۔ تم کتے کا پیچھا کرو اور اسے آواز دو۔“

مکین برٹ نے اپنی کارٹ کا رخ اس سمت موڑ دیا جدھر کتا جا رہا تھا، جلد ہی کتا اسے نظر آ گیا۔ مکین برٹ پوری قوت سے چیخا۔ ”ٹیز! ٹیز!“

کتا اپنا نام سن کر رکا اور تیزی سے مکین برٹ کی طرف آنے لگا۔

ایک ہی دن میں استنبول جیسے شہر سے پورے ہو گئے؟“
”جی نہیں میں پورا اس لیے ہو رہا ہوں کہ استنبول جیسے عجیب و غریب اور قابل دید شہر میں آنے کے بعد بھی ہم ہوٹل کے اندر بیٹھے ہیں۔ اگر ہوٹل ہی میں وقت گزارنا تھا تو ہم استنبول کیوں آئے ہیں؟“

خان صاحب بولے۔ ”بٹ صاحب خدا کا خوف کیجئے۔ آپ کو استنبول آئے ہوئے ابھی وقت ہی کتنا ہوا ہے۔ کل آپ جو دیکھ سکتے تھے وہ دیکھ لیا۔ آج ابھی آپ نے ناشا کیا ہے۔ ناشا ختم ہو چکا۔ اب ہم استنبول کی سیر کے لیے نکلیں گے۔“

”تو پھر نکلیے۔ یہ ہوٹل تو مجھے قید خانہ لگنے لگا ہے۔“
”بٹ صاحب، ایسے خوبصورت حسین قید خانے آپ نے دنیا میں کہیں دیکھے یا سنے ہیں؟“
شعیب مرزا نے کہا۔ ”میں آپ کو ایک دلچسپ اور عجیب بات بتاؤں! استنبول میں ایک قید خانے کو ہوٹل اور ریسٹورنٹ بنادیا گیا ہے۔ یہ شہر کا بہت مہنگا ہوٹل اور ریسٹوران ہے۔“

”قید خانے کو ریسٹوران اور ہوٹل میں تبدیل کرنے کی ضرورت کیوں پیش آئی۔ کیا استنبول میں جگہ کم ہے۔ پھر تو کسی ہوٹل کو بھی قید خانہ بنانا چاہیے“ شعیب مرزا مسکرائے۔
”قید خانے کو ہوٹل اور ریسٹوران کیوں بنایا گیا اس کا مجھے بھی علم نہیں ہے لیکن اس قید خانے یعنی ریسٹوران میں کئی بار میں نے کھانا کھایا ہے۔ یہ مہنگا ضرور ہے لیکن یہاں لذیذ ترین کھانا ملتا ہے۔“

بٹ صاحب غلغلے غلغلے رک گئے۔ ”تو پھر دیر کیوں کر رہے ہیں۔ آئیے قید خانے نما ہوٹل دیکھنے چلتے ہیں۔ میں آج کی سیر کا آغاز قید خانے سے ہی کرنا چاہتا ہوں۔“
خان صاحب کب چپ رہنے والے تھے۔ ”بٹ صاحب، ہمیں معلوم نہیں تھا کہ آپ کو قید خانے جانے کا اتنا شوق ہے۔ فکر نہ کیجیے لاہور واپس چل کر آپ کو کوٹ لکھت جیل یا ٹیکس جیل میں داخل کرادیں گے۔ وہاں کے جیل میرے اچھے واقف کار ہیں۔“

”ظاہر ہے مجرم یا مجرمانہ ذہنیت رکھنے والے ہی جیلروں سے دوستی کرتے ہیں۔ مگر میری بات سن لیجئے بھائی، یہ جیلر کسی کے دوست نہیں ہوتے۔ کسی وقت ان کی ٹھوڑی ٹھوم گئی تو آپ جیل خانے میں ہی نظر آئیں گے۔“
ہوٹل سے باہر نکلے تو اس بات پر بحث ہوتی رہی کہ

ٹیکسی سے جائیں، بس سے جائیں یا ٹرام استعمال کر لیں۔ بٹ صاحب ٹرام کا نام سن کر چل گئے۔ ان کا اصرار تھا کہ وہ استنبول کی ٹرام میں سوار ہو کر کراچی کی مرحوم ٹرام کی یادیں تازہ کرنا چاہتے ہیں۔ خان صاحب بس کے حق میں تھے۔ ہمارا وٹ کسی کے حق میں نہ تھا۔ شعیب مرزا کی تجویز تھی کہ کچھ دیر پیدل چلتے ہیں پھر جو سواری مناسب ہوگی اس میں بیٹھ جائیں گے۔ آپ کو بتا رہے ہیں کہ ہم پاکستانی ہنسی مذاق اور پیار محبت کی بات بھی کرتے ہیں تو اونچی آواز میں جس سے گمان گزرتا ہے کہ شاید کوئی جھڑا ہو رہا ہے۔ ترک بہت نرم گفتار لوگ ہیں۔ اونچی آواز میں بات کرنا خصوصاً سڑک پر ان کے لیے ناقابل تصور ہے۔ ہم نے دیکھا کہ چند ترک مرد اور خواتین کن انکھوں سے میں دیکھتے ہوئے گزر گئے۔ جس وقت بٹ صاحب اپنی پاٹ دار آواز میں کراچی کی ٹراموں کا تذکرہ کر رہے تھے اچانک ہم نے دیکھا کہ دو پولیس والے اپنی مخصوص وردیوں میں نمودار ہوئے اور ہم لوگوں کی طرف آئے۔ ترکی میں پولیس والوں کو Polis لکھا جاتا ہے۔ یعنی نام تو وہی پولیس ہے مگر جیسے بدل گئے ہیں۔ دوسرے آزاد ملکوں کی طرح ٹریش اپنی فوجی زبان ہی میں بات چیت کرتے ہیں۔ اس زبان میں دکانوں کے بوڑھے لکھے نظر آتے ہیں۔ ہم جیسے لوگ تو ایسے ملکوں میں جا کر اپنے آپ کو جاہل ہی محسوس کرتے ہیں۔ یہ خوبی ہمارے ملک ہی میں ہے کہ انگریزی بولنا ہی خیر سمجھتے ہیں۔ یہاں تو جاہل رکشا والے بھی انگریزی سمجھتے ہیں۔

پولیس والے سرخ و سفید رنگت کے قد اور لوگ تھے۔ ترکی میں ہم نے دیکھا کہ پولیس والے کسی قسم کا اسلحہ یہاں تک کہ انگریزوں کی طرح چھوٹا سا ڈنڈا بھی اپنے ہاتھ میں نہیں رکھتے۔ پولیس والے بہت اخلاق سے لوگوں سے بات کرتے ہیں لیکن ان کا رعب اتنا ہے کہ اگر دو پولیس والے چندہ بھرے ہوئے سب افراد سے کہیں کہ ہتھیار ہمارے حوالے کر دو اور پولیس اسٹیشن چلو تو کسی کی مجال نہیں کہ انہیں رعب دکھائے یا ان کی ہدایت کی پابندی نہ کرے۔ پولیس والے بہت اطمینان سے ہم لوگوں کے پاس آئے۔ انہیں دیکھ کر بٹ صاحب بھی خاموش ہو گئے۔

پولیس مین نے کہا ”خوش آمدید؟“
جواب میں ہم سب نے السلام علیکم کہا۔
”آپ مسلمان ہیں؟“ انہوں نے بڑی نرمی سے پوچھا۔

”جی ہاں، ہم پاکستانی ہیں۔“

یہ سن کر وہ مسکرائے۔ دونوں نے آگے بڑھ کر ہم لوگوں سے مصافحہ کیا اور خوش ہو کر دہرایا۔ ”پاکستان! برادر مرحبا۔“

ہم نے بھی ان کے دیکھا دیکھی مرحبا کہہ دیا۔
ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں ایک پولیس والے نے پوچھا ”کیا کوئی جھگڑا ہے؟“
ہم نے کہا۔ ”بالکل نہیں۔ دراصل ہم لوگ آپس میں بحث کر رہے تھے۔ ہم سب دوست ہیں۔ دوستوں میں کیسا جھگڑا۔“

پولیس والا مسکرایا۔ ”مہربانی، اپنی آواز ہلکی رکھا کیجئے۔ استنبول میں اونچی آوازوں میں بات کرنے والوں کو دیکھ کر یہی سمجھا جاتا ہے کہ کوئی جھگڑا ہو رہا ہے۔“
ہم سب شرمندہ ہو گئے۔ ہم لوگ واقعی تہذیب اور اخلاق کے بارے میں دوسرے ملکوں سے بہت پیچھے ہیں۔ تیز اور تہذیب کو ہم نے خدا حافظ کہہ دیا ہے۔

ہم نے پولیس والے سے کہا۔ ”سوری آفسیر، آئندہ ہم خیال رہیں گے۔“
”آپ کا شکریہ۔“ اس نے انگریزی میں کہا۔ ”اللہ حافظ کرے آپ کی۔“

پولیس والے تو رخصت ہو گئے مگر کچھ دیر ہم لوگ خاموش رہے پھر خان صاحب بولے ”بڑے افسوس اور شرمندگی کی بات ہے۔ آخر ہم لوگ اخلاق کو کیوں بھول گئے ہیں؟“

موقع سے فائدہ اٹھا کر شعیب مرزا نے کہا۔ ”آئیے تو پھر ٹیکسی لے لیتے ہیں۔“

اس بار کسی نے بحث نہیں کی۔ مرزا صاحب کے اشارے پر ایک ”ٹاکسی“ آ کر رک گئی۔ ہم سب لوگ اس میں سوار ہو گئے۔ ٹیکسی ڈرائیور ایک سفید بالوں والا بارعہ شخصیت کا مالک تھا۔ کوئی بہت ہی بڑا ریشٹراڈ انٹر نظر آتا تھا۔

اس نے مسکرا کر کہا ”خوش آمدید؟“
ہم لوگ پریشان ہوئے کہ ہم کو جواب میں کیا کہنا چاہیے۔ بہر حال ہم نے بھی انہیں ”خوش آمدید“ کہہ دیا۔

مرزا صاحب نے ہم لوگوں سے پوچھا۔ ”باغیورس چلیں؟“
”مسالا بازار یا جیل ہوٹل؟“
سب نے کہا ”جیل ہوٹل۔“

ٹیکسی والے نے مسکرا کر سر ہلایا اور ٹیکسی چل پڑی۔
استنبول کی کشادہ اور نہایت صاف ستھری سڑکوں سے گزرتے ہوئے ہم منزل کی طرف رواں دواں تھے۔ خان صاحب نے کہا۔ ”مرزا صاحب، جیل خانے کو ہوٹل بنانے کی کیا نیک تھی؟“

وہ بولے۔ ”استنبول میں تاریخی مقامات کو کسی نہ کسی طرح ترمیم، ترمیم اور مرمت کے ساتھ بہت احتیاط سے محفوظ رکھا جاتا ہے۔“

”مگر جیل خانہ تاریخی عمارت کیسے ہو گیا؟“
”یہ جیل خانہ ایک سو سال سے بھی زیادہ پرانا ہے۔ شہر کے ایک اچھے اور خوبصورت علاقے میں ہے اس لیے بلدیہ نے جیل کی اور جگہ منتقل کر دیا اور اس کو بہت شاندار ہوٹل بنادیا۔“

ہوٹل پہنچ کر ٹیکسی سے ہم لوگ اترے۔ ترک کرنسی کا حساب ہمارے بس کی بات نہ تھی ڈھیرے سارے نوٹ نکال کر ٹیکسی ڈرائیور کو دلے۔ اس نے مسکرا کر کچھ نوٹ ہمیں واپس کر دیے اور ساتھ ہی میں کچھ چھوٹے نوٹ بھی دے دیے۔

ہم نے کہا۔ ”انہیں ٹپ دینے کی ہمت نہیں ہو رہی۔“

بٹ صاحب بولے۔ ”نپ شاید انہوں نے خود ہی کاٹ لی ہے۔“
ٹیکسی والے نے ہمیں خدا حافظ کہا اور مسکراتے ہوئے چلا گیا۔

اب جو سامنے والی شاندار اور خوبصورت عمارت کو دیکھا تو دیکھتے ہی رہ گئے، دراصل سارا ملک ترکی خصوصاً استنبول سلطنت عثمانیہ اور بازنطینی دور کی انتہائی خوبصورت اور رنگینہ عمارتوں سے بھرا پڑا ہے۔ عثمانی حکمران مغللوں سے بھی زیادہ خوش ذوق تھے۔ ان کے تعمیر کردہ شہر، قلعے، حویلیاں، محلات انتہائی دلکش ہیں۔ مرزا صاحب نے ہم سے کہا کہ چاندنی راتوں میں استنبول دنیا کے حسین ترین شہروں میں نمایاں ہے۔ چاند کی چودھویں کو استنبول کا نظارہ نہ کرنا ایک ”جرم“ کے برابر ہے۔ چاندنی میں شہر کی پانچ سو سے زائد پرانی اور نئی مساجد کے حسین گنبد اور مینار ایک عجیب ماحول طاری کر دیتے ہیں۔

خان صاحب فوراً حساب لگانے لگے کہ چاند کی چودہ تاریخ کب آئے گی اور کیا ہم اس وقت استنبول میں ہوں

گے بھی یا نہیں۔ اس جیل خانے کی عمارت میں تہذیبیاں ہونے کے بعد یہ انتہائی شاندار ہوٹل نظر آتا ہے جو جتنی طرف نظر تھیں گے غموں کا نمونہ ہے۔ اس ہوٹل سے کچھ فاصلے پر دریا کے کنارے کچھ گاؤں تھے۔ ہوٹل میں بیٹھ کر اس پاس کا منظر ایک طلسمانی کیفیت پیدا کر دیتا ہے۔ یوں تو استنبول میں ہوٹلوں، کلبوں اور ریسٹورانوں کی کمی نہیں ہے لیکن بقول مرزا صاحب خود شہر کے لوگ اور دوسرے شہروں اور ملکوں سے آنے والے سیاح بھی یہاں ایک بار کھانا کھانا ضروری سمجھتے ہیں۔

مرزا صاحب بولے ”یہ ہوٹل ترکی کے مخصوص اور لذیذ کھانوں کے لیے مشہور ہے۔ حالانکہ لوگوں کو یہ احساس بھی رہتا ہے کہ وہ ایک جیل خانے میں کھانا کھا رہے ہیں، یہ ہوٹل سلطان احمد کے علاقے میں ہے۔ کچھ فاصلے پر بلیو مسجد ہے۔ آیا صوفیہ کی حسین عمارت بھی یہاں سے نظر آ جاتی ہے۔ یہ استنبول کا ایسا علاقہ ہے جو ہر قابل ذکر مقام سے نزدیک ہے بلکہ یہاں بیٹھ کر ان تاریخی نامدار عمارتوں کو دیکھا بھی جاسکتا ہے۔

ہوٹل کے اندر کی حواث بہت خوبصورت ہے۔ ترکی کے کسی بھی شہر یا عمارت کے لیے یہ کہنا کہ نہایت صاف ستری ہے بے معنی ہے کیونکہ صفائی کے اعتبار سے ترک سچ کے مسلمان ہیں۔ نہایت صفائی پسند، لباس شرعی یا پھر مغربی مگر صاف شفاف۔ نہایت خوش اخلاق محل اور آہستہ سے بات کرنے والے۔ بٹ صاحب استنبول کی یہ خوبیاں دیکھ کر بہت مرعوب ہوئے اور بولے۔ ”آفاقی صاحب، استنبول تو یورپ کا کوئی شہر لگتا ہے۔“

خان صاحب نے فوراً ٹوکا۔ ”یورپ کے شہروں میں ایسی خوبصورت قدیم عمارتیں نہیں، نہ باغیچوں، نہ مشرق اور مغرب کا سنگم۔“

ہال میں داخل ہوتے ہی ایک خوش لباس ویر نے ہمیں ایک کھڑکی کے سامنے لے جا کر بٹھا دیا جہاں سے نہ صرف ہوٹل کا اندرونی منظر بلکہ باہر کا حسن بھی نظر آتا تھا۔ میز کے گرد کرسیوں کی جگہ کشن لگے ہوئے نرم صوف نما کرسیاں تھیں جس پر بیٹھ کر ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے ہوا میں تیر رہے ہیں۔

ہیڈ وئر دوبارہ نوٹ بک لے کر آگیا۔ وہ بہت کم انگریزی جانتا تھا لیکن خوش قسمتی سے ہمارے ساتھ شعیب مرزا تھے جو ترکی کی ٹانگ تو ذکر اپنا مطلب سمجھا دیتے تھے۔

ایک خوبصورت مینو کارڈ ہم سب کو پیش کر دیا گیا۔ دراصل امیروں کا پسندیدہ ہوٹل ہے اس لیے ادب آداب اور رکھ رکھاؤ بھی بہت زیادہ ہے۔

مرزا صاحب نے مینو پڑھ کر ہمیں بتایا کہ یہاں آپ کو اسٹیکس بھی مل سکتے ہیں۔ شندے مشروبات اور مختلف قسم کے سوپ بھی ہیں۔

ہم نے کہا ”مرزا صاحب بلاوجہ وقت ضائع نہ کیجیے یہ بتائیے کہ کھانے میں کیا ہے؟“

وہ مسکرا کر بولے۔ ”اس سے پہلے میں نے جتنی چیزیں آپ کو بتائی ہیں وہ سب بھی کھانے پینے کی ہیں۔ اب آگے بنے۔ یہاں آپ کو ترکی کھانے بھی ملیں گے اور بازنطینی لذیذ کھانے بھی مل جائیں گے اس کے بعد انہوں نے کھانوں کی فہرست بھی پیش کرنی شروع کر دی۔ خان صاحب بولے ”یار مرزا صاحب، ہمارے مہر مزید امتحان نہ لیجیے۔ یہ کام ہماری سمجھ میں نہیں آتے۔ آپ یہ سب کھاتے رہے ہیں۔ خود ہی آرڈر دے دیجیے۔“

بٹ صاحب فوراً بول پڑے۔ ”مگر گوشت حلال ہو کسی چیز میں ناجائز چیز شامل نہ ہو۔ مینڈک، ککڑا، مگرچہ جھینگے وغیرہ بالکل نہ ہوں۔“

مرزا صاحب نے کہا۔ ”بٹ صاحب یہ ایک اسلامی ملک ہے۔ یہاں کوئی چیز آپ کو ایسی نہیں ملے گی جسے عام مسلمان پسند نہیں کرتے۔ آپ چپ چاپ دیکھتے رہیے کوئی اعتراض ہو تو بتا دیجیے گا۔“

مرزا صاحب نے ڈونر کباب، کوftے اور شیش کباب اور ترکی نان کا آرڈر دیا۔

ایران کی طرح ترکی میں بھی نان کی مختلف قسمیں ہوتی ہیں جو سب کی سب انتہائی لذیذ ہوتی ہیں۔ دستور ہے کہ ریسٹوران میں کھانے کا آرڈر دینے کے بعد جب تک کھانا آئے اس سے پہلے ایک نوکری میں نان کے ٹکے ہوئے ٹکڑے رکھے ہوتے ہیں۔ ساتھ ہی مکھن بھی ہوتا ہے۔ سلا بھی ایک پلیٹ میں آ جاتی ہے۔ جب تک کھانا آئے آپ ان چیزوں سے دل بہلاتے رہیں۔ بٹ صاحب کو نان اور مکھن اس قدر پسند آیا کہ مسلسل کھانے رہے یہاں تک کہ سارے نان ختم ہو گئے۔

خان صاحب نے کہا۔ ”بٹ صاحب یہ نان صرف چکھنے کے لیے آئے تھے۔ آپ نے تو سارے ختم کر دیے۔ اب کھانا کیسے کھائیں گے؟“

خان صاحب نے کہا۔ ”بٹ صاحب یہ نان صرف چکھنے کے لیے آئے تھے۔ آپ نے تو سارے ختم کر دیے۔ اب کھانا کیسے کھائیں گے؟“

بٹ صاحب نے ایک چھوٹی سی ڈکاری اور بولے۔ ”خان صاحب، آپ کھیر یوں کو نہیں جانتے۔ یہ ساری دیکھ بھی کھالیتے ہیں اور ہم بھی کر لیتے ہیں۔“

ہم نے کہا۔ ”ہمارے ایک پروفیسر کہا کرتے تھے کہ ہر انسان کے پیٹ میں ہر قسم کے کھانوں کے لیے علیحدہ خانہ ہوتا ہے۔ مثلاً آپ پیٹ بھر کر پلاؤ کھالیتے ہیں لیکن پھر روٹی بھی کھالیتے ہیں۔ چاول اور روٹی کے بعد اب پیٹ میں مٹی بکس نہیں رہتی مگر جب میٹھا آتا ہے تو آپ میٹھا بھی کھالیتے ہیں۔ اب آپ کا پیٹ بالکل فل ہو چکا ہے لیکن پھل اور خشک میوہ پیش کیا جائے تو آپ وہ بھی ختم کر دیتے ہیں۔ اتنا کھانے کے بعد اب آپ کے پیٹ میں سانس لینے کی گنجائش بھی نہیں ہوتی لیکن چائے یا کافی پیش کی جائے تو آپ وہ بھی پی جاتے ہیں۔“

آئی دیر میں کھانے کی مختلف ڈشز آ گئیں۔ کبابوں کی خوشبو سے لاہور کے سج کباب یاد آ گئے۔ کوftے ہمارے جیسے ہی تھے مگر شور بہ تھا۔

مرزا صاحب نے کہا ”یہاں کھانا کھانے کا لطف یہ ہے کہ کھڑکیوں میں سے آیا صوفیہ کے خوبصورت گنبد بھی نظر آ جاتے ہیں۔ سلطان احمد مسجد کے مینار بھی دیکھ سکتے ہیں۔ چاندنی رات میں مسجد کے مینار اور آیا صوفیہ کا گنبد دنیا کا سب سے خوبصورت نظارہ پیش کرتا ہے۔ میں تو چاندنی رات میں یہ منظر ضرور دیکھتا ہوں۔“

بٹ صاحب بولے۔ ”مرزا صاحب آپ نے کبھی چاندنی میں تاج محل دیکھا ہے۔ ساری دنیا کہتی ہے کہ چاندنی میں اس کا حسن بے مثال ہوتا ہے۔“

مرزا صاحب نے کہا۔ ”بدقسمتی سے میں چاندنی رات میں تاج محل نہیں دیکھ سکا۔ آپ نے دیکھا ہے؟“

بٹ صاحب کا جواب تھا۔ ”جی نہیں۔“

”تو آپ تعزیریں کیوں کر رہے ہیں؟“

”میں نے فلموں میں دیکھا ہے اور اخباروں میں پڑھا ہے۔“

ایک تو کھانا بہت لذیذ تھا۔ پھر کھانا پیش کرنے کا طریقہ اتنا دلکش تھا کہ جی چاہتا تھا اس زبان کو کوئی دیکھتے رہیں۔

اور نیلی اسکرٹ پہنے ہوئے تشریف لائیں اور مسکرا کر ”خوش آمدید“ کہنے کے بعد پوچھا۔ ”آپ کھانے کے ساتھ موسیقی پسند کریں گے؟“

مرزا صاحب نے اس کا ترجمہ ہم سب کو سنایا۔

بٹ صاحب بول اٹھے۔ ”ضرور، واہ کیا بات ہے میوزک کی؟“

”کس قسم کا میوزک آپ کو پسند ہے؟“

بولے۔ ”جو اچھا ہو۔ یعنی کانوں کو اچھا لگے۔“

خانوں ترجمہ سن کر مسکرائیں۔ بولیں ”ٹرس میوزک یا عرب میوزک؟“

بٹ صاحب نے کہا۔ ”مجھے تو غزلیں پسند ہیں، یا پھر پکا گانا۔“

”غزلیں۔ جس میں عورتوں کی تعریف ہوتی ہے یا اظہار محبت؟“

بولے۔ ”بالکل صحیح سمجھیں آپ۔“

”مگر ہمارے پاس تو کوئی غزل نہیں ہے آپ انگلیس میوزک سن لیجیے۔“

”ہرگز نہیں۔ انگریزی سے مجھے نفرت ہے۔“

”مگر کیوں؟“

”اس لیے کہ وہ انگریزوں کی زبان ہے۔“

مرزا صاحب نے وضاحت کی ”ان کا مطلب یہ ہے کہ انگریزوں نے ہمیں ڈھائی سو سال غلام رکھا۔ ہمیں ان کی ہر چیز سے نفرت ہے۔“

خانوں حیران ہو کر بولیں ”مگر آپ دو ڈھائی سال تک غلام کیوں رہے۔ جنگ کر کے انہیں اپنے ملک سے باہر کیوں نہیں نکال دیا۔“

”کیونکہ ہمارے پاس کوئی مصطفیٰ کمال نہیں تھا۔“

وہ بولیں۔ ”آپ سچ کہتے ہیں۔ جو ترک مصطفیٰ کمال کو سیکر کہتے ہیں اور خلافت ختم کرنے کا ذمہ دار ٹھہراتے ہیں وہ بھی دل سے تسلیم کرتے ہیں کہ آج کا آزاد اور خوددار ترکی مصطفیٰ کمال پاشاہی کی دین ہے۔ اچھا تو پھر میں آپ کے لیے ترک میوزک لگا دیتی ہوں۔ ٹھیک ہے؟“

”جی، بالکل ٹھیک۔“

بٹ صاحب جھٹ بول پڑے۔ ”جیسا دیس ویسا ہمیں۔“

خانوں نے حیرت سے بٹ کی طرف دیکھا کہ مطلب کیا ہے اس کا۔ مرزا صاحب نے کہا۔ ”یہ ہماری اردو زبان کا ایک محاورہ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جہاں بھی

رہو وہاں کے لوگوں کی طرح رہو۔“

کھوئی؟“

”اچھا مجھے بھی بتائیے۔“

”ضروری کام اور باتیں چھوڑ کر عیش و عشرت کھانوں کی سیکڑوں تئیں دریافت کرنے لگے۔ کھانا شوق پیدا ہوا تو سب جنگ و جدل بھول کر کھانے پینے ناچ رنگ میں مصروف ہو گئے۔“

مرزا صاحب نے کہا: ”بٹ صاحب کھانے پینے سے کوئی نہیں مرتا ہے بشرطیکہ اعتدال قائم رکھے۔ مغلوں کی آخری نسلیں سب کچھ بھولی کر صرف کھانے پینے اور ناچ گانے میں مصروف ہو گئیں۔ آپ ترکی کو دیکھ لیں۔ کھانے پینے میں بھی آگے اور ترقی میں اس سے بھی زیادہ آگے۔ ترقی اور آسائش ساتھ ساتھ چلنا چاہیے۔ ریسٹوران میں بہترین دہی میں ترکی ہوئے کباب نہایت لذیذ ہیں، یہاں کا پیزا کا کرکس (روٹی) نہایت باریک اور کرکرا ہوتا ہے۔ کریم کے ساتھ تیار کیے ہوئے پنیر پھل اس طرح پیش کیے جاتے ہیں کہ دیکھ کر ہی منہ میں آجاتا ہے۔“

خان صاحب بولے ”منہ میں پانی تو بہت آچکا کھانا بھی آجائے تو بہتر ہوگا۔“

کھانا واقعی بہت مزیدار تھا۔ ہوٹل سے باہر ٹریفک کی توجہ صاحب نے بطور خاص فورینرز ہوٹل کے سامنے کھڑے ہو کر تقصیر بنوائی تاکہ یادگار رہے گا کہ ہم نے جیل میں کھانا کھایا تھا۔

ہم نے کہا: ”بٹ صاحب آپ فکر نہ کیجئے، ہم آپ کو لاہور کے کسی بھی جیل میں جب آپ چاہیں ڈرہاڑا کھلا دیں گے۔“

اس علاقے میں شاندار ہوٹلوں اور ریسٹورانوں کی کمی نہیں ہے۔ نزدیک ہی ریسٹوران کی مشہور سڑک استقلال کڈیسی ہے۔ جبکہ پہلے بتایا جا چکا ہے اس سڑک پر ہر قسم کی ٹریفک بند ہے۔ چوڑے چوڑے فٹ پاتھوں پر سائیکل سوار مقامی لوگ گھومتے پھرتے ہیں۔ اس سڑک پر چھوٹی چھوٹی خوبصورت کھوکھانہ کافے بھی ہیں۔ یہاں تازہ بننے والے باب کارن، کھانے پینے کی دوسری ہلکی اشیا اور مختلف اینٹیکس دستیاب ہو جاتے ہیں۔ استقلال کڈیسی (روٹی) ایک پہاڑی علاقہ ہے جہاں سے آپ شہر کا نظارہ بھی کر سکتے ہیں۔ اس علاقے کو اگر نوڈل سٹریٹ کہیں تو غلط نہ ہوگا۔

ریستوران یہاں بہت زیادہ ہیں اور ہر ریسٹوران میں

کھانا بہت لذیذ تھا۔۔۔ پلاؤ کی قسم کے چاول تھے۔ مختلف قسم کے کباب تھے۔ دہی بہت میٹھا تھا۔ پیڑی کی قسم کا تھا لیکن انتہائی نمکین اور کڑوا۔ ہم نے جب بھی ترکی کا پیڑی کھایا پیچھتائے۔ دیکھنے میں تو یہ بہت دلکش ہوتا ہے۔ جی چاہتا ہے کہ بس صرف پیڑی کھائے جاؤ مگر ایک لقمہ بھی جلیق سے نہیں اترتا۔ ہم نے کئی ترکوں سے پوچھا کہ آپ اتنے میٹھے لوگ ہیں مگر آپ کا پیڑی اتنا کڑوا کیوں ہوتا ہے۔ اس کا جواب ہمیں ہمیشہ یہی ملا کہ بس شروع ہی سے یہ دستور ہے۔ ترکوں کو زیادہ نمکین پیڑی ہی اچھا لگتا ہے۔“

ہم سب نے جیل ہوٹل اور اس کے کھانے کی بہت تعریف کی۔ مرزا صاحب نے بتایا کہ استنبول میں یورپ اور ایشیا کے بہترین ہوٹل اور ریسٹوران ہیں۔ دنیا بھر سے دولت مند ترین لوگ یہاں اپنے ذاتی بحری یا ہوائی جہازوں میں آتے ہیں اور شہر کے خوبصورت اور پرکشش مناظر کے ساتھ ساتھ بہترین ریسٹورانوں کے کھانوں سے بھی لطف اندوز ہوتے ہیں۔ یہاں کی نائٹ لائف بھی بہت خوبصورت ہوتی ہے۔ یورپ کے شہروں سے بالکل مختلف ہے۔ اچھے ہوٹلوں میں عموماً صوفہ نما اور کمرن والے صوفے ہوتے ہیں جن پر بیٹھ کر کھانے کا لطف دوہلا ہو جاتا ہے۔ عموماً یہ قدیم دیوان نما صوفے ہوتے ہیں جو ترکی کے ریسٹورانوں کی علیحدہ خصوصیت ہے۔ یہاں کا ایک مشہور ریسٹوران ”واک“ بھی ہے۔ کسی دن آپ کو وہاں بھی لے جاؤں گا۔ ”مرزا صاحب بولے۔“ اس ہوٹل کے اسٹیکس بہت مشہور ہیں، اور یہ مختلف اقسام کے ہوتے ہیں۔ یہاں کی کرکس ڈش ”سوشی“ سارے شہر میں مشہور ہے۔ رات کو میوزک اور ڈانس بھی ہوتے ہیں جو مہمان کرتے ہیں۔ استنبول کے ایک اور معروف ریسٹوران کا نام 360 ہے۔

”عجیب و غریب نام ہے۔“ ہم نے کہا ”اگر گھبروں پر ہی نام رکھنا تھا تو 786 رکھ لیجئے۔“

”ارے نہیں، یہ بہت ماڈرن ریسٹوران ہے۔ اس نام کی بے حد ترقی ہوئی، اس ریسٹوران کی دیواریں شیشے کی ہیں جہاں سے پاسفوس اور استنبول شہر کے مناظر نظر آتے ہیں۔ رات کے وقت تو یہ پریوں کے دیش جیسا لگتا ہے۔“

بٹ صاحب کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا۔ بولے۔ ”مرزا صاحب، آج مجھے معلوم ہو گیا کہ مغلوں نے کئی سو سال حکومت کرنے کے بعد ہندوستان کی حکومت کیوں

حکومت قائم کر سکا تھا۔ ویسے بھی لوگ اور خواتین گلوں میں غرق نہ ہوئے کھانے کی مختلف چیزیں فروخت کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ہر قسم کے مشرقی کھانوں کے لیے استنبول کو ایک مرکزی حیثیت حاصل ہو گئی ہے۔

ہوٹل سے اب کہاں جائیں؟ ابھی یہ سوچ ہی رہے تھے اور شور سے کر رہے تھے کہ ایک ترک جوان سامنے سے آئے اور مرزا صاحب کے گلے لگ گئے۔ ہم لوگ تو حیران رہ گئے کہ یہ کون صاحب ہیں اور اس بے تکلفی کا سبب کیا ہے؟

مرزا صاحب نے ان صاحب سے گلے ملنے کے بعد عارف کریم کہا کہ یہ مراد ہیں جنہیں ترکی میں مراد کہا جاتا ہے۔ مراد تھوڑی بہت انگریزی جانتے تھے۔ ہم تینوں سے بھی ملے اور کہا۔ ”میں نے سنا ہے کہ آپ کی زبان اردو میں ترکی کے دس ہزار سے زیادہ الفاظ ہیں لیکن ہم لوگ پھر بھی اپنی زبان میں بات نہیں کر سکتے۔“

ہم نے کہا۔ ”ہم آئندہ ترکی سیکھنے کی کوشش کریں گے اور آپ اردو سیکھیے۔“

”مرحبا! ضرور ایا کرنا چاہیے۔“

فیصلہ یہ ہوا کہ اب ہم لوگ پاسفوس کی سیر کو چلیں گے۔ پاسفوس کو چلیج ہے جو مشرقی اور مغربی استنبول کو دو حصوں میں تقسیم کرتی ہے۔ ان دونوں حصوں کو آپس میں ملانے کے لیے ایک کشاہ پل ہے جسے پاسفوس برج (پل) کہا جاتا ہے۔ یہ پل 1973ء میں تعمیر کیا گیا تھا۔ اس پر سے گزریں تو دونوں جانب پاسفوس کا نیلا پانی نظر آتا ہے۔ پاسفوس کو اگر استنبول کے ماتھے کا مجموعہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ پاسفوس نے استنبول کو ایک نئی شناخت دے دی ہے۔ شاید ہی شہر کا کوئی حصہ ہو جہاں سے پاسفوس نظر نہ آئے۔ اس میں بڑے بڑے بحری جہاز ہر وقت دریاں دوایں رہتے ہیں۔ سیاحوں اور سیر و تفریح کرنے والوں کی کشتیاں بھی ہر وقت سمندر کے سینے پر تیرتی نظر آتی ہیں۔ تقریبی کشتیاں رات کو بھی سیاحوں کو پاسفوس کی سیر کرائی ہیں۔ یہ روشن، جھلکی ہوئی کشتیاں اور ان میں بجایا جانے والا میوزک ماحول کو ایک طلسمی کیفیت میں تبدیل کر دیتا ہے۔ یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ استنبول میں رہ کر آپ کو پاسفوس کا کوئی نہ کوئی حصہ نظر نہ آئے۔ پاسفوس کے دونوں حصوں کو جوڑنے والا کشاہ پل 1040 میٹر طویل ہے۔ یہ دنیا میں اس قسم کا چوتھا بڑا پل ہے۔ پاسفوس کے

آس پاس محلات، بلند و بالا خوبصورت عمارتیں، ہوٹل، رہائش گاہیں اور دور تک پہنچنے والے شہر کی گلابی چھتوں اور سفید رنگ روشن والی عمارتیں اس نظارے میں کچھ اور اضافہ کر دیتی ہیں۔ یہ پہاڑی علاقہ ہے اس لیے شہر کے مکانات بھی نشیب و فراز میں بنائے گئے ہیں۔

بٹ صاحب بار بار ہر ایک سے پوچھتے رہے کہ وہ سات پہاڑیاں کہاں ہیں جن پر یہ شہر آباد ہے۔

خان صاحب تنگ آ کر بولے۔ ”بٹ صاحب آپ جس ڈھلوان والی سڑک سے گزر رہے ہیں یہ بھی ایک پہاڑی ہے۔“

ہم لوگ پاسفوس برج سے گزرے۔ یہ دو طرفہ ہے اور ہر طرف چار لینیں پر ٹریفک چلتی رہتی ہے۔ ہم نے یہاں کبھی ٹریفک کا جھجکا یا ٹریفک کی بدگلی نہیں دیکھی حالانکہ پولیس کا ایک سپاہی بھی نظر نہیں آتا۔ استنبول جرائم سے پاک شہر ہے۔ عموماً لوگ دکانوں اور مکانوں کو تالے نہیں لگاتے۔ کار پارک کر کے اسے قفل کرنا ضروری نہیں ہے۔ بٹ صاحب اور خان صاحب انگریزی اخبار کی تلاش میں تھے۔

”انگریزی اخبار کا آپ کیا کریں گے؟“

”اخبار کو پڑھتے ہیں۔ اسے الماریوں میں نہیں بچھاتے۔“

انگریزی اخبار ملا تو یہ دونوں حضرات اس پر ٹوٹ پڑے اور شروع سے آخر تک پڑھ ڈالا۔ یہاں تک کہ اشتہارات اور اخبار کی پرنٹ لائن بھی پڑھ لی۔

”آپ اخبار میں کیا پڑھ رہے ہیں۔“ ہم نے پوچھا۔

”خبریں۔ ہمیں اخبار میں ایک بھی جرم یا قتل کی خبر نہیں ملی۔“

بٹ صاحب بولے۔ ”میرا خیال ہے کہ یہ غیر ملکیوں پر اپنے ملک کا بہتر تاثر ڈالنے کے لیے جرائم کی خبریں چھاپتی ہی نہیں ہیں۔“

اس پل سے گزر کر ہم سر پر پورٹ پہنچ گئے۔ یہ ایسی نوآوری یا کھانا ہے۔ اس کے نزدیک ہی مشہور مسالا بازار واقع ہے۔

مراد بھی اب ہمارے ساتھ ہو گئے تھے۔ ان کا اصرار تھا کہ مسالا بازار ضرور دیکھیے۔

بٹ صاحب بولے۔ ”دیکھیے صاحب ہم کو پاکستان

میں مسالا یا تو بارہا چلی خانے میں نظر آتا ہے یا کھانے کی پلیٹ میں۔ بازاروں میں بھی مسالا فروخت ہوتا ہے لیکن یہ کام خواتین کرتی ہیں۔

مراد نے کہا۔ ”یہ تو اس بازار کا پرانا نام ہے۔ اب تو یہ گریڈ بازار کہلاتا ہے اور یہاں دنیا بھر کی ہر چیز ملتی ہے۔ کیا آپ کو قالینوں کا شوق ہے؟“

”شوق؟ ارے میں تو قالینوں کا عاشق ہوں۔ میرے گھر میں فرش پر بھی قالین نظر آتے ہیں اور دیواروں پر بھی۔“

مرزا صاحب بولے۔ ”تو پھر چھت نے کیا قصور کیا ہے۔ چھت پر آپ نے قالین کیوں نہیں آراستہ کیے۔“

”آپ کے شورے پر غور کروں گا۔“

ترکی میں ہاتھ کے بنے ہوئے قالین بہت خوبصورت اور مہنگے ہوتے ہیں۔ لیکن ہمیں یہ تجربہ ہوا کہ ترکی میں بھی قیتوں کے معاملے میں لین دین اور کمی بیشی کا رواج ہے۔ اگر ایک قالین کی قیمت دس ہزار طلب کرتے ہیں تو تجربہ کار لوگ یہی قالین دو ہزار میں خرید لیتے ہیں۔

یہ جگہ گولڈن ہارن کے نزدیک ہی ہے۔ دراصل اس جگہ باغیچوں میں ایک چھتری شکل میں نظر آتا ہے اس لیے اس کو گولڈن ہارن اور بادلوں میں سنہری سیلنگ کہتے ہیں۔

مراد نے یہ توضیح کی کہ مسالا بازار اور گریڈ بازار دو الگ الگ بازار ہیں اور دیکھنے کے قابل ہیں۔ آپ کے لیے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہوتا ہے کہ کیا خریدیں اور کیا نہ خریدیں۔ قدیم نوادرات کے علاوہ جدید اشیاء بھی یہاں مل جاتی ہیں۔

خان صاحب نے فیصلہ کیا کہ بازاروں کو بعد میں دیکھ لیا جائے گا۔ فی الحال باغیچوں کی بحری سیر کے لیے جانا چاہیے۔

بٹ صاحب بولے۔ ”نہیں“ ہمیں سب سے پہلے ٹوپ کا پی میوزیم جانا چاہیے۔ مراد نے کہا کہ ٹوپ کا پی واقعی قابل دید میوزیم ہے لیکن یہ اس قدر لمبا چوڑا ہے کہ اگر صحیح معنوں میں دیکھنا چاہیں تو اس کے لیے کئی دن درکار ہوں گے۔

ہم نے کہا۔ ”باغیچوں تو ہم نے ہر جگہ سے دیکھ لیا۔ کیوں نہ ہم کوئی نئی اور عجیب و غریب جگہ دیکھیں۔“

”تو پھر ہم آپ کو انڈر گراؤنڈ شہر دکھائیں گے۔“

بٹ صاحب بولے۔ ”یہ تو بہت خطرناک بات

ہے۔ بھائی میں ابھی زندہ ہوں۔ زندہ درگور نہیں چاہتا۔“

”فکر نہ کیجیے آپ زندہ درگور نہیں ہوں گے کیونکہ یہ قبریں نہیں ہیں۔ ایک ایسا شہر ہے جو زمین کے اندر بنایا گیا ہے۔“

اس جگہ جانے کے لیے بس یا ہوائی جہاز استعمال کرنا ہوتا تھا۔ ہمیں جہاں جانا تھا اس کا نام کیسری ہے۔ ہمارے ملک میں تو خواتین کے ملبوسات کے لیے ایک کپڑے کا نام کیسریا ہے۔ مگر یہ کیسریا نہیں کیسری ہے۔ اور کیسری ہمارے

میں زعفرانی کو کہتے ہیں۔ بس بہت اچھی اور صاف نظر آتی ہے۔ کیونکہ استعمال کرنے والے مسافر بھی بہت شاکہ و غیرہ اور مہذب ہیں، بسوں کو دیکھ کر ایسا لگتا ہے جیسے ابھی ٹیکس سے بن کر آئی ہے۔

کیسری ایک الگ تھلک علاقہ ہے۔ مراد نے بتایا کہ یہاں انتہائی قدیم تہذیب سے تعلق رکھنے والے لوگ رہتے ہیں جنہیں آپ قباہی بھی کہہ سکتے ہیں۔ معلوم ہوا کہ

یہ لوگ چار ہزار سال قبل از مسیح سے اس علاقے میں رہتے ہیں لیکن انہوں نے اپنی عادات اطوار اور رسم رواج میں کئی تبدیلی نہیں کی۔ وہی لباس، وہی حلیہ، وہی لیے لیے بال

ان کی آبادیاں جو قدیم زمانے کی مٹی اور چولہے جھونپڑیوں پر مشتمل ہیں دریائے سرخ کے کنارے کنارے واقع ہیں۔ دریائے سرخ کو اس لیے یہ نام دیا گیا ہے کیونکہ پہاڑوں سے بارش میں بہہ کر آنے والی سرخ مٹی اس کے پانی میں شامل ہو جاتی ہے اور یہ دریا ایک طویل فاصلے پر

گرنے کے بعد بلیک سی میں جا گرتا ہے۔

ہم لوگوں نے ان سے بات چیت کرنے کی کوشش کی مگر ان کا رویہ ایسا تھا جیسے ہم انہیں نظری نہیں آ رہے۔ ہماری طرف دیکھنا بھی پسند نہیں کرتے تھے۔ اگر کوئی ہم سے نظر ملا بھی لیتا تو ہم لوگوں کے سلام یا سوال کے جواب میں خاموشی سے گزر جاتا تھا۔

بٹ صاحب بولے۔ ”معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ بہروں کا قبیلہ ہے۔“

خان صاحب نے کہا۔ ”اور ان میں کچھ اندھے بھی شامل ہیں جنہیں ہم نظری نہیں آتے۔“

بٹ صاحب بولے۔ ”یہ تو عجیب نسل کے لوگ ہیں۔ یا تو یہ مرد ہیں یا سب کی سب عورتیں ہیں۔“

”وہ کیوں؟“

”بھائی، غور سے دیکھ کر بتائیے کہ آپ کو ان میں کون کون نظر آتی ہے اور مرد کون۔“

ان کی بات کافی حد تک درست تھی، کبھی کی چوٹیاں سر تک لمبی لمبی تھیں۔ انہوں نے چوٹ اور کھاس کا لباس پہنا ہوا تھا۔ شاید یہ ان جانوروں کی کھالیں تھیں جو وہ کھانے کے لیے بھڑکارتے تھے۔ ان کے قد و قامت بھی ایک جیسے تھے۔ کبھی مضبوط، تندرست اور لمبے ترنگے تھے۔ کسی میں

عروں والی نزاکت نظر نہیں آتی۔

”بھائی یہ کس قسم کے لوگ ہیں؟“ خان صاحب حیران ہو کر بولے۔

”خان صاحب یہ مت بھولیں کہ یہ چار ہزار سال قبل مسیح کے لوگ ہیں، یعنی حضرت عیسیٰ کی پیدائش سے بھی چار ہزار سال پہلے پیدا ہوئے تھے۔“

”مجھے تو یقین نہیں آتا کہ یہ سچ ہے۔ اتنے ہزار سال کے بعد انسان زندہ کیسے رہ سکتے ہیں۔ یا چار ہزار سال تک تو کوئی لوہے کی عمارت بھی قائم نہیں رہ سکتی، یہ تو پھر انسان ہیں۔“

مرزا صاحب نے کہا۔ ”میرے خیال میں تو یہ کوئی بھوتوں کی بستی ہے۔ جتنی جلدی ہو سکے ہمیں یہاں سے چلنا چاہیے۔“

بٹ صاحب نے فوراً بلند آواز میں لاجول پڑھنی شروع کر دی۔

خان صاحب نے مشورہ دیا۔ ”بھوتوں سے بچنے کے لیے لاجول نہیں آعوذ باللہ من شیطان الرجیم پڑھنا چاہیے۔“

ہم نے کہا۔ ”جو بھی چاہیں پڑھیں مگر اس مردوں کی بستی سے تو باہر نکلیں۔“

ہم لوگ لاجول اور مختلف آیات پڑھتے ہوئے یہاں سے مل پڑے۔ ایک مراد نے کہا۔ ”اب آپ یہاں تک آگے ہیں تو انڈر گراؤنڈ شہر بھی دیکھ لیں۔“

”بھائی آپ کیسی پراسرار جگہ ہمیں لے کر آئے ہیں۔ کوئی بھوتوں کی بستی ہے۔ کوئی مردوں کا شہر ہے۔“

”ارے یہاں مردے نہیں ہوتے۔ یہ تو ایک عجیب و غریب شہر ہے۔ بلکہ ایک پراسرار جگہ ہے۔“

یہ جگہ بلیک سی ہے۔ خدا جانے کس زبان کا یہ لفظ ہے اور اس کے معنی کیا ہیں۔ لیکن سچ پوچھیے تو یہ ایک انگوٹھی جگہ ہے۔ یہاں زمین کے اندر ہی اندر زمین خود کو لمبی لمبی

آئرزراک (آئرز چٹان)

آئرز چٹانیں الائنس سیرنگ سے 280 میل کی دوری پر واقع ایک قدیم چٹان کا نام۔ آئرز چٹانیں یا شٹلے اے یو لور Uloru کا نام دیتے ہیں۔

اس چٹان کی بلندی 1142 فٹ یا 348 میٹر، محیط ساڑھے پانچ میل ہے۔ یہ 3.6 کلومیٹر یا 2-1/4 میل لمبی، 2.4 کلومیٹر یا 1-1/4 میل چوڑی ہے۔

اپنے محیط کے اعتبار سے یہ دنیا کی سب سے بڑی چٹان ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ چٹان چھ کروڑ سال پرانی ہے۔ اسے عجائبات عالم میں شمار کیا جاتا ہے۔

یہ چٹان لوہے کی بھاری مقدار پر مشتمل ہے اور ہوا اور نمی کی وجہ سے اس پر گہرے ہنری مائل بھورے رنگ کی چھڑی ہوئی ہے۔ سورج کی روشنی میں یہ سرخ دکھائی دیتی ہے۔ اسے سب سے پہلے ولیم

کرستی گو نے 1873ء میں سر کیا تھا۔ آئرز چٹان کے حکمران ہنری آئرز کے نام پر اس کا نام آئرزراک رکھا گیا ہے۔

مرسلہ: مریم اسد، ڈی آئی خان

سرنگیں اور عجیب و غریب کرے بنے ہوئے ہیں۔ آپ نے اگر زمین کے اندر چوٹیوں کے گھر دیکھے ہوں تو یہ اسی قسم کی جگہ ہے۔ اوپر سے زمین ہموار ہے مگر اس کے اندر سرنگیں اور پناہ گاہیں ہیں جن میں اب کوئی نہیں رہتا۔ یہ چوہے کے بل یا چوٹیوں کے گھروں جیسی جگہ ہے۔ ان گھروں کی دو دو تین منزلیں بھی ہیں۔ بعد میں کچھ بزرگوں نے ہمیں بتایا کہ ہزاروں سال پہلے لوگوں نے حملہ آوروں یا دشمنوں سے محفوظ رہنے کے لیے یہ خفیہ زیر زمین شہر آباد کیا ہوگا۔ اس چٹان میں ٹوپل سیرنگ میں بہت سے گھر ہیں۔ دو منزلہ گھروں تک جانے کے لیے بیڑیاں بھی ہیں اور ان بیڑیوں میں روشنی اور ہوا کی آمد و رفت کے لیے چٹانوں میں بنائی گئی ہیں۔ گھروں کی مختلف بالائی منزلوں کو آپس میں ملانے کے لیے بھی بیڑیاں بنی ہوئی ہیں۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ جب انہوں نے یہ شہر بنایا ہوگا تو ظاہر ہے کہ زمین کے اندر تو اندھیرا ہی ہوگا۔ اس اندھیرے میں انہوں نے تیروں یا بیڑیوں کی مدد سے یہ راستے کھودے ہوں گے

کیونکہ اس زمانے میں اس مقصد کے لیے جدید ترین آلات اور مشینیں تو نہیں تھیں پھر بھی انہوں نے زمین کے اندر ایک خفیہ پناہ گاہ بنائی جو ان کے دشمنوں کی نظروں سے اوصل تھی۔ جو اس شہر میں خطرے کے وقت اپنے بیوی بچوں کے ساتھ رہتے ہوں گے۔ خدا جانے کھانے پینے کا انہوں نے کیا بندوبست کیا تھا۔ ہوسکتا ہے وہ ضرورت کے وقت کے لیے ان گھروں میں کھانے پینے کا سامان ذخیرہ کر لیتے ہوں۔ یہ جگہ واقعی حیران کن اور انتہائی پراسرار ہے۔

یہ ایک بٹ صاحب فوجیوں کی طرح تن کر کھڑے ہوئے اور فوجی سلوٹ مارتے ہوئے کہا۔ ”آئی سلوٹ یو۔“

”کس کو سلوٹ کر رہے ہیں آپ؟“

”ان جو ان صحت اور ذہین لوگوں کو جنہوں نے ہزاروں سال پہلے زمین کے اندر یہ شہر بنایا جو آج بھی ہمارے لیے ایک سبق ہے کہ انسان واقعی اللہ کا خلیفہ ہے۔“

ہم لوگ خدا کی قدرت اور انسان کی عقلی کو خراج تحسین پیش کرنے کے بعد اس زمین و در شہر سے باہر آئے تو ہر طرف روشنی اور دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ ساحل کی طرف سے آتی ہوئی تازہ ہوائے ہم سب کے ہوش و حواس بہت جلد بحال کر دیے۔

لوگوں نے سالہا بازار اور گرینڈ بازار دیکھنے کا ارادہ فی الحال ترک کر دیا تھا۔ اس شام یا اگلی صبح از میر جانے کا ارادہ تھا۔

مرا دو ہم کو اللہ حافظ کہہ کر رخصت ہو گیا تھا مگر جاتے ہوئے اپنا فون نمبر دے گیا اور کہا کہ جب بھی آپ کو میری ضرورت ہو اس نمبر پر ٹیلی فون کر لیں۔ میں الہ دین کے چراغ کے جن کی طرح حاضر ہو جاؤں گا۔

خان صاحب کو یہ فکر تھی کہ از میر کے لیے ہوائی جہاز کی سہولت کرائی جائے لیکن ایسا نہ ہو کہ ہمیں سیٹ ہی نہ ملے اور ہمارا پروگرام خراب ہو جائے۔

مرزا صاحب نے مسکرا کر کہا۔ ”خان صاحب، آپ ہوائی جہاز کی سیٹوں کی فکر نہ کیجیے۔ ترکی میں اندرونی پروازوں کا بندوبست بہت اچھا اور دن کے وقت مختلف شہروں کے لیے ٹرکس کی پروازیں جاری رہتی ہیں۔ آئیے تو کہیں چل کر پائے کافی پیئے ہیں تاکہ طبیعت ہشاش بشاش ہو جائے۔“

یہ ایک مرزا صاحب نے اپنے ماتھے پر ہاتھ مارا۔

کہا ہوا، کیا اپنا وراثت زمین و در زمین میں بھول آئے۔

”نہیں بھائی، مجھ سے بہت بڑی غلطی ہو گئی ہے۔ میں بھول ہی گیا کہ سب سے پہلے مجھے آپ حضرت ایوب انصاریؑ کے مزار پر لے جانا چاہیے تھا۔“

”دانشی، یہ بہت بڑی غلطی ہو گئی۔“ خان صاحب بولے۔ ”میں نے اپنی ڈائری میں نوٹ کیا تھا کہ استنبول جا کر سب سے پہلے ہم حضرت ایوب انصاریؑ شہید کے مزار پر فاتحہ پڑھنے جائیں گے۔“

”مگر آپ ڈائری پڑھنا بھول گئے۔“ بٹ صاحب طنز آمیز لہجے میں بولے۔ ”ماشاء اللہ کتنا اچھا حافظہ ہے۔“

کوئی استنبول جائے اور حضرت ایوب انصاریؑ کے مزار کی زیارت نہ کرے یہ کیسے ممکن ہے۔ استنبول شہر یوں مساجد کا مرکز ہے لیکن یہاں دو مقامات ایسے ہیں جو سب سے زیادہ متبرک اور مقدس ہیں۔ ان میں ایک تو ایوب سلطان کی مسجد ہے جو حضرت ایوب انصاریؑ کے مزار سے متصل ہے۔ بلکہ اسی کا ایک حصہ ہے۔

یہاں پہنچ کر انسان پر ایک عجیب روحانی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ یوں لگتا ہے کہ دنیا کے جمیلوں سے روشہ نوٹ چکا ہے اور ایک جذب کا عالم طاری ہو گیا ہے۔ گولڈن ہارن سے کچھ فاصلے پر مسجد ابو ایوب ہے۔ عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ یہ مقام مسلمانوں کے مقدس ترین مقامات میں سے ایک ہے۔ یہ گولڈن ہارن یعنی قرین زریں سے زیادہ فاصلے پر نہیں ہے۔ قرین زریں کی زمانے میں سلطانوں کے کھیلوں اور شہسواروں کے لیے بہت کھلا میدان تھا۔ جب آبادی میں اضافہ ہوا اور سلطانوں کا دور بھی ختم ہو گیا تو اس کا بانی کندہ بلکہ دلدل کی طرح ہو گیا ہے جو ایک جمیل میں جا کر گر جاتا ہے۔ اس پانی کو صاف کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے مگر ابھی تک اس مقصد میں کامیابی نہیں ہوئی ہے لیکن آئندہ چند سالوں میں یہ منصوبہ ضرور پورا ہو جائے گا۔

مسلم زائرین جن میں ہزاروں سیاح اور بے شمار مقامی زائرین بھی ہوتے ہیں، صبح سے رات تک یہاں حاضری دیتے اور فاتحہ پڑھتے نظر آتے ہیں۔ ترکوں کا کہنا ہے کہ سلیمانہ پڑ شوکت ہے، سلطان احمد کی مسجد خوبصورتی میں اپنی مثال آپ ہے لیکن مسجد ایوب ایک مقدس مقام ہے۔ مزار پر غور و تامل اور مردوں کی تعداد قریباً برابر ہوتی ہے۔ عورتیں سیاہ برقع پہن کر آتی ہیں۔ یہاں آنے والی

عورتوں کو پہلے ہی ہدایات کر دی جاتی ہے کہ وہ اس مسجد کے احرام کا پورا خیال رکھیں، مناسب لباس زیب تن کریں۔ یہاں ٹوٹو بنانے کی اجازت نہیں ہے۔ خصوصاً برقع پوش خواتین کی تصویر بنانا سخت منع ہے۔ یوں تو مسجد میں شب و روز جہوم رہتا ہے لیکن جمعہ کے روز تو یہاں عید کا حال ہوتا ہے۔ مسجد کے آس پاس ہزاروں کبوتروں کا ڈیرا ہے جنہیں آنے والے اپنے ہاتھ سے دانہ ڈالتے ہیں اور یہ کبوتر بھی انسانوں سے خوفزدہ نہیں ہوتے۔ ان کے ہاتھوں، کندھوں اور سروں پر بے تکلفی سے آکر بیٹھ جاتے ہیں اور دانہ چیتے رہتے ہیں۔ یہ کبوتر وقت ان کے سروں پر بیٹھ لاتے رہتے ہیں جیسے وہ آنے والوں کا ساتھ ہی نہیں چھوڑنا چاہتا ہے۔ مسجد ایوب کو سلطان محمد فاتح نے پندرہویں صدی میں تعمیر کرایا تھا۔

حضرت ایوب انصاریؑ کے بارے میں کبھی جانتے ہیں جیسا کہ نام ہی سے ظاہر ہے وہ انصار میں شامل تھے۔ جب رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ لائے تو ہر انصاریؑ خواہش تھی کہ وہ ان کے مہمان رہیں لیکن رسول اکرمؐ نے یہ فیصلہ خود کرنے کے بجائے اپنی اہلی پر چھوڑ دیا کہ جس گھر کے سامنے یہ اونٹنی بیٹھے گی اسی گھر کو اللہ کے رسولؐ کی میزبانی کا شرف حاصل ہوگا۔ اونٹنی آہستہ آہستہ ہر طرف گھومتی رہی۔ ایک دو جگہ رک بھی گئی مگر بالآخر حضرت ایوب انصاریؑ کے گھر کے سامنے آکر بیٹھ گئی تو پھر اُٹھی نہیں۔ اس طرح حضرت ایوب کا مرتبہ نہ صرف میزبان رسولؐ کا تھا بلکہ وہ ایک بزرگ اور صاحبِ عظیم صحابی بھی تھے۔ رسول کریمؐ انہیں سب سے زیادہ عزیز رکھتے تھے۔

رسول اللہؐ نے قسطنطنیہ و استنبول کو مسلمانوں کے ہاتھوں فتح کرنے کی پیش گوئی بھی کی تھی۔ کئی سلاطین نے قسطنطنیہ کو فتح کرنے کی کوشش کی لیکن قلعے کی انتہائی مضبوط دیواروں اور مقامی لوگوں کی زبردست مزاحمت کی وجہ سے کامیاب نہ ہو سکے۔ حضرت ایوب انصاریؑ اپنی صفائی کے باوجود ایک معرکہ میں فوج کے ساتھ شریک ہوئے۔ کئی ماہ تک محاصرہ جاری رہا مگر کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔ قلعے کے اندر سے آگ، پتھر، تیر بہتر تیزی سے برسائے جا رہے تھے۔ وہ قسطنطنیہ کے پہلے محاصرے کے دوران ہی زخمی ہو کر شہید ہو گئے۔ محاصرہ تو کامیاب نہ رہا لیکن حضرت ایوب انصاریؑ کی شہادت قسطنطنیہ کے قلعے کی دیوار کے باہر بنایا گیا چونکہ عربوں

کا عزم تھا کہ ایک دن مسلمان انشاء اللہ قسطنطنیہ کو ضرور فتح کریں گے اور ایسا ہی ہوا۔ سلطان محمد نے بالآخر قسطنطنیہ کو فتح کر لیا اور یہ انتہائی مضبوط و مستحکم شہر مسلمانوں کے قبضے میں آ گیا لیکن حضرت ایوب انصاریؑ کا مزار شہر کی فصیل کے سامنے ہی میں موجود ہے۔ یہ ایک مقدس ترین مقام ہے جہاں لوگ فاتحہ پڑھنے اور مردوں کو مانگنے کے لیے آتے ہیں شادی شدہ جوڑے نکاح کے بعد یہاں حاضری دیتے ہیں۔

قسطنطنیہ اب استنبول کہلاتا ہے۔ ہم نے جب اس شہر کا باقی ماندہ قلعے اور فصیل کا حصہ دیکھا تو حیرت ہوئی کہ اس قدر مضبوط قلعے کو سلطان نے کیسے فتح کر لیا بہر حال وہ ایک عظیمہ داستان ہے۔ لیکن استنبول میں سمندر کے کنارے اس ٹرسکوہ اور ناقابلِ تغیر قلعے کے کافی حصے آج بھی موجود ہیں جنہیں حکومت نے بہت سنبھال کر رکھا ہے۔ استنبول کی بعض اہم شہر اہلوں سے گزرتے ہوئے بھی پرانے قلعے کے دروازے اور دیواریں نظر آتے ہیں لیکن ایسی اچھی حالت میں کہ انہیں دیکھ کر رشک آتا ہے۔ ان دروازوں کے نیچے سے کشادہ خوبصورت سڑکوں پر ٹریفک رواں دواں رہتی ہے۔

خان صاحب نے یہ سب دیکھا تو کہا۔ ”دیکھیے ہم نے اپنے پرانے قلعے کی فصیلوں کو طے کا ڈھیر بنادیا ہے۔ لاہور شہر کے بارہ تاریخی دروازے کا رویاری مرکز بن گئے ہیں مگر پرانے تاریخی دروازوں کی طرف نہ حکومت توجہ دیتی ہے نہ شہریوں نے دی۔ لاہور کی بلدیاتی انتظامیہ اور شہریوں کو استنبول آکر یہ ضرور دیکھنا چاہیے کہ زندہ قومیں اپنی پرانی یادگاروں کو کس طرح سنبھال کر رکھتی ہیں اور ان پر فخر کرتی ہیں۔ لیکن ہم ناولوں پر انما سون والا مقصد بھول چکے ہیں۔ دولت کی ہوس نے ہم کو ہر چیز سے بیگانہ کر دیا ہے۔ ہمارے قدیم شہر، تاریخی عمارتیں، نوادرات سے بڑھ کر قیمتی اور ان مول خزانے، دولت کے لالچ میں ہم ہمارے کر کے زیادہ پیسا کمانے کے لالچ میں انہیں کمرشل پلانزوں اور شاؤپنگ سینٹرز میں تبدیل کر رہے ہیں کیونکہ تاریخ جانتے بھاڑ میں۔ قدیم تاریخی عمارتیں، محلے اور عمارتیں جاگمیں چولہے میں۔ ہمیں تو اس وقت دولت کمانے کا نادر موقع مل رہا ہے نا۔ ہماری حکومتیں اور بلدیاتی ادارے بھی ان کی حفاظت پر توجہ نہیں دیتے۔ پرانے لاہور شہر اور فصیل اور دروازوں ہی کو دیکھ لیجیے۔ یہ کھنڈر، کیا خانے یا تجارتی مرکز

بن چکے ہیں۔ دنیا کے دوسرے ملکوں نے انہیں جان سے بھی عزیز سمجھ کر اور سینٹ سینٹ کر رکھا ہے۔ استنبول کا پرانا علاقہ دیکھیے، قلعہ دیکھیے، قلعے کے دروازے دیکھیے، لگتا ہے جیسے انہیں کوئی بنا سناور کر رکھتا ہے۔

ہم اٹالیہ گئے تو کسی اور کام سے تھے مگر انگریزی جاننے والا ایک نیکی ڈرائیور ہمارا ساتھی بن گیا۔ وہ سارے دن تقاضا کرتا رہا کہ چلیے پرانا شہر تو دیکھیے۔ آخر شام کو کاموں سے فارغ ہو کر ہم اٹالیہ کے پرانے شہر میں گئے تو یوں لگا جیسے وقت ٹھم گیا ہے۔ وہی پرانا ماحول، پرانی گلیاں، بازار، قبوہ خانے درختوں کے سائے میں قبوہ پیتے ہوئے قدیم لباس میں ملبوس لوگ۔ وہی پرانی دکانیں، ہوٹل، عمارتیں لیکن انتہائی صاف ستری۔ گلیوں میں اپنے گھروں کی دیواروں سے جھانکی اور ہسائیوں سے باتیں کرنی ہوئی عورتیں۔ کمال ہے۔ واقعی اگر ہم یہ پرانا شہر نہ دیکھتے تو پرانے ترکی کی تصویریں دیکھ سکتے تھے۔

جیرس، لندن، روم اور دنیا کے دوسرے ممالک نے اپنی پرانی عمارتوں کو چھڑا تک نہیں ہے۔ انتہائی قیمتی علاقوں میں وہی پرانے طرز کی دمنزل عمارتیں۔ سنے شہر انہوں نے ان حدود سے باہر آباد کیے ہیں تاکہ قدیم ماحول پر نگہ نہ ہو۔ عمارت کی بیرونی عمارت میں تبدیلی پر جرمانہ ہوتا ہے اور اس کو دوبارہ اپنے خرچے پر ہی بنانا پڑتا ہے۔ ان کے اندر آپ جو چاہیں تبدیلیاں کریں لیکن بیرونی حصے برآمدے، ستون، دروازے وہی پرانے لیکن نئی حالت میں۔ پرانے علاقوں کے سفر معلوماتی اور تحریف ضرور ہوتے ہیں لیکن وہاں جا کر اپنی ہمسائیگی، ناقدری کا احساس شدت سے ہوتا ہے اور دل دکھ سے بھر جاتا ہے۔

استنبول صبح معنوں میں مشرق اور مغرب کا امتزاج ہے۔ یہ ایک عجیب و غریب معاشرہ ہے جس میں ہر شخص کو اپنی مرضی کے مطابق زندگی گزارنے کا حق حاصل ہے۔ سڑکوں اور تمام مقامات پر آپ کو جینز میں ملبوس خواتین بھی اپنی تشریف ہوئی رئیس لہرائی نظر آجائیں گی۔ مغربی اسکرٹ اور بلاؤز بھی عورتوں کا پسندیدہ لباس ہے۔ بہت سی عورتیں سروں کو رد مالوں سے ڈھانپے نظر آتی ہیں۔ عبا اور برقع پوش خواتین بھی استنبول میں کثرت سے نظر آتی ہیں۔ یہاں پانچ سو سے زائد مساجد ہیں جو نمازیوں سے بھری رہتی ہیں۔ گر جاگروں کو اتوار کے روز عورتوں مردوں اور بچوں کے قافلے جاتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ مقدس مزارات بھی

ہیں اور شراب خانے بھی کھلے ہوئے ہیں مگر کسی کو بیک لڑکھڑاتے ہوئے نہیں دیکھا۔ اگر کوئی ٹھٹھٹے لگتا ہے تو مزاج اور خوش اخلاق پولیس کا سپاہی اچانک کھنکھنسا نمودار ہو جائے گا اور ٹھٹھٹے والے کو بڑے پیار سے اسے ساتھ لے جا کر اس کی کار میں یا پھر پولیس کار میں بٹھا کر اس کے گھر پہنچا دے گا۔

ہم لوگ تو خیر پہلی مرتبہ یہ منظر دیکھ کر کچھ حیران رہے لیکن بٹ صاحب کی تو آنکھیں پچی کی پچی رہ گئیں۔ وہ معاہدے کے مطابق مسلسل لاجل پڑھتے رہے یا پھر مشرقی لباس میں ملبوس خواتین کو دیکھ کر سبحان اللہ کہہ کرتے تھے۔

”بھئی، یہ کیا اسلامی ملک ہے۔ ان ماور پدراؤ عورتوں کو روکنے والا کوئی نہیں ہے؟“

خان صاحب نے کہا۔ ”بٹ صاحب دراصل یہاں ہر فرقے کے علما نہیں ہیں۔ نہ ہی کسی حکومت کی اجازت کے بغیر کسی کے خلاف اعتراض کرنے یا فتویٰ دینے کا حق ہے۔ وہ صرف مسجدوں میں اسلامی تعلیمات دے سکتے ہیں۔ فرقہ واریت یا نفرت پھیلانا جرم ہے۔ سیاست کے بارے میں بھی علما تبصرہ نہیں کر سکتے، نہ ہی اپنی سیاسی پارٹی بنا سکتے ہیں اور نہ ہی الیکشن میں حصہ لے سکتے ہیں۔“

”آپ کو کس نے بتایا؟“

”مرزا صاحب اور مراد نے۔۔۔“ اگر یقین نہ ہو

آپ خود تصدیق کر لیجیے۔

”بھئی مجھے تو آپ پر پورا یقین ہے، سچ کہنا، جھوٹ۔“

”بٹ صاحب، مجھے آپ سے جھوٹ بولنے کی ضرورت ہے۔“

”کچھ لوگوں کی عادت جھوٹ بولنے کی ہوتی ہے۔ وہ جھوٹ کو بھی سچ سمجھ کر ہی بولتے ہیں۔“

سب کا خیال تھا کہ اب بھی ہوٹل واپس جانا چاہیے لیکن خان صاحب اور بٹ صاحب کی فرمائش تھی کہ ایک بار پاسبورس کی سیر اور کر لیں۔ پاسبورس کی سیر تو ہمیں ہی بہت اچھی لگتی تھی مگر تنگ گئے تھے پھر سوچا کہ پاسبورس تازہ ہوا اور خوشنما مناظر بار بار دیکھنے کو شاید نہیں۔

پاسبورس کی سیر کئی اور فیئر میں کرنے کا کچھ اور فیئر ہے۔ یہ فیئر نماستی کیلئے امران کھلاتی ہے۔

ایک نوٹو پورٹ وہ مقبول جگہ ہے جہاں سے پاسبورس

جانے والوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ یہ بے حد صاف ستری اور خوبصورت جگہ ہے جسے پنجابی میں چن کہتے ہیں۔ یہاں سیاحوں اور مقامی لوگوں کا ہر وقت مجمع لگا رہتا ہے۔ اس کو ترک پورٹ بھی کہتے ہیں۔

بٹ صاحب بولے۔ ”بھئی ہم تو باہر سے آئے ہیں مقامی لوگ ہر وقت پاسبورس کی سیر کرنے کے لیے تیار رہتے ہیں۔“

ہم لوگ بھی ٹکٹ خرید کر کیٹا مران (فیئر) میں سوار ہو گئے۔ عرشے پر قدم رکھتے ہی تازہ ہوائے جادو کا اثر کیا، ساری محسن۔۔۔ غائب ہو گئی۔ اب سمندر کی ہوائی اور اس پاس کے حسین مناظر۔ پاسبورس کی سیر کرتے ہوئے ساحل پرے ہوئے محلات بے حد دلکش لگتے ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اگر محلوں سے پاسبورس کو دیکھا جائے تو یہ منظر بھی قابل دید بلکہ ناقابل فراموش ہے۔ ہم نے یورپ میں بھی فیئر میں سیر کیے ہیں مگر یہ حسن اور جاذبیت کہیں نظر نہیں آتی۔

خان صاحب شہر کی خوشحالی دیکھ کر بہت حیران اور خوش تھے۔

ہم نے کہا۔ ”بھائی، اتنی معمولی سی بات آپ کی سمجھ میں نہیں آئی۔ یہاں کے سیاسی رہنما اور حکمران کرپشن نہیں کرتے۔ نہ ہی وہ اپنی جائز اور ناجائز دولت بیرونی ملکوں میں رکھتے ہیں۔ نہ ہی ان کے بچے دوسرے ملکوں میں تعلیم حاصل کر کے وہیں سکونت اختیار کر لیتے ہیں اور اپنے ملک میں کڑے بھی نہیں ڈالتے۔ وزیر اعظم اور دوسرے حکمران سادہ زندگی بسر کرتے ہیں۔ ملک کے لیے اور اپنے لیے کفایت شعاری کرتے ہیں۔ یہاں پیسے اور پیسے کے حوالے سے کوئی بڑا چھوٹا نہیں ہے۔ چھوٹے اور غریب آدمی بھی بڑے لوگوں سے بے تکلفی سے بات چیت کرتے ہیں۔ یہ کسی سے مرعوب نہیں ہوتے۔ ہر شخص دوسرے کا شکر یہ ادا کرتا رہتا ہے۔ مرجا اور خوش آمدید کہہ کر مخاطب کرتے ہیں۔“

بٹ صاحب نے فوراً بات کاٹ دی۔ ”بس بس، بہت ہو گئی تم نے تو ریکارڈ ہی چلانا شروع کر دیا مگر آپ جو کہہ رہے ہیں سو فیصد سچ ہے۔“

ہم نے کہا۔ ”۔۔۔ کیا ہمارا ملک بھی ایسا ہو سکتا ہے۔ ہمارے ہاں بھی امیر غریب اور چھوٹے بڑے کی

آخری مرحلہ

اندھی محبتوں اور جذباتی بھونچال کے طفیل کبھی بیروں تلے ایسے رستے آجاتے ہیں جن کی کوئی منزل نہیں ہوتی اور..... زندگی مسائل کے انبار تلے دھکی چلی جاتی ہے، آخری صفحات پر **ایچ اقبال** کے قلم کا جادو

زخمِ کل

فرش کی خاک جب آسمان کا چاند بنی ہے تو ہر آنکھ میں حیرانی کی چمک آجانی ہے مگر..... یہ سب اتنا آسان کہاں ہوتا ہے۔ ابتدائی صفحات کی شان تار سخی لمحات..... **ڈاکٹر ساجد امجد** کی کاوش

زہرباد

ہر دلجو بہ مصنف **ناہید سلطانہ** اختراک خوب صورت تحفہ

قارئین پر سوچ کے نئے دروا کرنے والی پر فکر تحریر۔

مسافر

قطرہ قطرہ آنسو بن کر حالات کی سرکش موجوں کے درمیان بننے والی میڈیم ٹھیکہ کی اذیتوں کا قصہ..... **ناصر ملک دلکش** انداز

کشکول

زہرے لکڑیوں کے درمیان خوبصورت

رشتوں کی کہانی..... **انوار صدیقی**

کے قلم کی روانی

جولائی 2013ء کا شمار

مضان المبارک کی آمد کے ساتھ

خوبصورت کہانیوں کا مجموعہ

سینئر لکچرٹس

ماہنامہ

کاشف فیضیت، بیرواض

ضیائیت، لکچرٹس

ڈاکٹر شہزاد شامی

اسٹیل لکچرٹس

مرزا امجد بیگ کے دلائل، آپ کے خطوط اور محفل شعرو سخن

تفریق مٹ جائے۔“

”بس کرو بھائی، اب تم اپنا ریکارڈ شروع کر دینا۔ تم دونوں تو اس وقت گراموفون لگ رہے ہو۔“ بٹ صاحب بولے۔

”ہاں اور آپ مجھے گراموفون کے سامنے بیٹھ کر گانا سننے والے ڈاگی لگ رہے ہیں۔“

”سنبل کرات کیجیے۔ آپ مجھے کتا کہہ رہے ہیں۔“

”بالکل نہیں، میں نے تو ڈاگی کہا ہے۔ کتنا پیارا لفظ ہے۔ انگریز تو اپنے ڈاگی پر جان دیتے ہیں۔ اپنی ساری جائیداد اس کے لیے چھوڑ جاتے ہیں۔“

یہ بحث ہم لوگوں نے خود ہی بند کر دی چونکہ عرشے پر خوب رونق اور گہما گہمی ہوئی تھی۔ شاید کبھی لوگ ٹھنڈی ہوا کھانے کے لیے اور باسفورس میں روشنی کے چلتے پھرتے جہاز دیکھ کر دل خوش کرنے نکل آئے تھے۔

بٹ صاحب بہت بے چین نظر آ رہے تھے۔ ہم نے کہا۔ ”بٹ صاحب کو شاید لاجول پڑھنے کا موقع نہیں مل رہا۔“

بٹ صاحب۔ ”آپ شوق فرمائیے۔ ذرا ادھر ادھر نظر دوڑائیے۔“

بٹ صاحب تو جیسے ہماری اجازت کے منتظر تھے۔ انہوں نے گلے میں لٹکا ہوا معمولی سا کیمرا سنبھالا اور تصویریں بنانے کے بہانے خواہتاہن کے مجمع میں ٹھس گئے۔

چند تصاویر بنانے کے بعد آئے اور بولے۔ ”آفاق صاحب، یقین کیجیے یہاں تو لاجول پڑھنے کا بہت سامان ہے۔ ویسے سبحان اللہ کی بھی کافی گنجائش ہے۔“

ہم نے کہا۔ ”تو پھر جاؤ، اپنی ڈیوٹی پوری کرو۔“ وہ فوراً رخصت ہو گئے۔

کچھ دیر بعد بہت خوش خوش آئے، کہنے لگے۔ ”ماشائے اللہ! بڑی اچھی جگہ ہے یہ تو۔ اگر اسٹینبل میں کہیں بھی نہ جائیں اور باسفورس کی سیر کو آجائیں تو کافی ہے۔“

خان صاحب نے کہا۔ ”آفاق صاحب، آپ تو کہتے تھے کہ ترک پاکستانیوں سے بہت محبت کرتے ہیں مگر یہاں تو کوئی ہمیں گھاس ہی نہیں ڈال رہا۔“

ہم نے کہا خان صاحب کیا آپ نے کسی کو بتایا ہے کہ پاکستانی ہیں۔ آپ اپنے ماتھے پر ایک بورڈ لٹوا لیجیے کہ میں پاکستانی ہوں تو پھر آپ کا مسئلہ حل ہو جائے گا۔“

کہنے لگے۔ ”واقعی بہت اچھا خیال ہے مگر فیری پرتو

بورڈ بنانے والا ملے گا نہیں۔ اسٹینبل واپس چل کر سب سے پہلا کام یہی کریں گے۔“

اور بٹ صاحب اپنے کام میں مصروف تھے۔ انہوں نے دل ہی دل میں لاجول پڑھی اور ایک طرح وار مغرب زدہ لڑکی کو اکیلا دیکھ کر اس کے پاس پہنچ گئے۔

”ایک کیسوزی، کیا آپ تکلیف کر کے میری دوچار تصویریں بنا سکتی ہیں؟“

اتفاق سے وہ انگریزی بھی جانتی تھیں۔ فوراً رضامند ہو گئیں۔ ”آف کورس، میرے لیے باعث مسرت ہوگا۔“

لڑکی نے ان کی چند تصاویر بنائیں پھر بولی۔ ”کیا آپ سینٹرل ایشیا پانٹی سے تعلق رکھتے ہیں۔“

”جی نہیں، میں پاکستانی ہوں۔“

لڑکی نے بے اختیار ان سے ہاتھ ملایا۔ ”اوہ پاکستان! برادر۔“

بٹ صاحب نے فوراً ان سے کہا۔ ”میرے ساتھ دوسرے پاکستانی دوست بھی ہیں۔ آئے ان سے بھی ملیے۔“

وہ فوراً چل پڑیں۔ پوچھنے لگیں۔ ”آپ تو بہت گورے ہیں۔ یورپین لگتے ہیں۔“

”دراصل میں کشمیری ہوں۔ کشمیر کو ایشیا کا سوئٹزرلینڈ بھی کہا جاتا ہے۔ کشمیر کو سب دنیا کی جنت کہتے ہیں مگر ہندوستان نے ہمارے کشمیر پر قبضہ کر لیا ہے۔“

”ہاں، مجھے معلوم ہے۔ کیا سارے پاکستانی ایسے ہی گورے چٹے اور خوبصورت ہوتے ہیں۔“

”دراصل پاکستان میں کئی نسلیں آباد ہیں، منگول، ایرانی، یونانی، افغانی، ترک۔ پاکستانی ان سب کی کاک ٹیل ہے۔“

”ہاؤ ٹائس! واقعی وہ تو دیکھنے کے لائق ملک ہے۔“

”پاکستان بھی دنیا کا خوبصورت ترین ملک ہے۔ پہاڑ، دریا چشمے، ندیاں، سرسبز وادیاں، سمندر، جھیلیں کا کچھ نہیں ہے پاکستان میں، اور وہاں ہر موسم ہوتا ہے۔

گرمیوں میں گرمی، سردیوں میں سردی، برسات میں بارش، خزاں کے زمانے میں خزاں اور وہاں بہار کا موسم بھی ہوتا ہے۔ ہر موسم میں پھول کھلتے ہیں اور ہاں، پاکستان میں سمندر بھی ہے۔“

”پھر تو میں پاکستان ضرور دیکھوں گی۔“

یہ باتیں کرتے ہوئے وہ دونوں ہمارے پاس آ گئے۔ (جاری ہے)



مہاشکاری

اقبال احمد

اس کا نام سنتے ہی ذہن میں آدم خورشیریوں کی شبیہا بھرتی ہے کیونکہ اس نے برصغیر میں آدم خورشیریوں کے شکار کی ایک تاریخ مرتب کی ہے۔ اس نے ہی برصغیر کے جنگلوں کی پہچان عالمی طور پر کرائی۔ بلاشبہ وہ مہاشکاری تھا۔ اس کی داستان شکار تقریباً ہر زبان میں ترجمہ ہو کر مقبولیت کے اوج پر پہنچی۔

ایک عالمی شہرت یافتہ شکاری کا مختصر سا تذکرہ

جیم کاربٹ کو مرے ہوئے حالانکہ 138 برس گزر چکے ہیں، لیکن وہ اب بھی لوگوں کے دلوں میں زندہ ہے۔ خاص طور پر کمائون اور گھڑ وال کے لوگ اسے تاقیامت فراموش نہیں کر سکتے، اس لیے کہ وہ ایک مہاشکاری تھا جس نے زندگی کو ابھرن کرنے والے دردوں سے انہیں بچایا تھا۔ اس کے علاوہ ساری دنیا اس کے کارناموں کی بنا پر اس کی شہادت ہے۔ ایک ریکارڈ کے مطابق اس نے 33 آدم خوروں کو موت کے گھاٹ اتارا جنہوں نے مجموعی

ایڈورڈ جیمز کاربٹ 25 جولائی 1875ء کو بمبئی تال کے علاقے نکش میں پیدا ہوا تھا۔ جم کاربٹ کا خاندان تیرہ افراد پر مشتمل تھا۔ ترتیب کے اعتبار سے جم کا نمبر آٹھواں تھا۔ اس کا باپ ولیم کرسٹوفر کاربٹ اور ماں میری جین کاربٹ تھیں۔ ان کا خاندان آئرلینڈ سے 1862ء میں ہجرت کر کے برٹش انڈیا آیا تھا۔

بمبئی تال ایک خوب صورت پہاڑ ہے جس کی بلندی سطح سمندر سے چھ ہزار فٹ ہے۔ آج کل علاقے کے درمیان اونچے پہاڑوں سے گھری ہوئی کئی میل لمبی اور چوڑی ایک تحصیل ہے جس کی گہرائی کا صحیح اندازہ نہیں کیا جاسکتا۔ چاروں طرف اوپر سے نیچے تک پہاڑوں پر رہائی مکانات بنے ہوئے ہیں۔ جن کی روشنیوں کا عکس رات کے وقت نہایت خوبصورت منظر پیش کرتا ہے۔ فضا شیشم، چیر اور مختلف قسم کے پہاڑی درختوں اور پودوں کی خوشبو سے مہکتی ہے۔ بے شمار لوگ موسم گرما میں تبدیلی آب و ہوا اور پرسکون وقت گزارنے کے لیے آتے ہیں۔

ولیم کاربٹ نے پوسٹ ماسٹر کی حیثیت سے ملازمت کر لی۔ اس وقت اس عہدے کی عزت بھی اور تنخواہ بھی معقول تھی۔ آسانی سے گزربسرو جاتی تھی۔ جاڑوں میں یہ خاندان ہمالیہ کی ترائی میں چلا جاتا تھا، جہاں ان کا ایک کاٹیج ”ارونٹیل“ کے نام سے تھا۔ اب اس جگہ کا نام تبدیل کر کے کالا ڈھنگی رکھ دیا گیا ہے۔ (اب اس کاٹیج کو حکومت انڈیا نے شائقین کے لیے محفوظ کر دیا ہے اور عجائب گھر بنادیا ہے)

جب جم کی عمر صرف 4 برس تھی تو اس کے باپ کا انتقال ہو گیا۔ اس وقت اس کے بڑے بھائی ٹام نے بمبئی تال کے پوسٹ آفس میں اپنے باپ کی جگہ پر پوسٹ ماسٹر کا عہدہ سنبھال لیا۔ وہ بہر حال کم عمر تھا، مگر اس نے ایک بڑے کنبے کا بار سنبھال لیا۔ وہ کم عمر تو تھا، لیکن باحوصلہ اور بلند ارادہ بھی تھا۔ حیرت انگیز بات ہے کہ ٹام نے جنس چھ برس کی عمر میں ایک پیتا شکار کیا تھا۔ ٹام کی بیانی غیر معمولی طور پر تیز تھی اور وہ کافی فاصلے کی چیزیں آسانی سے دیکھ لیا کرتا تھا۔ اس طرح سے وہ انتہائی خفیف سے خفیف آوازیں بھی سننے پر قادر تھا۔ اس کی یادداشت عمدہ تھی۔ اس کا مشاہدہ دوسروں سے سوا تھا اور وہ قدرتی طور پر عام لوگوں کی نسبت زیادہ حوصلہ مند اور نڈر تھا۔ اچھی تعلیم حاصل کرنے کے بعد اس نے موسیقی اور گیت کی طرف توجہ دی تو اس میں بھی نام پیدا کیا۔ اکتسابی

تعلیم مکمل کرنے کے بعد 22 سال کی عمر میں اس نے مشرقی ریلوے بہار میں ملازمت کر لی۔ اس کے علاوہ بمبئی تال میں اس نے کافی عرصے تک جامد اکا کا بار بھی کیا۔ وہ پہلی اور دوسری عالمی جنگوں میں شریک ہوا اور اس نے جنگ سے بے پناہ تجربات حاصل کیے۔ عہدے کے اعتبار سے وہ لفٹیننٹ کرنل تھا اور جنگل میں جانے والے فوجیوں کے دستے تیار کیا کرتا اور انہیں خصوصی تربیت دیا کرتا تھا۔ ان خدمات کے صلے میں اسے متعدد اعزازات اور میڈلز سے نوازا گیا۔

☆☆☆

جم کی ماں کو اپنے شوہر کی وفات سے دلی صدمہ ہوا۔ اسے اب تیرہ بچوں کو نہ صرف یہ کہ پروان چڑھانا تھا، بلکہ انہیں زور پر تعلیم سے بھی آراستہ کرنا تھا۔ جب کہ حکومت سے ملنے والی پیشکش بے حد قلیل تھی۔ جم کا کہنا تھا ”میری ماں کوئی معمولی خاتون نہیں تھیں۔ ان میں جون آف آرک کا سا عزم و حوصلہ اور حالات سے مقابلہ کرنے کی بے پناہ جرأت تھی۔“ 1924ء میں جب اس کی ماں جین کاربٹ کا بھی انتقال ہو گیا تو گھر کو اس کی بھینرہ میکی نے سنبھال لیا۔ جم اور اس کی بہن میکی نے ملے کیا کر انہیں اپنے خاندان کی کفالت کرنا ہے، اس لیے وہ دونوں شادی نہیں کریں گے۔ اپنی ماں کی طرح میکی میں بھی حوصلے اور عزم کی کوئی کمی نہیں تھی۔ وہ جانتی تھی کہ اگر اس موقع پر وہ پیچھے ہٹتی تو ان کے خاندان کا شیرازہ بکھر جائے گا۔ اسے اپنے بھائی کے ساتھ مل کر بکس کی کفالت کرنی ہے۔ کام کرنا... اور دوسروں کے کام آنا اس کے خیر میں شامل تھا۔ ہر چند کہ وہ ڈاکٹری یا حکیم نہیں تھی، لیکن اس نے ایک حکیم کے ساتھ چند ماہ بیٹھ کر امراض کی شناخت اور دوا دینا سیکھ لی۔ چنانچہ وہ غریب اور مفلس عورتوں کا علاج مفت کیا کرتی تھی۔ جنگ عظیم کے دوران میکی کالا ڈھنگی والے کاٹیج میں تنہا رہتی تھی۔ اس کے پاس کوئی سواری بھی نہیں تھی جب کہ قریب ترین آبادی چودہ میل دور تھی۔ ان کی حفاظت کے لیے جم کو کبھی پریشانی نہیں ہوئی اس لیے کہ اسے اپنے ہندوستان کے غریب لوگوں پر پھر وسالتھا۔

کالا ڈھنگی کے چاروں طرف جنگل تھا جہاں درندے بھی گھومتے پھرتے تھے۔ جم چونکہ سیلائی طبیعت کا مالک تھا، اس لیے زیادہ تر وقت گھومنے پھرنے میں گزارتا۔ اسے پرندوں کے اٹنے جمع کر کے کھانے کا شوق تھا۔ اس کے بڑے بھائی ٹام کو شکاریات سے شغف تھا اور اسلئے کو بھلی

استعمال کر سکتا تھا، اس لیے اس نے اپنے چھوٹے بھائی جم کی بھی تربیت کی اور اسے شکاریات کے اسرار و رموز سے آگاہ کیا۔ میکی کو شکاریات سے دل چسپی نہیں تھی، البتہ وہ قدرت کے حسین مناظر کو دیکھنے کی دیوانی تھی۔ وہ جم کو اپنے ساتھ لے کر جنگل میں گھومتی رہتی اور اسے جانوروں کے نام بتاتا کرتی تھی۔ جم جنگل سے اتنا شاسا ہو گیا تھا کہ بہت سے جانوروں اور پرندوں کی آوازیں اپنے منہ سے نکالا کرتا تھا۔ دل چاہے کہ پرندے اس کی آواز سن کر اس کی طرف متوجہ ہو جایا کرتے تھے۔ اس نے اپنے بچپن ہی میں جان لیا تھا کہ اس علاقے میں ایک سواٹھائیں اقسام کی چڑیاں رہتی ہیں۔

اپنی اس تکنیک کو اس نے شیروں کو شکار کرنے میں بھی استعمال کیا۔ جب جم شیرنی کی آواز اپنے منہ سے نکالا کرتا تھا تو شیر اس کی طرف متوجہ ہو جایا کرتے تھے پھر اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے تھے۔ اس کا کہنا تھا کہ اس نے چڑیوں کی بولی اور اس کا مفہوم سمجھ لیا تھا۔ اگر کوئی پیتھیا شیر میری طرف آ رہا ہوتا تو میں چڑیوں کی آواز سن کر اندازہ کر لیا کرتا تھا کہ کوئی درندہ اس طرف قدم رنجہ فرما رہا ہے، لہذا اپنی ہندو کی تال اس طرف کر دیتا اور جیمبر کو گولیوں سے بھر لیتا تاکہ آنے والے کی بھرپور خاطر تواضع کر سکوں۔

تھوڑے دنوں کے بعد جم کی واقفیت ایک شوق شکاری سے ہو گئی، جس کا نام کنورنگ تھا۔ وہ لائسنس کے بغیر شکار کیا کرتا تھا۔ کنورنگ ذات کا شکار اور چاندنی گاؤں کا کھیا تھا۔ جم نے اس کے بارے میں لکھا ”وہ اچھا آدمی تھا یا برا مجھے کچھ معلوم، جو بات اس کی پسند آتی وہ یہ تھی کہ کالا ڈھنگی کا بہترین اور نہایت کامیاب ہانکا دینے والا تھا اور میرے بڑے بھائی ٹام کا شیدائی تھا۔ ٹام کے ساتھ اس نے بہت شکار کیا تھا۔“

وہ اور دوسرے گورے لڑکے کالا ڈھنگی کے جنگلات میں گھوما کرتے تھے اور مقامی بچوں کے ساتھ مل جل جاتے تھے، جس کے نتیجے میں انہیں ہندوستانی بولیوں سے بڑی حد تک واقفیت ہو گئی تھی۔ جم کو سارے انڈیا میں کہیں بھی زبان کے مسئلے میں پریشانی نہیں اٹھانا پڑی۔ ان کے عادات، رکن کن اور طور طریقے سے کم حقہ واقفیت کی بنا پر وہ لوگوں میں جلد ہی شکر ہو جایا کرتا اور انہیں دوست بنالیا کرتا تھا۔ تعلیم بہر حال اس کے لیے اہمیت رکھتی تھی، اس لیے

جم نے اوک اوپنگ اسکول میں داخلہ لے لیا۔ یہ اسکول بعد میں فلیڈز راسٹھ کالج بمبئی تال میں ضم کر دیا گیا۔ پھر اس کا نام ہائٹ دار اسکول پڑ گیا۔ آج کل اسے برلا ویا مندر بمبئی تال کہتے ہیں۔ جب جم کی عمر 19 برس ہو گئی تو اس نے اسکول چھوڑ دیا، اس لیے کہ گھر کے حالات درست ہونے میں ہی نہیں آرہے تھے۔ تیرہ بچے کہاں سے کھاتے پیتے؟ اس کے علاوہ ان کی تعلیم کے اخراجات کہاں سے پورے ہوتے؟

اس نے شمال مشرق ریلوے میں ملازمت کر لی اور مائک پور (پنجاب) میں فیول انپیکٹر کی حیثیت سے اپنے فرائض انجام دینے لگا۔ آگے کی کہانی خود اس کی زبانی سنئے۔ ”میں نے فیول انپیکٹر کی حیثیت سے ریلوے کے محکمے میں ملازمت کر لی تو اٹھارہ ماہ جنگل میں گزارنا پڑا۔ وہاں... میں نے پانچ لاکھ مربع فٹ شیشم کی لکڑی کوٹائی جو ایدھن کے طور پر بھاپ سے جلنے والے انجنوں میں جلائی جاتی تھی۔ درختوں کو کاٹ کر انہیں گرایا جاتا تھا اور اس کے بعد کھسا کر ان کے ٹکڑے کر دیے جاتے۔ ان ٹکڑوں کی لمبائی چھتیس انچ سے زیادہ نہ ہوتی۔ پھر انہیں تیل گاڑیوں پر لا دیا جاتا اور دس میل دور اسٹیشن پر بھجوا دیا جاتا۔ وہاں ان کا ذخیرہ ہوتا اس کے بعد پیمائش کر کے وہاں سے انہیں ریل کے ڈبوں میں لا دیا کر جہاں جہاں لکڑی کے ایدھن کی ضرورت ہوتی، بھجوا دیا جاتا۔

وہ اٹھارہ مہینے میرے لیے تکلف دہ تھے، اس لیے کہ میں جنگل میں تنہا تھا۔ دور و نزدیک کوئی نہیں، بس اپنا کام کیے جاؤ۔ مگر میری صحت ٹھیک تھی، اس لیے کام میں دل لگا رہا۔ اس کے علاوہ جنگل میں شکار بھی تھا۔ بارہ سال جنگل میں مرثی اور سور کا کافی تعداد میں تھے۔ جنگل کے کنارے دریا تھا جہاں سے پھل پھل جاتی تھیں۔ چاندنی راتوں میں چھکی کا شکار کھیلنا کافی رومان پرور ہوتا ہے۔

جنگل کے کافی جانور مجھ سے مانوس تھے، وہ میری چھو لداری میں آ جاتے اور ہمتوں وہاں پڑے رہتے۔ جب بچے جوان ہو جاتے تو انہیں خود ہی جنگل میں چھوڑ آتا وہ چلے جاتے۔ البتہ بارہ مہینے کے ایک بچے نے میرا پیچھا نہیں چھوڑا، غالباً اسے مجھ سے محبت ہوئی تھی۔

وہ انسانوں میں رہتا تھا، اس لیے اسے انسانوں سے خوف نہیں محسوس ہوتا تھا۔ ایک روز میں ڈبوں سے واپس آیا تو میں نے اسے اپنے بستر کے قریب بیٹھے پایا۔ اس کے دونوں پاؤں ٹوٹے ہوئے تھے اور اس کی آنکھوں سے آنسو ٹپک

رہے تھے۔ تھوڑی دیر میں مجھے اطلاع ملی کہ کسی شخص نے اسے جنگلی بھتے ہوئے ڈنڈا مار دیا تھا۔ زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ وہ شخص بھی آگیا۔ چونکہ اس نے بتایا کہ وہ معافی مانگنے کے لیے آیا ہے۔ میں نے اسے اندر آنے کی اجازت دے دی۔ اندر آکر اس نے بتایا کہ وہ جنگل کی طرف سے اس کے کھیت میں آگیا تھا۔ اس نے ڈنڈا مار کر اسے بھگانا چاہا۔ جب وہ زخمی ہو گیا تو اس کا پیچھا کیا۔ وہ لڑکھاتا ہوا اس پھولداری میں داخل ہوا تو احساس ہوا کہ بارہ سنگھاپتو ہے۔

اس شخص مالک رام نے کہا کہ دوسرے دن وہ ایک اور شخص کو ساتھ لائے گا جو ہڈیاں جوڑنے کا ماہر ہے۔ میں نے بارہ سنگھ کو بستر پر لٹا دیا اور دو دھ پلایا۔ دوسرے دن مالک رام اس شخص سکینہ کو لے آیا۔ اسے حکمت کا تجربہ تھا اور یہ بات اس کے چہرے پر بھی لکھی تھی۔ اس نے مجھ سے سنجیدگی اور بردباری سے بات کی۔ اس کے کپڑوں سے ظاہر ہوا تھا کہ وہ مفلس اور نادار ہے۔

اس نے بارہ سنگھ کے پاؤں کا معائنہ کیا اور کہا کہ وہ دو گھنٹے کے بعد آئے گا۔ اپنے کہنے کے مطابق وہ دو گھنٹے کے بعد سن کے قتل لے کر آگیا۔ جن کے اوپر سے اس نے چھلکا اتار دیا تھا۔ کسی چیز کی لٹی اور انڈ کی پیتا اس کے علاوہ معلوم نہیں کیا کچھ۔

میں بارہ سنگھ کو گود میں لے کر بیٹھ گیا تو سکینہ نے بتایا کہ اس کے پیروں کی ہڈیاں اس کے گھٹنوں اور کمر کے درمیان سے لٹنی تھیں اور پھر جرح مقامات کی کھال چھل... گئی تھی، سکینہ نے نہایت آہستگی سے بل سیدھے کیے اور پھر گھٹنوں سے کھروں تک لٹی گاڑی۔ پھر انڈ کی کپڑے رکھ کر ڈنڈوں کو زخموں پر سیٹ کر کے کن کی ری سے باندھ دیا۔

دوسرے روز اس نے پٹیاں تبدیل کر دیں۔ یہ سلسلہ چار دن تک چلا رہا۔ جو تھے دن اس نے لکڑی کی کھچیاں زخموں پر باندھ دیں تو بارہ سنگھ اپنی ناگوں پر کھڑا ہو گیا۔ اس شخص سکینہ کی اجرت ایک روپیہ تھی، جو میں نے اسے ادا کی۔ اس کے علاوہ اس نے کوئی انعام لینے سے انکار کر دیا۔ دو روز بعد بارہ سنگھ اچھلنے کودنے لگا تو مجھے از حد خوش ہوئی۔

میں نے اب تک جو کام کیا تھا میں اس سے لطف اندوز ہوا تھا۔ جب کام ختم ہو گیا اور لکڑی کے بجائے کونٹے کے انجن استعمال کیے جانے لگے تو میرا کام بھی ختم ہو گیا۔ میرے

حساب کی کتاب بالکل درست تھی اور میرا ضمیر بھی مطمئن تھا۔ میں صبح نو بجے سستی پور پہنچ گیا۔ پہلے تو چراسی نے کہا کہ صاحب مصروف ہیں۔ پھر نصف گھنٹے کے بعد مسٹر رامس تک جانے کی اجازت دے دی۔ وہ لوگوں کو ڈیپارٹمنٹ اور تاریخ و میٹرن ریلوے کے سب سے بڑے افسر تھے۔ انہوں نے نہایت عرق ریزی سے میرا حساب کتاب چیک کیا کہ میں نے کتنی لکڑی کٹوائی اور کہاں کہاں پہنچی۔ اس کے بعد مجھ سے کہنے لگے کہ اب ادارے کو آپ کی ضرورت نہیں ہے، لہذا آپ جاسکتے ہیں۔ اس کے احکامات آپ کو کسی دن مل جائیں گے۔ میں نے اپنا ہیٹ اٹھایا اور ان سے ہاتھ ملا کر رخصت ہو گیا۔

ایک ہفتے بعد ریلوے کی طرف سے خط ملا کہ ابھی مجھے رخصت نہیں کیا جا رہا ہے، میں کام جاری رکھوں، لیکن اس کی نوعیت مختلف ہوگی۔ میں مزید ایک برس تک ریلوے کے مختلف کام نمٹاتا رہا۔ اس کے بعد ہدایت دی گئی کہ میں جگہ گھاٹ جا کر کشتیوں کے سپرنٹنڈنٹ اسٹور سے ملوں۔

تاریخ و میٹرن ریلوے لنگا کی وادی کے درمیان سے گزرتی تھی۔ وہ دریا تک جا کر ختم ہو جاتی اس کے بعد اس کا انجن کشتیوں کے ذریعے دوسرے کنارے تک پہنچا دیا جاتا۔ وہاں ایک لائن پہلے سے بنی ہوئی تھی۔ وہ انجن اس پر چلنے لگتا۔ اس کا مال کشتیوں کے ذریعے ہی دوسری طرف پہنچا دیا جاتا۔

میں سستی پور سے علی الصباح روانہ ہوا اور چھوٹی لائن کے آخری اسٹیشن پہنچ کر ایس ایس گورکھپور نامی کشتی میں سوار ہوا۔ اسٹور انچارج کو میری آمد کی اطلاع دے دی گئی تھی۔ وہ ریلوے کا ہیڈ کوارٹر تھا۔ میں نے اسٹور اور شیڈز کا اچھی طرح سے معائنہ کیا۔ شیڈز کو دیکھ کر اندازہ ہوا کہ بہت بڑی تعداد میں مال بھرا ہوا ہے جو دوسرے کنارے پر نہیں پہنچ سکا۔ کاروبار معطل ہو چکا ہے۔ مجھے بتایا گیا کہ جگہ گھاٹ میں مجھے گران انجیلر کی حیثیت سے تعین کیا گیا ہے۔ میرا کام یہ ہوگا کہ میں مال کو دریا کے دوسرے کنارے اتار کر مال گاڑی میں لدواؤں۔ میری تنخواہ سو روپے سے بڑھا کر ڈیڑھ سو روپے کر دی گئی ہے۔

مجھے کچھ پتا نہیں تھا کہ یہ کیا کام ہے اور کس انداز سے کرنا ہوگا۔ پھر یہ کہ مزدور کہاں سے آئیں گے؟ وہاں کا انچارج جو فز نامی شخص تھا۔ اس نے بتایا کہ سامان کو ایک کنارے سے دوسرے

کنارے تک پہنچانے کے لیے اسٹور اور بادبانی کشتیاں تھیں۔ اس کے علاوہ مال گاڑی کے ڈبے بھی کشتیوں میں لا کر ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک لائے جاتے تھے۔ مجھے اس کام کی گہرائی نہ تھی۔ اس نے کہا کہ فصل کٹنے کے دوران مردوں کی کمی کی وجہ سے سامان کی نکاسی نہیں ہو پاتی تھی اور ڈیڑھ لگ جاتے تھے۔ اس نے کہا کہ اس وقت بھی اتنا سامان شیڈز میں رکھا ہے کہ مال گاڑی کے چار سو ڈبوں میں آئے گا جو بے کار کھڑے ہیں۔ اور ایک سو ڈبے دوسرے کنارے پر ہیں تاکہ انہیں کشتیوں پر ادھر لایا جائے۔ میری عمر اس وقت اکیس برس تھی۔ جو زف نے مشورہ دیا کہ میں سری گھاٹ جا کر وہاں سے سیدھا گورکھ پور جاؤں اور مختلف حکام سے کہہ دوں کہ یہ میرے بس کی بات نہیں ہے۔

دوسرے دن میں سری گھاٹ تو نہیں گیا، لیکن میں نے شیڈز کا غور سے معائنہ کیا اور اس نتیجے پر پہنچا کہ جو زف نے غلط بیانی سے کام نہیں لیا تھا۔ شیڈز میں تقریباً پندرہ ہزار ٹن مال جمع تھا۔ جسے دوسرے کنارے تک پہنچانا مذاق نہیں تھا۔ اب گرمیوں کا موسم آنے والا تھا اور اس موسم میں کام کرنا ایک عذاب تھا کہ میں نے اس پہنچ کر قبول کر لیا اور تیرہ کر لیا کہ چاہے کچھ بھی ہوا ہے کرے رہوں گا۔

ہیرا دائرہ کار دوسرے کنارے تک تھا۔ میں نے ایک روز تو عمل سے ملاقات میں لگایا۔ اس کے بعد مزدوروں سے ملا جو لیبر کمیٹی کے تحت کام کرتے تھے۔ ان سب کی کنٹروولنگ آسان نہیں تھی۔

میں نے کچھ اشخاص کو نمبردار مقرر کیا اور ان سے مزدوروں کو لائے کا کہا۔ جن میں عورتیں اور مرد شامل تھے۔ میں نے گورکھ پور ہیڈ کوارٹر کو تار کے ذریعے بتا دیا کہ میں نے اس مال کو دوسرے کنارے تک ڈھونڈنے کی ذمہ داری قبول کر لی ہے۔

سب سے پہلے میں نے شیڈز میں سے گندم، نمک اور شکر اٹھا کر محلہ میدان میں رکھوا دی اس طرح سے جگہ پیدا ہوئی۔ اس کے بعد سامان کی ترسیل شروع ہوئی اور کافی جگہ مٹا گئی۔ میں نے ریلوے ہیڈ کوارٹر کو لکھا کہ اب سامان کی ہنگاموں دی جائے جو دو ہفتوں سے بند پڑی ہے۔ اب شیڈز میں جگہ ہو چکی ہے۔

ابتدائی تین ماہ میں مزدوروں نے نہایت وقاداری سے کام کیا، اس لیے کہ دوسرے مزدوروں کے مقابلے

میں انہیں اجرت زیادہ مل رہی تھی۔ میں نے ان کی تعداد کم کر دی تھی اور کام زیادہ لیا تھا۔ میرے ٹھیکہ لینے سے پہلے چار یا پانچ لاکھ ٹن سامان محکمہ گھاٹ سے گزر رہا تھا، میرے ٹھیکہ لینے پر ایک کروڑ ٹن سامان وہاں سے گزرنے لگا۔

غیر شادی شدہ اشخاص اور ان کے ملازمین کی طرز زندگی اور عادات عموماً مستحکم ہو جاتی ہیں چنانچہ یہی حال میرا بھی تھا۔ علاوہ ان ایام کے جب کام کی زیادتی ہوتی عموماً آٹھ بجے گھر واپس آ جاتا۔ اور ملازم جو میرا منتظر ہوتا مجھے دیکھتے ہی پانی بھرنے والے کو آواز دے کر میرے نہانے کا پانی غسل خانے میں رکھنے کی ہدایت کرتا۔ چاہے سردی ہو یا گرمی میں گرم پانی سے غسل کرتا تھا۔

مکان کے تین کمرے تھے جن کا رخ برآمدے کی طرف تھا۔ اس میں ایک بھٹنے کا کرا، ایک کھانے کا اور ایک سونے کا تھا۔ سونے کے کمرے سے پہنچ ایک غسل خانہ تھا۔ اس میں دو دروازے تھے، جب کہ ایک کھڑکی اور دروازہ برآمدے میں کھلتا تھا، دوسرا غسل خانے میں جانے کے لیے تھا۔

غسل خانے میں ایک ہاتھ بٹ تھا جس میں بیٹھ کر میں غسل کیا کرتا تھا۔ اس کے علاوہ ایک لکڑی کا پائیدان جس میں سوراخ تھے اور بوٹی کے گھڑے جن میں ٹھنڈا پانی بھرا رہتا تھا۔ جب ہشتی غسل خانے میں گرم پانی کا بندوبست کر دیتا تو میرا ملازم غسل خانے کا دروازہ باہر سے بند کر دیتا اور میرے جوتے پالش کرنے کے لیے باورچی خانے میں چلا جاتا۔ پھر جب میں غسل کر لیتا تو میں آواز دے کر اسے بلا لیتا اور کھانا لگانے کے لیے کہتا۔

ایک رات جب میرا ملازم غسل خانے کا دروازہ باہر سے بند کر کے چلا گیا تو میں نایک چھوٹی لائین اپنی سنگار میز سے اٹھائی اور غسل خانے میں لے گیا اور اسے چچی دیوار پر رکھ دیا۔ وہ چھانچ اونچی تھی۔ وہ غسل خانے کو نصف حصے میں تقسیم کرتی تھی۔ میں نے مڑ کر غسل خانے کی چھتی اندر سے لگا دی۔ ہندوستان کے دروازے ٹیڑھے میڑھے ہوتے ہیں، اس لیے جب تک ان میں اندر سے چھتی نہ لگائی جائے وہ بند نہیں ہوتے۔ اس روز گھاٹ پر میں نے کافی دوڑ بھاگ کی تھی اور پسینا بہایا تھا، اس لیے خوب صابن لگایا تاکہ جسم کی کثافت دور ہو جائے۔

جب میں نے صابن کو پائیدان پر رکھنے کے لیے

آنکھیں کھولیں اور پائیدار انداز کی طرف ہاتھ بڑھایا تو یہ دیکھ کر خون رگوں میں جمد ہو گیا کہ ایک کورا سانپ میرے پیروں سے چند انچ کے فاصلے پر تھا اور رفتہ رفتہ اپنے چمن کو اٹھا رہا تھا۔ صابن لگانے سے چشمہ میں نے جسم پر خوب پانی ڈالا تھا، وہ غالباً اس کے جسم پر بھی پڑ گیا تھا اور اس کے غصے کا سبب بنا تھا۔ وہ کورا تھا، اس لیے کہ اس کا چمن کافی چوڑا تھا اور وہ اپنے مکروہ منہ سے زبان نکال کر لپکا رہا تھا۔ مجھے اس کے زہریلے دانت صاف طور پر دکھائی دے رہے تھے۔ اس سے بچنے کا درست طریقہ یہ تھا کہ میں اپنے ہاتھوں کو بدستور حرکت دینا رہتا اور اپنے پیروں کو بتدریج سکڑتا رہتا تھا پھر جب سے نکل کر لائے قدموں دروازے تک جاتا اور اس کی کنڈی کھول کر باہر چلا جاتا۔

اس کے برعکس میں نے یہ کیا کہ دونوں ہاتھوں کو ب کے کناروں پر رکھا اور زور دے کر کھڑا ہو گیا۔ پھر اس چھوٹی سی دیوار پر کھڑا ہو گیا مگر پاؤں پھسل گیا۔ دھڑام سے فرش پر گرا۔ اٹھا تو مٹی سے پانی گرا اور لائین بجھ گئی۔ اب غسل خانے میں گھپ اندھیرا چھا گیا اور میرا دل اس طرح سے دھڑک رہا تھا جیسے ریلوے کا انجن!

اب میں اس چھوٹے سے غسل خانے میں بند تھا اور میرے ساتھ ہندوستان کا سب سے زہریلا سانپ موجود تھا۔ صرف ایک لمبا قدم مجھے دونوں دروازوں میں سے کسی ایک کے پاس پہنچا سکتا تھا۔ لیکن گھپ تاریکی کی بنا پر یہ اندازہ لگانا دشوار تھا کہ سانپ کس طرف ہوگا۔ اگر میں پاؤں بڑھاتا تو میرا پاؤں سانپ پر پڑ جاتا۔ اگر نہ بھی پڑتا تو یہ اندیشہ تھا کہ جب میں دروازے پر پہنچ کر کنڈی کھول رہا ہوں گا تو سانپ بھی وہاں سے باہر نکلنے کے لیے بیٹھا ہوگا۔ دونوں صورتوں میں میری یقینی موت کے امکانات تھے۔

لازمین کے کوارٹر وہاں سے ساٹھ گز دور تھے، اس لیے اگر میں چھٹا چلاتا تو وہاں تک آواز نہیں جاسکتی تھی۔ میرے بچنے کا واحد حل یہ تھا کہ میں انتظار کروں۔ پھر میرا ملازم تشویش میں مبتلا ہو کر خود وہاں آجائے اور کھانے کے بارے میں پوچھے۔ ایسا بھی ہو سکتا تھا کہ میرا کوئی دوست اچانک وہاں آجائے۔

میں نے سنا تھا کہ بعض اوقات سنگین باتوں کے مقابلے میں انسان معمولی باتوں سے ٹھٹکتا کھا کر اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھتا ہے۔ تاریکی میں عجیب خیالات آ رہے تھے۔ میرے جسم سے صابن بہہ رہا تھا اور مجھے ایسا معلوم ہو رہا

تھا جیسے سانپ اسے جاٹ رہا ہو۔

آخر وہی ہوا، میرا ملازم وہاں آ کر آواز دی۔ میں نے اسے دروازے پر بلایا اور اسے ایک لائین اور سیرھی لانے کی ہدایت کی۔ کافی دیر بعد سیرھی کے دیوار پر ٹھٹھنے کی آواز سنائی دی۔ پھر ایک لائین کو کھڑکی کے قریب لایا گیا۔ لیکن روشنی اندر نہیں آئی۔ چھت البتہ روشن ہوئی۔ میں نے ملازم سے کہا کہ وہ کھڑکی کا شیشہ توڑ کر لائین اندر لائے۔ شیشہ توڑا گیا، مگر لائین اندر نہ آ سکی۔ اسے بجھا کر میز ہا گیا کیا پھر اندر لا کر چلا گیا۔ یہ سارا کام ملازم نے کیا۔ جب روشنی ہوئی تو میں نے دیکھا کہ سانپ دروازے کے پیچھے ٹھیک میرے پیروں سے دفن کے قریب لیٹا ہے۔ میں نے جبکہ کر سہل کرنے والا بھاری پٹرا اٹھا یا اور

اس پر گرا دیا۔ نشانہ ٹھیک رہا۔ وہ سانپ کے چمن سے کچھ آگے گرا۔ سانپ نے اسے کاٹنا شروع کر دیا اور دم اس پر مارنا شروع کر دی۔ میں برآمدے کے دروازے کی طرف لپکا۔ پھر اسے کھول کر میں باہر چلا گیا۔ وہاں ریلوے کے بہت سے ملازمین لائینیں لیے کھڑے تھے کیوں کہ میرے اور سانپ کے بارے میں خبریں پھیل چکی تھیں۔

سب نے زندہ بچ رہنے پر مبارک باد دی۔ یہ سلسلہ دیر تک چلتا رہا۔ جب آخری آدمی بھی رخصت ہو گیا تو پتا چلا کہ میں تو بہت کھڑا ہوں اور جسم پر لگا ہوا صابن خشک ہو چکا ہے۔ سانپ غسل خانے کے اندر کیسے چلا گیا، یہ پتا نہ چل سکا۔ ممکن ہے وہ چھت سے نیچے ٹپک گیا ہو، اس لیے کہ چھت پھوس کی بنی ہوئی تھی جہاں چڑیوں کے کھولے تھے۔

☆☆☆

دیں میری دوستی میرے مزے سے ہوئی۔ ریزے کے مکاؤں کا بیج ہونے کے علاوہ جھڑپ، پولیس آفیسر، جنگلات اور انجینئر کے فرائض انجام دیتا تھا۔ اس کے علاوہ بھی اس پر بہت سی ذمے داریاں تھیں جس کے لیے اسے ایک پڑاؤ سے دوسرے پڑاؤ تک پیدل سفر کرنا پڑتا تھا۔ سفر کے دوران لوگوں کی ایک بڑی نفری اس کے ساتھ چلتی تھی اور اپنے مسئلے مسائل بیان کرتی تھی۔ دیوانی اور فوج داری کے مقدمات بھی اس کے روبرو پیش کیے جاتے تھے۔ وہ چلتے پھرتے عدالت سجالا کرتا تھا۔

پہلے تو فریادی اور گواہوں کی شہوائی ہوتی اس کے بعد مدعا علیہ اور اس کے گواہ پیش ہوتے۔ پھر مباحثے اور سوچ بچار کے بعد اسی وقت فیصلہ سنایا جاتا۔ جرمانہ ہوتا اور قید کی

راہی ہوتی تھی۔ میرے ہوتے ہوئے ایسا کبھی نہیں ہوا کہ کسی کو جرمانہ ہوا ہو اور اس نے ادا نہ کیا ہو یا قید ہونے کی صورت میں خود زور دیکر تین چار دن قید نہ کیا ہو۔ انہی دنوں جودل چپ مقدمہ پیش کیا گیا وہ راجیش کی طرف سے کالو کے خلاف تھا۔ جس میں الزام عائد کیا گیا تھا کہ کالو نے اس کی بیوی کو اغوا کر لیا ہے۔ یہ کوئی ایک ماہ پہلے کی بات ہے جب اس نے وطنی پر ڈورے ڈالنا شروع کیے تھے۔ اس نے اپنی بیوی وطنی کو بہت بھجایا اور دھمکیاں بھی دیں، لیکن اس کا نتیجہ الٹا ہی نکلا اور اس کی بیوی وطنی نے اس کی جھوٹی بیوی چھوڑ کر کالو کے ساتھ رہنا شروع کر دیا۔

ریزے نے پوچھا کہ کالو کہاں ہے؟ جواب میں کالو نے مجھ کے ایک گوشے سے کھڑا ہو گیا اور اس نے اعتراف کیا کہ وہ کالو ہے۔ مجمع میں خواتین اور مرد گہری گہری سانسیں لے رہے تھے جس سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ اس رومان انگیز مقدمے میں دل چسپی لے رہے ہیں۔

ریزے نے پوچھا کہ راجیش اس کے خلاف جو کچھ کہہ رہا ہے کیا یہ درست ہے؟

اس کے جواب میں کالو نے اعتراف کیا۔۔۔۔۔ کہ درست ہے۔ وطنی اس کی فراہم کردہ چھوٹی سی میں مقیم ہے مگر یہ الزام غلط ہے کہ اس نے وطنی کو اغوا کیا ہے۔ اس سے پوچھا گیا کہ کیا وہ وطنی کو اس کے شوہر کو واپس کرنے پر تیار ہے؟

کالو نے جواب دیا کہ یہ وطنی کا معاملہ ہے۔ اس کا جہاں جی چاہے رہے۔ وہ اپنی مرضی سے آئی ہے، وہ اسے مجبور کیوں کرے؟

ریزے نے پوچھا کہ وطنی کیا یہاں ہے تو خواتین ٹک سے ایک عورت نے کھڑے ہو کر کہا ہاں میں وطنی ہوں مگر وہ آپ مجھ سے کیا پوچھنا چاہتے ہیں؟

وہ ایک خوش شکل عورت تھی جس نے ترائی میں رہنے والی عورتوں کی طرح اپنے بالوں کا دھنسا جوڑا بنایا ہوا تھا۔ وہ تنگ سی انگلیا پہنے ہوئے تھیں اور لباس کو مکمل کرنے کے لیے اس نے لمبائی پہنا ہوا تھا۔

ریزے نے پوچھا کہ وہ کون ہے تو اس نے جواب دیا کہ وہ کالو کی بیوی ہے۔ اس کی رنگت سفید تھی، لیکن وہ بے حد کمرور تھی۔ اس کے پاؤں میں سوجن بھی تھی، جو ترائی میں رہنے والوں کو اکثر ہوتا ہے۔ اس نے کہا کہ چوں کہ کالو نے دوسری بیوی خرید لی ہے، لہذا اسے اب کام کر کے گزارا کرنا پڑے گا۔ جس کی اجازت اس کا پیار ختم نہیں دے

جوڑیاں اور موتیوں کا پار مجھے کالو نے بنا کر دیا ہے۔ اس سے پوچھا گیا کہ کیا وہ راجیش کے پاس جانے پر آمادہ ہے تو اس کا جواب تھا کہ کوئی اسے اس پر مجبور نہیں کر سکتا۔

قدیم قبیلہ جو ترائی کے صحت مند ماحول میں رہتا ہے دو باتوں کے لیے مشہور ہے۔ اول یہ کہ لوگ صفائی پسند ہیں دوم یہ کہ عورتوں کو مکمل آزادی ہے۔ اسی لیے وطنی نہایت بے باکی سے اس مجمع میں جہاں تین انگریز بھی تھے، اپنا مقدمہ لڑ رہی تھی۔

راجیش سے ریزے نے پھر پوچھا کہ اب کیا کرنا چاہیے۔ اس کے جواب میں راجیش نے جواب دیا کہ وہ تو انہیں بڑی سرکار سمجھ کر یہاں آیا ہے، وہی الٹا اس سے پوچھ رہے ہیں کیا کرنا چاہیے۔ اگر آپ لوگ میری بیوی واپس نہیں دلا سکتے تو پھر ہر جانہ دی دلا دیجیے۔ ریزے نے پوچھا نہیں کتنی رقم چاہیے؟ اس پر راجیش نے جواب دیا کہ ڈیڑھ سو روپے۔ مجمع نے شور مچا دیا کہ رقم زیادہ ہے، لہذا اس کے لائق نہیں ہے۔

اب ریزے نے کالو سے دریافت کیا کہ کیا وہ وطنی کے لیے اتنی رقم دینے کو تیار ہے؟ کالو نے کہا راجیش نے اپنی بیوی کو سو روپے میں خریدا تھا، اب دو سال کے بعد اس کے ڈیڑھ سو روپے کیوں مانگ رہا ہے؟ یہ زیادتی ہے۔ وہ وطنی کے لیے پچاس روپے دینے کو تیار ہے۔

ریزے نے اپنا فیصلہ سناتے ہوئے کہا کہ کالو وطنی کے لیے 75 روپے ادا کرے۔ کالو نے اپنی کمر میں بندھی ایک تھیلی ریزے کے قدموں میں الٹ دی۔ اس میں سے چاندی کے بالوں روپے نکلے۔ باقی رقم اس کے ساتھیوں نے چندہ کر کے دے دی۔ رقم راجیش کو دے دی گئی جو اس نے مٹی اور کہا کہ پوری ہے۔

خواتین میں ایک عورت جو سب سے افرہ معلوم ہوتی تھی الگ تھلک بیٹھی تھی۔ وہ نقاہت کی وجہ سے اپنے پاؤں پر بھی کھڑی نہیں ہو پارتی تھی۔ اس نے نحیف سی آواز میں کہا کہ سرکار میرا کیا ہوگا؟

ریزے نے پوچھا کہ وہ کون ہے تو اس نے جواب دیا کہ وہ کالو کی بیوی ہے۔ اس کی رنگت سفید تھی، لیکن وہ بے حد کمرور تھی۔ اس کے پاؤں میں سوجن بھی تھی، جو ترائی میں رہنے والوں کو اکثر ہوتا ہے۔ اس نے کہا کہ چوں کہ کالو نے دوسری بیوی خرید لی ہے، لہذا اسے اب کام کر کے گزارا کرنا پڑے گا۔ جس کی اجازت اس کا پیار ختم نہیں دے

رہا ہے۔ سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ اسے کیا کرنا چاہیے۔ اگر وہ کام نہیں کرے گی تو قاتلوں سے مر جائے گی۔ وہ اپنی جگہ پر بیٹھ کر اور ہتھیاروں سے روکنے لگی۔

یہ ایسی پیچیدہ صورت حال تھی کہ ریزے کے اچھے بھی کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ جب اس نے مقدمے کا فیصلہ سنایا تھا تو اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ کالو کی پہلی بیوی بھی وہاں موجود ہے۔ محض پر ایک تکلف دہ خاموشی چھائی ہوئی تھی کہ اچانک وہ جیتی اپنی جگہ سے اٹھی اور اس عورت کے قریب جا کر بولی۔ ”رومت“ میں تمہیں اپنے ساتھ رکھوں گی۔ جو کچھ کالو لا کر دے گا میں اس میں سے تمہیں نصف دینے کا وعدہ کرتی ہوں۔ اب چپ ہو جاؤ۔ تم بے گھر و بے سہارا نہیں ہو۔“

☆☆☆

میں اس مقدمے کا آنکھوں دیکھا گواہ ہوں مگر پھر کے ساتھ زیادہ دن رہ نہ سکا اور جنگلات کا ٹکڑہ چھوڑ کر برٹش انڈین آرمی میں ملازم ہو گیا۔ فوج اس زمانے میں معتبر اور باعزت ادارہ ہوا کرتا تھا اور رسول حکومت کے ماتحت رہنے کو اچھا سمجھتا تھا۔

پہلی جنگ عظیم میں کپٹن تھا اور میری ماتحتی میں 500 فوجی تھے اور میری۔۔۔ اور کو کمان کی ستر ویں کو رکھا جاتا تھا۔ جنگ کے بعد مجھے ترقی دے کر میجر بنا دیا گیا اور شاہی مشرفی فزئیر کمانڈر کی حیثیت سے 14 ویں لیبر بٹالین کا اعلیٰ عہدے دار بنا کر افغانستان بھیج دیا گیا جہاں جربا ت میں بے پناہ اضافہ ہوا۔

وہ نئی طرح کے لوگ تھے اور ان کا رہن بہن سب سے جدا تھا۔ نیک، سادہ لوح اور شرم و حیا رکھنے والے۔ مگر اپنے وطن کے لیے لڑنا اور اپنی جان قربان کرنا بھی خوب جانتے تھے۔

میں برٹش آرمی کے تحت وہاں متعین کیا گیا تھا اور بٹالین کی رہنمائی چرچل جیسا جہاں دیدہ و بینہ شخص کر رہا تھا۔ چرچل نے پٹانوں کو برطانیہ کا دست نگر کرنے کی بھرپور کوشش کی، لیکن ناکام رہا۔ جس کا اعتراف اس نے اپنی کتاب ”میں اور پٹان“ میں بھی کیا۔

1929ء سے لے کر 1936ء تک میں نے تقریباً چھ ماہ کا عرصہ تنگائی کا، افریقہ میں گزرا جہاں میں نے ہر قسم کا شکار کیا اور اپنے تجربات میں اضافہ کیا۔ جنگل بہر حال میرے لیے کوئی نئی جگہ نہیں تھی۔ اس لیے وہاں کا ماحول مجھے شہروں

سے زیادہ پسند آیا۔

اس دوران میں نے کالاسخاروں کے پہاڑوں پر کافی اور کئی کی کاشت کی نگرانی بھی کی۔ اس طرح سے شے زراعت کا بھی تجربہ ہو گیا۔ چون کہ افران کو معلوم تھا کہ میں شکاری ہوں، لہذا وہ اتر بدیش میں ایسے علاقوں میں مجھے بطور خاص بھیجا کرتے جہاں آدم خور شیروں یا پیپٹوں نے لوگوں کا جینا حرام کر رکھا ہوتا تھا۔

میں نے 1907ء اور 1939ء کے دوران 33 آدم خوروں کو شکار کیا۔ ریکارڈ کے مطابق میں نے جن آدم خوروں کو شکار کیا انہوں نے مجموعی طور پر 1500 مردوں، عورتوں اور بچوں کو ہلاک کیا تھا۔ سیلاشیر میں نے چھاپوت میں ہلاک کیا تھا جس نے چار سو چھپیس افراد کو موت کے کھاٹا اتارا تھا۔ میں نے اپنی شکاری زندگی میں صرف شیر ہی نہیں بلکہ جیتے اور تیندوے بھی ہلاک کیے تھے۔ میرے بارے میں مشہور زمانہ اخبار آبرور کی رائے یہ تھی کہ میں جنگل کے ہر ایک گوشے سے واقف تھا اور درندوں کے نام انگلیوں کے پوروں پر تھے۔

اپنی ایک کتاب میں، میں نے لکھا ہے کہ جب انسان غور و فکر میں مبتلا ہو تو عجیب عجیب قسم کے خیالات رونما ہوتے ہیں۔ ایک بار میں شیر کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ برابر میں پر بیٹھا ہوا تھا کہ ایک مجھے محسوس ہوا جیسے شیر آ رہا ہے۔ پھر وہ قریب آ گیا۔ میرے روٹنے کھڑے ہو گئے۔ جب میری قوت برداشت جواب دے گئی تو میں نے بندوق تھامی اور تیزی سے گھوما۔ معلوم ہوا کہ وہاں شیر تو نہیں ہے البتہ میرے سر پر ایک مڑا درخت پر بیٹھا اس کی سونگی پتیاں کتر رہا تھا۔

ایک واقعہ اور سنیے کہ جب میں شیر کے مارے ہوئے شکار کے پاس بیٹھا تھا اور انتظار کر رہا تھا کہ شیر کب وہاں آئے اور میں اس کا شکار کروں۔ اچانک مجھے ایسا لگتا جیسے کوئی بہت بڑا جانور آ رہا ہے۔ میں نے بندوق سنبھال لی اور مڑا یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ میری آنکھوں سے چنداچ کے فاصلے پر ایک بڑی چوٹی ایک نئے پر یک رسی ہے۔ اسی طرح سے میرے دماغ میں سلطانہ ڈاکو بیٹھا ہوا تھا۔ جب میں نے چند افراد کو آگ تپتے دیکھا تو یہ خیال آیا کہ انہوں نے اپنی رافٹیں دیوار سے ٹکائی ہوئی ہیں لیکن جب میں نزدیک پہنچا تو معلوم ہوا کہ وہ تو کھڑیاں ہیں، جن سے وہ لوگ درخت کاٹتے ہیں۔

1910ء میں میں نے ضلع پینار میں ایک ایسے چپے کو ہلاک کیا، جس نے ریکارڈ کے مطابق 400 انسانوں کو موت سے ہمکنار کیا تھا۔ 1926ء میں میں نے دوسرے چپے کو درپردہ پر ایک میں ہلاک کیا جو کیدار اور بدری ناتھ کے مندر میں آنے والے زائرین کو ہڑپ کر جاتا تھا۔ اس کے بارے میں خیال کیا جاتا ہے کہ اس نے سوا سو افراد کے خون سے پیاس بجھائی تھی۔ اس کے علاوہ میں نے جن مشہور و معروف آدم خوروں کو اپنا نشانہ بنایا ان میں سیلا دس، مون، من، ہلکین، بکٹھو اور اور چوگرانا نیکر شامل ہیں۔

وہ سارے آدم خور جنہوں نے ایک عالم میں دہشت پھیلائی ہوئی تھی، ان کی موت کے بعد جب ان کا پوسٹ مارٹم کیا گیا تو یہ ثابت ہوا کہ وہ کسی نہ کسی تکلیف میں مبتلا تھے۔ ممکن ہے وہ اس کا ذمے دار بنی نوع انسان کو سمجھتے ہوں۔ ان کے جسم میں کوئی چوٹ لگ گئی اور مندر نہ ہو سکی یا خار پت کے کاٹنے ان کے جسم میں اس طرح سے پیوست ہوئے کہ نکل نہ سکے۔ میں نے ایک چپے کو ہلاک کیا تو اس کے کانڈے میں ایک گولی پہلے سے لگی ہوئی تھی۔ غالباً اسی بنا پر وہ آدم خور بن گیا۔ میں نے اپنی کتاب میں لکھا: ”جس شکاری نے اس پر فائر کیا اس نے بے پروائی سے کام لیا اور اسے قتل کر دیا۔ چنانچہ وہ چپتا لوگوں پر اپنا غم و غصہ اتارنے لگا۔“

میں زمین پر کھڑے ہو کر شکار کیا کرتا تھا اور اس سلسلے میں کسی کی مدد نہیں لیا کرتا تھا۔ شکار کرنے کا عادی تھا۔ بعض اوقات میرے ساتھ ایک چھوٹا سا کتا رہتا تھا جو بھی ہوا کرتا تھا۔ میں نے ان علاقوں میں عزت و توقیر پائی جن علاقوں میں اپنی جان کی پروا نہ کرتے ہوئے آدم خوروں کو موت کا نشانہ بنایا۔ میرے پیش نظر انسانی زندگی اہم ہوتی جس میں میں نے اپنی جان کی پروا نہ کی۔

اپنی زندگی کا بیشتر حصہ میں نے گرنی ہاؤس میں گزارا۔ میرا خاندان جس میں ماں میری جین کاربٹ اور میری بیٹی شیرہ مارگریٹ و نفرو کاربٹ جسے پیار سے میکی کہا جاتا تھا اسی مکان میں سکونت پذیر رہے۔

میرا قد چھ فٹ اور ایک انچ تھا۔ اپنی نیلی آنکھوں کے سبب حسین کہا جاسکتا تھا۔ میں عموماً ڈھیلے ڈھالے کپڑے اور جیٹ پہنتا تھا۔ جنگل میں داخل ہوتے وقت میرے سر پر ہیٹ ضرور ہوتا تھا۔ جاڑے کا موسم میں عام طور پر کالادھنگی میں گزارتا تھا۔ مجھے خاص طور پر مصنف بننا

مفتی صدر الدین خان، آرزو

(1789-1868) عالم اور شاعر۔

مولوی لطف اللہ کشمیری کے بیٹے تھے۔ دہلی میں پیدا ہوئے۔ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی اور مولانا فضل امام سے تعلیم حاصل کی اور صدر الصدور کے عہدے پر فائز ہوئے، جو اس وقت سب سے بڑا منصب سمجھا جاتا تھا۔ درس و تدریس کا شغل بھی جاری رہتا تھا۔ نواب یوسف علی خان والی رام پور، نواب صدیق حسن خان رئیس بھوپال اور سر سید احمد خان ان کے شاگردوں میں سے تھے۔ 1857ء کے ہنگامے کے بعد نصف جائیداد ضبط ہو گئی۔ اردو، فارسی، عربی تینوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ اردو میں اصلاح پہلے شاہ نصیر سے اور آخر میں میر نظام الدین منون سے لیتے رہے۔ کلام دیوان کی صورت میں مرتب نہیں ہوا۔ شعرائے اردو کا ایک تذکرہ بھی لکھا تھا، جو اب ناپید ہے۔

مرسلہ: عنایت مسیح بشو پورہ

پسند تھا۔ یہ وہ وقت تھا جب مصنفوں کو قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا اور ان کی عزت و توقیر کی جاتی تھی۔ وہ مارے مارے نہیں پھرتے تھے۔

جب فوج سے ریٹائر ہو گیا تو میں نے اپنے شکاری تجربات سے لوگوں کو روشناس کرانے کے لیے شکاریات پر کتابیں لکھنا شروع کر دیں۔ میں ایک ماہر فوٹو گرافر بھی بن چکا تھا، اس لیے میں نے اپنی کتابوں کو تصاویر سے بھی مزین کیا تھا۔

لوگ مجھے نجات دہندہ مانتے تھے اور بہت عزت کرتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ میں بھگوان کا سادھو (بزرگ) ہوں۔ بہت سے لوگ میرا نام غلط انداز سے لیا کرتے تھے اور مجھے محبت سے ”کار پٹ صاحب“ کہا کرتے تھے۔ مزاج کے اعتبار سے بڑی حد تک میں شرمیلا تھا، لیکن اپنے ہندوستانی دوستوں میں اٹھنا بیٹھنا پسند کرتا تھا۔ مجھے شکار کا بہت شوق تھا اور میں خصوصیت کے ساتھ ایسے شہروں کا شکار کرتا پسند کرتا تھا جو آدم خور ہوتے تھے۔ ہندوستان میں عرصہ دراز تک رہنے سننے کی وجہ سے مجھے ہندوؤں کے رسم و رواج اور ان کی رسومات سے بڑی حد تک واقفیت ہو گئی

تھی۔ میں ان کے جذبات و احساسات سے بھی اچھی طرح سے آگاہ تھا۔ چنانچہ درندوں کو شکار کرتے وقت میں بعض اوقات اپنی جان کی بھی پروا نہیں کرتا تھا۔ اسی لیے جب مجھے ایک چیتے کے بارے میں معلوم ہو گیا کہ اس نے اب تک دس افراد کو کھالیا ہے تو میں نے اسے شکار کرنے اور وہاں کے رہنے والوں کو ایک عظیم مصیبت سے نجات دلانے کے لیے بندوق اٹھائی۔ یہ قصہ میں نے اپنی کتاب ”کمان کا آدم خور“ میں بیان کیا ہے۔ میری دوسری کتاب ”دراپر یاگ کا آدم خور چیتا“ ہے، جس میں میں نے ایک آدم خور چیتے کا احوال درج کیا ہے جس نے 220 لوگوں کو ہلاک کر دیا تھا۔ لوگ اس کی وجہ سے تاریکی میں جانے سے خوف کھانے لگے تھے۔ وہ چیتا کھڑکی سے گھروں میں داخل ہو جاتا تھا اور انسانوں کو ہلاک کر دیتا تھا۔ اس لیے علاقے کے 300 شکاریوں کو ہندوؤں کے لائسنس دیے گئے، لیکن کامیابی کسی کے حصے میں نہیں آئی۔ جد یہ ہے کہ اس چیتے کو ہلاک کرنے کے لیے دس ہزار روپے کی رقم انعام میں مقرر کی گئی مگر کوئی اس رقم کو جیتنے کا خود کو اہل ثابت نہ کر سکا۔

ایک شکاری نے چیتے کو ہلاک کرنے کے لیے پونا شیم سانائڈ کا زہر بھی جانوروں کے جسموں پر لگا کر انہیں کھلے عام چھوڑ دیا کہ جب چیتا انہیں کھانے آئے گا تو ہلاک ہو جائے گا۔ مگر چیتے کی عیاری کے سبب یہ حربہ بھی ناکام رہا۔ (دافع ہو کر پونا شیم سانائڈ ایسا زہر ہے جس کا ذائقہ آج تک نہیں معلوم ہو سکا ہے۔ زبان پر رکھتے ہی زہر اتنی تیزی سے جسم میں پھیل جاتا ہے کہ کوئی اس کے بارے میں کچھ نہیں بتا سکتا)

ایک بار جب برطانیہ کی پارلیمنٹ میں بحث ہوئی تو میرا نام تجویز کیا گیا کہ چیتے کے شکار کے لیے ہم پر مجھے بھیجا جائے۔ اس لیے کہ انڈیا جب برطانیہ کی راج دہانی میں شامل ہے تو حکومت برطانیہ کا فرض ہے کہ وہ ریاست کے لوگوں کی جان و مال کو بھی تحفظ دے۔ چنانچہ مجھے اس چیتے کو شکار کرنے کے لیے اس علاقے میں جانا پڑا۔ ایک موقع پر میں نے مشاہدہ کیا کہ جن راستوں پر چل کر میں چیتے کو تلاش کرتا رہا تھا، ٹھیک انہی راستوں پر چیتا بھی چلا رہا تھا، تاہم اسے میرا پتلا چل جائے۔ یقیناً اس نے میری بو سونگھ لی تھی۔

اس آدم خور کو شکار کرنے کے ایک اور موقع پر جب میں ایک اونچی جمبو نیڑی میں بیٹھا تھا تو بارش ہونے لگی اور

تاریکی پھیل گئی۔ چیتا چونکہ خود مجھے تلاش کر رہا تھا، اس لیے ٹھیک اسی جمبو نیڑی کے نیچے آ گیا جہاں میں اس وقت موجود تھا۔ تاریکی کی بنا پر چیتے نے ادھم نہیں مچایا اور جب تاریک دور ہوئی اور بارش محکم تو وہ دالے چلا گیا۔ اس طرح سے میں بال بال اس کا شکار ہونے سے بچ گیا۔

پورے ایک سال کی محنت شاقہ اور حکمت عملی کے بعد وہ چیتا ایک رات آم کے درخت سے بندھی ہوئی ایک بکری کو شکار کرنے کے لیے آیا تو میں نے اسے شکار کر لیا۔ میں نے اس بارے میں اپنی کتاب میں لکھا ”آہ! کاش کہ کوئی اور بھی اس وقت وہاں موجود ہوتا جب میں اس بوڑھے چیتے کو کوئی مارنے جا رہا تھا۔ اس کی توحشی کاستری تھی اور موچیں بے حد تھیں۔ وہ واقعی انڈیا کا سب سے قابل نفرت درندہ تھا جس کا میں نے نشانہ لیا۔“

جب اس مردہ چیتے کو فنانس کے لیے لایا گیا تو ہزاروں افراد جمع ہو گئے اور انہوں نے مجھ پر گلے کی پیتاں بھجوا دیں اور کارپٹ صاحب کے نعرے لگائے ایک ماہ بعد حکومت برطانیہ نے مجھے دس ہزار روپے کا گرانقدر انعام ایک تقریب میں دیا۔

میری عادت تھی کہ کسی بھی علاقے کے رہنے والے جب تک مجھے یقین دہانی نہ کرادیتے کہ فلاں علاقے میں ایک آدم خور شیر، چیتے یا تیندوے نے لوگوں کا جینا حرام کر دیا ہے، اس وقت تک میں ان پر اپنی بندوق نہیں اٹھاتا تھا۔ میں نے اپنی ایک کتاب میں لکھا ہے کہ جب ایک شیر آدم خور بن جاتا ہے تو دن و رات بھی بستیوں پر حملہ کر کے انسانوں کو ہلاک کر دیتا ہے، لیکن چیتا رات کو شکار کرنے کے لیے آتا ہے، وہ دن میں کسی بستی میں داخل ہونے کا رستہ نہیں لیتا۔

اپنی ایک اور کتاب میں میں نے یہ بھی انکشاف کیا ہے کہ میں نے جنگل کی زندگی میں بار چڑیل کی آواز سنی اور ایک بار اسے دیکھا بھی تھا۔ وہ ایک آٹو تھا، جس کا رنگ سنہری تھا۔ میں نے اپنی زندگی میں ایسا آٹو کبھی نہیں دیکھا۔ میں اسے گولی مارنا چاہتا تھا، لیکن اتنا اندھیرا تھا کہ میں اس کا صحیح طریقہ پر نشانہ نہیں لے سکتا تھا۔ اس کی آواز اتنی بیت ناک تھی کہ میرا کچھ دہل گیا اور گولوں کا خون خشک ہو گیا تھا۔ دل چسپ بات یہ بھی کہ وہ میرے مکان کے برآمدے سے کچھ ہی فاصلے پر ایک درخت پر بیٹھا تھا۔

ایک بار میں نے ایک چڑیل کو عورت کے روپ میں

بھی دیکھا ہے۔ اس کی آنکھوں میں بہت خرقہ تھا۔ میں بچان پر بیٹھا تھا اور وہ میرے ایک ملازم کو اپنی آنکھوں سے تھپتی اور ہاتھ قائم کر کھینچتی رہی۔ جیسے کہ سانپ برندوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھ کر مڑ کر لیا کرتا ہے۔ جب میں نے اس چڑیل پر گولی چلائی تو وہ چپختی ہوئی غائب ہو گئی۔ اس سے میں نے یہ اندازہ لگایا کہ اگر کوئی چڑیل سامنے آجائے تو اس کی طرف نہیں دیکھنا چاہیے اور اپنا سر بل جیسی کسی چیز میں چھپا لینا چاہیے۔

فوج سے بھاڑ ہونے کے بعد میں نے نہ صرف یہ کہ شکاریات پر کتابیں لکھیں بلکہ ہندوستان کی جنگلی زندگی کو محفوظ کرنے کے لیے جدوجہد میں حصہ لیا۔ کیونکہ شکار کرنے کا مفقہ درندوں کو اندھا دھند ہلاک کرنا نہیں ہونا چاہیے۔ البتہ انہیں زندہ پکڑنے کے بعد چڑیا گھروں میں رکھا جاسکتا ہے۔ خاص طور پر میں بنگال کا ٹیکر کو زندہ رکھنے کی وکالت کرتا ہوں۔ میرا موقف یہ ہے کہ اگر اس درندے کو کھنٹ شوق کی خاطر شکار کیا جاتا رہا تو روئے زمین سے اس کی نسل معدوم ہو جائے گی۔

☆☆☆

میں نے اپنا پہلا کیمرا 1920ء میں خریدا تھا۔ حقیقت میں میں اپنے دوست فریڈرک والٹر جیمین سے مل کر شکار جو شیروں کی تصاویر کھینچ کر مارکیٹ میں اچھے داموں سے فروخت کیا کرتا تھا۔ حالانکہ جنگل کے بارے میں اس کی معلومات زیادہ نہیں تھیں۔ میں نے سوچا کہ یہ کام تو مجھے کرنا چاہیے، اس لیے کہ جانوروں کی تصاویر کھینچنا میرے لیے کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ میری پہچنی ہوئی تصویروں کی لوگوں نے بہت تعریف کی تو میں نے فوٹو گراف بننے کو ترجیح دی۔ گویا میں نے بندوق ایک طرف رکھ دی اور کیمرا استعمال لیا اور ”دھما میں دھما“ لگے بجائے ”کلیک۔ کلیک۔ کلیک“ کرنے لگا۔

میں جانوروں کی نقیسات سے واقف ہوں کہ جانور شریلے ہوتے ہیں۔ ان کو اس وقت تک ہلاک نہیں کرنا چاہیے جب تک کہ وہ بنی نوع انسان کے لیے ہلاکت خیز نہ ہو جائیں۔

میری اخباری نمائندے نے مجھ سے پوچھا کہ شیر تو ایک درندہ ہے۔ اس کی درندگی سے بچنا چاہیے۔ وہ انسان کو دیکھ کر کچھ بھاڑا کرتا ہے۔

میں نے جواب دیا کہ شیر کسی آدمی پر اس وقت تک حملہ نہیں کرتا جب تک کہ انسان کوئی کارروائی کر کے اسے

مشتعل نہ کر دے۔

وہ افراد جو جنگل کے علاقوں میں رہتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ اگر ان کا سامنا شیر سے ہو جائے تو اس میں خطرے کی کوئی بات نہیں ہے، کیوں کہ شیر اپنا راستہ چلتا ہوا گزر جائے گا بشرطیکہ اسے چھیڑنا نہ جائے۔

حقیقت یہ ہے کہ شیر اپنی فطرت کے اعتبار سے انسان دشمن جانور نہیں ہے۔ شیر کے لیے ”آدم خور“ لفظ محض اتفاقی معنوں میں درست ہے۔ شیر پیدا کی طور پر آدم خور نہیں ہوتا۔ بلکہ بعض نادان انسانوں کی بے ہنگم کارروائیاں کسی شیر کو آدم خور بنا دیتی ہیں۔ کسی شیر کو آدم خور بنانے والے اکثر وہ انڈیا کی شکاری ہوتے ہیں جو اپنے نشانے پر یقین کیے بغیر شیر پر گولی چلا دیتے ہیں۔ وہ شیر کو ہلاک کرنے کے شوق میں گولی تو چلا دیتے ہیں، مگر مہارت نہ ہونے کے سبب ان کی گولی نشانے پر نہیں پڑتی تھی اور اپڑھتی ہوئی نکل جاتی ہے۔ شیر بجائے مرنے کے زخمی ہو جاتا ہے۔

اس قسم کا زخمی شیر انسان کا دشمن ہو جاتا ہے۔ وہ جہاں کہیں بھی انسانی صورت کو دیکھتا ہے اسے اپنا دشمن سمجھ کر اس پر حملہ کر دیتا ہے اور اسے ختم کر دیتا ہے۔ دوسرے درندہ صفت جانوروں کا بھی یہی حال ہے۔

میں نے نہ صرف یہ کہ جانوروں کی تصاویر اتارنے کا پیشہ اختیار کیا بلکہ یہ تحریک چلانا بھی شروع کر دی کہ درندوں کو تفریحاً ہلاک نہ کیا جائے ورنہ ان کی نسلیں معدوم ہو جائیں گی۔ اس سلسلے میں میں نے ایک تنظیم بنائی پھر اس تنظیم کی کئی کانفرنسیں اتر پردیش میں منعقد کیں۔ میرا مطالعہ تھا کہ حکومت کو چاہیے کہ وہ وائلڈ لائف کو تحفظ دے۔ میں نے اپنے دوست جیمین کی مدد سے کمان (انڈیا) کے پہاڑوں میں حکومت پر زور دے کر پہلا نیشنل پارک بنوایا۔ یہ پارک نیپال کی سرحد کے قریب ہے۔ اس کا رقبہ 520 مربع میل ہے جہاں شیر، چیتے اور دوسرے درندے آزادانہ بھومتے پھرتے ہیں اور کوئی شکاری انہیں شکار نہیں کر سکتا۔ لوگ صرف اپنی گاڑیوں میں بیٹھ کر گھوم پھر سکتے ہیں اور ان درندوں کو دیکھ سکتے ہیں۔ (جم کاربٹ کی وفات کے ایک سال بعد اس پارک کو اس کے نام پر رکھا گیا۔ مدیر)

1947ء میں جب انڈیا نے آزادی حاصل کر لی تو دوسرے گورے لوگوں کی طرح سے میں نے بھی انڈیا کو چھوڑ دیا اور اپنی بہن مکی کے ساتھ کینیا چلا گیا جو اب بھی برطانیہ کے زیر تسلط تھا۔ کینیا اپنے حسین قدرتی مناظر کی وجہ سے



واردات خونچکاں

نسرین عثمانی

قتل و خوں ریزی، لوٹ مار اب زندگی کا حصہ بن چکا ہے۔ امریکی ریاست میں رہنے والے آنند کو بھی کب معلوم تھا کہ اس کے پاس جو چند سو ڈالرز ہیں ان کی خاطر دو لٹیرس کی جان لینے کی کوشش کریں گے۔ دودو گولیاں اس کے سر میں اتار دیں گے مگر جسے اللہ رکھے اسے کون مار سکتا ہے۔ سر میں دو گولیاں لگنے کے بعد بھی وہ زندہ رہا۔

امریکا کے مکروہ معاشرے کی ایک جھلک

گیا۔ اس نے کارٹن اپنی بغل میں دبائے اور پیزا والے ہاتھ سے دروازے پر دستک دی۔ جب کسی عورت نے اندر سے استفسار کیا تو اس نے جواب میں کہا: ”میں ڈومینو پیزا لایا ہوں، مادام!“

”دفع ہو جاؤ یہاں سے“ میں نے تو ایسا کوئی آرڈر نہیں دیا ہے۔ ”اندر سے خشک اور کھر در آواز آئی۔ دروازہ کھولنے کی زحمت نہیں کی گئی تھی۔

آنند وہاں سے پلٹ آیا اور آزر رگی سے خود کلامی میں

یہ 23 جولائی 1980ء اور رات گیارہ بجے کا واقعہ ہے کہ ڈومینو پیزا کے سٹورمان کا ملازم آندہ اپنے ایک ہاتھ میں بڑا سا پیزا اور دوسرے ہاتھ میں پیٹری کے چھ کاٹن تھا سے اسپانڈر اپارٹمنٹ کی دوسری منزل سے گزر رہا تھا۔ اسے اپنا توازن برقرار رکھنے میں دشواری پیش آ رہی تھی۔ اس لیے کہ اس کے ہاتھ میں سامان زیادہ تھا۔ اس کے پاس اس فلیٹ کا ہتھکڑا تھا جس سے یہ پیزا اور پیٹری کے کاٹن پہنچا تھا۔

چند قدم کا فاصلہ طے کرنے کے بعد اسے وہ فلیٹ مل

چھ کتابیں لکھیں، جن میں سے تین کو اس کی سوانح حیات) درج دیا جاسکتا ہے۔

اس کی کتابیں پڑھ کر لوگ حیرت زدہ رہ جاتے تھے کہ وہ اتنی زندگی سے قریب تر ایسی کتابیں جزئیات کے ساتھ کیسے لکھ لیتا ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ جم اپنی یادداشتوں کو ایک ڈائری میں لکھتا رہتا تھا۔ پھر جب وہ کوئی کتاب لکھنے کا ارادہ کرتا تھا تو اس ڈائری کو کھول کر سامنے رکھ لیتا تھا۔

اس کی جنگل ایڈوچر کہانیوں پر تبصرہ کرتے ہوئے ناٹنر اخبار نے لکھا کہ جم کاربٹ کا انداز تحریر مشہور زمانہ مصنف ریڈارڈ کیلنگ سے بہت ملتا جلتا ہے۔ مگر ڈیڈ کیلنگ نے جنگل دیکھا تھا اور فنی کہانیاں لکھا کرتا تھا۔ جب کہ جم کاربٹ نے حقیقت نگاری کی ہے۔ اس کے شکار کے قصے پڑھتے ہی سر آکر کانڈل کا سنسنی خیز ناول ”ہاؤنڈ آف باسکروئلڈ“ یاد آ جاتا ہے۔ جم کی کتابوں میں ہماری کی سفر نگاری غیر معمولی ہے۔ اس لیے اس نے وہاں ایک بڑا عرصہ گزارا تھا۔

چچن اور انڈیا کے بہت سے شیروں کی قسموں کا نام جم کاربٹ پر رکھا گیا۔ یقیناً ان کے حوالے سے وہ تاقیامت ہماری یادوں میں بسا رہے گا۔

1994ء اور 2002ء میں اس کی اور اس کی بہن کی قبروں کا جائزہ لیا گیا اور جیری اسے میل نے ان کی مرمت کرائی جو جم کاربٹ فاؤنڈیشن کا ڈائریکٹر ہے۔

اس کی زندگی پر چار فلمیں بھی بنائی جا چکی ہیں۔ 1948ء میں اس کی کتاب پر ہالی ووڈ کے ایک ڈائریکٹر ہارون ہاسکن نے فلم بنائی جس میں سائو نے جنگل میں کا کردار ادا کیا تھا۔ یہ فلم مقبول ہوئی اور اس نے باکس آفس پر اچھا بزنس کیا۔ جم کاربٹ نے فلم دیکھنے کے بعد تبصرہ کرتے ہوئے کہا تھا ”اس فلم میں جو شیر دکھایا گیا ہے وہ بلاشبہ اصلی ہے اور یقیناً وہ درندہ ہے، لیکن اس نے انسانوں سے زیادہ اچھی اوکاری کی ہے۔ میں اس سے بہت متاثر ہوا۔“

1986ء میں بی بی سی نے ایک ڈراما انڈیا کا آدم خور پیش کیا جس میں فریڈرک ٹریوس نے جم کاربٹ کا کردار ادا کیا تھا۔ برطانیہ میں 2002ء میں کرسٹوفر ڈھل کو لے کر ایک فلم بنائی گئی جس کا نام ”شیروں کی ریاست“ رکھا گیا۔ 2005ء میں ایک ٹیلی فلم تیار کی گئی جس میں جم کاربٹ کا کردار جیمس فلیمنگ نے ادا کیا تھا۔

بہت مشہور ہے۔ چونکہ بنیادی طور پر شکاری تھا، اس لیے وہاں پہنچ کر بھی میں نے جانوروں کے تحفظ کی حمایت میں آواز اٹھانا جاری رکھی۔ میں اور میکی اس دوران ایک ہوٹل کے لان میں برگلڈ کے مضبوط درخت کی شاخوں پر بنائے گئے جھونپڑے میں رہتے تھے۔ اسی دوران یعنی 5 اور 6 فروری 1952ء کو شہزادی الزبتھ وہاں آکر شہری۔ اس نے جو درخت جھونپڑی کے بارے میں سنا تو اس نے مجھ سے درخواست کی کہ مجھے بھی اس انوکھی جگہ پر ٹھہرنے کا موقع دیا جائے۔

میں نے اس کی اجازت دے دی۔ اتفاق سے اسی دوران شہزادی کے باپ یعنی جارج ششم کا انتقال ہو گیا۔ شہزادی واپس لندن چلی گئی۔ مگر میں نے اس ہوٹل کی مہمانوں کی کتاب میں اس واقعہ کو منفرد انداز میں لکھا ہے:

”دنیا کی تاریخ میں ایسا تھیر خیر واقعہ کبھی پیش نہیں آیا ہوگا کہ جب ایک شہزادی برگلڈ کے درخت پر چڑھ کر جھونپڑے میں ٹھہری اور جب دوسرے دن نیچے اتری تو شہزادی سے ملکہ بن چکی تھی۔ خدا ملکہ کی حفاظت کرے۔“

جم کاربٹ جب اپنی چھٹی کتاب مکمل کر چکا تو اس پر دل کا دورہ پڑا۔

مہی دل کا دورہ اس کے انتقال کا باعث بنا۔

☆☆☆

اسے سینٹ پیٹرز کے انجیلکن چرچ، نائیری میں انیس اپریل 1955ء کو دفن کیا گیا۔ اس کی خواہش تھی کہ مرنے سے پیشتر وہ ایک بار پھر انڈیا جائے، لیکن اس کی علالت نے اسے ایسا کرنے کی اجازت نہیں دی۔

نائیری (کینیا) میں اس نے اپنے دوست کورنگ کے لیے ایک چوہاں بنوائی تھی جس میں علاقے کے لوگ آکر بیٹھتے اور اپنے مسائل بیان کرتے۔ اس نے نائیری کے گرد بہت سی دیوار بھی تعمیر کرائی تھی تاکہ علاقے کے لوگ جنگلی درندوں سے محفوظ رہ سکیں۔ اس دیوار کی لمبائی ساڑھے چار میل تھی۔

اس کی پہلی کتاب ”کومان کا آدم خور“ انڈیا میں شائع ہوئی اور بے حد مشہور ہوئی۔ اس کے علاوہ برطانیہ اور امریکا میں بھی اس کا پہلا ایڈیشن ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ ایک اندازے کے مطابق اس کی ڈھائی لاکھ کاپیاں فروخت ہوئیں۔ بعد میں اس کو دنیا کی 27 زبانوں میں ترجمہ کیا گیا۔ اس کی چوتھی کتاب ”جنگل کی پہچان“ کے بارے میں خیال کیا جاتا ہے کہ وہ اس کی خود نوشت سوانح حیات ہے۔ مجموعی طور پر اس نے

بولو۔ ”لوگوں کو ایسا نہیں کرنا چاہیے۔ میں جانور نہیں انسان ہوں۔ ایسا مذاق بھلا س کام کا؟ اس دوران میں کوئی اور کام کر لیتا۔“

وہ 23 برس کا ایک محنت مند لڑکا تھا جس کے ارادے بلند اور حوصلے جوان تھے۔ وہ ہر وقت کچھ نہ کچھ کرنے پر آمادہ رہتا تھا۔ نچلا بیٹھنا تو اس کی فطرت کے خلاف تھا۔ اس نے گریجویٹ کر لیا تھا اور اس کا نام لاء کالج کی ویننگ لسٹ پر تھا۔ اس کو قانون پڑھنے میں دلچسپی تھی، تاکہ بعد میں لوگوں کو قانون و انصاف کی راہ پر چلا سکے۔ سردست اس نے اپنے اخراجات پورے کرنے کے لیے بیڑا کی ایک دکان پر ملازمت کر لی تھی اور عموماً آرڈر پر مال پہنچایا کرتا تھا۔ لوکل زبان میں وہ ”باہر والا“ تھا۔

جب آئندہ زینے اتر کر پارکنگ لاٹ کی طرف جانا چاہتا تھا کہ برآمدے کی طرف سے ایک آواز آئی۔ ”اے لڑکے! مجھے ایک بیڑا کی ضرورت ہے۔ کیا تمہارے پاس بیڑا ہے؟“

وہ ایک مخفی سا آدمی تھا جس کے جسم پر ڈھیلا ڈھالا سا پتلون اور کاٹن کی قمیض تھی، برآمدے میں کھڑا تھا۔ اس کے چہرے پر تنجید کی تھی۔ آئندہ اس کے قریب چلا گیا۔ ”کیا تم نے ہی بیڑا کا آرڈر دیا تھا؟“ اس نے پوچھا۔ ”اور پرہنے والی خاتون نے کہا کہ میں نے آرڈر نہیں دیا ہے؟“

”ہاں، دراصل میں نے اس کا فون استعمال کیا تھا۔“ اس شخص نے اپنی داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے جواب دیا۔ ”تم میری گرل فرینڈ کے پاس ہے جو پارکنگ لاٹ میں موجود ہے، تم ذرا یہاں ٹھہرو۔“

وہ آدمی سڑا اور عمارت کے پیچھے چلا گیا۔ چند منٹ بعد ہی وہ واپس آ گیا۔ اب اس کے ساتھ پرستہ قامت کا ایک شخص تھا جس نے کپ لگائی ہوئی تھی۔

”بیڑا کونسا پر رکھ دو۔“ پہلے والے نے جس کے رخساروں پر ہلکی داڑھی تھی سر دلچے میں اسے حکم دیا۔ جب آئندہ اس کے حکم کو رد و خور اعتنا نہ سمجھا تو وہ اپنے دانتوں کی نمائش کرتا ہوا بولا۔ ”لڑکے ہم تم سے مذاق نہیں کر رہے ہیں۔“

آئندہ تذبذب میں مبتلا تھا کہ پستہ قامت شخص نے اپنی جیب سے چھوٹی نال کار ریوٹر نکال لیا، جس کی نال کا رخ آئندہ کے سینے کی طرف تھا۔ آئندہ کے رگ و پے میں سنسنیٹ دوڑ گئی۔

اس نے پیٹیشی کے ڈبے اور بیڑا گھاس پر رو دیے۔ اسے یاد آیا کہ اسی طرح سے ایک ہفتے قبل ایک اور بیڑا پہنچانے والے کو بھی ریوٹر کی نال پر لوٹا گیا تھا۔ اس نے قیاس لگایا کہ یہ وہی لوگ ہیں۔

وہ بیڑا گھاس پر رکھنے کے بعد دست رفتاری سے سیدھا ہوا اور اس نے اپنے ہاتھ اوپر اٹھا دیے۔ واٹر می والے نے درشتی سے کہا۔ ”اب اپنا پرس اور کار کی چابیاں میرے حوالے کر دو اور مجھ دار کھلاؤ۔“

آئندہ نے اپنا پرس اور چابیاں جیب سے نکال کر اس کی طرف بڑھا دیں۔ ہنڈائی کا اس کے والد کی تھی۔ داڑھی والے نے دونوں چیزیں جھپٹ کر لے لیں اور تیزی سے پارکنگ لاٹ کی طرف چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ اس کی کار ڈرائیو کرتا ہوا وہاں لے آیا۔

پستہ قامت شخص نے آئندہ کو کار کی طرف دھکا دیا۔ آئندہ چند قدم آگے بڑھا تو اس نے کار کی ڈی کھول دی اور ریوٹر کی نال اس کی کمر میں چھپو کر درشتی سے کہا۔ ”اتنے بچوں کی طرح اس میں لیٹ جاؤ۔“ آئندہ ہچکچایا تو وہ بولا۔ ”چلو جلدی کرو، تم کیا جانتے نہیں ہو کہ ہم تمہارے ساتھ کیا کچھ کر سکتے ہیں؟“

آئندہ اسلحے کے بل پر ہونے والی وارداتوں کے بارے میں اچھی طرح سے جانتا تھا، اس لیے سہم کر رہ گیا۔ اس کا دل بے ترتیبی سے دھڑکنے لگا تھا اور پیشانی پر پسینے کی مٹی تھی۔ یونہی اند آئی تھی۔ وہ ریوٹر کے سامنے ان کے جسم و کمر پر تھا۔ وہ ڈوکی میں لیٹ گیا تو پستہ قامت نے ڈوکی کو بند کر دیا۔ آئندہ تاریکی میں ملفوف ہو گیا۔

کار پارکنگ لاٹ سے روانہ ہوئی تو آئندہ کا حلق خشک ہو چکا تھا۔ اس نے ایسی صورت حال کا بھی سامنا نہیں کیا تھا۔ ان لوگوں نے کار کا ریڈیو آن کر دیا تھا، اس لیے آئینک جیکسن کا ایک دل آویز نغمہ اس کی سماعت میں رس ہوا۔

جب ابتدائی ہیجان خیز لمحات گزر گئے تو آئندہ نے خود کو پرسکون رہنے کی تلقین شروع کر دی۔ اسے معلوم تھا کہ اگر وہ اضطراب میں مبتلا رہا تو کوئی کام ڈھنگ سے نہ کرے گا۔ جب اس پر دسے کا دورہ پڑتا تھا تو وہ ہلکے ہلکے سانس لے کر اپنے سینے کو معتدل کر لیا کرتا تھا۔ اس نے اس وقت بھی ایسا ہی کیا۔ وہ ڈر رہا تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ اس وقت بھی دورہ پڑ جائے۔

بچپن کے دنوں کے واقعات اس کے ذہن میں در آئے۔ جب وہ دس برس کا تھا تو اس کا بھائی اسے والد کی کار کی ڈی میں بند کر دیتا تھا۔ بعض اوقات شرارتا اور کبھی کبھی تربیت دینے کے لیے کہ اگر تم پر ایسا کوئی برا وقت پڑا تو تم کیا کرو گے اور اس صورت حال کا مقابلہ کیوں کر کرو گے؟

جب آئندہ دیا چنچا تو اس کے بڑے بھائی نے اسے بتایا کہ ڈوکی سے نکلنے کا طریقہ کیا ہے۔ اب اس بات کو تیرہ برس گزر چکے تھے، آئندہ نے فیصلہ کیا کہ وہ اس کی ہدایت پر عمل کرے گا۔ اس نے دماغ پر زور دیا تا شروع کر دیا۔ موسیقی اس کے ذہن پر برا اثر ڈال رہی تھی، لہذا اس نے اپنے کان بند کر لیے تاکہ منصوبہ بندی کرنے میں آسانی ہو۔

اس نے سوچا مجھے روشنی چاہیے تاکہ ڈوکی کا جائزہ لے کر کوئی قدم اٹھا سکوں۔ کار کی عقبی روشنی کے قریب اس کا سر تھا، اس لیے روشنی اندر نہیں آ پڑی تھی۔ اس نے بلب کو اندر لانے کے لیے دو اسکرپو ڈھیلے کرنا شروع کر دیے۔ جب یہ مرحلہ گزر گیا تو اس نے تاریں اندر کھینٹ لیں تو بلب بھی ڈی میں آ گیا اور وہ چھوٹی سی جگہ روشن ہوئی۔ وہاں ایک محدود روشنی پھیل چکی تھی۔

اب اسے تازہ ہوا کی ضرورت تھی۔ اس نے ڈوکی میں بچھے ہوئے قالین کا ایک گوشہ اٹھایا اور اس پائپ کو تلاش کیا۔ جس سے بارش کے دنوں میں گاڑی کا پانی باہر نکالا جاتا ہے۔ جب اس نے پائپ کو کھینٹ لیا تو خلا پیدا ہو گیا اور تازہ ہوا اندر آنے لگی۔ آئندہ نے چند گہرے سانس لیے تو اس کا سینہ معتدل ہو گیا۔ اس چھوٹی سی جگہ کا جس بھی بتدریج دور ہونے لگا۔

اب دوسرا مرحلہ یہ تھا کہ وہ اس ڈی کو کھول کر ہی باہر آ سکے۔ اس نے ایک بار پھر اپنے گرد و پیش کا جائزہ لیا تو قریب ہی وہ اوزار نظر آ گیا جس سے لاک کو کھولا جاسکتا تھا۔ تاہم اس نے کسی مصلحت کے تحت اسے وہاں رکھ دیا تھا اور فراموش کر بیٹھا تھا۔

اس نے اندازہ لگایا کہ کار کی رفتار بہت تیز ہے اسی لیے جب کہیں ڈرائیو کو بریک پر پاؤں رکھنا پڑتا ہے تو کار کو شدید جھکا لگتا ہے۔ آئندہ نے سوچا کہ کار کی ایک لائٹ غائب ہو چکی ہے، تو ممکن ہے پولیس والوں کی نگاہ اس پر پڑ جائے اور وہ اس کا گرد و خاک میں تو اس وقت وہ کار سے نکل جائے گا۔ اسے معلوم تھا کہ جب وہ ڈی کو کھولے گا تو ڈیش بلڈز پر ایک لائٹ جل جائے گی اور ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے

ہوئے شخص کو معلوم ہو جائے گا کہ کسی نے ڈی کو کھولا ہے۔ بہر حال اس کی خاص مویج کا انتظار تھا۔

آئندہ نے لاک کھولنے والے اوزار کو ہاتھ میں لیا اور پوری طرح سے تیار ہو گیا۔ مگر خوش قسمتی کی دیوی ابھی اس سے دور تھی۔ جب کار کے پیچے چرچرائے اور کار رک گئی تو اس کے دروازے فوراً۔۔۔ جل گئے۔ پھر ڈوکی کو کھولا گیا۔ پستہ قامت والے کی صورت نظر آئی۔ اس نے گونج دار آواز میں کہا۔ ”باہر آ جاؤ۔“

آئندہ باہر آ گیا اور حکم کے مطابق کار میں جا کر اگلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ وہ پستہ قامت اس کے بالکل ٹھیک پیچھے بیٹھ گیا۔ آئندہ نے سوچا اس وقت ان کے ساتھ اس کا رویہ دوستانہ ہونا چاہیے۔ اس لیے وہ قدرے مسکرایا اور گردن ہٹھا کر بولا۔ ”تمہارا شکریہ دوست! میں اس خشک و تاریک ڈی میں سکر اسٹا رہا تھا۔“ اس نے چند ثانیوں تک انتظار کیا کہ ان کی طرف سے کوئی جواب آئے، لیکن کار میں سناٹا طاری رہا۔ وہ پھر بولا۔ ”میں جانتا ہوں میرے لیے صورت حال کمبھیر ہے، یقین کرو اگر میرے پاس کچھ اور رقم ہوتی تو میں تمہیں دے دیتا۔“

ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے ہوئے داڑھی والے شخص نے کہا۔ ”خاموش بیٹھو! تمہاری زندگی کے دن پورے ہو چکے ہیں۔“

کار ایک جھٹکے سے چلی پڑی۔ اس وقت وہ شہر کی جن شاہراہوں سے گزر رہی تھی، وہ آئندہ کے لیے اجنبی تھیں۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ لوگ اسے کہاں لے آئے ہیں؟ بالآخر کار ایک جگہ ٹھہر گئی۔ وہاں سے سڑک دو حصوں میں منقسم ہو جاتی تھی۔ آئندہ کا دل زور سے دھڑکنے لگا۔ ریوٹر والے نے اسے اشارہ کیا کہ وہ اس گڑھے میں جا کر لیٹ جائے جو کار سے تھوڑے فاصلے پر تھا۔

آئندہ اس گڑھے میں جا کر اونڈھے منہ لیٹ گیا، ہر چہرہ کہ ایک خود رو پودا اس کے سینے سے گر کر کھا کر چھ رہا تھا، لیکن اس نے برداشت کیا۔ وہ کچھ کہہ کر ان لوگوں کے غصے کو ہوائ نہیں دینا چاہتا تھا۔ ”تھوڑی دیر یہاں پڑے رہو، اس کے بعد اٹھ کر چلنا شروع کر دو۔ ہم تمہاری کار کی چابیاں انجین میں لگی چھوڑ دیں گے۔ کوئی چالاکی دکھانے کی کوشش نہ کرنا۔ ورنہ موت سے مصافحہ کرنا پڑے گا۔“

آئندہ اس سے کچھ پوچھنا چاہتا تھا کہ ایک دھماکا ہوا، شعلہ چمکا اور اس کی نگاہ ٹھوکر گیا۔ پھر اس نے اپنی کھوپڑی

میں ناقابل برداشت تکلیف محسوس کی۔ پھر دوسرا دھماکا ہوا اور اس کے چہرے کے دائیں جانب تکلیف ہونے لگی۔ ممکن ہے اس پستہ قامت نے فائر کیا ہو۔ آئینہ بخاندانہ نہیں لگا سکا کہ صورت حال کیا ہے۔ وہ اوندھے منہ گھاس پر گر پڑا۔ اس کا جسم کرب ناک کیفیت سے دوچار تھا۔ پھر کوئی چیز اس کی ٹھوڑی سے ٹکرائی اور وہ ہوش و حواس سے بے گانہ ہو گیا۔ اس کا جسم بے حس و حرکت تھا۔

☆☆☆

پولیس کی تحقیق کے مطابق رہزنی کی یہ وارداتیں 27 سالہ لیون اور 28 سالہ پرائس کر رہے تھے۔ انہوں نے علاقے کے بہت سے اسٹور کو لوٹا تھا اور خاص طور پر ان کی نگاہ ان لڑکوں پر ہوتی تھی جو پیزا وغیرہ گھر تک سپلائی کرتے تھے۔

وارداتی والا لیون اب تک ہاتھ پاؤں بچا کر کام کر رہا تھا اور پولیس کے پاس اس کا کوئی ریکارڈ نہیں تھا۔ البتہ پستہ قامت پرائس بہت سی وارداتوں میں ملوث تھا اور اسے سیاہ کارناموں کی وجہ سے پولیس کو مطلوب تھا۔ جب کہ اس کی عمر محض سترہ برس تھی کاس نے وارداتیں کرنا شروع کر دی تھیں۔

ایک ماہ پیشتر جب ان دونوں کی جبین خالی ہو گئیں تو انہوں نے پیزا سپلائی کرنے والے لڑکوں کو غوا کر کے ان کی جبین خالی کرنا شروع کر دیں۔ سب سے پہلے انہوں نے انسبل نامی لڑکے پر ہاتھ ڈالا تھا، جو کار کی ڈھکی کو کھول کر فرار ہو گیا۔ انہوں نے اس پر فائر کیا تھا لیکن گولی اس کے بازو پر لگی، وہ مرنے سے بچ گیا۔

اس بار واردات ان کے لحاظ سے اچھی رہی اس لیے کہ ان کے پاس رقم سے بھرا ہوا ایک برس اور ایک کار ہاتھ آگئی تھی، جب کہ اس واردات کا کوئی عینی شاہد نہیں تھا۔

☆☆☆

جب آئندگی آنکھ کھلی تو اس نے محسوس کیا کہ اس کا جسم کانپ رہا ہے۔ جیسے اس کی توانائی کسی نے سلب کر لی تھی۔ اس سے سانس نہیں لیا جا رہا تھا۔ اس کی ساعت میں اب تک فائر کا دھماکا گونج رہا تھا۔ اس کے منہ سے خون بہہ رہا تھا۔ اس نے اپنی آنکھیں جھپکائیں تو منظر غیر واضح تھا۔ غالباً خون آنکھوں تک چلا گیا تھا۔ اس نے اندازہ لگایا کہ وہ بری طرح سے زخمی ہے اور اسے فوری طبی امداد کی ضرورت ہے۔ ورنہ وہ اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے گا۔ اگر خون زیادہ بہہ گیا تو اس کے زندہ رہنے کے امکانات کم ہی

تھے۔ اس نے اپنی ہمت کو مجتمع کیا اور اس گڑھے سے نکل آیا۔ اس کی کار کا نام و نشان تک نہیں تھا۔ وہ کسی نامعلوم سمت میں جا چکی تھی۔

اس نے سڑک پر چلنا شروع کیا تو معلوم ہوا کہ اس کے دونوں ہاتھوں سے خون چک رہا ہے۔ اس کی نقابہت میں وقت گزرنے کے ساتھ اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ اس کے قدم سڑک پر صحیح انداز سے نہیں پڑ رہے تھے، وہ لڑکھڑا رہا تھا۔ وہ سڑک سے ہٹ کر پختہ روش پر آ گیا۔ دو کاریں

سڑک سے گزریں تو آئندہ نے ہاتھ سے اشارہ کیا اور آواز دینا چاہی، لیکن ہاتھ اٹھانے میں اسے دیر ہوئی اس لیے کہ بازو زخمی تھا اور ہاتھ پوری طرح سے اٹھ نہیں رہا تھا۔ اس کے علاوہ اس کے منہ سے نکلنے والی آواز بھی غیر واضح اور ٹھنسی تھی۔ یقیناً وہ کار ڈرائیور کی ساعت تک نہیں پہنچی ہوگی۔

اس نے اپنے منہ کو چھوا تو اس پر انکشاف ہوا کہ اس کے دانتوں کو بھی نقصان پہنچا ہے، خون وہیں سے ٹپک رہا ہے۔ اس کے ہونٹ سو جے ہوئے تھے، اسی لیے آواز نہیں نکل رہی تھی۔ تیسری بار ایک کار سڑک پر سے گزری تو اس نے آواز دی، لیکن وہ صدا بے صحرانہ ثابت ہوئی۔ آئندہ نے کسی سے مدد لینے کا ارادہ ترک کر دیا اور بدستور چلتا رہا۔ وہ چل کر رہا تھا بلکہ ٹھٹھ رہا تھا۔

پھر ایک کار اس پختہ روش پر آگئی۔ اس کے ڈرائیور نے بریک لگائے، لیکن وہ آئندہ سے چند فٹ آگے نکل گئی۔ خوف و ہشت کی ایک لہر آئندہ کے رگ و پے میں دوڑ گئی، اس لیے کہ اس کار کی ایک میل لائٹ غائب تھی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ کار اسی کی تھی۔ بلاشبہ قاتل اس کی تلاش میں تھے۔ انہوں نے جان لیا تھا کہ وہ زندہ ہے اور پتہ کر رہا ہے۔ اس کے ہاتھ سے نکلنے کا مطلب یہ تھا کہ وہ پولیس کے نرغے میں آجائے۔

آئندہ نے اپنی رفتار تیز کر دی اور نکاسی کے ایک بائپ کے پیچھے چلا گیا۔ کار رک گئی اور وہ دونوں اتر پڑے۔ انہوں نے ٹھوڑی دیر ہی پہلے اس کی جان لینے کی کوشش کی تھی۔ وہ اپنے جوتوں سے دھمک پیدا کرتے ہوئے اس کے پیچھے چلے آ رہے تھے۔ آئندہ آگے بڑھا تو اسے خاردار تاروں کی ایک باڑھ نظر آئی۔ وہ باڑھ ایک مکان کے گرد کھڑی تھی۔ آئندہ نے اسے کی جگہوں سے چھو کر دیکھا تو ایک مقام پر وہ ٹوٹی ہوئی ملی۔ وہاں اتنی عجیب سی کڑی ایک آدمی کھڑے تھے۔ وہ آئندہ چلا گیا۔

وہ مکان کا لان تھا۔ آئندہ ایک قد آور پودے کے پیچھے جا چھا۔ اسے تو فتح تھی کہ تار کی کی وجہ سے اسے نہیں دیکھا جائے گا۔ البتہ وہاں کتے نہیں تھے۔ دوسری صورت میں ان کے تیز واردات اس کے پیٹ میں جا سکتے تھے۔

قدرت اسے سلامت رکھنا چاہتی تھی۔ وہ اسے تلاش کرتے رہے اور ان کے مکان میں جی نہیں آیا کہ وہ خاردار باڑھ کے پیچھے جا کر کسی پودے کے پیچھے چھپ گیا ہے۔ وہ بڑبڑاتے رہے اور مغلظات بکھتے رہے۔ پھر مڑے اور کار کی طرف چل پڑے۔ چند ثانیوں بعد کار اسٹارٹ ہوئی اور وہاں سے چلی گئی۔

آئندہ نے اٹھنا چاہا، لیکن اس بار اٹھنا اس کے لیے دشوار ثابت ہوا، اس لیے کہ اس کی توانائی مفقود ہو چکی تھی اور ہاتھ بھر جواب دے چکے تھے۔ وہ گہرے گہرے سانس لیتا رہا جب جان لوٹ آئی تو وہ کر رہتا ہوا اٹھا۔ وہ پختہ روش پر چلا گیا، لیکن اس نے سڑک سے خود کو دور ہی رکھا۔ اس لیے کہ اب وہ اچھی طرح سے آگاہ ہو گیا تھا کہ اس کے قاتل اسی علاقے میں گھوم رہے ہیں اور اس کی جان کے درپے ہیں، لہذا اسے کوئی ایسا قدم نہیں اٹھانا چاہیے کہ وہ ان کی دستوں میں چلا جائے۔ اب اس کی نگاہ خلاسی اسی صورت میں ہو چکی تھی کہ وہ مسلسل چلتا رہے اور اپنی جان بچانے کے لیے کوئی مکتبہ کار بھی تلاش کرتا رہے۔

☆☆☆

اس کے خاندان میں سب ہی تعلیم یافتہ اور برسر روزگار تھے۔ وہ انڈیا سے ہجرت کر کے امریکا آئے تھے۔ انہوں نے تعلیم کو اپنا مقصد بنا لیا تاکہ کوئی معاشرتی پریشانی نہ اٹھانا پڑے۔ آئندہ کے باپ نے انجینئرنگ میں ماسٹر کیا تھا اور اسی بنا پر وہ ایک کمپنی میں اعلیٰ عہدے پر فائز تھا۔ اسی کے دونوں بھائیوں نے میڈیکل میں داخلہ لیا تھا اور تو قیسمی کہ وہ جلد ہی ڈاکٹر بن جائیں گے۔ آئندہ کے لیے اس کے گھر والے آئیڈیل تھے اور وہ ان کی پیروی کر کے اپنا مستقبل شان دار بنا سکتا تھا۔

☆☆☆

وہ چلتا رہا۔ جب ٹھک جاتا تو کسی مکان یا دکان کی آڑ میں بیٹھ جاتا اور سستا نلے لگتا۔ اس طرح سے اس نے دو میل کا فاصلہ طے کر لیا۔ بالآخر وہ ایسی جگہ پہنچ گیا جس کے گرد و نژاد سے وہ واقف تھا۔ اسے لوپ 820 کہا جاتا تھا۔ اس نے ایک کھجے سے ٹیک لگائی اور دو عامانے لگا کر گسٹی پولیس کی

کوئی گاڑی وہاں آجائے۔ کافی دیر کے بعد پولیس کی ایک گاڑی وہاں آگئی۔ اس کی چھت پر لگی ٹھوٹی ہوئی روشنی اسے دلا سادے رہی تھی۔ آئندہ جانتا تھا کہ وہ موت کے منہ میں پہنچ کر واپس آ گیا ہے۔ جب افسر نے اتر کر اس سے ماجرہ دریافت کیا تو اس نے گھوٹا آواز میں کہا۔ ”دور ہتھوں نے میرے ساتھ یہ سب کچھ کیا ہے۔“ افسر نے اس کے شکے ڈھانچے کی طرف ہجرت سے دیکھا۔ ”اور میں ان دونوں کا حلیہ بیان کر سکتا ہوں۔“ اس نے اپنی کار ہنڈائی کا لائسنس نمبر لکھوایا اور پولیس کی گاڑی کی عقبی نشست پر بیٹھ گیا۔

☆☆☆

آئندہ پر حملے کے دو دن بعد پولیس کو اپنے ایک منجر سے اطلاع ملی کہ ایک مشتبہ شخص مارکیٹ میں گھومتا ہوا پایا گیا ہے۔ ان دونوں کو گرفتار کر لیا گیا۔ آئندہ نے انہیں فوٹو گراف سے شناخت کر لیا۔ پولیس نے ان سے پوچھ گچھ کی اور سابقہ وارداتوں کے بارے میں ان کے بیانات ریکارڈ کیے۔

پولیس نے آئندہ کو ہسپتال میں داخل کر لیا جہاں اس کے سر سے اعشاریہ 22 کی دو گولیاں نکالی گئیں۔ ڈاکٹر حیران تھے اتنا ہولناک حادثہ ہونے کے باوجود وہ زندہ کیسے رہا؟ گولیاں دماغ کے پردے سے آدھے آدھے سی ایم کے فاصلے پر رہ گئیں تیسری گولی اس کی ٹھوڑی میں لگی تھی جسے بعد میں نکلنے کا پروگرام تھا۔ اس کی ساعت اور پینائی کا بھی علاج کیا گیا۔ ان دونوں چیزوں پر بھی بھیا کم اثر پڑا تھا۔

ڈاکٹروں نے اسے بتایا تھا کہ اس کے آپریشن کئی مراحل میں ہوں گے۔ سب سے آخر میں جڑے کو ٹھیک کیا جائے گا۔ اس کے اہل خانہ کئی بار اسے دیکھنے کے لیے ہسپتال آ چکے تھے۔ اس کے والد نے کہا کہ ہم ہجرت کر کے امریکا تو آ گئے ہیں، لیکن لا قانونیت نے یہاں بھی ہمارا پیچھا نہیں چھوڑا۔ دراصل ہم ایک جرم قبول معاشرے میں رہتے ہیں۔ کسی کو لا قانونیت کرتے دیکھتے ہیں تو منہ موڑ لیتے ہیں کہ ہم سے کیا؟ حقیقت یہ ہے کہ یہ حقائق سے گریز ہے۔ اگر ہم جرم رو کر دیں تب ہی اس کا خاتمہ ہو سکتا ہے۔ ہم جرائم کی طرف سے آنکھیں پھیر لینے کے عادی ہیں۔“

آئندہ نے دھیرے سے کہا۔ ”مگر میں قانون پڑھ کر جرم کے خلاف جہاد کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔“

”قادرِ مطلق تمہیں اپنے ارادوں میں کامیابی عطا کرے۔“



سراب

راوی: شہباز ملک
تحریر: کاشف زبیر

75: تا



وہ پیداہی مہم جو تھا۔ بلند وبالا پہاڑ، سنگلاخ چٹانیں، برف پوش چوٹیاں اور نگاہ کی حدوں سے آگے کی بلندیاں اسے پیاری تھیں۔ اسے ان میں ایک کشش اور ایک لکسکاری سی ابھرتی محسوس ہوتی کہ آؤ ہمیں دیکھو، مسخر کرو اور ہمارے سحرے میں مسحور ہو کر اپنا آپ مٹا ڈالو۔ اسے یہ سب حقیقت لگتا مگر کیا واقعی یہ حقیقت تھا یا محض سراب..... ایسا سراب جو آنکھوں کے راستے ذہن و دل کو بھٹکاتا ہے، جذبوں کو مہمیز دیتا ہے مگر اسودگی اور اطمینان چھین لیتا ہے۔ سیرابی لمحوں کے فاصلے پر دکھائی دیتی ہے مگر وہ لمحہ حقیقت میں کبھی نہیں آتا۔ اس کی زندگی بھی سراپوں کے ایسے دائروں میں گزرتی رہی۔ وقت کے گرداب میں ڈوبتے ہوئے نوجوان کی سنسنی خیز اور ولولہ انگیز داستان حیات۔

پلٹر حوصلوں اور بے مثال ولولوں سے گندمی ایک تہلکہ خیز کہانی



تلاش کروا رہا تھا۔ میں نے کہا۔ ”بڑے کنور کا کیا حال ہے؟ کیا وہ زندہ ہے؟“

اپنے بھائی کے بارے میں سن کر اس کا رنگ بدلا تھا۔ ”ہاں وہ زندہ ہیں مگر ان کا مرض بڑھ رہا ہے۔“

”ظاہر ہے اب تم لوگوں کے پاس نہ سندھو ہے جو کسی کے خون سے اس مرض کی دوا کی تیار کر کے دے اور نہ کوئی ایسا فرد جس کا خون مخصوص قسم کا ہو۔“

”سندھو کی جگہ دوسرا آدمی تلاش کر لیا ہے وہ اس سے بھی زیادہ ماہر ہے مگر کوئی ایسا بندہ اب تک نہیں ملا ہے جس کا خون کام آ سکے۔“

”تم لوگوں کے پاس مجبور انسانوں کی کیا کی ہے تم سیکڑوں لوگوں کو بھی ساپ سے ڈسوا کر ایسا آدمی تلاش کر سکتے ہو جو زہر سے بچ جائے اور اس کے خون میں وہی چیز آجائے۔“

”اب ایسا بھی نہیں ہے۔“ میرے طنز کے جواب میں اس نے بلی زبان میں کہا۔ ”ہم نے کچھ لوگوں پر تجربہ کیا مگر وہ بچ نہ سکے۔ اصل میں سندھو ایسے لوگوں کو مخصوص جڑی بوٹیوں سے کر بچاتا تھا، ان جڑی بوٹیوں کا کسی کو پتا نہیں ہے۔“

”ابھی تم کہہ رہے تھے کہ نیا آدمی سندھو سے زیادہ ماہر ہے۔“

”اس کا طریقہ علاج دوسرا ہے لیکن جب اس بارے میں پتا چلا تو اس نے دعوٰی کیا کہ وہ تمہارے خون سے کہیں زیادہ موثر دوا بنا سکتا ہے جو بڑے کنور کو چند منٹوں میں بالکل ٹھیک کر سکتی ہے اور خون بھی زیادہ نہیں درکار ہوگا۔ ہر ہفتے صرف آدھا لیٹر خون چاہیے ہوگا۔“

میرا خدشہ درست نکلا تھا وہ اسی مقصد کے لیے یہاں آیا تھا۔۔۔ میں ممتاز کا قیدی تھا اگر وہ مجھے بے دست و پا کر کے اس کے حوالے کر دیتا تو میں کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ ”یہ خون تمہیں میرے جسم سے چاہیے؟“

”ہاں مگر اس کے بدلے تمہیں بھی فائدہ ہوگا۔ تمہارے خلاف انڈیا میں جتنے کیس ہیں ان سب سے تمہارا نام نکال دیا جائے گا اور دوسرے تم جو رقم مانگو گے وہ تمہیں دی جائے گی۔“

ایسے ہی وعدے مرشد نے بھی کی تھے مگر اب مجھے یہ یقین ان پر عمل درآمد کی نوبت اس وقت آئی جب وہ میرے سامنے بالکل مجبور ہو گیا تھا۔ جب کہ کنوروں کو ایسی کوئی

مجبوری نہیں تھی اور وہ مرشد سے کہیں زیادہ گھٹیا قسم کے سیاست دان تھے۔ گزشتہ رات جب۔۔۔ ممتاز نے اچانک ہی مجھے محضر زمہمان سے معزز قیدی کا درجہ دیا تھا تو میں دنگ رہ گیا تھا اور فوری طور پر میرے ذہن میں اس مشکل سے نکلنے کا کوئی طریقہ نہیں آیا۔ جب کہ۔۔۔ ممتاز نے پہلی منصوبہ بندی سے مجھے بھڑکایا تھا۔ اس نے اپنی بیٹی کو بھی دھوکا دیا تھا۔ میں یوں بھی کٹیوز تھا کہ مجھے اس دکن کا کل نہیں تھا جس نے۔۔۔ ممتاز سے رابطہ کیا تھا۔ اب وہ دکن سامنے تھا اور مقصد بھی واضح تھا۔ وہ مجھے یہاں سے لے جانے آیا تھا جب کہ میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ میں کی صورت اس کے ساتھ نہیں جاؤں گا۔ میں نے سوچتے ہوئے کہا۔ ”راج کنور اگر میں تمہارے ساتھ جانے سے انکار کروں تو۔۔۔“

”تو اس صورت میں جلد بھارتی حکومت کی طرف سے تمہاری حوالگی کا مطالبہ کیا جائے گا۔ اگر تمہیں حوالے نہیں کیا گیا تو یہ معاملہ عالمی اداروں میں جانے گا۔ تمہیں کسی مستند دہشت گرد تنظیم کا رکن قرار دیا جائے گا تم سوچ سکتے ہو اس کے بعد کیا ہوگا۔“ راج کنور کا لہجہ مجھے ڈرانے والا تھا۔

”میرے خلاف بھارتی حکومت کے پاس کوئی ثبوت نہیں ہے۔“

”ثبوت ہیں۔“ اس نے زور دے کر کہا۔ ”فوج کے وردہ (خلاف) ویوہار (استعمال) ہونے والے اور ہمارے سینا کے سپاہیوں کو مرتیو (موت) کے گھاٹ اتارنے والے کئی ہتھیاروں پر تمہاری اگلیوں کے نشانات ہیں۔ اسی طرح کم سے کم سو افراد موجود ہیں جنہوں نے تمہیں انڈیا میں اپرا دھیک (خیر مانہ) گزار دیا ہے۔“

دیکھا ہے۔ دوسرے پرمان (ثبوت) بھی ہیں۔“ مجھے لگا اس بار راج کنور ٹھیک کہہ رہا تھا۔ میں نے بھارت کی سر زمین پر بے شمار ہتھیار استعمال کیے تھے اور ان پر سے میری اگلیوں کے نشانات لینا ممکن تھا۔ میں اس سے انکار نہیں کر سکتا تھا مگر موازنے کے لیے ان کے پاس میری اگلیوں کے نشانات کہاں سے آئے۔ میں نے کبھی سوال راج کنور سے کیا تو اس نے کہا۔ ”یہ کوئی مشکل کام نہیں ہے یہاں میری موجودگی سے تمہیں اندازہ ہو گیا کہ ہماری رسائی کہاں تک ہے۔“

راج کنور اپنی گفتگو میں ہندی کے وہ الفاظ استعمال

کر رہا تھا جو ناجائز طور پر اس میں شامل کیے گئے تھے اور اسے شددہ بندی کہا جاتا ہے۔ ان میں سے اکثر الفاظ برے سے گزر رہے تھے اور مجھے اندازے سے بھٹکا پڑ رہا تھا کہ کیا فرما رہا ہے۔ میں اس کی گفتگو کو آسان بنا کر پس کر رہا ہوں۔ میں تشویش زدہ ہو رہا تھا مگر اپنے انداز سے میں نے ظاہر نہیں کیا۔ اس کے بجائے میں نے پلے دھانی سے کہا۔ ”ٹھیک ہے تم یہاں بہت اثر و رسوخ رکھتے ہو لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ تم مجھے اتنی آسانی سے لے جا سکو گے۔“

”آسانی سے نہیں تو مشکل سے لے جاؤں گا۔“ راج کنور نے غرا کر کہا۔ وہ اپنے اصل روپ میں آ رہا تھا۔ ممتاز صاحب نے مجھے وجہ دیا ہے کہ وہ میری سہجیا (مدد) کریں گے۔“

”تب تم ان ہی سے بات کرو۔“ میں نے سرد لہجے میں کہا۔ ”میرا دماغ کیوں کھار ہے ہو؟“ ”تم سو شرم (خود) چلو گے تو تمہیں بھی لالچہ (فائدہ) ہوگا۔ انا تھا (ورنہ) تمہیں ہندی (قیدی) بنا کر لے گیا تو تم کو کچھ نہیں ملے گا۔“ اس نے دھمکی دی۔

میں خاموش رہا تھا۔ میں نے اس سے کہا نہیں کہ میں راضی خوشی بھی گیا تو مجھے کچھ نہیں ملے گا۔ سوائے اذیت ہلک موت کے۔ اسی لئے۔۔۔ ممتاز وہاں آ گیا۔ حسب معمول وہ دروازہ اور سو روگ رہا تھا۔ اس نے گاؤں پہنچ رہا تھا۔ وہ اپنی نشست پر آیا اور اس نے راج کنور کی طرف دیکھا۔ ”میرا خیال ہے تمہاری بات ہوگئی ہے۔“

”کہاں جناب۔“ اس نے شکایت کرنے والے انداز میں کہا۔ ”یہ کچھ ماننے کے لیے تیار نہیں ہے۔“ ”بھڑکیا بھیڑ سے کہے کہ دیوار سے نیچے آ جاؤ میں تم کو کچھ نہیں کہوں گا تو کیا بھیڑ اس کی بات مان لے گی؟“ میں نے سادہ سے لہجے میں پوچھا۔

”میں ضمانت دیتا ہوں کہ تمہیں کچھ نہیں ہوگا۔“ راج کنور بولا۔ ”بس چند منٹوں کی بات ہے۔“

”اس پر مجھے ایک لطیفہ یاد آ رہا ہے، عدالت میں ایک قانون نے وکیل کے سوال پر اپنی عمر اٹھائیں سال اور چتر میسے تائی، جب وکیل نے چند منٹوں کی وضاحت کرنے کو کہا تو یہ میسے ڈیرے ہو نکلے تھے۔ تو راج کنور صاحب مجھے یقین ہے آپ کے چند منٹ بھی اس سے کم نہیں ہوں گے۔“ قسمت از زرب پرب مسکرایا تھا مگر اس نے سنجیدگی سے

کہا۔ ”جب اس مسئلے کا کیا حل نکل سکتا ہے؟“ ”میں اس کے ساتھ نہیں جاؤں گا اور اگر مجھے زبردستی اس کے ساتھ روانہ کیا گیا تو بڑے صاحب کچھ سکتے ہیں آئندہ میرا اور میرے ساتھیوں کا رد عمل کیا ہوگا۔“ ”میں تمہارا ہمدرد ہوں۔“ اس نے ناگواری سے کہا۔ ”مگر کنور کھلی سے میرے دیرینہ مراسم ہیں۔“ ”جب آپ مجھے ان کے حوالے کر دیں۔“

ممت از نے تائی سے سگار کیس اٹھایا۔ سگار نکال کر سلگایا اور ایک گھبراہٹ لے کر دھواں چھوڑا اور ٹٹی میں سر ہلایا۔ ”یہ ممکن نہیں ہے۔“ میں کی حد تک سمجھ رہا تھا کہ یہ کیوں ممکن نہیں ہے۔ یقیناً ممتی باپ کے آڑے آئی تھی۔ میری معلومات کے مطابق۔۔۔ ممتاز سین کی دہائی بیٹیاں تھیں۔ نورالسا عرف ممتی اور مہرالسا عرف ممتی۔ کوئی بیٹی نہیں تھا مگر جہاں تک اس کا نام روشن کرنے کا تعلق تھا تو یہ دو بیٹیاں دس بیٹیوں پر بھاری تھیں۔ ان کے کثرت میں خود ملاحظہ کر چکا تھا۔ وہ ان کے آگے مجبور تھا۔ راج کنور یہ سن کر اچھل پڑا تھا اس نے کسی قدر برہمی سے کہا۔ ”ممتاز صاحب آپ کیا سمجھتے ہیں کہ میں اتنا خطرہ مول لے کر اس لیے یہاں آیا ہوں کہ ایسے ہی واپس چلا جاؤں۔“

”دیکھو ہر مسئلے کا کوئی نہ کوئی حل ہوتا ہے اگر دونوں طرف افہام کو تقسیم کا جذبہ ہو۔“

”جو ہمارے سیاست دانوں میں بہت پایا جاتا ہے۔“ میں نے لقمہ دیا۔۔۔ مگر ممتاز نے برا نہیں منایا اس کے بجائے اس نے سر ہلایا۔

”تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ یہ فطری اصول ہے جو طبقہ جتنا متحد ہوگا وہ دوسرے طبقوں پر اتنا ہی حاوی ہوگا۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا کہ وہ اقلیت میں ہے اور اکثریت پر حکمران ہے۔ دنیا میں دیکھو تو یہودی اس کی بہترین مثال ہیں۔“

”اور ہماری حکمران کلاس۔“ میں نے کسی قدر تعجب سے کہا۔ ”انہوں نے اپنے مفاد کے لیے ایک کیا ہوا ہے اور عوام کو تسلیم کر رکھا ہے۔“

راج کنور بولا۔ ”صرف پاکستان نہیں ایسا ہر جگہ ہوتا ہے۔ انڈیا میں بھی سیاست دان متحد ہیں لیکن جناب میں یہاں سیاست پر بحث کرنے نہیں آیا ہوں آپ مجھے بتائیں کہ اس شخص کو میرے حوالے کر رہے ہیں یا نہیں، اگر آپ کا

جواب انکار میں ہوتا ہے تو سوچ لیجیے گا بعد میں ہمارے پاس بھی انکار کا موقع آئے گا۔“

یقیناً.... ممتاز اور کنوروں کے درمیان کوئی مالی مفاد کا چکر تھا اور راج کنور اسے اسی حوالے سے دھمکی دے رہا تھا۔۔۔۔۔ مگر ممتاز نے بے ظاہر کوئی اثر نہیں لیا۔ اس کے بجائے اس نے ایک گہرا کس اور لیا اور نرم لہجے میں بولا۔ ”میرے پاس ایک تجویز ہے اگر تم دونوں مان لو؟“

”ممتاز صاحب میں اس شخص سے کسی قسم کا تعاون نہیں کروں گا۔“ میں نے واضح الفاظ میں کہا۔ ”اس سے بہتر ہے میں شیطان سے تعاون کروں، آپ جانتے ہیں یہ شخص ہزاروں معصوم افراد کا قاتل ہے جن میں زیادہ تر عورتیں اور بچے تھے۔“

”اگر تمہارا اشارہ قاتلوں کے قتل عام کی طرف ہے اس کی ذمہ داری جتنی کنور خاندان اور بھارتی حکومت پر عائد ہوتی ہے اتنی ہی ان قبائلی زعماء پر ہوتی ہے جنہوں نے میرے کی کان اپنے قبضے میں رکھنے کے لیے اپنے لوگوں کو مراد دیا۔۔۔۔۔“ ممتاز نے سرد لہجے میں کہا۔ ”انہیں پیش کی گئی تھی کہ وہ یہ جگہ چھوڑ دیں تو انہیں نہ صرف متبادل جگہ فراہم کی جائے گی بلکہ اس کا معاوضہ بھی دیا جائے گا۔“

”متبادل زمین۔“ میں نے طعنے انداز میں کہا۔ ”بڑے صاحب میں اس لفظ کے معنی بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔ ہزاروں سال سے طاقتور حکومتیں محکموں کو اس طرح کے لارے دیتی رہی ہیں۔ امریکا کی تو پوری تاریخ ہی اس لفظ کے گرد گھومتی ہے جب مقامی باشندوں کو ان کی زمینوں سے بے دخل کر کے متبادل زمین کے دھوکے دیے گئے اور انڈیا میں متبادل زمین ہے کہاں؟“

مستاز کے چہرے پر ہیزاری دکھائی دینے لگی۔ اس کا خیال تھا کہ میں فوراً اس کی تجویز مان لوں گا مگر میرا رد عمل اس کی توقع کے خلاف تھا۔ راج کنور خاموش تھا ایسا لگ رہا تھا کہ مذکورہ تجویز پہلے سے اس کے علم میں تھی کیونکہ اس نے اس بابے میں ذرا بھی اشتیاق کا مظاہرہ نہیں کیا تھا۔ امکان یہی تھا کہ دونوں مل کر مجھے بے وقوف بنانے کی کوشش کر رہے تھے۔ میں خاموش ہوا تو مستاز نے جھنجھلا کر کہا۔ ”شہباز تم ایک بامیری تجویز سن تو لو۔“

”مجھے معلوم ہے آپ کیا تجویز پیش کریں گے۔“

میری اس بات پر وہ چونکا۔ ”ہمیں کیسے معلوم؟“

”جناب عالی اللہ نے مجھے عین دی ہے۔ آپ یہی

تجویز کرتے تاکہ میں یہیں رہوں۔ آپ مجھے راج کنور حوالے نہیں کریں گے لیکن اسے ضرورت کے مطابق خون مہیا کیا جاتا رہے گا۔“

اس بار.... ممتاز کے ساتھ راج کنور بھی تھا۔ انہوں نے بے ساختہ ایک دوسرے کو جس طرح دیکھا اس سے ان کی کٹی شکست واضح ہو گئی۔۔۔۔۔ ممتاز نے بادل ناخواستہ مہیا بلایا۔ ”یہ درست ہے۔“

”میں راضی خوشی اپنے جسم سے صرف اضافی پانی دے سکتا ہوں۔“ میں نے کہا تو راج کنور اچھل پڑا تھا۔ ”بس جناب، میں اس سے زیادہ بے برداشت نہیں کر سکتا۔“

”بے عزتی۔“ میں نے طنز کیا۔ ”جو لوگ اپنی مٹی کی کو دشمنوں کے رحم و کرم پر چھوڑ کر فرار ہو جائیں وہ بے عزتی کا مطلب سمجھتے ہیں۔“

راج کنور کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ اس نے غرا کر کہا۔ ”کیا اس مت کرو، آشتیابیوں کے سلسلے میں مہلاک گئی تھی۔ انہوں نے اس کی لاش بھی جلادی تھی۔“

”چلو یہ مسئلہ بھی حل ہوا اور تمہاری عزت بھی گئی۔“ میں نے ہنس کر کہا۔ ”لاش جتنی تم نے شناخت کی ہوگی۔“

مستاز نے سگار تنے سرے سے سلا کر فضا دھواں آلود کرتے ہوئے کہا۔ ”تم دونوں بیکار کی بحث میں الجھ گئے ہو۔ ماضی میں جو ہوا اسے بھول جاؤ، حال کے سنے پر بات کرو۔“

”ممتاز صاحب میں اسے لے کر جاؤں گا۔“ راج کنور نے میری طرف اشارہ کیا۔

”میں کسی صورت اپنی مرضی سے تمہارے ساتھ نہیں جاؤں گا اور یہ بات بڑے صاحب بھی سمجھتے ہیں کہ میرے ساتھ زبردستی کرنے کے کیا نتائج نکل سکتے ہیں۔“

”اسی لیے میں نے متبادل تجویز دی ہے۔“

”لیکن جناب، شہباز انکار کر رہا ہے۔“ راج کنور نے کہا۔

”شہباز تم اپنے رویے سے میرے اور اپنے لیے مشکلات پیدا کر رہے ہو۔“ اس بار میاں ممتاز نے بدلے ہوئے لہجے میں کہا۔

”بڑے صاحب، مشکلات نہ آپ کے لیے نئی ہیں اور نہ میرے لیے نئی ہیں۔“ میں نے بے پروائی سے کہا۔ ”اس لیے آپ یہ مت سوچیں کہ میں مشکلات کی وجہ

سے آپ کی تجویز سے متفق ہو جاؤں گا۔“

”اس میں حرج ہی کیا ہے۔۔۔۔۔“ ممتاز نے پھر لمحے میں شہد گھول کر کہا۔ وہ بلاشبہ ماہر سیاست دان تھا ورنہ اس کی جگہ اس حیثیت کا کوئی اور شخص ہوتا تو اب تک مشغول ہو کر اپنے اصل روپ میں اچکا ہوتا۔ ”راج کنور کا کہنا ہے کہ اسے صفحے میں نصف لیٹر خون درکار ہے جب کہ اس سے پہلے تم کئی بار ایک لیٹر تک خون دے چکے ہو۔ یہاں بہترین ڈاکٹر تمہاری دیکھ بھال کریں گے۔ تمہیں بہترین غذا میں اور سبزی منٹ دینے جائیں گے، اگر کوئی کمی ہوئی تو وہ متبادل طریقے سے پوری کر دی جائے گی۔“

”میں جانتا ہوں ممتاز صاحب کہ نصف لیٹر خون دینے سے میری صحت پر خاص فرق نہیں پڑے گا۔ اگر کسی کی جان بچانے کا سوال ہوتا تو میں اپنی پروا بھی نہ کرتا لیکن ان بھائیوں کے لیے میرے پاس کیا ہے وہ میں بتا چکا ہوں۔“ میں نے دو ٹوک لہجے میں کہا۔

اس گفتگو کے ابتدائی حصے میں میں سمجھ چکا تھا کہ۔۔۔۔۔ ممتاز اور راج کنور اصل میں ایک پارٹی ہیں مگر۔۔۔۔۔ ممتاز بہ ظاہر اقوام متحدہ کا کردار ادا کر رہا تھا یعنی وہ کردار جو اقوام متحدہ ثالثی کے نام پر بڑی طاقتوں کے لیے ادا کرتی ہے۔ وہ سب پہلے سے طے کر کے آئے تھے اور اس میں یقیناً یہ بھی شامل تھا کہ میں تعاون سے بالکل انکار کر دوں تو وہ پھر کیا کریں گے۔۔۔۔۔ ممتاز نہ بھی لیکن راج کنور مجھے اچھی طرح جانتا تھا۔ اسے معلوم تھا میں کسی صورت نہیں مانوں گا۔ بات اس طرف جاری تھی جب متبادل طریقہ سامنے آتا۔ دوسرے لفظوں میں مٹی تھیلے سے باہر آجاتی۔۔۔۔۔ ممتاز نے گہری سانس لی۔ ”شہباز مجھے افسوس ہے کہ تم نے میری تجویز مسترد کر دی۔“

”اس لیے آپ اب مجھے راج کنور کے حوالے کر دیں گے؟“

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ”اگر تم راضی خوشی چلے جاتے تو ٹھیک تھا لیکن اس صورت میں جب کہ تم کنور خاندان کو اپنا دشمن قرار دے رہے ہو تمہیں ان کے حوالے کرنا مناسب نہیں ہوگا۔“

”یعنی مجھے یہیں رکھ کر میرا خون نچوڑا جائے گا۔“

”مجبوری ہے۔۔۔۔۔“ ممتاز نے پُر فکر انداز میں کہا۔ ”تم نے کوئی اور راستہ چھوڑا نہیں ہے۔“

”ممتاز صاحب تب بہتر ہے یہ کام آپ پوری

احتیاط سے کریں۔ میں اس سلسلے میں آپ سے کی ضرورت تعاون نہیں کروں گا۔ بلکہ ہر ممکن مزاحمت کروں گا۔“

”مجھے بھی اسی بات کا خدشہ تھا۔۔۔۔۔“ ممتاز نے سر ہلایا۔ اس نے اپنا موبائل نکال کر نمبر ملایا اور پھر کسی نے کہا۔ ”کیار پورٹ ہے؟“ دوسری طرف سے سن کر اس نے موبائل میری طرف بڑھا دیا۔ ”لو بات کرو۔“

میں نے موبائل کان سے لگایا تو دوسری طرف سے بیوی کی آواز آئی۔ ”شوٹی۔۔۔۔۔ شوٹی آپ کہاں ہے؟“

”بیو۔۔۔۔۔“ میرا دل دھڑکا تھا۔ ”تم کہاں ہو؟“

”یہ لوگ ہم کو کل سے کہیں باہر لایا ہے۔ آکھ پرانا باندھ کر۔۔۔۔۔ ادھر ہم کو قید کیا ہے۔۔۔۔۔ آپ ٹھیک ہونا۔“

”بیو میں ممتاز ہاؤس میں ہی ہوں۔“ میں نے فوراً قابو پاتے ہوئے کہا۔ اسی اثنا میں کسی نے بیو سے موبائل لے کر کال کاٹ دی۔ میں بے یل و پلو کھڑا رہ گیا۔ میں نے غصے میں۔۔۔۔۔ ممتاز کا موبائل۔۔۔۔۔ دیوار پر دے مارا اور اس کے پڑے پھرنے لگے تھے۔۔۔۔۔ مگر ممتاز پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوا اس کے بجائے اس نے سگار کا ایک گہرا کش لیا اور بولا۔ ”شہباز ملک اب تم سمجھ گئے ہو گے۔“

”جی سمجھ گیا ہوں۔“ میں نے دانت پروانت جاکر کہا۔ ”مجھے امید ہے ابھی آپ نہیں سمجھیں ہیں لیکن جلد سمجھ جائیں گے۔“

ظاہر ہے اس دھمکی کا اس پر کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔ راج کنور کل اٹھا تھا اس کا مقصد پورا ہو گیا تھا۔ وہ کھڑا گیا۔ ”اچھا جناب بہت شکریہ۔۔۔۔۔ میں پھر چکر لگاؤں گا۔“

”لیکن سرحد کے راستے۔۔۔۔۔“ ممتاز نے کہا۔ ”آپ کا اس طرح آنا جانا ٹھیک نہیں ہے۔“

راج کنور نے یہاں نہ تو کچھ کہا یا پھر اتنا کہ وہ اس نے۔۔۔۔۔ ممتاز سے ہاتھ ملانے کی کوشش کی۔ وہ چہرے چھات کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ مجھے حیرت ہوئی کہ اس کے اس رویے کے باوجود یہ قول۔۔۔۔۔ ممتاز اس کے کنور خاندان سے مراسم تھے۔ میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ ورنہ میں رہا تھا کہ کہیں۔۔۔۔۔ ممتاز مجھے راج کنور کے حوالے نہ کر دے۔ اگر وہ ایسا کرنے پر تیار جاتا تو میں اس کے سامنے ہلے بس تھا۔ اگرچہ یہاں بھی حالات اچھے نظر نہیں آ رہے تھے لیکن ایک تو میں اپنے ملک میں تھا دوسرے یہاں میں آزاد کی کوشش کر سکتا تھا۔ راج کنور کے جانے کے بعد۔۔۔۔۔ ممتاز نے کہا۔ ”مجھے افسوس ہے شہباز، مگر میں بعض وجوہات کی

بجائے کنور کو صاف انکار نہیں کر سکتا تھا۔“

”آپ افسوس نہ کریں ممکن ہے اس کا موقع کبھی بعد میں آئے۔“

اس نے ناگواری سے مجھے دیکھا۔ ”تم خود کو کچھ سمجھتے ہو گے۔ میں نے تو یہ بھی سوچا تھا کہ انہیں کسی اور کا خون دے دوں گا۔ مگر ان کے پاس تمہارے خون کا نمونہ موجود ہے اس لیے وہ دھوکا نہیں کھائیں گے۔“

”آپ نے بہت دور تک کا سوچا ہوا تھا،“ میں نے مراد کی سے طنز کیا۔ ”دھوکا بھی آپ انہیں ہی دیتے ہیں جو راضی خوش دھوکا کھالیں۔ جیسے اس بد نصیب ملک کی عوام جس کے آپ جیسے لیڈرز ہیں۔“

اس بار اس کا حوصلہ جواب دے گیا اور اس نے اپنے کارڈ کو طلب کر لیا۔ وہی دونوں اندازے۔۔۔۔۔ ممتاز نے ان سے کہا۔ ”اسے لے جاؤ اور پوری طرح چوکس رہنا۔“ ان کو ہدایت دے کر اس نے میری طرف دیکھا۔ ”شہباز تمہاری کسی غلط حرکت یا عدم تعاون کا خیاں نہ ہو۔“

”میرا خیال ہے تم سمجھ گئے ہو؟“

وہ مجھے بیوی کی دھمکی دے رہا تھا اس کا مطلب تھا کہ وہ بیوی کی اہمیت سمجھتا تھا۔ بیو پر تشدد کیا جاسکتا تھا۔ اسے قتل کیا جاسکتا تھا یا اسے کنور خاندان کے حوالے کر دیا جاتا۔ وہ کنوروں کے دشمن تھیں اس لیے میں

شرائط سے واپس اس کمرے میں پہنچ گیا جو میرا زندان تھا۔ اچھا کھانا پہلے میرے وہم و گمان میں نہیں تھا کہ مجھے راج کنور سے سامنا کرنا پڑے گا۔ میرے خیال میں وہ میرے راضی کا ایک حصہ بن چکا تھا لیکن اس نے اچانک سامنے آ کر بتادیا تھا کہ کسی بھی وقت خود کو دہراتا ہے۔ اس وقت سورج کی تہ بند ہوا تھا۔ کمرے میں آکر۔۔۔۔۔ دیکھا تو سات بج رہے تھے اور وہاں ناشائستہ انتظار تھا۔ یہ قوت بخش جسم کا ناشائستہ۔ اس میں ایک گلاس دودھ، ایک گلاس اورج جوس

اور دو بکس انڈے، شہد، پنیر اور براؤن بریڈ تھے۔ چائے یا کافی جیسی معطر صحت چیزوں کا دور تک کوئی نام و نشان نہیں تھا۔ مجھے یاد ہے جب کنوروں کے محل میں میرا خون لیا جا رہا تھا تب بھی مجھے چائے یا کافی نہیں دی جاتی تھی کہ اس سے کچھ مسئلہ ہوتا تھا۔ اب بھی میرے ساتھ

میرا دل تھا۔ میرا دل نہیں چاہ رہا تھا کہ ناشائستہ کروں لیکن

میرا دل تھا۔ میرا دل نہیں چاہ رہا تھا کہ ناشائستہ کر دیتا تب

میرا دل تھا۔ میرا دل نہیں چاہ رہا تھا کہ ناشائستہ کر دیتا تب

مندر اور جدوجہد کے قابل رکھنا تھا تو کھانا پینا لازمی تھا۔ میں نے پہلے تو خود کو معمول پر لانے کے لیے سانس کی چند مشقیں کیں۔ پھر کمرے میں ہی ہلکی ہلکی ایکس سائز کی۔ واٹس روم میں نہانے کی سہولت تھی لیکن فی الحال میں نے صرف منہ ہاتھ دھونے پر اکتفا کیا۔ ناشائستے سے فارغ ہو کر میں لیٹ گیا۔

اب تک میں نے اس بات پر غور نہیں کیا تھا کہ میرے ساتھیوں پر میری اور بیوی کی کم شدگی کا کیا اثر ہوگا اور وہ مجھے تلاش کرنے کی کوشش کس طرح کر سکتے ہیں۔ یہ سوچ آتے ہی میں اٹھ بیٹھا۔ میرے ساتھی سب سے پہلے اس شاہد کو تلاش کریں گے۔ اگرچہ شاہد کو سفیر نے ہار لیا تھا اور پھر ہم نے اسے گولی نہیں بلایا تھا بلکہ خود فیض آباد کے ایک کینے کے سامنے پہنچے تھے جہاں وہ ہمارا منتظر تھا۔ عبداللہ ہمیں چھوڑنے آیا تھا لیکن وہ بھی نہیں دورا تار کر چلا گیا تھا۔ اس لیے اب شاہد کے بارے میں کوئی نہیں جانتا تھا سوائے سفیر کے، لیکن یہ کوئی مشکل کام نہیں عبداللہ سفیر سے رابطہ کر کے شاہد کے بارے میں پوچھ سکتا تھا اور ایک بار اس کا نمبر مل جاتا تو اسے تلاش کرنا کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ شاہد نے بنی کو دیکھا تھا اور شاید میں نے اس کے سامنے بنی اور۔۔۔۔۔ ممتاز حسین کا نام بھی لیا تھا۔ کم سے کم بنی کا نام تو لیا تھا اور اگر شاہد کو یاد رہ گیا تھا تو اس سے میرے ساتھی سمجھ جاتے کہ میں کن کی تحویل میں ہوں۔

لیکن یہ ایک مفروضہ تھا۔ اس کا بھی امکان تھا کہ مار کھا کر اور لبو لہان ہونے کے بعد شاہد کو اس کا ہوش ہی نہ ہو کہ وہ بنی کا نام سنایا پھر اس کی پراڈ کا نمبر دیکھ لیتا۔ اس صورت میں وہ زیادہ سے زیادہ یہ بتا سکتا تھا کہ میں کسی چائے والی حسین لڑکی کے ساتھ گیا تھا اور میں اسے دوست قرار دے رہا تھا۔ اس صورت میں مجھے اور بیو کو تلاش کرنا آسان نہ رہتا۔ بہر حال امید پر دنیا قائم ہے۔ بہت سارے معاملات انسان قسمت پر چھوڑنے پر مجبور ہو جاتا ہے اور تقدیر کے فیصلے کا انتظار کرتا ہے۔ سوچوں کا رخ بنی کی طرف مڑ گیا تھا۔ یہ تو طے تھا کہ وہ اصل معاملے سے واقف ہو گئی تھی اور شاید اسی کا دباؤ تھا جس کی وجہ سے۔۔۔۔۔ ممتاز مجھے راج کنور کے حوالے نہیں کر سکا۔ اپنی باتوں سے میں نے اسے جتنا مشغول کیا تھا اس کے بعد وہ یقیناً ایسا کرتا چاہ رہا ہوگا۔ سوال یہ تھا کہ میرے ساتھ جو ہونے والا تھا کیا اس میں بنی کی رضا شامل تھی؟

اگر فنی کی رضا اس میں شامل تھی کہ مجھے قید میں رکھ کر میرا خون لیا جائے تو اس کی طرف سے کوئی امید بیکار تھی ویسے بھی وہ ایک حد سے زیادہ اپنے باپ کی مخالفت نہیں کر سکتی تھی۔ میں اس کا محسن بھی نہیں دے سکتی تھی۔ بیٹو کا ساتھ میرے لیے چندا بن گیا اب میں کسی بھی کارروائی کے لیے آزاد نہیں تھا۔۔۔۔۔۔ ممتاز نے جالا کی سے کام لیا اور اسے کہیں اور منتقل کر دیا تھا۔ وہ اس کے ہاتھ میں میری کمزوری بن گیا تھا۔ میں سوچ رہی تھی کہ دروازہ کھلا اور وہی دو گارڈز دکھائی دیے۔ لگتا تھا انہیں مستقل میرے لیے مخصوص کر دیا تھا۔ ان میں ایک گور تھا اور ایک سانوا تھا۔ گور اب اس لگتا تھا کیونکہ وہی مجھ سے بات کرتا تھا اور حکم دیتا تھا۔ سانوا لچپ رہتا تھا اور حکم کی تیل کرتا تھا۔ گور نے مجھ سے کہا۔ ”آپ کو بلایا گیا ہے جناب؟“ اس کا لہجہ پھر بدل گیا تھا اور وہ اب عزت سے بات کر رہا تھا۔ اس سے پوچھنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا اس لیے میں جوتے پہن کر باہر آیا۔ البتہ راستے میں مجھے خیال آیا۔

”میرے سامنے کے پاس ایک بیک تھا اس میں میری چیزیں اور کپڑے تھے۔“

”آپ کی ہر چیز محفوظ ہے۔“ اس نے جواب دیا۔

”مجھے اپنے کپڑے چاہئیں۔“

”آپ کے کمرے میں پہنچا دیے جائیں گے۔“

میرا خیال تھا کہ مجھے عمارت میں ہی نہیں لے جایا جا رہا ہے لیکن وہ مجھے ایک عقی دروازے سے باہر نکال لائے۔ اس طرف بھی دور تک پھیلنا ہوا ان تھا۔ یہاں گئے درخت بھی تھے اور پھولدار پودوں کے تختے بھی تھے۔ ہم پختہ درختوں سے گزرتے درختوں کے پیچھے پہنچے تو وہاں چار دیواری کے گوشے میں ایک سفید رنگ کی مختصر عمارت تھی۔ اندر داخل ہوتے ہی دواؤں کی بو نے بتایا کہ یہ عمارت طبی مقاصد کے لیے مخصوص تھی۔ مجھے ایک کمرے میں لایا گیا۔ وہاں ایک ڈاکٹر اور ایک نرس پہلے سے موجود تھے۔ سانوا باہر رک گیا تھا لیکن گور امیرے ساتھ اندر تک آیا۔ گور نے مجھ سے کہا۔ ”آپ کے لیے بڑے صاحب کا حکم ہے کہ ڈاکٹر سے مکمل تعاون کریں۔“

میں نے دل ہی دل میں بڑے صاحب اور ان کے حکم کی ایسی کم تھی کی اور ڈاکٹر کی طرف دیکھو وہ سوکھے چہرے اور بڑی بڑی ابلی ہوئی سرخ آنکھوں والا کرپٹ نظر

آنے والا شخص تھا۔ ”تم ڈاکٹر ہو۔“

اس نے سر ہلایا اور اس طرح کا ڈچ کی طرف اشارہ کیا۔ ”اس پر آجائیں۔“

میں لینا تو اس نے پہلے معمول کا طبی معائنہ کیا۔ درجہ حرارت اور بلڈ پریشر چیک کیا۔ اس کے بعد آنکھوں اور زبان کا معائنہ کیا۔ زبان دکھانے کے مطالبے پر میں نے چڑانے والے انداز میں زبان دکھائی جس پر نرس کی ہلکی سی گئی اور جب ڈاکٹر نے اسے گھورا تو یہی رنگ گئی تھی۔ وہ نعر اور گول مولی لڑی تھی۔ سرخ و سفید رنگت اور قدرتی لائٹ برداؤن بالوں کے ساتھ وہ دلکش لگ رہی تھی۔ جسامت بھاری تھی مگر یہ بھی بری نہیں لگ رہی تھی۔ چست و بیضی فہم میں اس کا جسم بھی چست لگ رہا تھا۔ وہ موٹی لڑکیوں کی طرح مکمل مکمل نہیں کر رہی تھی بلکہ فنی جسامت کی مالک تھی۔ اپنا کام مکمل کر کے ڈاکٹر نے اسے عم دیا۔ ”بلڈ پمپ لو۔“

”ایک منٹ۔“ میں نے نرس کو سرخ گھونٹے کی تیاری کرتے ہوئے دیکھ کر کہا۔ ”یہ پمپ کس لیے لیا جا رہا ہے۔“

”بلڈ کا جنرل چیک اپ ہو گا کہ کوئی کمی تو نہیں ہے اور کسی بیماری کے جراثیم تو نہیں ہیں۔“

اس بار میں نے اعتراض نہیں کیا اور نرس نے کوئی ایک چھانک خون میری رگوں سے کشید کر لیا اور پھر سرخ گو بہت احتیاط سے کپ لگا کر ایک پلاسٹک شاپر میں پیک کیا۔ ڈاکٹر نے مارکر سے اس پر کچھ لکھا اور اسے ایک طرف موجود چھوٹے سے فریج میں رکھ دیا۔ اس کا کام ہو گیا تھا اس لیے اس نے مجھے جانے کی اجازت دے دی۔ مجھے واپس کمرے میں پہنچا دیا گیا اور میں وقت گزاری کے لیے ایک سر ساز کرنے لگا۔ وقفے وقفے سے جانی والی ورزش نے جب مجھے تھکا دیا اور کسی قدر پہنچا گیا بہہ نکلا تو میں نے واش روم کا رخ کیا اور شاور لیا۔ میرے کپڑے آگے تھے لیکن یہ صرف کپڑے تھے۔ ان کے علاوہ بیگوں کا سارا سامان غائب تھا۔ بیٹو کے کپڑے بھی نہیں تھے اور میرے بیک کے ساتھ صرف میرے کپڑے تھے۔

اسلے اور دوسری چیزوں کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ بہر حال کپڑے مل گئے تھے یہی بڑی بات تھی۔ اب تک گارڈز کے علاوہ کسی کی صورت دکھائی نہیں دی تھی۔ لیکن کچھ دیر بعد کھانے کے وقت فنی کی خاص خادمہ با

کھانے کی فرامی لے کر آئی تھی۔ گور اس دوران میں اندر نہیں آتا تھا لیکن وہ مستعدی سے باہر موجود رہا تھا۔ بانو نے سب معمول حیدر آبادی فراک اور چست پاجامہ پہن رکھا تھا جس کی مناسب جسامت برج رہا تھا۔ اس نے میز پر کھانا لگاتے ہوئے آہستہ سے کہا۔ ”بے بی کہہ رہی ہیں آپ گزرتے کریں آپ کو کوئی نقصان نہیں ہوگا۔“

اس سے بڑا نقصان کیا ہو سکتا تھا کہ میرا خون ایک غیب انسان کو صحت دینے میں کام آتا اور وہ صحت پا کر نہ بانے کتنے انسانوں کی برادری کا باعث بن جاتا۔ یہاں زبردستی میرا خون لیا جاتا۔ یہ بھی کم نقصان نہیں تھا میں نے بھی آہستہ سے کہا۔ ”میں فنی سے ملنا چاہتا ہوں۔“

”میں پیغام دے دوں گی۔“ اس نے جواب دیا۔ ”کھانا دینے میں ہی آؤں گی۔ آپ کو اور کوئی کام ہے دیکھتا ہوں۔“

مجھے چائے یا کافی کا خیال آیا مگر وہ ملتی نہیں۔ پھر مجھے اپنے کپڑوں کا خیال آیا۔ ”کپڑے دھلوانے ہیں۔“

”دے دیں میں“ چند گھنٹوں میں دھو کر لادیتی ہوں۔“ وہ بولی۔ میں نے اسے اپنے اتارے کپڑے دے دیے۔

اپنے پیچ میں بھی سادہ اور قوت بخش غذا میں تھیں۔ جیسے ایک چوزے کی ہنٹی، دلیے، مٹن اور مشروم سمیت بعض چیزوں کی مدد سے ایک ڈش تیار کی گئی تھی۔ یہ گاڑھے سوپ کی طرح تھی۔ پھر ایک کھیر نما مٹھی ڈش تھی جس میں بھجور کے ٹکڑے ڈالے گئے تھے۔ تمام چیزیں غیر روایتی لیکن مزے کی تھیں اور قوت بخش تو لازمی تھیں۔ انہیں دینے کا مقصد یہی تھا کہ میری صحت میں اگر کوئی کمی رہ گئی ہے تو وہ بحال ہو جائے اور میرا جسم بہتر بن جائے۔ اس طرح ہر کھانے والی خون کی کمی کو آسانی سے پورا کیا جاسکے گا۔ لیکن خون لینے کا سلسلہ ایک حد سے اوپر جاتا تو لازمی مجھ پر اثر پڑتا۔ گھوڑوں نے میرے ساتھ جو کیا تھا اس کے بعد میں کچھ جاہر متے مرتے بچا تھا۔ آخری بار جب قبا کیوں نے کپڑے بدلے تو میرا دو گنا خون یعنی دو لیٹرز سے زیادہ خون نکال لیا گیا تھا۔ وہ قبا کیوں نے میری دیکھ بھال کی اور مجھ میں بھی سخت جان تھا اس لیے پچ گیا تھا لیکن ضروری نہیں تھا کہ ہر بار میری ہی پخت ہو جاتی۔ میں نے دل میں دعا کی کہ کاش میرے خون کی وہ تاثیر ختم ہوگئی ہو جس کی وجہ سے وہ مجھ کے علاج کے لیے بے باقی بن گیا تھا۔ وہ شخص بلکہ پورا خاندان اس قابل تھا کہ مکمل مکمل کر مر جائے۔ مگر ابھی

اللہ نے ان کی رسی دراز رکھی ہوئی تھی۔

مجھے بھوک لگ رہی تھی اس لیے میں نے تمام چیزوں سے پوری طرح انصاف کیا تھا۔ کھانے کے دوران مجھے بیٹو کا خیال آیا۔ وہ بھی قید میں تھا اور اس کی سوائے اس کے کوئی اہمیت نہیں تھی کہ۔۔۔۔۔۔ ممتاز نے مجھے بھجور کر دیا تھا۔ اسے ٹھیک طرح سے رکھا اور اس کا خیال رکھنا ان لوگوں کے لیے ضروری نہیں تھا۔ میں نے فیصلہ کیا کہ اب مجھے اسپتال لے جایا گیا یا کسی وجہ سے اس کمرے سے نکلنے کی بات کی تو میں اس وقت تک نہیں جاؤں گا جب تک میری بیٹو سے بات نہیں کرادی جائے گی۔ کھانا بانو لے کر آئی تھی لیکن برتن ایک ملازم لڑکا لے گیا۔ وہ صاف ستھرا اور چسپاں ہوا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ یہاں تمام ملازم شخصیت کے لحاظ سے اچھے اور تربیت یافتہ تھے۔ ان کے انداز میں رکھ رکھاؤ تھا۔ شاید ان کو باقاعدہ تربیت دی جاتی تھی اور خاص ملازموں کی تعلیم کا بندوبست بھی کیا ہوگا۔ جیسے بانو اپنے انداز اور رکھ رکھاؤ سے کہیں سے خادمہ نہیں لگتی تھی۔ رات کے کھانے کے ساتھ باہر شاپر لائی تھی۔ اس نے شاپر کرسی پر رکھا۔ ”بے بی نے آپ کے لیے بیجا ہے۔“

میں نے شاپر میں جھانکا۔ اس میں دو پینٹ اور شرٹ سوٹ تھے۔ ایک سلنگ سوٹ اور سوئی پاجامہ تھا یہ شاید ایک سر ساز کے لیے تھا۔ میں نے اپنے پیغام کے بارے میں پوچھا تو اس نے کہا۔ ”میں نے بے بی سے کہہ دیا تھا لیکن انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔“

”ٹھیک ہے تم اس سے پھر کہنا اور میرے ساتھی بیٹو کے بارے میں پتا ہے اگر نہیں تو مجھے اس کے بارے میں معلوم کر کے بتاؤ یا میری اس سے بات کراؤ۔“

بانو نے سر ہلایا اور کھانا لگا کر رخصت ہوگئی تھی۔ گورا مجھے اور بانو کو بات کرتے دیکھتا تھا لیکن اس نے اعتراض نہیں کیا اور نہ ہی کوئی پابندی لگائی تھی۔ کھانے کے بعد میں کچھ دیر کمرے میں چھل قدمی کرتا رہا اور جب تھک گیا تو لیٹ کر سو گیا۔ اگلی صبح مجھے ناشتے سے پہلے بیدار کیا گیا۔ یہاں دروازے میں کٹڑی تھی اور میں کٹڑی لگا کر سویا تھا۔ کوئی دروازے پر مستقل دستک دے رہا تھا۔ میں نے کٹڑی کھولی تو باہر گورا موجود تھا۔ ”چلنا ہے۔“ اس نے بلا تہدید کہا۔

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ”جب تک میرے ساتھی

بیٹہ سے میری بات نہیں کرائی جائے گی میں کہیں نہیں جاؤں گا۔“

گورے نے چونکا ہوا کر شات گن کا رخ میری طرف کر دیا اور غرایا۔ ”تم انکار نہیں کر سکتے۔“

”کر سکتا ہوں تم مجھے گولی مار سکتے ہو لیکن یہاں سے چلنے پر مجبور نہیں کر سکتے۔“ میں دوبارہ بستر پر دراز ہو گیا۔ وہ چند لمحے مجھے گھورتا رہا پھر اس نے دروازہ باہر سے بند کر دیا۔ غالباً وہ اس بارے میں ہدایت لے رہا تھا۔ تقریباً دس منٹ بعد دروازہ کھلا اور گورے نے ایک موبائل میری طرف بڑھایا اور ساتھ ہی وارننگ دی۔

”اپنے ساتھی سے بات کر لو مگر کوئی غلط حرکت مت کرنا۔“

دوسری طرف بیٹہ موجود تھا اس نے میری آواز سنتے ہی بے تابی سے کہا۔ ”شوہنی یہ کیا ہے؟ یہ ہم کو آپ کے پاس کیوں نہیں لاتا۔“

”بس میری جان مجبوری ہے۔ تمہیں کنویر یاد ہیں۔“

”ہم ان کو کیسے بھول سکتا ہے۔“ اس نے نفرت سے کہا۔ ”وہ ہمارا گھر اور لوگوں کا قاتل ہے۔“

”یہ منحوس یہاں بھی آگیا۔“ میں نے کہا اور بیٹہ کو کسی قدر تفصیل سے بتایا کہ راج کنور کیوں آیا اور کیا چاہتا ہے۔ بیٹہ دم بخود ہو گیا تھا۔

”تو ہم کو اس لیے الگ کیا ہے۔“

”یہ تمہارے ساتھ کوئی بدسلوک تو نہیں کر رہے ہیں؟“

”نہیں شوہنی سب ٹھیک ہے۔ اچھا کرا ہے اور کھانا بھی ٹھیک ہے یہ ہم کو آپ کا فکر ہے۔ یہ آپ کے ساتھ پھر وہی کر رہا ہے۔“

”اللہ مالک ہے یار، پہلے بھی ایسی صورت حال میں وہ مدد کرتا رہا ہے، آگے بھی وہی کرے گا۔ تم فکر مت کرو۔“ میں نے تسلی دی اور موبائل گورے کو واپس کر دیا کیونکہ وہ اب کچھ بے چین ہو رہا تھا۔ بیٹہ کی خیریت معلوم کر کے مجھے کمی ہو گئی تھی۔ اس لیے میں ان کے ساتھ روانہ ہو گیا۔ وہ مجھے اسی کلینک میں لے گئے جہاں ڈاکٹر اور گول مٹول سی نرس موجود تھی۔ اتنی صبح بلانے کا مقصد ناشتے سے پہلے کچھ سپرل لینا تھا۔ یہ یورین، ٹھوک اور بلڈ سپرل تھے۔ اس بار خون کم لیا گیا تھا۔ پھر ڈاکٹر نے مجھے ایک انجکشن لگانا چاہا تو میں پوچھا۔ ”یہ کس لیے ہے؟“

”یہ ایسی لیٹر ہے جس کی طرف فائبرس بہتر بناتا ہے۔“

”یعنی اسٹرا انڈو جیسی کوئی چیز ہے؟“

”نہیں۔“ اس نے ہچکچا کر کہا۔ ”لیکن اسی جیسی تو ہے۔“

میں اسٹرا انڈو کے نقصانات سے واقف ہوں کیونکہ میرا تعلق کوہ پناؤں سے بھی رہا ہے۔ وہ پہاڑوں میں اپنی جسمانی کارکردگی بڑھانے کے لیے اپنے پاس ایسی دوا لیں اور انجکشن رکھتے تھے جن میں اسٹرا انڈو ہوتے تھے۔ دوسرے کھیلوں میں ان کا استعمال عرصے سے جاری ہے اور اسپورٹس مین اور دوڑ میں کی ایک بڑی تعداد کارکردگی بڑھانے کے لیے ان کا بے دریغ استعمال کرتی ہے۔ کئی دہائیوں پہلے جب ان پر پابندی نہیں تھی تو کھلاڑی بڑے بڑے اور میڈل حاصل کرنے کے لیے انہیں استعمال کرتے تھے۔

اب ان پر پابندی لگ گئی ہے اس کے باوجود ہر سال بے شمار کھلاڑی انہیں استعمال کرتے ہوئے پکڑے جاتے ہیں۔ انہیں جیت کا ایسا جنون ہوتا ہے کہ وہ اس کے لیے اپنی جان پر کھیلنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔

اسٹرا انڈو کی وضاحت کر دوں۔ یہ ایسی ادویات ہوتی ہیں جو انسانی جسم میں موجود توانائی کے چھپے ذخائر کا کام میں لے آتی ہیں۔ یہ ہماری ریزرو توانائی ہوتی ہے۔ جب ہم بیمار پڑتے ہیں، کسی حادثے کا شکار ہوتے ہیں ہمارے اعصاب کو کوئی بڑا صدمہ برداشت کرنا پڑتا ہے تو توانائی ہمیں اس حادثے یا صدمے یا بیماری سے لڑنے میں مدد دیتی ہے۔ یہ توانائی طویل عرصے میں جمتی ہے اور اگر اسے خرچ کر دیا جائے تو انسان میں غیر متوقع حالات کا سامنا کرنے کی صلاحیت کم ہو جاتی ہے اور یہ ظاہر ٹھیک ٹھاک انسان کسی معمولی بیماری کی وجہ سے دنیا سے گزر جاتا ہے۔ کئی شاندار صحت رکھنے والے کھلاڑی اسی وجہ سے اچانک جو جوانی میں دنیا سے رخصت ہوتے تو اسٹرا انڈو کے نقصانات سامنے آئے اور ان پر پابندی لگی۔

مگر اب بھی لوگ انہیں استعمال کرتے ہیں۔ ان سے زیادہ تشویش ناک بات یہ ہے کہ اب اسٹرا انڈو کا استعمال عام لوگوں نے بھی شروع کر دیا ہے اور وہ ایسا بے خبری میں کر رہے ہیں۔ اس میں زیادہ ہاتھ ان نام نہاد ڈاکٹروں اور عطانیوں کا ہے جو معمولی بیماریوں میں لوگوں کو اسٹرا انڈو دے دیتے ہیں۔ ٹھوکا شکار کوئی شخص کسی ڈاکٹر کے پاس جاتا ہے اور وہ اسے اسٹرا انڈو کا انجکشن دے دیتا ہے۔ چند منٹ کے بعد آدی لوگلتا ہے جیسے اسے بھی غلط تھا تو

اور وہ خود کو کسی گھوڑے کی طرح فٹ اور طاقتور محسوس کرنے لگتا ہے۔ جنسی معاملات میں بھی ان کا بے دریغ استعمال کیا جاتا ہے اور لوگوں کو پتا ہی نہیں چلتا کہ اس طرح وہ خود اپنی قبر تیار کر رہے ہیں۔ ایک دن اچانک ہی بغیر کسی خاص وجہ کے وہ مر جاتے ہیں اور لوگ کہتے رہ جاتے ہیں کہ کیا دور آگیا ہے اب انسان بیٹھے بیٹھے مر جاتا ہے۔ ان کو یہ معلوم ہی نہیں ہے کہ ایسا بے وجہ نہیں ہے۔ کوئی ان ڈاکٹروں کو نہیں پوچھتا ہے لیکن لوگوں کو تو اپنا خیال رکھنا چاہیے کہ وہ کسی ڈاکٹر سے جو دوا لے رہے ہیں وہ اصل میں ہے کیا؟ بد قسمتی سے اسٹرا انڈو بہت سست لگ جاتے ہیں۔ ان کی گولیاں اور انجکشن ہول سیل میں چند روپے میں دستیاب ہیں۔

مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے۔“ میں نے انکار کیا۔

”یہ ضروری ہے۔“ اس نے اصرار کیا۔ ”ڈاکٹر مجھے بے وقوف مت بناؤ۔“ میں نے اسے گھورا۔ ”مجھے اچھی طرح معلوم ہے اس قسم کی دوا میں کیسے کام کرتی ہیں۔“

بالوں نا خواست اس نے انجکشن واپس رکھ دیا اور بولا۔ ”اس صورت میں تمہیں طاقتور غذا میں لینا پڑے گی اور اس کے ساتھ باقاعدگی سے سپلی منٹس بھی لینا ہوں گے۔“

”یہ ٹھیک ہیں۔“ اس نے مجھے گولیاں اور کپسول دیے اور بتایا کہ کس طرح کھانے ہیں۔ ساتھ ہی مشورہ دیا۔ ”پانی زیادہ سے زیادہ پو۔ اس سے گردوں کا فنکشن بہتر ہوگا۔“

میں نے اس کی ہدایات ذہن نشین کر لیں۔ واپسی پر بس نے ٹوڑے سے کہا۔ ”مجھے دم کار ہے اگر یہاں جم ٹھیک ہے تو مجھے کھلی جگہ چاہیے جہاں میں ایکس سائز کر سکیں۔“

”اس کا بندوبست ہو جائے گا۔“ وہ بولا۔ ”جم ہے لیکن وہ صرف بڑے صاحب کی فٹیلی کے لیے ہے۔“

میں نے ایک بار پھر دل میں بڑے صاحب اور ان کی فٹیلی کی ایسی کم تھی کی اور اس سے مطالبہ کیا۔ ”میری فٹیلی سے بات کراؤ دوسری صورت میں میں کسی قسم کا تعاون نہیں کروں گا۔“

فٹیلی کا نام اس طرح لینے پر اس نے مجھے گھورا لیکن کچھ کہانیوں اور دروازہ باہر سے بند کر دیا۔ مگر میری وارننگ کا

گھر۔ اداس۔ ویران

جو اولاد نہیں

آج بھی ہزاروں گھر انے اولاد کی نعمت سے محروم سخت پریشان ہیں۔ اولاد نہ ہونے سے دوسری شادی یا طلاق جیسے گھریلو جھگڑے، اداسیاں اور جدائیاں جنم لے رہی ہیں۔ آپ خدا تعالیٰ کی رحمت سے مایوس نہ ہوں کیونکہ مایوسی تو گناہ ہے۔ ہم نے صرف دیسی طبی یونانی قدرتی جڑی بوٹیوں پر ریسرچ کر کے ایک ایسا خاص قسم کا بے اولادی کورس تیار کر لیا ہے جس کے استعمال سے ان شاء اللہ آپ کے ہاں بھی خوبصورت اولاد پیدا ہو سکتی ہے۔ آپ کے آگن میں بھی خوشیوں کے پھول کھل سکتے ہیں۔ آج ہی فون پر اپنی تمام علامات سے آگاہ کر کے گھر بیٹھے بذریعہ ڈاک وی پی بے اولادی کورس منگوا لیں۔ خدا کے لئے ہمارا بے اولادی کورس ایک دفعہ تو آزما لیں اور خدا را اپنے گھر کے ماحول کو توجنت بنالیں۔

المسلم دارالحکمت رجسٹرڈ ضلع حافظ آباد۔ پاکستان

0301-6690383
0300-6526061

فون اوقات
صبح 10 بجے سے عصر 4 بجے تک

خاطر خواہ اثر ہوا تھا۔ آدھے گھنٹے بعد ناشتے کے ساتھ بانو آگئی۔ اس نے ناشتا لگانے کے دوران حسب معمول دھیمی آواز میں کہا۔ ”بے بی آپ سے نہیں مل سکتیں۔ بڑے صاحب کی طرف سے پابندی ہے۔“

”یہ مجھ سے تعاون نہیں کر رہے ہیں۔ دوسری صورت میں میں بیوک ہڑتال کروں گا۔“

بانو نے اپنی فرما کے گریبان میں ہاتھ ڈال کر ایک چھوٹا سا واکی ٹاکی نکالا اور میری طرف بڑھا دیا۔ ”یہ بے بی نے آپ کے لیے بھیجا ہے اس سے آپ کسی وقت بھی ان سے رابطہ کر سکتے ہیں۔“

یہ دو طرفہ واکی ٹاکی سیٹ تھا جس کی فریکوئنسی طے شدہ ہوتی ہے اور اس سے کہیں اور رابطہ نہیں کیا جا سکتا۔ واکی ٹاکی ہلکا سا گرم ہو رہا تھا اور ہلکا سا نمی تھا۔ یہ گرمی اور نمی بانو کی تپتی میں اسے لیتے ہوئے جھینپ گیا لیکن وہ بالکل نارمل رہی تھی۔ میں نے پہلے ناشتا کیا اور پھر واکی ٹاکی آن کر کے فنی کو پکارا۔ اس کی طرف سے جواب نہیں ملا۔ شاید وہ کہیں مصروف تھی مگر میں مستقل مزاجی سے ہر دو تین منٹ بعد اسے پکارتا رہا تھا۔ بالآخر اس نے جواب دیا۔ ”سواری میں ہاتھ لے رہی تھی۔“

”فنی تم جانتی ہو میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔“

”میں جانتی ہوں اور تم فگرمت کرو میں تمہیں کوئی نقصان نہیں ہونے دوں گی۔“

اگرچہ وہ بہت خلوص سے کہہ رہی تھی لیکن میں اس کی ضمانت پر بھروسہ کرنے والا نہیں تھا۔ وہ تو میں ابھی مجبور تھا اس لیے میں نے اس کی بات تسلیم کر لی۔ ”میں جانتا ہوں میرے لیے تم نے اپنے پاپا سے رعایت لی ہے اور مجھے راج کتور کے حوالے کیے جانے سے بچایا ہے۔“

”شکر ہے تم سمجھ گئے۔“ وہ خوش ہو کر بولی۔ ”پاپا نے مجھے ضمانت دی ہے کہ تمہیں کوئی نقصان نہیں ہوگا۔“

”تمہیں معلوم ہے یہ ہر پختہ میرا خون چاہتے ہیں اور کوئی انسان ہر پختہ خون نہیں دے سکتا۔۔۔ چاہے وہ جسمانی طور پر کتنا ہی فٹ کیوں نہ ہو۔“

”اسی لیے میں نے ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق تمہاری ڈائنٹ ترمیم دی ہے۔“

”اے بھائی میں جھوٹو۔ میں اپنا پروگرام خود بتا رہا ہوں اور مجھے میری مرضی کے مطابق کچھ سہولیات درکار ہوں گی؟“

”مثلاً؟“

”ایک تو مجھے جم چاہیے۔ دوسرے خوراک میری مرضی کے مطابق اور میرے بتائے وقت پر دی جائے۔ قدر مختصر میں اپنا نام ٹیبل خود بناؤں گا۔“

”جم یہاں موجود ہے۔ نیچے ٹیمٹ میں ہے۔ تم جیسے کہو گے تمہیں ویسی سہولت مہیا کی جائے گی۔“

”یہ بات گارڈز کو بھی سمجھا دو۔“

”تمہاری خوراک کا معاملہ بانو کے ہاتھ میں ہے تم اس سے جو کہو گے وہ کرے گی۔“

”تم پر پابندی کیوں ہے؟“

اس نے گہری سانس لی۔ ”پتا نہیں، پاپا اس شرط پر میری بات مانے کے میں تم سے نہیں ملوں گی۔“

”تم نے جو واکی ٹاکی بھیجا ہے اس کی بیٹری کتنی دیر چلتی ہے؟“

”خاصی دیر چلتی ہے جیسے ہی بیٹری کمزور ہوگی اس کے اوپر ایک سرخ لائٹ ہر پانچ سیکنڈ بعد چلے گی۔ بانو کو بتا دینا وہ دوسری بیٹری لا دے گی۔“

”مجھے پتہ کی بھی خبریت معلوم ہونی چاہیے۔“

”روز تو نہیں لیکن میں حیات سے کہہ دوں گی وہ تمہاری اس سے بات کر دیا کرے گا۔“

”حیات کون؟“

”جو گورا گاڑ ہے۔ وہ بہت ماہر آدمی ہے اور پاپا کے خاص آدمیوں میں سے ہے۔“

”بھی انہوں نے میرے سر پر مسلط کیا ہے۔“ میں نے کہا اور واکی ٹاکی بند کر دیا۔ دس منٹ بعد بانو اندر آئی وہ ایک نوٹ پیڈ لے کر آئی تھی۔ میں نے اسے لکھوایا کہ مجھے کس کس وقت کیا چاہیے ہوگا۔ لکھوا کر میں نے اس سے پوچھا۔ ”اس میں آگے پیچھے بھی ہو سکتا ہے تو میں تمہیں کہے بناؤں گا۔“

”اب بے بی کا واکی ٹاکی میرے پاس ہوگا۔“ اس نے کہا۔ ”آپ اس پر مجھ سے کسی وقت بھی رابطہ کر سکتے ہیں۔“

میں نے اپنی ڈائنٹ تین کے بجائے چار پارہ کر لی تھی اور اس میں مختلف مائع جات کا اضافہ کر لیا تھا۔ صبح سات بجے سے رات دس بجے تک ہر پانچ گھنٹے کے بعد مجھے کھانا فراہم کیا جاتا۔ صبح میں کمرے میں ہلکی چٹکی ورڈ کر دیا اور ناشتے کے دو گھنٹے بعد میں دو گھنٹے کے لیے جم جاتا۔ اس

مرح شام سات بجے میں دوبارہ دو گھنٹے کے لیے جم جاتا۔ یہ پروگرام اسی دن سے شروع ہو گیا تھا اور نو بجے حیات نے دروازہ کھولا اور مجھ سے کہا۔ ”آپ نے جم بنانا ہے۔“

حیات اور اس کا ساتھی مجھے ممتاز ہاؤس کے درخانے میں واقع جم تک لائے۔ اس میں آنے جانے کے دروازے تھے۔ مجھے ایک ایسے راستے سے لایا گیا تھا جو اصل میں سردی ڈور تھا اور جم کی صفائی اور دوسرے کاموں کے لیے مخصوص ملازمین یہیں سے آتے جاتے تھے۔ مالکان جس دروازے سے آتے جاتے تھے وہ اندر کے حصے میں واقع تھا۔ ظاہر ہے اسے بند کر دیا گیا ہوگا۔ اس پر بھی حیات اور اس کا ساتھی احتیاطاً جم میں براجمان ہو گئے تھے۔ گویا وہ مجھے سوائے میرے کمرے کے کسی جگہ بھی اکیلے چھوڑنے کو تیار نہیں تھے۔ جب میں کلیٹک میں ہوتا تب بھی حیات خود میرے سر پر مسلط رہتا تھا۔ یہ چھوٹا سا جم تھا جہاں ایکسٹریکٹ کی تمام سہولتیں مہیا تھیں حتیٰ کہ ایک طرف ایک چھوٹا سا سونگ پول بھی بنا ہوا تھا۔ مجھے جوائنکس سائز کرنا تھیں ان کا سامان یہاں موجود تھا۔ میں تمام باتیں ذہن سے جھٹک کر ایکسٹریکٹ میں لگ گیا۔

شاید میرا رویہ عجیب لگے۔ میں ایک دوست نما دشمن کی قید میں تھا اور اس نے اس قید کو مضبوط کرنے کے لیے بیڑے کو پرغال بنالیا تھا کہ میں فرار کا سوچوں بھی نہیں۔ میرے ساتھیوں کو پتا نہیں تھا کہ میں کہاں تھا اور میری جان کے دشمن میرا خون چھوڑنے کی تیاری کر رہے تھے۔ ایسے میں بے فکری سے ڈائنٹ پلان بنانا اور ایکسٹریکٹ کرنا عجیب ہی لگے گا۔ مگر اس کی کچھ وجوہات تھیں۔ میں اس جدوجہد کے آغاز سے دیکھتا آیا کہ جب کوئی مشکل پیش آتی اور میں مبروہ حوصلے کے ساتھ اس کا سامنا کرتا تو جلد یا بدیر مجھے موقع ملتا تھا اور میں آزاد ہو جاتا یا دشمن پر حاوی ہو جاتا۔ یہ چیز اب میری عادت بن چکی تھی کہ کسی بھی موقع پر پریشان نہیں ہوتا۔ دوسرے اگر میں یہ سب نہ سمجھتا تب بھی یہ میرے جسم سے لازمی خون حاصل کرتے اور اس کا نقصان مجھے ہوتا۔ اس لیے مجھے اپنا خیال رکھنا تھا کہ ان ڈر کیلکولس سے مجھے کم سے کم نقصان ہو اور جب قدرت مجھے موقع دے تو میرا جسم اتنا توانا ضرور ہو کہ میں اس موقع سے فائدہ اٹھا کر خود کو آزاد کر اسوں۔ یہی سوچ کر میں یہ سب کر رہا تھا۔ مجھے یقین تھا ہمیشہ کی طرح مجھے موقع ضرور ملے گا اور نہ

ماہنامہ سنی ٹائمز

بدلتے موسم کی آنکھیں
جولائی 2013ء شمارے کی قیمت آنکھیں

عقل کی فراوانی میں وحشت کی انتہاؤں کو چھوٹی کہانی کے ابتدائی سوغات... سمیرا یعقوب کے قلم کی جولانیاں۔

گرداب... وفات کے نگلاب میں گرفتار لڑکوں کا آغاز و انجام اسحاق قادری کا سلسلہ

جواہری... احمد اقبال کے شریں قلم سے ایک نیا نیا قلمی فرشتہ ہلکے خیر سلسلے کا آغاز

مغرب کے نالہ انداز... مغربی دنیا کی تیل کی خول کی عکاسی اور حیات کو چڑھتا قاتل فرشتہ کہانیاں

سرورق کی کہانیاں

بھٹی کہانی... مغرب ہوا مشرق میں ہلکے قلم کی نگاہ میں جھنڈے نظر آتے ہیں۔ ایسی ہی نظمیں علی چیلے نے لکھی ہیں کہ ان کا شوق کا کاشف زبیر کے انداز میں لکھا

دوسری کہانی... محبت کے جذبے کے ساتھ ہر پختہ میں... فرشتہ نہیں لپکتا ہے محبت کے

اسرار اور قوتوں کے الاؤ میں دہائی داستان... احمد اقبال کی تحریر



آپ کے تجربے...
میں نے اپنی ڈائنٹ تین کے بجائے چار پارہ کر لی تھی اور اس میں مختلف مائع جات کا اضافہ کر لیا تھا۔ صبح سات بجے سے رات دس بجے تک ہر پانچ گھنٹے کے بعد مجھے کھانا فراہم کیا جاتا۔ صبح میں کمرے میں ہلکی چٹکی ورڈ کر دیا اور ناشتے کے دو گھنٹے بعد میں دو گھنٹے کے لیے جم جاتا۔ اس

بھی ملا تب بھی میں زندہ اور صحت مند تو رہوں گا۔ دشمن کی قید میں رہتے ہوئے مجھے موقع مل رہا تھا تو میں کیوں نہ فائدہ اٹھاتا۔

ڈیڑھ گھنٹے کی ایکس سائز کے بعد میں نے آدھے گھنٹے سونگ کی اور جب میں کمرے میں واپس آیا تو مجھے خوفناک قسم کی بھوک لگ رہی تھی میں نے بانو کو کال کر کے کھانا لانے کو کہا اور خود نہانے چلا گیا۔ میرے پاس محدود کپڑے تھے اس لیے جب بانو آئی تو میں نے اس سے چند اسپورٹس شرٹس اور ایک گاؤن کا کہا۔ ”میں ابھی لائی ہوں۔“ اس نے کہا اور پھر کمرے کا جائزہ لیا۔ ”میرا خیال ہے آپ کو ایک الماری اور کپڑے پنگ کرنے کی جگہ کی ضرورت ہے۔“

میں آرام کر رہا تھا تو بانو کچھ ملازمین کے ساتھ آئی۔ انہوں نے ایک درمیانے سائز کی دوپٹ والی الماری اٹھا رکھی تھی۔ وہ انہوں نے کمرے میں ایک طرف رکھ دی۔ پھر انہوں نے واش روم میں کپڑے ٹانگنے والی ایک خوب صورت کھوتی لگائی۔ جب ملازمین چلے گئے تو اس نے میرے کپڑے بیک سے نکال کر سیلیف سے الماری میں لگائے۔ وہ مزید سوئی پا جائے، اسپورٹس شرٹس، بنائیں، گاؤن اور چار عدد دینے تو لے لائی تھی۔ وہ میرا ہر ممکن خیال رکھ رہی تھی۔ صرف وہی نہیں کر رہی تھی جو میں اسے کہتا تھا۔ اپنے طور پر اسے جو بہتر لگا وہ بھی کر رہی تھی۔ اپنا کام کر کے اس نے مجھ سے پوچھا۔ ”آپ مطمئن ہیں ناسر، کسی اور چیز کی ضرورت ہے۔“

”میں بور ہوتا ہوں۔“ میں نے کہا۔

”میں ہوں ناسر۔“ وہ مسکرا کر بولی۔ ”آپ کہیں گے تو میں آپ کو کچھ بھی دے سکتی ہوں۔“

اگرچہ اس کے انداز میں کوئی ایسی بات نہیں تھی اس نے بہت سادہ اور عام سے انداز میں پیشکش کی تھی لیکن میں نے جلدی سے کہا۔ ”میری بوریت کسی پڑھنے والی چیز جیسے اخبار رسالے اور فی دی سے بھی دور ہو سکتی ہے۔“

”اس بارے میں مجھے بے بی سے پوچھنا پڑے گا۔“

”ٹھیک ہے معلوم کر لو۔“ میں نے دوبارہ بستر پر دراز ہوتے ہوئے کہا۔ میں نے جو ڈائٹ پلان بنایا تھا اس میں صبح کا ناشتا بھاری اور بارہ بجے کسی قدر ہلکا کھانا ہوتا۔ شام پانچ بجے پھر بھاری کھانا اور رات سونے سے پہلے ہلکا کھانا تھا۔ دوپہر اور رات کے وقت میں آرام کرتا۔ صحت

کے لیے جتنا ضروری کھانا پینا ورزش ہے اتنا ہی ضروری آرام اور نیند ہے۔ مجھے دوپہر میں سونے کی عادت نہیں تھی اس لیے آرام کر سکتا تھا۔ شام کے کھانے کے دو گھنٹے بعد میں نے حیات اینڈ سکنی کے ساتھ دوبارہ جم کا رخ کیا۔ میں ورزش کر رہا تھا کہ غیر متوقع طور پر وہاں۔۔۔۔۔ ممتاز آ گیا۔ اس کے آدمی الٹ ہو گئے تھے لیکن میں توجہ دیے بغیر مشین پر رنگ کرتا رہا۔ اس نے دچکی سے مجھے دیکھا اور بولا۔ ”گلتا ہے تم نے خود کو پوری طرح تیار کرنا شروع کر دیا ہے۔“

”ظاہر ہے۔“ میں نے خشک لہجے میں کہا۔ ”میں یہ نہیں بھی کروں گا تب بھی میرے جسم سے خون نکلا جائے گا۔“

”اس سے تمہاری ری کوری تیز ہو جائے گی۔۔۔۔۔“

ممتاز نے سر ہلایا۔ ”کیا مرشد سے تمہاری کوئی سیٹل منٹ ہو رہی ہے؟“

اس کا سوال غیر متوقع تھا لیکن میں گڑبڑایا۔ ”کسی سیٹل منٹ؟“

”یہی کہہ رہے تمہارے خلاف موجود مقدمات جو اصل میں اسی کے اشارے پر شروع ہوئے تھے۔ اب ختم کر رہا ہے؟“

”اگر وہ ایسا کر رہا ہے تو اس کا علم میرے وکیل کو ہو گا۔ میں نے قانونی معاملات اسی پر چھوڑ رکھے ہیں۔“

ممتاز کچھ دیر مجھے دیکھتا رہا۔ ”تم بتانا نہیں چاہتے ہو تو تمہاری مرضی لیکن اگر تم واقعی ایسا کچھ کر رہے ہو تو میں اس میں کوئی رکاوٹ نہیں ڈالوں گا بلکہ تمہاری مدد کر سکتا ہوں۔“

میں رنگ مشین سے اتر آیا اور ایک تولیے سے پسینا صاف کرتے ہوئے کہا۔ ”بڑے صاحب آپ میری جتنی مدد کر رہے ہیں میرے لیے وہی کافی ہے۔“

وہ ایک لمحے کو کھپکھپا پھر بولا۔ ”مرضی تمہاری۔“ وہ واپس جانے کے لیے مڑا پھر رکا اور بولا۔ ”پرسوں خون لیا جائے گا۔“

ممتاز اذکبر کر چلا گیا اور اس کے جانے کے بعد حیات نے غرا کر کہا۔ ”بڑے صاحب کے سامنے لہجہ اور زبان قابو میں رکھا کرو۔“

میں نے مستحضرانہ نظروں سے اسے دیکھا۔ ”بڑے صاحب کو میری زبان اور لہجہ پر کوئی اعتراض نہیں ہے جب

تم کو کیا اعتراض ہے؟“

”وہ مالک ہیں۔“

”تمہارے ہوں گے میرے نہیں ہیں۔“ میں نے سچے ہوئے سونگ بول کا رخ کیا۔ حیات کا چہرہ بڑک گیا تھا لیکن مجھے ایسے لوگوں کی کوئی پروا نہیں ہوتی جو ایک انسان کی غلامی میں حد سے آگے چلے جاتے ہیں۔ میں واپس کمرے میں آیا تو غیر متوقع طور پر وہاں پر ایک خاصا بڑا سا ایل سی ڈی لگا ہوا تھا۔ اس میں ڈی وی ڈی پلیئر بلیں تھا اور ڈی وی بھی دیکھی جا سکتی تھی۔ بیڈ کی سائیڈ دروازے پر آج کے اخبارات اور کچھ رسائل رکھے تھے۔ گویا میرے مطالعے کو مان لیا گیا تھا۔ بانو بھی وہاں تھی اس نے مجھے بتایا کہ فی وی ایک ہزار چینل والے سیٹلائٹ سسٹم سے منسلک تھا۔ اس کی مدد سے میں دنیا کا کوئی بھی چینل دیکھ سکتا تھا۔ وہ ڈی وی ڈیز کا ایک بزنل بھی لائی تھی۔ یہ سب مودیر تھیں۔

”یہ آج کے اخبارات ہیں دو انگریزی کے ہیں اور تین اردو کے اور یہ کچھ رسائل ہیں۔“

رسائل میں اکثر فین میگ تھے ظاہر ہے یہاں اگر شہیدہ کو فحش کے رسائل آتے تھے تو فحش کے پاس نہیں تھے اور اس کے پاس یہی ہو سکتے تھے۔ میں نے کہا۔ ”یہ کافی ہیں لیکن رسائل میرے کام کے نہیں ہیں انہیں لے جاؤ۔“

رات کا کھانا کھا کر میں نے کچھ دیر ٹی وی دیکھا اور اخبارات پر سرسری نظر ڈالی۔ اس بھاگ دوڑ کی زندگی میں ہم حالات حاضرہ سے اتنے بے خبر ہو گئے تھے کہ ہمیں پتا نہیں چلا کہ کب الیکشن بھی ہو گئے۔ ہم خود سے غافل ہو گئے تھے۔ زندگی میں روین نام کی کوئی چیز نہیں تھی جب موقع ملا کھالیا، جب موقع ملا سویلے۔ ورزش بھول چکے تھے۔ اس کا اعزاز مجھے دوبارہ کی ایکس سائز سے واجب معمولی ورزشوں سے میرا سانس پھولنے لگا تھا۔ میرا استینا بہت کم ہو گیا تھا۔ رنگ مشین پر دس منٹ بعد میرا سانس پھولنے لگا تھا۔ اس لیے بھی میں اسے قدرت کی طرف موقع سمجھتا تھا اور اپنے جسم کا تے والے حالات کے لیے تیار کر رہا تھا۔ رات میں کمرہ سے صبح بچے تنگ سات گھنٹے کی نیند میرے لیے کافی تھی۔ سونے سے پہلے میں نے حیات سے کہا کہ وہ مجھے صبح چائے لٹھا دے۔ پھر مجھے خیال آیا کہ میں بانو سے کوئی ٹاک بکوں نہ منگوالوں۔ میں نے اسے کال کی تو وہ جاگ اٹھی۔ میں نے اس سے الارم کلاک کا کہا تو اس نے

کہا۔ ”میں ابھی لاتی ہوں سر۔“

”نہیں اتنی جلدی کی ضرورت بھی نہیں ہے ابھی میں نے حیات سے کہہ دیا ہے وہ مجھے صبح اٹھا دے گا۔ تم کل لا دینا، ابھی آرام کرو۔“

”میں یہاں آرام کرنے کے لیے نہیں ہوں، اپنی ذمے داریاں نبھانے کے لیے ہوں۔“ اس نے کہا۔ ”میں کلاک لا رہی ہوں۔“

چند منٹ بعد وہ اندر آئی۔ اس نے ایک چھوٹا سا ڈیجیٹل کلاک اٹھا رکھا تھا۔ پہلی بار میں نے اسے دوسرے لباس میں دیکھا۔ اس نے سادہ سالان کا سوٹ پہن رکھا تھا۔ شرٹ سیلیف تھی اور کسی قدر کشادہ گلے سے اس کی سنہری جلد جھلک رہی تھی۔ شاید یہ اس کے آرام کا لباس تھا۔ اس نے مجھے کلاک کا استعمال سمجھایا۔ اس دوران میں وہ اتنی قریب آگئی کہ اس کے وجود سے انشتی جھینسی مہک مجھے پریشان کرنے لگی۔ میں نے جلدی سے کہا۔ ”ٹھیک ہے میں سمجھ لوں گا۔ اب تم جا سکتی ہو۔“

اس نے عجیب سی نظروں سے مجھے دیکھا۔ شاید یہاں کوئی ایسا نہیں ملتا ہو گا جو اس کے قریب آنے سے یوں گھبرائے مگر اس نے کچھ کہا نہیں سوائے گڈ نائٹ کے اور کمرے سے نکل گئی۔ میں نے الارم سیٹ کیا اور سو گیا۔ آنے والے دو دن تک یہ معمول برقرار رہا تھا۔ ممتاز حسین نے بتایا کہ دو دن بعد خون لیا جائے گا لیکن ایسا نہیں ہوا اس کے بجائے اگلے دن صبح سویرے میرا خون لیا گیا۔ خون نکالنے کا سارا پروسس ڈاکٹر نے خود کیا تھا۔ صرف کیونلا گول مٹول نرس نے لگایا تھا۔ ڈاکٹر نے بہت احتیاط سے نصف لیٹر کی تھیلی بھری اور اس نے مجھے واضح دکھایا کہ تھیلی میں نصف لیٹر خون ہی گیا ہے۔ اس نے اپنا کام کرنے کے بعد مجھے طاقت کا ایک انجکشن دیا اور فوری طور پر جوس اور اس کے ساتھ منرل سالٹ دیا۔ ”ہمارے پاس پلازما مدہ ہے لیکن ابھی آپ کو اس کی ضرورت نہیں ہے۔“

”اس کی ضرورت کب پڑے گی؟“

”شاید چوکی بار خون لینے کے بعد۔“

”ڈاکٹر ایک شخص کتنا خون اور کتنے عرصے بعد دے کر صحت مندرہ سکتا ہے؟“

”ایک لیٹر خون دو مہینے بعد۔“ اس نے جواب دیا۔

”اور میرے جسم سے مہینے میں دو لیٹر سے زیادہ خون نکالا جائے گا۔“ میں نے فکر مندی سے کہا۔ ”کیا یہ

خطرناک نہیں ہے؟“

”آپ کی جان کو خطرہ نہیں ہے لیکن آپ کمزور ہو جائیں گے۔ البتہ ہم دواؤں اور خوراک سے اس کمزوری کو کم سے کم رکھنے کی کوشش کریں گے۔“ ڈاکٹر نے جلدی سے کہا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ خطرے کو کم سے کم کر کے دکھا رہا ہو۔

اس پہلی بار خون نکالے جانے کے بعد مجھے محسوس نہیں ہوا تھا اگر کمزوری ہوئی بھی تھی تو وہ طاقت کے انکسشن اور جوش سے پوری ہو گئی تھی۔ البتہ ڈاکٹر نے احتیاطاً مجھے صبح کے سیشن میں ایکس سائز سے منع کر دیا تھا۔ اس سے توانائی استعمال ہوتی جب کہ مجھے آنے والے چوبیس گھنٹے میں توانائی کی ضرورت تھی۔ اس نے ڈھکے چھپے انداز میں بتایا کہ اگلی بار خون نکالے جانے کے بعد مجھے آرام کی زیادہ ضرورت ہوگی۔ میں نے شام کو دو گھنٹے تک ایکس سائز کی اور مجھے اپنی طاقت میں کوئی کمی محسوس نہیں ہوئی تھی۔ مگر یہ آغاز تھا۔ اس کے بعد ایک معمول بن گیا۔ چوبیس گھنٹے میں میرا ہر لمحہ کسی نہ کسی مصروفیت میں گزارنا تھا۔ مجھے ٹی وی یا اخبارات دیکھنے کا موقع بھی کم ملتا تھا۔ رات کو بستر پر لیٹتے ہی نیند آ جاتی اور پھر صبح الارم سے آگے کھٹکتی تھی۔ دو دن بعد میو سے میری بات ہوئی تھی۔ وہ بدستور آرام سے تھا اور اسے کوئی تکلف نہیں تھی۔ بالو ہمہ وقت میرے لیے مخصوص تھی اور میں کسی بھی وقت اس سے کوئی کام کہہ سکتا تھا یا اسے طلب کر سکتا تھا۔ گویا بیٹی نے اپنی خادمہ مجھے ادھار دے دی تھی مگر خود وہ مجھ سے ملنے نہیں آ سکتی تھی۔ اس کے باپ کی طرف سے پابندی تھی۔

خون دینے کے بعد چوتھے دن میں جم میں تھا۔ حسب معمول حیات میری نگرانی پر تھا اور اس کا سامھی اوپر جم کے دروازے پر موجود تھا۔ چاکا ہی بالو وہاں آئی اور اس نے حیات سے کہا۔ ”تم کچھ دیر کے لیے باہر جاؤ۔“ مجھے یہاں سے جانے کا حکم نہیں ہے۔“ حیات نے انکار کیا۔

”مجھے یہاں کچھ کام ہے۔“ بالو نے تھکامانہ انداز میں کہا۔ ”یہ بے بی کا حکم ہے۔“ حیات سوچ میں پڑ گیا۔ اگرچہ اسے...۔۔۔ ممتاز نے میری نگرانی کا حکم دیا ہوا تھا لیکن بیٹی بھی اس کی مالک تھی اور وہ اس کے حکم سے سرتابی نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے سر ہلایا۔ ”کیا بی بی سے میری بات ہو سکتی ہے؟“

بالو نے اپنے وال کی ٹاکی سے بیٹی سے رابطہ کیا۔ ”بے بی، حیات آپ سے بات کرنا چاہ رہا ہے۔“

بالو نے وال کی ٹاکی کی حیات کی طرف بڑھا دیا۔ میں نے لے کر بات سنی اور پھر وال کی ٹاکی واپس کر کے اپنی شاٹ کن سنجنال ہوا اوپر کی طرف چلا گیا۔ بالو اس کے ساتھ ہی وہ دروازہ اندر سے بند کر کے آئی۔ میں ویٹ مشین پر بیچروں سے وزن اٹھانے والی ورزش کر رہا تھا۔ اب تک میں نے بالو سے پوچھا نہیں تھا کہ اسے کیا کام تھا جس کے لیے اس نے حیات کو باہر بھیج کر اندر سے دروازہ بھی بند کر رکھا تھا۔ میری طرف نہیں آئی اور جم میں آنے والے دوسرے دروازے کی طرف بڑھ گئی جہاں سے مالکان آتے جاتے تھے۔ اس نے اندر سے دروازہ کھولا اور خود باہر چلی گئی اس کی جگہ بیٹی اندر آئی تھی۔ میں نے گہری سانس لی تو یہ سارا چکر بیٹی مجھ سے ملاقات کے لیے چلا رہی تھی۔ خاص بات یہ تھی کہ اس نے بھی ورزش کا لباس پہن رکھا تھا اور یہ خالص ویٹرن اسپتال کا تھا۔ یعنی چست نیک اور مختصری بنیان، بہ ظاہر وہ ایکس سائز کرنے یہاں آئی تھی۔ میں نے اسے غور سے دیکھا۔

”اگر تمہارے پاپا کو پتا چل گیا کہ تم ان کے حکم کی خلاف ورزی کر رہی ہو اور وہ بھی کس حلے میں تو ان کا کیا رد عمل ہوگا۔“

”کچھ نہیں۔“ وہ ایکس سائز سائیکل پر آتے ہوئے بولی۔ ”وہ بے باہر ہیں ان کو پتا نہیں چلے گا۔“

”تقریباً تمام اولادوں کو یہ خوش بھی ہوتی ہے کہ ان کی حرکتوں کا ان کے والدین کو پتا نہیں چلے گا۔“

”وہ دوسری اولادیں ہوتی ہیں۔“ اس نے پھر والی سے کہا۔ ”وہ یہ تم اس کے لیے فکر مت کرو اگر انہیں پتا چل چلا گیا تو میں سنجنال لوں گی۔“

میں نے سر ہلایا۔ ”میں نے دیکھا ہے تم بڑے صاحب سے اپنی بات منوالیتی ہو کیا بیٹی میں بھی یہ کوالٹی ہے؟“

”نہیں اسے ان معاملات سے کوئی غرض نہیں ہے اور ویسے بھی پاپا نے اسے اسڈی کے لیے انگلیڈ بھیج دیا ہے۔“

”اسڈی کے لیے یا اسے کر مین جیسے گفتگوں سے دور کرنے کے لیے۔ ظاہر ہے اس کے اور بھی ایسے دوست ہوں گے۔“

”شاید۔“ اس نے تسلیم کیا۔ ”تمہیں جیسا لگا؟“

”بہترین، یہاں ہر سہولت موجود ہے۔“

”میں نے خاص طور سے ڈیزائن کرایا ہے۔“ وہ فخر سے بولی۔ ”جب تم سے ملی تو مجھے اس کے بعد سے ایکسر سائز کا شوق ہوا۔“

میں نے اس کی بات پر غور کیا۔ ”مجھ سے ملنے کے بعد کیوں؟“

”میں نے سوچا کہ انسان کی زندگی میں کتنی بات بھی کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ اس لیے اسے جسمانی طور پر ٹھ ہونا چاہیے۔ جیسے کہ تم ہو۔ اسی لیے میں نے جم بنوایا اور میں نے سیلف ڈیفنس کی تربیت بھی حاصل کی ہے۔“

میں نے حیرت سے اسے دیکھا۔ ”اچھا، لگتا نہیں ہے تم تو پہلے سے زیادہ نازک اندام ہو گئی ہو۔“

”میرا استاد چاہانی ہے۔“ وہ بولی۔ ”اس نے مجھے اس طرح سے سیلف ڈیفنس کی تربیت دی ہے کہ میرے جسم پر اثر نہیں پڑا ہے۔ اگر یقین نہیں آ رہا تو ایک دوستانہ مقابلہ کر کے دیکھ لو۔“ وہ سائیکل سے اتر آئی ذرا سی دیر میں اس کے چہرے پر پسینا موتیوں کی طرح نمودار ہو گیا تھا۔ میں ویٹ مشین سے اٹھ گیا اور تولیا سے جسم صاف کرتے ہوئے کہا۔

”اس کی ضرورت نہیں ہے مجھے یقین ہے تم نے اچھی تربیت حاصل کی ہے۔“

”پلیز میں اسے آزمانا چاہ رہی ہوں۔“

مجھے بھی ہاتھ پاؤں کھولے خامسے دن ہو گئے تھے۔ میں نے سوچا اور تولیا اچھا کر اس کی طرف بڑھا۔ ”کیا خیال ہے مقابلے کے ساتھ ساتھ کچھ گفتگو بھی کر لی جائے۔“

”کیسی گفتگو؟“ اس نے میرے پاس آتے ہی اسٹانس لیا اور ایک پیر اور ایک ہاتھ آگے نکال کر مخصوص کرانیکا کے انداز میں کھڑی ہو گئی۔

”بہن کی کنورٹیلی تمہارے پاپا پر اس قدر حاوی کیسے ہے؟“

”ان سے پاپا کے پرانے تعلقات ہیں۔“

”میں ان تعلقات کی نوعیت سمجھنے سے قاصر ہوں کیونکہ کنورٹ خاندان اعلیٰ ذات کا ہندو ہے اور وہ چھوٹ چھات کے قائل ہیں۔ راج کنور اتنا بڑا خطرہ مول لے کر یہاں آیا اور اس نے یہاں سے ایک گلاس پانی پینا بھی گوارا نہیں کیا۔ تم میری بات سمجھ رہی ہو۔ کنور خاندان مسلمانوں سے شہید نفرت کرتا ہے اور یہ بات میں نے ان کی قید میں

رہ کر بہت واضح محسوس کی پھر وہ تمہارے پاپا کے دوست کیسے ہو گئے؟“

وہ میری بات میں الجھ کر اپنا اسٹانس بھول گئی اور میں نے اچانک زمین پر بیٹھے ہوئے سوپ کپک لگائی۔ اس میں زور نہیں تھا ورنہ اسے بہت زیادہ چوٹ لگتی۔ پھر بھی وہ چیخ مار کر گری تھی۔ یہاں فرش پر موٹا ریٹرز تھا اس لیے اسے چوٹ نہیں لگی۔ میں نے کہا۔ ”جب کسی سے مقابلے کے تیار ہو تو اس کی باتوں سے زیادہ اس مقابلے پر دھیان دیا کرو۔“

وہ اٹھتے ہوئے خفت سے مسکرائی۔ ”تم نے سوال ہی ایسا کیا، میں الجھ کر رہ گئی۔ خراب نہیں سمجھوں گی۔“ اس نے دوبارہ اسٹانس بنایا اور بولی۔ ”میں اس بارے میں زیادہ نہیں جانتی، لیکن میرا اندازہ ہے کہ یہ کوئی مالی مفاد کا معاملہ ہے۔ پاپا اور ان کے درمیان کوئی ڈیل ہے۔“ اس نے کہتے ہوئے نیچلی کی طرح لپک کر میرا اور مجھ پر کرنے کی کوشش کی یعنی سوپ کپک ماری مگر میں اچھل کر بچا گیا۔ وہ گھومی اور اسے بدن کی قدرتی لپک کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اس نے کپک گور یوازہ کیا۔ مگر زمین پر قدم پڑتے ہی میں دوبارہ اچھلا تھا اور اس کا یہ وار بھی ناکام گیا۔ وہ بچوں کے بل اچھل کر کھڑی ہو گئی۔ ”تم بہت پھر تیلے ہو۔“

میں نے اس سے کہا نہیں کہ وہ ست تھی۔ شاید اس نے کچھ معمولی سا سیکھا تھا اور اسے کسی عام آدمی کے مقابلے میں اپنا دفاع کرنا آ گیا تھا۔ مگر وہ میرا کسی ماہر فن کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھی۔ اس کے بعد اس نے مجھ پر کئی حملے کیے مگر میں نے یہ آسانی انہیں ناکام بنادیا۔ ساتھ ساتھ اس سے بات بھی کرتا رہا تھا۔ اس نے مجھے باتوں سے زیادہ کچھ دوسری چیزوں میں الجھانا چاہا لیکن ناکام رہی۔ آخر میں اس نے ہاتھ اٹھا دیے۔ ”میں ہار گئی، تم نے جیت سکتی۔“

”چند منٹ میں تم نے بہت کچھ سیکھا ہے لیکن ابھی تمہیں اس سے کہیں زیادہ سیکھنا ہوگا۔“

اس کا اسٹینڈا بھی زیادہ نہیں تھا۔ اس کا سانس پھول گیا تھا اور میری نسبت کہیں زیادہ پسینا پسینا ہو رہی تھی۔ جب کہ میرا سانس ابھی معمول پر تھا۔ اس چند دن کی ورزش نے میرا اسٹینڈا اور قوت کار کو خاصا بہتر بنایا تھا۔ اس نے رشک سے مجھے دیکھا۔ ”تمہارا سانس ذرا نہیں پھولا۔“

”ہاں میرا اسٹینڈا بہتر ہوا ہے۔“ میں نے تسلیم کیا۔ ”ابھی ایک بار میرا خون لیا گیا ہے۔ جب مزید خون لیا

جائے گا تب میں اتنا بہتر نہیں رہوں گا۔“
 ”لیکن پاپائے تو کہا تھا کہ تمہاری صحت پر کوئی فرق نہیں پڑے گا۔“ وہ بے چین ہو گئی۔

”شاید انہوں نے درست نہیں کہا ہے میری ڈاکٹر سے بات ہوئی ہے اور اس کا کہنا ہے کہ کسی صحت مند آدمی کے لیے دو مہینے میں ایک بار ہی ایک لیٹر خون دینا مناسب ہے اس سے زیادہ خون دینا اس کی صحت پر اثر ڈالتا ہے جب کہ میرا ہر مہینے نصف لیٹر خون لیا جائے گا۔ اگر اس سے میری جان کو خطرہ نہ بھی ہوا تب بھی میں کمزور پڑ جاؤں گا۔ ہو سکتا ہے میں بیمار پڑ جاؤں۔“

میں دیکھ رہا تھا کہ اس کی تشویش بڑھ رہی ہے۔ یہ اچھی بات بھی وہ جتنا تشویش زدہ ہوتی میرے لیے اتنی ہی کوشش کرتی۔ ”ایسا نہیں ہوگا اگر تم کمزور ہوئے تو خون لینے کا سلسلہ روک دیا جائے گا۔“

”کیا یہ تمہاری اپنے پیپا سے ڈیل ہے۔“
 اس نے سر ہلایا۔ ”میں تم سے ملنا چاہ رہی تھی لیکن موقع نہیں ملا، اس لیے یہ طریقہ اختیار کرنا پڑا میں نے سوچا اس بہانے ایک سرساز بھی کر لوں گی۔“

اگرچہ بیٹی کا رویہ کبھی بہت زیادہ متوجہ ہونے والا نہیں تھا پھر بھی مجھے لگتا تھا کہ وہ میری توجہ چاہتی تھی۔ مختلف بہانوں سے قریب آتا اور خود کو نمایاں کرنا شاید اسی سلسلے کی کڑی تھی لیکن وہ میری فطرت اچھی طرح جان گئی تھی اس لیے کسی براہ راست کارروائی سے گریز کر رہی تھی۔ میرے ساتھ ہمدردی کی آڑ میں یقیناً اس کی ذاتی دلچسپی تھی۔ ورنہ شاید اسے مجھ سے کوئی غرض بھی نہ ہوتی۔ کوئی میں جب

میں نے اسے اور بیٹا کو کرم دین اور کرمین کی سازش سے بچایا تھا تبھی اس کا رویہ بہت لگاؤ والا ہو گیا تھا۔ مجھے اس وقت بھی اس سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ میں کوشش کر رہا تھا کہ وہ میرے نزدیک نہ آنے پائے اور اسے اپنی توہین کا احساس بھی نہ ہو ورنہ وہ اپنے پاپا کی صف میں جا کھڑی ہوتی اور میرے لیے مشکل ہو جاتی۔ ایک گھنٹے کے دوران اس نے ایک سرساز تو اتنی نہیں کی لیکن باتیں زیادہ کیں۔ جب میں اسے کنوڑ خاندان اور اس کے پاپا کے موضوع کی طرف لانے کی کوشش کرتا تو صفائی سے کئی کئی گھنٹا جاتی۔

جب میں نے سوئمنگ پول کا رخ کیا تو وہ واپس چلی گئی اور اس کی جگہ بانو اندر آئی۔ وہ حسب معمول حیدر آبادی فراک اور پاجامے میں تھی۔ ڈیوٹی کے وقت ایک

طرح سے یہ اس کا یونیفارم تھا۔ اس نے دروازہ کھول کر حیات کو اندر بلایا اور خود اسی دروازے سے باہر چلی گئی۔ اندر آ کر حیات نے معنی خیز نظروں سے میری طرف دیکھا تھا میں نے محسوس کیا کہ اس کے انداز میں کچھ عناد بھی تھا جسے اسے بانو کا میرے ساتھ یہاں اکیلے رہنا پسند نہیں آیا تھا مگر میں نے کوئی توجہ نہیں دی۔ ورژس کے بعد تیراکی سے جسم کے پھل جانے والے مسلو تیزی سے اپنی پوزیشن میں آ جاتے ہیں اور ان میں سختی پیدا نہیں ہوتی ہے جیسا کہ باڈی بلڈر کے مسلو میں آ جاتی ہے اور وہ پھرتی سے محروم ہو جاتے ہیں۔ میں اکثر ایسی ورژس کر رہا تھا جو جسم کو بنانے کے بجائے اسٹینڈا اور قوت میں اضافہ کرتی ہیں ساتھ ہی جسمانی لچک اور رفل کو بھی بڑھاتی ہیں۔

دو دن بعد بیٹی پھر اسی طرح آئی اور اس دن وہ ذرا معقول چلے میں تھی یعنی اس نے ٹراؤزر کے ساتھ ٹی شرٹ پہن رکھی تھی۔۔۔ ممتاز کے بارے میں اس نے انکشاف کیا کہ وہ لاہور میں مقیم تھا اور اس کی جلد ممتاز ہاؤس واپس کا کوئی امکان نہیں تھا اسی لیے بیٹی پھر جم چلی آئی تھی۔ اس دن غنی نے بھی سنجیدی سے ورژس کی۔ گفتگو کا سلسلہ بھی جاری تھا مگر یہ گفتگو زیادہ تر حالاتِ حاضرہ اور دلچسپی کے دوسرے موضوعات پر تھی۔ میں نے محسوس کیا تھا کہ وہ اپنے باپ اور کنوڑ خاندان کے تعلقات کے بارے میں بات کرنے سے گریز کرتی ہے اس لیے میں نے دوبارہ یہ ذکر نہیں چھیڑا۔ البتہ اس نے بانو کا ذکر پھیر دیا۔ ”کیا بات ہے تم اس سے اتنا گریز کیوں کرتے ہو؟“

”میں گریز کرتا ہوں؟“ میں نے حیرت سے کہا۔ ”وہ بے جاری تو سارا دن میری خدمت میں لگی رہتی ہے۔ ہر تھوڑی دیر بعد میں اسے کسی نہ کسی کام کے لیے کہتا ہوں۔“

”میں وہ بات نہیں کر رہی ہوں۔“ بیٹی نے منہ بتایا۔ ”وہ خوب صورت لڑکی ہے۔“
 ”اگر تمہارا مطلب ہے کہ میں اس کی خوب صورتی کی طرف توجہ نہیں دیتا ہوں تو تم جانتی ہو میں عورت کو صرف عورت سمجھنے کا قائل نہیں ہوں۔“

”میں جانتی ہوں۔۔۔۔۔“ غنی نے مفاہمہ انداز اختیار کیا۔ ”کیونکہ میرا لہجہ سنجیدہ ہو گیا تھا۔“ تم اکیلے ہو کوئی تفریح نہیں ہے۔ ایک طرح سے قید میں ہو۔ میں تمہارے

پاس نہیں آ سکتی ہوں اس لیے میں چاہتی ہوں بانو تم کو کہنی دے، وہ پرچی لکھی اور ذہین لڑکی ہے۔ تم اس سے بات کر سکتے ہو۔“

”تم سے بات ہو تو جاتی ہے۔“ میں نے جان چڑانے کے لیے کہا۔

”ہاں لیکن اس طرح کئی دن بعد۔“ اس نے ٹھنڈی سانس لی۔ ”تم نہیں جانتے اس ایک ملاقات کے لیے مجھے کتنے جتن کرنے پڑتے ہیں۔“

”میری سادھ پر کیا گزرتی ہے اس بارے میں تم سوچتی بھی نہیں ہوگی۔“

وہ چونکی۔ ”تمہاری سادھ، کیا ہوا ہے؟“

”تم خود سوچو کہ بانو حیات کو یہاں سے رخصت کر کے اندر سے دروازہ بند کرتی ہے اور حیات کے خیال میں ایک ڈیڑھ گھنٹا میرے ساتھ رہتی ہے تو وہ میرے بارے میں کیا سوچتا ہوگا۔“

”وہ حکم کا غلام ہے، اس کی جرات کہ کچھ سوچ سکے۔“ غنی کو خفا آ گیا۔ ”کیا اس نے تم سے کچھ کہا ہے۔“

”نہیں۔۔۔۔۔“

”جب تمہیں اپنی سادھ کی فکر کیوں لگ گئی ہے؟“

”کیونکہ میں سیلف ریسپکٹ کا قائل ہوں۔“ میں نے بتا کر کہا۔ ”میری عزت سب سے پہلے میری اپنی نظر میں ہے۔“

”ٹھیک ہے جب تم کوئی غلط کام نہیں کر رہے ہو تو یہ عزت تمہاری اپنی نظر میں بحال رہنی چاہیے۔“ اس نے مجھے لا جواب کرنے کے انداز میں کہا۔ ”حیات ایک معمولی سا ملازم ہے۔“

”کچھ دن پہلے تو تم اسے بڑے صاحب کا اہم ترین کارڈ اور آدمی قرار دے رہی تھیں۔“

”ملازم کتنا ہی اہم کیوں نہ ہو ملازم ہی ہوتا ہے۔“ غنی نے ایک آفاقی حقیقت بیان کی۔

اس دن جب میں حیات کے ساتھ واپس کرے کی طرف جا رہا تھا تو اس کا مڑو پہلے سے زیادہ خراب تھا، اس نے آج بیٹو سے میری بات بھی نہیں کرائی تھی جب میں نے خود توجہ دلائی تو وہ رکھائی سے بولا۔ ”میٹری چارج کر رہا ہوں، ابھی نہیں کر سکتا۔“

”تب ایک گھنٹے بعد کرا دو اور میں نے کون سا کھنڈل بات کرتی ہوتی ہے، مجھے اپنے ساتھی کی خیریت

معلوم کرنی ہوتی ہے۔“

اس نے کوئی جواب نہیں دیا اور کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر لیا تھا۔ جب اس نے ایک گھنٹے بعد بیٹو سے میری بات نہیں کرائی تو میں نے بانو کو کال کی، وہ میرے لیے کھانا لا رہی تھی۔ اس نے اسے بتایا کہ حیات کے دماغ میں کوئی کیڑا کھلا رہا ہے اور وہ بیٹو سے میری بات کرانے سے گریز کر رہا ہے تو اس نے کہا۔ ”میں آ رہی ہوں ابھی حیات سے بات کرتی ہوں۔“

شاید بیٹو بھی حیات کی تحویل میں تھا اور اس سے بات کرانے کی ذمہ داری اس کی تھی۔ یعنی وہ نمبر کی اور کے پاس نہیں تھا جس سے بیٹو سے بات کی جا سکتی تھی اس لیے حیات کو باقی پاس کر کے اس سے رابطہ ممکن نہیں تھا۔ کچھ دیر بعد میں نے محسوس کیا کہ دروازے کے باہر کوئی بول رہا ہے۔ میں نے دروازے سے کان لگائے تو دوسری طرف سے بانو کی آواز آئی۔ ”تم نے شہباز صاحب کی ان کے ساتھی سے بات کیوں نہیں کرائی؟“

”یہ میرا کام ہے تمہیں اس میں دخل دینے کی ضرورت نہیں ہے۔“ حیات نے اٹھ کر انداز میں کہا۔

”میرا بھی اس سے تعلق ہے۔ بے بی نے ان کی ذمہ داری مجھے سونپی ہے۔ اگر ان کو کوئی مشکل ہوگی تو۔۔۔۔۔“

”بہت خیال ہے تمہیں اس کی مشکلوں کا۔“ حیات کا لہجہ زہریلا ہو گیا تھا۔ ”جم میں دروازہ اندر سے بند کر کے تم اس کی کون سے مشکل آسان کرتی ہو؟“

”ذلیل شخص۔“ بانو نے کہا اور ایسی آواز آئی جیسے اس نے حیات کو تھپڑ مارا ہو۔ ایسا ہی ہوا تھا کیونکہ پھر حیات کی سر آواز آئی۔

”بانو میں یہ تھپڑ ہمیشہ یاد رکھوں گا اور ایک وقت آئے گا جب تمہیں اس کا حساب دینا ہوگا۔“

”اس سے پہلے میں تمہیں دوسرا تھپڑ لگاؤں میرے راستے سے ہٹ جاؤ۔“ بانو برہمی سے بولی۔ ”تم اس قابل بھی نہیں ہو کہ میں تم سے بات کروں۔ میں نے بے بی سے شکایت کر دی تو تم ایک منٹ میں فارغ کر دیے جاؤ گے۔“ وہ تو بہت قابل آدمی ہے نا۔ حیات پھر زہریلے انداز میں بولا۔ اس پر بیٹی سے شکایت کرنے کی دھمکی کا کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔ بانو اس کی بکواس پر توجہ دے بغیر دروازے تک آئی تھی مگر اس سے پہلے وہ دروازہ کھول کر اندر آئی میں واپس بیڈ پر بیٹھ گیا تھا۔ وہ اندر آئی تو اس کا گلابی چہرہ تھسے

سے سرخ ہو رہا تھا اور وہ اپنا نچلا گداز لب دانتوں میں دبا رہی تھی۔ میں نے انجان بن کر پوچھا۔

”خیر تم.... یہ لال نیلی کیوں ہو رہی ہو۔“
اس نے گہری سانس لے کر خود پر قابو پانے کی کوشش کی۔ عام طور سے وہ اندر آنے کے بعد دروازہ بند نہیں کرتی تھی لیکن اس وقت اس نے دروازہ بند کر دیا تھا اور چپ چاپ میز پر کھانا لگانے لگی۔ جب میں ہاتھ دھو کر آیا تو اس نے آہستہ سے کہا۔ ”کچھ نہیں، آدمی ملازمت میں مجبور ہو جاتا ہے لیکن میری مجبوری ان سے کہیں زیادہ ہے۔ کچھ لوگ ملازمت چھوڑ کر بھی نہیں جاسکتے۔“

”ایسی کیا بات ہو گئی؟“ میں نے کہا۔ ”اور میرا خیال ہے تم بچی کے پاس ملازم ہو۔“

”نہیں.... میں بڑے صاحب کی پروردہ ہوں۔ بچپن سے اسی جگہ رہی ہوں۔ انہوں نے مجھے پڑھایا لکھایا اور پھر مجھے بے پی کی کوڈے دیا۔ یہ ملازمت نہیں ہے۔“
وہ جذباتی طور پر منتشر تھی اس لیے یہ بات کہہ گئی پھر اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا اس نے جلدی سے معذرت کی۔ ”سوری سر، یہ آپ کا مسئلہ نہیں ہے میں نے بلاوجہ آپ کو بتادیا۔“

”کوئی بات نہیں۔“ میں نے نرمی سے جواب دیا۔
”اول تو میں نے خود پوچھا تھا اور دوسرے آدمی کسی کے سامنے دل کا بوجھ ہلکا کر لے تو اس میں کوئی برائی نہیں ہے۔“

”جھینک پوسر“ آپ اچھے آدمی ہیں۔“ اس نے ممنونیت سے کہا۔

میں ہنسا۔ ”میرے اکثر جاننے والے یہی کہتے ہیں لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ درست کہتے ہیں۔“

”نہیں سر، آپ سچ اچھے آدمی ہیں۔“ اس بار وہ بے ساختہ بولی۔ ”آپ نے بھی ان نظروں سے مجھے نہیں دیکھا جن سے یہاں کا ہر فرد دیکھتا ہے۔“
میں نے موضوع بدل دیا۔ ”میرے لیے کھانا کون بناتا ہے؟“

”میں خود بناتی ہوں۔“

میں نے حیرت سے کہا۔ ”اچھا میں تو سمجھتا تھا کہ شیف بناتا ہے۔“

”وہ عام کھانے بناتا ہے دراصل میں نے محسوس کیا کہ وہ آپ کے لیے مخصوص کھانے اس طرح نہیں بناتا جیسے

اسے بنانے چاہئیں اس لیے اب میں خود بناتی ہوں۔“
”اسی وجہ سے مجھے چار پانچ دن سے کھانے کے ڈانٹے میں واضح فرق لگ رہا ہے۔“

اس نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔ ”کیا مزے کا نہیں ہے سر، میں نے تو اسی لیے شیف سے لیا تھا کہ....“
”بہت مزے کا ہے۔“ میں نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔ ”شیف بھی برا نہیں بناتا تھا لیکن تمہارے بنائے کھانے کا ذائقہ الگ سے محسوس ہوتا ہے۔“

”جھینک پوسر۔“
”مجھے سہمت کہا کرو، مجھے اس لفظ سے الرجی ہے۔ سن کر ہی برا لگتا ہے۔ میرا نام شہباز ہے، اگر تم چاہو تو نام لے سکتی ہو یا چاہو تو شہباز صاحب کہہ سکتی ہو۔“

”شہباز صاحب ٹھیک رہ گئے۔“ اس نے جلدی سے کہا۔ ”آپ کھانا کھائیے پھر مجھے کال کیجئے گا میں نے آپ کے لیے انجیل ٹیک بنایا ہے۔“

جاتے ہوئے اس کا موڈ اچھا ہو گیا تھا۔ کھانے کے بعد وہ میرے لیے ٹیک لے آئی۔ یہ خاص کالے انگور، پیلی اور انناس سے بنایا ہوا ٹیک تھا اور واقعی لا جواب تھا۔ میں نے ٹیک کی دکانوں سے بے شمار قسم کے پھلوں کا اور کاک ٹیل ٹیک بھی پیا ہے لیکن اس کا ذائقہ واقعی سب سے منفرد تھا۔ میں نے تعریف کی تو وہ خوش ہو گئی۔ ”اب میں آپ کے لیے روز بنائوں گی۔“

”روز نہیں ایک دن چھوڑ کر ورنہ میں عادی ہو جاؤں گا اور پھر مجھے اتنا اچھا نہیں لگے گا۔“

”جیسے آپ کہیں، میں بدل بدل کر بھی ٹیک بنا سکتی ہوں۔“

”تب ٹھیک ہے تم روز ٹیک لے آنا۔“ میں نے اجازت دے دی۔ اس کے جانے کے کچھ دیر بعد حیات نے دروازے پر دستک دی اور موبائل مجھے پکڑا دیا۔ مجھے شرارت سوچی۔ میں نے اسے غور سے دیکھا۔

”خیریت تمہارا منہ سو جا ہوا ہے کیا کسی نے مارا ہے۔“
اس نے خونخوار نظروں سے مجھے دیکھا اور خون کے گھونٹ پی کر بولا۔ ”ابھی تک کوئی مانی کا لال ایسا پیلا نہیں ہوا جو میرے منہ پر چھڑ مار سکے۔“

میں نے مزید شرارت آمیز سادگی سے کہا۔ ”اچھا تمہارا ہے، بڑے صاحب تو یہاں ہیں نہیں تو پھر کس نے

اپنی جرأت کی؟“

جواب میں اس نے دروازہ دھڑام سے بند کر کے مجھے ٹھٹھاپا کال دی۔ میں نے بیٹو سے بات کی اور وہ نمبر ذہن نشین کر لیا جس سے وہ بات کر رہا تھا۔ کال ختم کر کے میں نے جوابی کال اور پھر ایس ایم ایس کرنے کی کوشش کی لیکن دونوں بار مجھے بیٹلس ختم ہونے کی خوشخبری سنائی گئی۔ بیٹلس سانس لے کر میں نے موبائل حیات کو واپس کر دیا۔ وہ بے وقوف نہیں تھا کہ بیٹلس کے ساتھ موبائل مجھے دے دیتا۔ اس وقت لون لینے کی ہولت بھی نہیں تھی ورنہ میں لون لے کر کال کرتا۔ بانو کے معاملے میں اس کا غصہ اپنی جگہ لیکن اس نے میرے معاملے میں اپنی مکاری برقرار رکھی تھی اور مجھے کوئی ہلکا سا موقع دینے کے لیے بھی تیار نہیں تھا۔

دو دن بعد میرا خون نکلا گیا تھا۔ اس بار بھی نصف لیٹر تھا لیکن خون دینے کے بعد میں نے ہلکی سی کمزوری محسوس کی تھی۔ اگرچہ یہ کمزوری چند منٹ کے لیے تھی جیسے ہی مجھے انگلیشن لگا اور جوں پیا تو خود کو پہلے کی طرح محسوس کرنے لگا۔ اس دن صبح کی ایئر سائز نہیں کی تھی اور آرام کیا تھا لیکن جب شام کو جگ بجا تو خلاف معمول میں نے تھکاوٹ محسوس کی تھی۔ میں دو گھنٹے کے بجائے ایک گھنٹے میں واپس آ گیا تھا۔ مجھے تشویش ہونے لگی تھی کہ صرف دوسری بار خون دینے سے میں تھکاوٹ اور کمزوری محسوس کر رہا تھا آجیدہ نہ جانے میرا کیا حال ہونے والا تھا۔ میں قوت بخش دو دھم غدا میں زیادہ مقدار میں لے رہا تھا۔ باقاعدگی سے ورزش نہ میری صحت کو پہلے سے کہیں بہتر بنادیا تھا۔ مجھے اتنی جلدی کمزوری کا شکار نہیں ہونا چاہیے تھا مگر اگلے دن تک میں ناول ہو گیا تھا اس لیے تشویش بھی مدہم پڑ گئی۔

ایک وجہ شاید یہ بھی ہو سکتی تھی کہ جب پہلی بار میرا خون لیا جا رہا تھا تو مجھے حکیم قافوں سے علاج کرائے زیادہ کر رہی تھی ہوا تھا اور اس وقت میرے جسم میں مجبوری دواؤں کا اثر باقی تھا۔ یہی وجہ تھی کہ میں بہت زیادہ خون نکالنے کے باوجود کمزوری کا شکار نہیں ہوا تھا اور آخری مرتبہ غیر معمولی مقدار میں خون لینے کے باوجود بچ گیا تھا مگر اب وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان دواؤں کا اثر بہت کم ہو گیا تھا لیکن ہے اس وجہ سے... کم مقدار میں خون دینے کے باوجود میں کمزوری کا شکار ہو رہا ہوں۔ مگر ضروری نہیں تھا کہ مجھے ہو۔ ان دواؤں کا ایک اثر اب تک برقرار تھا کہ

میرے زخم چاہے وہ کتنے ہی گہرے کیوں نہ ہوں غیر معمولی تیزی سے بھر جاتے تھے۔ پھر خون بھی صرف نصف لیٹر لیا جا رہا تھا جب کہ آدمی ایک لیٹر خون دے کر بھی بغیر کمزوری کے صحت مند رہ سکتا ہے۔

مممت از واپس آ گیا تھا۔ یہ اطلاع مجھے بانو نے دی۔ مگر وہ آرام کرنے آیا تھا کیونکہ جو توڑنے اُسے توڑ دیا تھا اور دن رات اس میں لگے رہنے کے بعد وہ تھک گیا تھا اس لیے چند دن کے لیے سستانے کو ممتاز ہاؤس آیا تھا۔ بانو کا کہنا تھا کہ وہ چند دن بعد دوبارہ جائے گا۔ اگر سہ ماہی ممتاز کی موجودگی اور غیر موجودگی کا مجھ پر زیادہ اثر نہیں پڑتا تھا۔ سوائے اس کے کہ بچی مجھ سے ملنے نہیں آ سکتی تھی مگر اس سے ملنا اتنا ضروری بھی نہیں تھا۔ اتنا تو میں نے جان لیا تھا کہ وہ اپنے باپ کی مرضی کے خلاف میری کوئی مدد نہیں کر سکتی تھی۔ پھر بھی میں اس سے واپس ہونا نہیں چاہتا تھا اور بیوسترہ سٹجر سے امیدیں بھار رکھ کے مصرع بر عمل پیرا تھا۔

بانو اب کھانا لانے کے ساتھ کبھی بھی وہیں رک جاتی تھی اور جب تک میں کھانا کھاتا وہ گپ شپ کرتی تھی۔ ظاہر ہے وہ میرے ساتھ کھانے کی حالت میں نے کئی بار اسے دعوت دی مگر اس نے سوری کر لی۔ یہ حفظ مراتب کے خلاف ہوتا۔ میں بھی زیادہ اصرار نہیں کرتا تھا۔ ورنہ شاید حفظ مراتب کی اس خلاف ورزی پر اسے کچھ سہنا پڑتا۔ اس کی حیات سے جھڑپ پرانی بات ہو گئی تھی اور میرا خیال تھا کہ دونوں نے معاملہ کول کر دیا تھا۔ بانو کے لیے اس میں بے عزتی تھی اور حیات کے لیے بے عزتی کا خطرہ اور بھی زیادہ تھا۔ شاید اس نے بعد میں موقع پا کر بانو سے معافی مانگ لی ہوگی۔ جب میں کمرے میں ہوتا تھا تو حیات یا اس کے سانگی میں سے ایک ہی شخص باہر ہوتا تھا اور دوسرا اس دوران میں آرام کرتا تھا لیکن میرے کمرے سے باہر نکلنے کے وقت حیات لازمی موجود ہوتا تھا۔۔۔۔۔ ممتاز کی طرف سے یہ اس کی لازمی ذمہ داری تھی۔

تیسری بار خون نکالنے سے ایک دن پہلے جب میں جیم میں مصروف تھا تو بانو اندر آئی اسے دیکھ میں سمجھ گیا کہ بچی آنے والی ہے اور یقیناً۔۔۔۔۔ ممتاز دوبارہ روانہ ہو گیا تھا۔ بانو کو کچھ کر حیات حسب معمول کچھ اور سمجھا تھا اور اسے گھورتا ہوا باہر گیا تھا۔ اس کے جانے کے بعد بانو دانت بیٹتی واپس آئی۔ وہ دروازہ بند کرنے لگی تھی۔ حیات اور اس کے سانگی کو بے خبر رکھنا لازمی تھا اس لیے بچی کی آمد سے

پہلے جم کا سروں ڈور اندر سے لازمی بند کیا جاتا تھا ورنہ اس بات کا خطرہ تھا کہ حیات کسی وقت بھی اندر آ سکتا تھا۔ بانو دوسرے دروازے سے باہر نکلی اور اس کی جگہ بنی اندر آئی۔ آج وہ پھر مختصر لباس میں تھی۔ مجھے خیال آیا کہ یہ لباس وہ صرف میری موجودگی میں پہن کر آئی تھی یا پھر وہ اس جم میں اسی لباس میں ورزش کرتی تھی۔ ویسے یہ جتنا روشن خیال گھرانہ تھا اس کے افراد سے ہر چیز کی توقع کی جاسکتی تھی۔

”بڑے صاحب چلے گئے؟“ میں نے کہا۔
 ”ہاں... تم سناؤ کیا چل رہا ہے سب؟“
 ”دوسری بار خون دینے کے بعد مجھے ہلکی کمزوری محسوس ہوئی تھی حالانکہ جب میں کنوروں کی قید میں تھا اور انہوں نے میرے جسم سے فی ہفتہ ایک لیٹر خون نکالا تھا تب بھی میں نے اتنی کمزوری محسوس نہیں کی تھی۔“
 وہ فکر مند ہو گئی۔ ”ایسا کیوں ہے؟“ میں ڈاکٹر سے پوچھتی ہوں۔“

کنوروں کی بات آئی تو اس نے پہلی بار خود پوچھا۔ ”تم ان کے ہاتھ کیسے لگے؟“
 ”یہ بی داستان ہے۔“
 ”تم مختصر کر کے سنا دو۔“ اس نے اصرار کیا تو میں ایک سر ساز کے ساتھ ساتھ اسے بتانے لگا کہ میں کنوروں کے ہاتھ کیسے لگے تھا۔ حسب معمول سوالات کی مدد سے داستان لمبی ہوتی چلی گئی۔ اوشا کا ذکر آیا تو وہ چونک گئی۔ ”سپیرے کی بنی، کیسی تھی؟“
 ”یہ فام تھی لیکن خوب صورت تھی۔“
 ”تم سے متاثر ہوئی ہوگی؟“ اس نے معنی خیز انداز میں پوچھا۔

”ایسا بھی نہیں ہے کہ میری زندگی میں آنے والی ہر لڑکی مجھ سے متاثر ہو جائے۔“
 ”لیکن متاثر ہونے والیوں کی تعداد بھی اچھی خاصی ہے۔“

اگر اسے معلوم ہو جاتا کہ اوشا کس طرح میری دیوانی ہو گئی تھی کہ اپنے باپ سے بغاوت کر بیٹھی تھی اور اس سے اپنی کھال اتروائی تھی تو نہ جانے اس کا کیا رد عمل ہوتا۔ اس لیے اوشا کا ذکر ایک حد میں رکھتے ہوئے میں نے اسے کنور خاندان کے ہاتھ لگنے کا واقعہ سنایا پھر انہوں نے کیوں میرا خون نچوڑنے کی کوشش کی اور کس طرح میری جان پکی۔ جب میں نے قبائلیوں کے خلاف کنور خاندان کی سازش اور

بھارتی حکومت کی بربریت کا بتایا تو وہ حیران ہوئی تھی۔ اس نے بے ساختہ کہا۔ ”اسنے سفاک لوگ ہیں۔“
 میں نے ملامت سے کہا۔ ”تمہیں ایک جاگیر دار خاندان کی نو چشم ہو کر بھی نہیں معلوم کہ غریبوں کے ساتھ اس قسم کے لوگ کیسی سفاکی دکھاتے ہیں۔“
 ”ہمارے ہاں ایسا نہیں ہوتا ہے۔“ اس نے دو ٹوک انداز میں کہا۔ ”ٹھیک ہے ہم جاگیر دار ہیں لیکن اپنے لوگوں کا خیال بھی رکھتے ہیں۔“
 ”جیسے بانو کا رکھا ہوا ہے؟“

میں نے کہا تو اس نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ ”تمہیں بانو نے بتایا ہے؟“
 میں نے سر ہلایا اور پھر اسے حیات کے ساتھ بانو کی جھڑپ کے بارے میں بتایا۔ ”وہ اس سے دل برداشتہ تھی اس لیے اس کے منہ سے نکل گیا۔“
 بنی نے سر ہلایا۔ ”میں جانتی ہوں وہ میری وفادار ہے مجھ سے محبت کرتی ہے۔“
 ”لیکن ہے تو تم لوگوں کی پروردہ۔“

”اس کا باپ پایا کی زمین پر کام کرتا تھا اور ماں یہاں ملازم تھی۔ ایک بار یہ لوگ کسی رشتے دار کی شادی میں جا رہے تھے کہ برات کی بس کو حادثہ پیش آ گیا۔ دونوں ماں باپ مارے گئے بس یہی بچی تھی۔ پوپیس بانو کو ہمارے پاس لے آئی تھی۔ اس کے اور رشتے دار بھی تھے لیکن جب میں نے اسے دیکھا تو بابا سے کہا کہ اسے رکھ لیں۔ بابا مان گئے۔ اسے ایک ملازمہ کے سپرد کر دیا گیا۔ بڑی ہوئی تو اسکول میں داخل کر لیا گیا۔ اس نے لاہور کے ایک اچھے کالج سے گریجوئٹ کیا۔ میں تو جانتی تھی کہ وہ مزید پڑے اور اپنا مقام بنائے۔ ہو سکے تو کوئی پروفیشنل ڈگری حاصل کرے لیکن اس نے انکار کر دیا۔ اس نے مجھ سے اور بابا سے کہا کہ اسے کوئی ڈسٹے داری دی جائے وہ ایسے ہی یہاں نہیں رہنا چاہتی تھی۔ تب میں نے اس سے کہا کہ وہ میری سکرٹری بن جائے۔“

”مگر امیٹیں سے وہ سکرٹری کی جگہ خادمہ لگتی ہے۔“
 ”میں اسے سکرٹری کا درجہ دیتی تھی مگر اس نے مجبور کیا کہ اسے ملازمہ کے لحاظ سے ٹریٹ کیا جائے۔“
 مجھے حیرت ہوئی اگر بنی درست کہہ رہی تھی تو یہ لوگ بانو پر مہربان تھے اور اس نے موقع سے فائدہ نہیں اٹھایا۔ وہ کوئی پروفیشنل ڈگری حاصل کر لیتی تو اپنی لائف خود بخود

تھی۔ بے شک وہ ممتاز باؤس میں ملازمہ تھی اور بنی کی خادمہ کی حیثیت سے وہ الگ ہی تھی لیکن تھی تو ملازمہ۔ چاہے اسے کوئی بھی تنخواہ دے دی جاتی یا یہاں وہ کتنی ہی سکون و آسائش سے رہتی۔ شاید اس میں ہمت کی کمی تھی اور وہ باہر نکل کر دنیا سے اپنا حصہ طلب کرتے ہوئے ڈر رہی تھی۔ ممتاز باؤس بچپن سے اس کے لیے گوشہ عافیت رہا تھا اور وہ یہاں سے نکلے ہوئے گھیرا رہی تھی۔ بنی نے معنی خیز انداز میں پوچھا۔ ”کیا بات ہے آج بانو میں بہت... دیکھی لے رہے ہو؟“

”ایسے ہی۔“ میں نے سوئمٹنگ پول کی طرف جاتے ہوئے کہا۔ ”کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ کل تم خون لینے کے موقع پر میرے ساتھ وہاں رہو۔“
 ”میں کوشش کروں گی۔“ اس نے وعدہ کرنے سے گریز کیا۔ جب میں سوئمٹنگ کرنے جاتا تو وہ رخصت ہو جاتی تھی۔ اس روز بھی اس نے ایسا ہی کیا۔ اس کے جاتے ہی بانو آئی اور سروس ڈور کی طرف گئی۔ اس کے جانے کے کچھ دیر بعد حیات اندر آیا۔ وہ کب آیا میں نے غور نہیں کیا تھا۔ سوئمٹنگ کر کے میں واپس کمرے میں آیا اور نہاد دھو کر کھانے کا انتظار کرنے لگا۔ مگر جب مقررہ وقت پر بانو نہیں آئی تو میں نے اسے واک ٹاکی پر کال کی۔ مگر دوسری طرف سے کوئی جواب نہیں آ رہا تھا بس سائیں سائیں کرتی آواز آرہی تھی۔ غالباً کسی وجہ سے واک ٹاکی کا رابطہ نہیں ہو رہا تھا۔ میں نے انتظار کیا پھر دروازہ بجایا۔ باہر سے حیات نے پوچھا۔

”کیا بات ہے؟“
 ”بانو ابھی تک کیوں نہیں آئی کھانا لے کر؟“
 ”بڑی بے چینی ہے تمہیں بانو کی۔“ اس نے متحیرانہ انداز میں کہا۔

میں نے اسے گھورا۔ ”میری بات کا جواب دو وہ اب تک کیوں نہیں آئی ہے؟“
 وہ رکھائی سے بولا۔ ”مجھے کیا معلوم، میں اس کا گھر ان نہیں ہوں۔“

مجھے کھانے سے زیادہ بانو کی فکر ہو رہی تھی جب سے اس نے یہ ڈسٹے داری سنبھالی تھی گھڑی کی سوئیوں کی سی باقاعدگی سے کام کرتی تھی۔ اور آج بارہ بج کر بیس منٹ ہوئے والے تھے اور وہ نہیں آئی تھی۔ آدھے گھنٹے بعد دروازے پر دستک ہوئی اور دروازہ کھلا۔ میں سمجھا کہ بانو ہو

گی لیکن اس کی جگہ وہی نو جوان ملازمہ جو پہلے دن نظر آیا تھا وہ کھانے کی ٹرائی لایا تھا۔ میں نے پوچھا۔ ”بانو کیوں نہیں آئی ہے؟“
 ”مجھے نہیں معلوم جناب۔“ وہ بولا۔ ”میرا تعلق کچن سے ہے۔“

”بانو میرا کھانا بناتی ہے کیا وہ کچن میں آئی تھی؟“
 ”ہاں نہیں جناب، مجھے شیف نے بلا کر یہ ٹرائی آپ کے لیے لے جانے کا حکم دیا میں لے آیا۔“
 دوسرے لفظوں میں اسے بالکل علم نہیں تھا کہ کھانا بانو نے بنایا ہے یا نہیں اور وہ کہاں تھی۔ میں نے اس سے کہا۔ ”کیا بے نیکی میرا پیغام لے جاسکتے ہو۔“

”بے نیکی صرف بانو پیغام لے جاسکتی ہے۔“ اس نے معذرت کی اور رخصت ہو گیا۔ کھاتے ہوئے میں سوچ رہا تھا کہ ایسی کیا بات ہو گئی کہ بانو نہیں آئی۔ اگرچہ یہ کوئی خاص بات بھی نہیں تھی۔ بانو کا نہ آنا اور آنا تقریباً برابر تھا۔ اگر بنی اس سے لے کر یہ ڈسٹے داری کسی اور کے سپرد کر دیتی تب بھی مجھے کوئی خاص فرق نہیں پڑتا۔ مگر ایک بانو کا نہ آنا مجھے کھٹک رہا تھا۔ اس کا تعلق بنی سے تھا اور بنی اس گھر میں میری واحد بھروسہ تھی۔ اس کی کوششوں سے میں راج کنور کے قبضے میں جانے سے محفوظ رہا تھا۔ اگر اس کی سوچ میں کوئی تبدیلی آئی تھی تو مجھ پر اس کا لازمی اثر پڑتا اس لیے میں بانو کے لیے فکر مند تھا۔ بہر حال یہ فکر مجھ پر زیادہ دیر سوار نہیں رہی تھی کیونکہ میں ہر قسم کے حالات کا بہت جلد عادی ہو جاتا ہوں۔ اس قید میں میرے لیے سب سے زیادہ تشویش ناک بات بیٹو کی قید تھی۔ اس کی وجہ سے میں اپنے ہاتھ پاؤں بندھے ہوئے محسوس کر رہا تھا۔ ورنہ اب تک آزاد ہونے کی کوشش کر چکا ہوتا۔ مگر اب میری ایسی کسی کوشش کا اثر بیٹو پر پڑتا اور اسے غمازہ سمجھنا پڑتا۔ اس لیے میں دیکھو اور انتظار کرو کی پالیسی پر عمل پیرا تھا۔

اگلے روز میں خون دینے کے لیے صبح سویرے کھینک پہنچا۔ ڈاکٹر نے پھر نصف لیٹر خون نکالا اور جب میں نے خون دے کر اٹھنے کی کوشش کی تو ایک لمحے کو مجھے چکر آ گیا تھا۔ اس لمحے میں سب بلیک آؤٹ ہو گیا۔ گول منڈل نرس پاس کھڑی تھی اس نے میری کیفیت بھانپ لی اور مجھے سہارا دیا ورنہ شاید میں گر جاتا۔ مگر دوسرے لمحے میں ہوش میں آ گیا اور میں نے خود کو سنبھال لیا۔ ڈاکٹر نے مجھے دوبارہ لیٹنے کو کہا اور مجھے اس بار طاقت کا انجکشن چھوٹی ڈرپ میں لگا کر دیا۔ اس

سے میری کیفیت خاصی بہتر ہوئی تھی پھر جوں ہی کر میری طبیعت تقریباً بحال ہو گئی تھی۔ مگر اپنی لمبائی کیفیت نے مجھے فکر مند کر دیا تھا۔ کیا میری صحت عام معیار سے بھی نیچے جا چکی تھی۔ واپسی کے بعد بھی میں اپنی کیفیت بھانپنے کی کوشش کرتا رہا۔

گزشتہ دن سوائے ناشتے کے باقی دن وہی لڑکا مجھے کھانا لاکر دیتا رہا تھا لیکن میں اسے ہر وقت طلب نہیں کر سکتا تھا اسی طرح میرا بطنی سے بھی رابطہ نہیں ہو رہا تھا۔ کمزوری کی وجہ سے میں صبح جھٹک نہیں گیا اور شام کو بھی میری ہمت نہیں ہو رہی تھی لیکن صرف اس وجہ سے مجھے گھبراہٹ نہ ہوئی تھی اور حیات کو یہاں سے رخصت کر دے اور میری بٹی سے ملاقات ہو۔ مگر ایسا نہیں ہوا اور نہ ہی مجھ سے ورزش ہوئی تھی۔ واپسی پر میں نے کتوں کا شور سنا وہ دور سے بھونک رہے تھے اور آوازوں سے لگ رہا تھا کہ کتوں کی تعداد خاصی زیادہ تھی۔ اگر یہاں کتے نہ ہوتے تو مجھے تعجب ہوتا کیونکہ ہمارے ہاں جاگیردار کتوں کے بغیر نہیں رہ سکتے۔ لڑکا آخری بار آیا تو میں نے کہا۔ ”سنو اگر تم بے بی تک رسائی نہیں رکھتے ہو تو کسی ایسے شخص کو تو جانتے ہو گے جو بے بی تک رسائی رکھتا ہے۔ اس سے کہو میں بے بی سے بات کرنا چاہتا ہوں۔“

”رستم صاحب سے کہہ دوں گا۔“ وہ بولا۔ ”وہ ممتاز ہاؤس کے منتظم ہیں۔“

”میری بہت سی چیزوں کا خیال بانور کو رکھ رہی تھی اب کون ان کو دیکھے گا۔“

”مجھے اس بارے میں نہیں معلوم ہے۔“ اس نے حسب معمول جواب دیا۔

”تو پھر کے معلوم ہے؟“ میں نے پتھر کر کہا اور دروازہ کھول کر حیات کو پکارا۔ ”ادھر آؤ تم؟“

”کیا ہے؟“ اس نے نہر درے لہجے میں کہا۔

”جا کر اپنے بڑے صاحب کو بتا دو کہ اب میں خون نہیں دوں گا اور اگر وہ نہیں ہیں تو بے بی کو یہ بات کہہ دو۔“ میں نے کہہ کر دروازہ بند کر دیا۔ حیات کے تاثرات نہیں دیکھے تھے البتہ اسے تاثرات غیظ و غضب والے رکھے تھے۔ مجھے یقین تھا کہ اس کا کوئی نہ کوئی نتیجہ برآمد ہو گا۔ میں بٹی سے رابطہ چاہتا تھا۔ تقریباً نصف گھنٹے بعد حیات نے مجھ سے ساتھ ملنے کو کہا۔ وہ اور اس کا ساتھی دونوں موجود تھے اور وہ مجھے بنی والے حصے میں لائے۔ وہ

اپنی نشست گاہ میں موجود تھی اور اسے دیکھتے ہی لگا کہ ”پریشان ہے۔ اس نے آنکھ سے حیات کو اشارہ کیا اور خاموشی سے وہاں سے چلا گیا۔ اب وہاں میں اور بنی تھے۔“

”تم مجھ سے کیوں ملنا چاہتے تھے؟“

”بانو کیوں نہیں آ رہی؟“

اس نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ ”کیا تمہیں معلوم ہے؟“

”کیا معلوم ہے؟“

”یہی کہ بانو کل صبح سے غائب ہے۔“

میں چونک گیا۔ ”غائب ہے... کب سے اور کس طرح سے غائب ہے؟“

”وہ کل صبح جب جم سے نکلی تو اس کے بعد میرے پاس نہیں آئی۔ بارہ بجے میں نے اس کے بارے میں معلوم کیا تو پتا چلا کہ اسے کسی نے نہیں دیکھا ہے۔ تب مجھے تمہارا خیال آیا اور میں نے شیف سے پوچھا اس نے کہا کہ باز جن میں بھی نہیں آئی۔ میں نے اسے تمہارے کھانے کے بارے میں ہدایت دی اور پھر بانو کو پورے ممتاز ہاؤس میں دیکھا گیا لیکن وہ کہیں نہیں ملی۔ اس کے کمرے میں اس کی تمام چیزیں موجود ہیں۔ چدر ہے کہ اس کا پرس اور موبائل بھی موجود ہے۔ آج اسے کتوں کی مدد سے تلاش کیا گیا۔ پاپا کے ڈاک ہاؤس میں بلڈ ہاؤس پر جو کسی شخص کی میولوں دور سے سونگہ لیتے ہیں۔ وہ بھی اسے تلاش کرنے میں ناکام رہے۔“

”کھر میں کتوں کی مدد سے تلاش؟“

”ہاں تم نے دیکھا ہے ناممتاز ہاؤس کتنا بڑا ہے اس میں کوئی بندہ کم ہو جائے تو اتنی آسانی سے نہیں ملتا ہے۔ مجھے خیال آیا کہ کہیں وہ بیمار یا بے ہوش ہو کر نہ پڑی ہو اس لیے کتوں سے مدد لی۔“

”مجھے تشویش ہونے لگی تھی۔“ گیٹ کیپر ڈکاکا کہتے ہیں؟“

”ان کا کہنا ہے کہ بانو نہ تو پیدل اور نہ ہی کسی گاڑی میں باہر نکلی ہے۔“

”ممتاز ہاؤس سے باہر جانے کا اور بھی کوئی راستہ ہے؟“

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ”پہلے ایک گیٹ اور قائم سیکورٹی کے نقطہ نظر سے اسے بند کر دیا گیا۔“

”کوئی خفیہ راستہ ہے؟“

”لازمی بات ہے لیکن اسے صرف میں، پاپا اور بیٹا استعمال کرنا جانتے ہیں۔ اس سے کوئی اور نہیں گزر سکتا ہے۔“

”جب کیا بانو کسی بن کر یہاں سے نکلی ہے۔“

میں نے کہا۔ ”اس پر مجھے یاد آیا یہاں بنلی بیڑ بھی ہے۔“

”لیکن کل یہاں نہ کوئی بنلی گاڑی آیا اور نہ گیا۔“

”مگر وہ خود سے جاتی تو اس کا کوئی نہ کوئی نشان ملتا اور اس کا سامان بھی غائب ہوتا۔“

”تمہارا مطلب ہے اسے کسی نے غائب کیا ہے۔“ بنی چونک گئی۔

”سانے کی بات ہے وہ کل جم سے نکلی اور اس کے بعد غائب ہو گئی۔“ میں نے سوچتے ہوئے کہا۔ ”گیٹ پر آنے جانے والوں کا مکمل ریکارڈ ہوگا؟“

اس نے سر ہلایا۔ ”وہ ریکارڈ بھی چیک ہوا ہے، کل سے اب تک کوئی دو درجن گاڑیاں اندر آئی اور گئی ہیں۔ ان میں سپلائی کی گاڑیاں بھی ہیں اور لاٹری کی گاڑی بھی اور ہماری گاڑیاں بھی ہیں۔“

میں چونکا۔ ”لاٹری کی گاڑی کیا اس میں بانو کو بے بس کر کے نہیں لے جایا جاسکتا ہے؟“

”لے جایا جاسکتا ہے لیکن آخر کسی کو اس سے کیا دشمنی ہو سکتی ہے۔“

”دشمنی ضروری نہیں ہے۔“ میں نے کہا۔ ”تم بھول رہی ہو وہ جو ان اور گمشدگی لڑکی ہے اور شاید کنواری بھی ہے۔“

اس نے مجھے گھورا۔ ”شاید نہیں وہ یقیناً کنواری ہے۔“

”تب کسی کی نیت بھی اس پر خراب ہو سکتی ہے۔“

”تم ممتاز ہاؤس کے کسی فرد کو لازم دے رہے ہو۔“

”ظاہر ہے اسے یہاں سے یہیں کا کوئی بندہ لے جا سکتا ہے اور کیا یہاں سب شریف اور پارسا لوگ ہیں۔“

بنی سوچ میں پڑ گئی۔ ”میری سمجھ میں تو نہیں آ رہا ہے۔ میں نے کل پاپا کو کال کر دی تھی۔ مگر ان کا کہنا ہے ابھی پولیس کے پاس جانے کے بجائے اسے خود تلاش کیا جائے۔ ہمارے آدمی آس پاس کے علاقے میں دیکھ رہے ہیں۔“

”فرض کرو کہ بانو کی گمشدگی میں اندر کا آدمی ملوث ہے تو تلاش کی اس مہم کو تا کام بنانا اس کے لیے تمہاری

آسان ہوگا۔“

”میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آ رہا ہے آج یا کل پاپا آ رہے ہیں وہی اس معاملے کو دیکھیں گے۔“

”تب تک اس بے چاری کے ساتھ نہ جانے کیا ہو جائے۔“ میں نے سرد اور بھری اور ساتھ ہی اطمینان محسوس کیا کہ بنی اور دوسرے حالات میں میرے حوالے سے کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ پھر مجھے شرمندگی ہوئی۔ اس لڑکی کا خیال کم تھا اور اپنا خیال مجھے زیادہ تھا۔ مگر یہ انسان کی فطرت ہے وہ کسی بھی معاملے میں پہلے اپنا مفاد دیکھتا ہے اور اس کے بعد کسی اور کی فکر کرتا ہے۔ بنی نے کہا۔

”میں نے تمہاری ذمے داری اکرم کو سونپ دی ہے۔“

اکرم وہی لڑکا تھا جو آج کل میرے لیے کھانا لاتا تھا۔ بنی کے حکم پر اب وہ ہمد وقت کمرے کے باہر موجود رہتا اور میرے حکم کی تعمیل کرتا۔ بنی نے پھر معنی خیز انداز میں کہا۔ ”اب تم نہیں کہہ سکتے کہ تمہیں بانو کی فکر نہیں ہے۔“

”فکر ہے لیکن ان معنوں میں نہیں اور دوسرے آدمی خود غرض ہوتا ہے۔ مجھے لگا کہ شاید تم نے اسے ہٹا دیا ہے اور شاید تم مجھ سے فرٹ ہو گئی ہو۔“

”سوری میں کلینک نہیں آ سکی تھی لیکن میں نے رپورٹ لی تھی۔ ڈاکٹر کا کہنا ہے کہ تمہیں چکر آیا تھا۔“

”ہاں یہ میرے لیے تشویش کا بات ہے کیونکہ میں نے اتنا خون نہیں دیا ہے کہ مجھے کمزوری محسوس ہو۔ مجھے ایسا لگ رہا ہے میں نے اس سے دو گنا خون دے دیا ہے جتنا مجھے دینا چاہیے تھا۔“

”ڈاکٹر کا کہنا ہے کہ تمہاری بلڈ ٹیسٹ رپورٹ بہترین آئی ہے۔ اسی طرح پورین اور دوسرا بلڈ ٹیسٹ بھی کلیئر ہے۔ یعنی جسمانی طور پر تمہیں کوئی مسئلہ نہیں ہے۔“

”یہ ڈاکٹر تو لوگوں نے ہار کیا ہے؟“

بنی چونکی۔ ”نہیں تو، یہ صرف اسی کام کے لیے آیا ہے۔“

اس بار میں چونکا۔ ”باہر؟ کہاں سے؟“

”یہ تو مجھے نہیں معلوم لیکن پاپا کہہ رہے تھے اسے خاص طور سے اسی کام کے لیے بلایا ہے۔“

میں سوچ میں پڑ گیا۔ بنی مجھے غور سے دیکھ رہی تھی۔ ”اس میں کوئی خاص بات ہے جو تم پوچھ رہے ہو اور اب کچھ فکر مند بھی لگ رہے ہو؟“

میں نے جلدی سے خود کو نازل کیا۔ ”نہیں ایسے ہی میں سوچ رہا ہوں کہ ڈاکٹر سے کہہ کر ایک بار اپنے نیٹ کراؤں۔“

”میرا مشورہ ہے اب خون دینے کے بعد تم پلازما لے لے لیتا اس سے خون کی مقدار پوری ہو جائے گی۔“

میں نے سر ہلایا۔ ”اس سے کہوں گا۔“

یہ ظاہر ایسا لگ رہا تھا کہ میں اپنی صحت کے بارے میں بہت فکرمند ہوں اور میں بنی کو بھی یہی تاثر دینا چاہتا تھا یعنی میں ان سے پوری طرح تعاون کر رہا تھا۔ میں نے گفتگو کا رخ دوبارہ بانو کی طرف موڑ دیا۔ ”اگر اسے غائب کیا گیا ہے تو اسے لے جانے والے اسے زندہ چھوڑنے کا خطرہ تو کسی صورت مول نہیں لے سکتے۔“

بنی نے گہری سانس لی۔ ”مجھے بھی ایسا ہی لگ رہا ہے۔ شاید اب اسے نہ دیکھ سکوں۔“

”مگر اس طرح سے ایک بیٹا جاگتا بندہ غائب ہو جاتا اس گہری سیکورٹی پر بہت بڑا سوالیہ نشان نہیں ہے؟“

”تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ یہاں فول پروف سیکورٹی ہے۔ پورے ممتاز ہاؤس کو دوسو سے زائد سیکورٹی کیرے کور کرتے ہیں لیکن کسی کیرے میں کوئی خلاف معمول بات نہیں آئی ہے۔“

”اس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ کام کرنے والے سیکورٹی سے پوری طرح واقف تھے اور انہوں نے ہاتھ پاؤں بچا کر کام کیا ہے اور اس کا بھی امکان ہے کہ بانو کی گم شدگی رپورٹ ہو۔“

بنی پھر چونکی۔ ”کیا مطلب؟“

”یہ کام کرنے والوں کا نشانہ کوئی اور ہو سکتا ہے لیکن اسے اٹھانے سے پہلے انہوں نے بانو پر ریپرسل کر لی۔“

بنی کچھ خوف زدہ ہوئی تھی۔ ”تمہارا مطلب ہے ہم میں سے کسی کو اغوا کرنے کا پلان ہو سکتا ہے؟“

”کیوں نہیں کیا تم لوگوں کے دشمن نہیں ہیں۔ کر مین والے واقعتے کو زیادہ عرصہ نہیں ہوا اور اس کے خاندان والے تم لوگوں سے اس کی لاش کا مطالعہ بھی کر چکے ہیں۔ اگر وہ تم میں سے کسی کو قبضے میں کر لیں تو ممتاز صاحب پھر ان کا مطالعہ مسترد کر سکتے ہیں۔“

”نہیں... مگر یہ بہت مشکل کام نہیں ہے۔“

”تم اس نقطہ نظر سے سوچو کہ تمہارے پاپا ایک معروف آدمی ہیں اگر گھر سے باہر ایسی کوئی کارروائی ہو تو

سب یقین کریں گے۔ لیکن اگر تم گھر سے غائب ہو جاؤ اور تمہارے پاپا خود کریں تو کوئی اس پر یقین نہیں کرے گا۔ اسے ان کا اسٹنٹ قرار دیا جائے گا۔“

بنی قائل نظر آنے لگی حالانکہ یہ نہایت احمقانہ تیوری تھی۔ گھر میں اس قسم کی کارروائی گھر کے افراد کے تعاون کے بغیر ناممکن ہے اور پولیس جب چھترول کرے گی تو اصل مجرم کو اگلے ہی بنے گی۔ اس قسم کے کام ہمیشہ گھر سے باہر ہوتے ہیں۔ اس میں آسانی ہوتی ہے اور پولیس کے ہاتھ آنے کا امکان بھی نہیں ہوتا ہے لیکن بنی کی سوچ محدود تھی اس لیے وہ فوراً فکرمند ہو گئی۔ میں یہی چاہتا تھا کہ وہ اس رخ پر سوچے اور اپنے باپ کو قائل کرے اس طرح سے وہ زیادہ تیزی سے بانو کو تلاش کر سکتے تھے۔ جب بانو کی تلاش کی جاتی تو لازمی بات تھی یہ ممتاز ہاؤس کے معمولات سے ہٹ کر ہوتی اور ممکن ہے اس دوران میں مجھے کوئی موقع ملتا۔ جب میں واپس کمرے میں آیا تو اپنی کارکردگی سے مطمئن تھا۔ میری تین دن سے بیٹو سے بات نہیں ہوئی تھی اور بنی نے روائی سے پہلے حیات کو وارننگ دی تھی کہ اب مجھے شکایت کا کوئی موقع نہ دے۔ میں نے اس سے مطالبہ کیا۔

”میری بیٹو سے بات کرانی چاہئے۔“

بادل نا خواست اس نے اسی موہاں پر بیٹو سے بری بات کرانی۔ وہ ٹھیک تھا۔ مگر اس کے صبر کا پیمانہ لیبر ہو رہا تھا اس نے کہا۔ ”شوبی اب ہم سے برداشت نہیں ہو رہا ہے یہ ہم کو آپ کے پاس لائے ورنہ ہم اب شرافت سے نہیں رہے گا۔“

”ابھی تم کچھ نہیں کرو گے۔“ میں نے اسے سمجھایا۔ ”دیکھو ہمیں موقع ملے گا اس لیے جلد بازی نہیں کرو۔“

”شوبی آپ قید ہو کر سکون سے رہ سکتا ہے ہم نہیں۔“ اس نے فریادی۔ ”ہم کو اس کا عادت نہیں ہے۔“

”چھوڑو یار۔“ میں نے کہا۔ ”بلا وجہ ہنگامہ کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہو گا بلکہ الٹا یہ تمہارا کھانا پانی بند کر دیں گے۔“

”ہم کو یہ فکر ہے کہ جیسے جیسے آپ کا خون نکال رہے گا ویسے ویسے آپ کمزور پڑ جائے گا۔“

”میں ٹھیک ہوں۔“ میں نے تسلی دی۔ ”یہاں میرا پورا خیال رکھا جا رہا ہے اور ڈاکٹر میری دیکھ بھال کرتا ہے۔“

اگر میں کمزور ہوا تو یہ خون لینا بند کر دیں گے۔“

”شوبی ہم کو یقین نہیں ہے۔“ اس نے صاف گوئی سے کہا۔ ”ذہن کی بات کا بھی اعتبار نہ کرو۔“

”میں کون سا مہی خوشی کر رہا ہوں مجبوری ہے۔“

”بہم مجبوری ہے۔“ اس نے سرد آہ بھری۔

”بس تو ابھی صبر کرو۔“

اس دن میں دونوں وقت ورزش نہیں کر سکا تھا کیونکہ کمزوری کا احساس باقی تھا بس کھانے کے بعد چھل قدی کر لیتا تھا۔ مجھے لگ رہا تھا کہ کوئی گڑبڑ ہے۔ لیکن یہ گڑبڑ کچھ میں نہیں آ رہی تھی۔ صرف ایک چیز مجھ میں آ رہی تھی کہ اس کا تعلق خون نکالنے سے تھا۔ یعنی لڑبو کیونکہ میں کی جاری تھی۔ دوسرے دن جا کر میری حالت اس قابل ہوئی کہ میں جب جا کر ایکس سائز کر سکوں اور یہ بھی میں پورے اسٹینڈ سے نہیں کر سکا تھا۔ آخر میں میری سانس بے قابو ہونے لگی تھی اس لیے میں ورزش ادھوری چھوڑ کر سوٹنگ پر مجبور ہوا تھا۔ جیسے جیسے میں اس بارے میں سوچ رہا تھا میری چھٹی حس خردار کرنے لگی تھی کہ میرے ساتھ کوئی چکر کیا جا رہا تھا۔ مگر کہے کیا جا رہا تھا یہ مجھ سے باہر تھا۔ ڈاکٹر میرے سامنے برے کیونلا سے نصف لیٹر کی ششیں منسلک کرتا تھا اور جب یہ بھر جاتی تو مجھے دکھاتا تھا کہ اس نے میرا کتنا خون نکالا ہے۔ یہ ظاہر اس میں کہیں گڑبڑ نظر نہیں آ رہی تھی۔ مجھے بنی کے انکشاف سے مشکوک کر دیا تھا کہ ڈاکٹر ای کام کے لیے باہر سے آیا اور ممتاز ہاؤس کا ڈاکٹر ہوتے ہوئے بھی باہر سے کسی ڈاکٹر کو بلا تا مجھے ٹھنک رہا تھا کیونکہ خون لینا کوئی اتنا بڑا کام نہیں تھا جس کے لیے خاص طور سے ڈاکٹر اور نرس ہائر کرنے کی ضرورت پیش آتی۔

تیسرے دن میری حالت ٹھیک ہو گئی اور میں پوری توانائی محسوس کرنے لگا تھا۔ بانو کی جگہ اکرم آ گیا تھا اور وہ میرا پورا خیال رکھتا تھا۔ میں نے بنی سے کہا تھا کہ وہ اکرم کو رابطہ کرنے کی اجازت دے تاکہ اگر میں اسے کوئی فوری نظام دیتا جا ہوں تو مجھے مشکل نہ ہو۔ دو دن گزر جانے کے بعد بانو کا کہیں پتا نہیں تھا اور میں ممتاز بھی نہیں آیا تھا۔ شاید کام کی زیادتی اسے واپس آنے کی مہلت نہیں دے رہی تھی اس لیے کے دوران بنی سے میری ملاقات نہیں ہوئی اور نہ ہی بانو کا پتا چلا۔ میرا خیال تھا کہ وہ بے سہارا لڑکی کی زور آور کی زبردستی کا شکار ہو گئی تھی۔ یہ ظاہر مست از اور بنی اس کے سر پرست تھے لیکن اس کی پچاسراں شہدگی پر

ان کا رویہ واضح تھا۔۔۔ ممتاز نے پولیس میں رپورٹ کرنے سے منہ کر دیا تھا اور بنی بھی خاص فکرمند نہیں تھی۔ وہ ان کے لیے صرف ملازمتی اور وہ نہیں رہے گی تو اس کی جگہ دوسری ملازمت آ جائے گی۔ اگر اس کے ساتھ کچھ برا ہوتا ہے تو یہ لوگ صرف افسوس کریں گے۔ اس سے زیادہ کی توقع نہیں جاسکتی تھی۔ غالباً اس سے زیادہ فکر انہیں اپنے سیکورٹی نظام کی ناکامی کی ہوگی۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ وہ اس کے لیے کیا کر رہے تھے۔

میرا خون بھجرات کی صبح لیا جاتا تھا۔ بھجرات آئی تو صبح کلینک جانے کے لیے تیار ہو گیا۔ حیات نے چہرہ

قارئین متوجہ ہوں

کچھ عرصے سے بعض مقامات سے یہ شکایات مل رہی ہیں کہ ذرا بھی تاخیر کی صورت میں قارئین کو پرچا نہیں ملتا۔ ایجنٹوں کی کارکردگی بہتر بنانے کے لیے ہماری گزارش ہے کہ پرچا نہ ملنے کی صورت میں ادارے کو خط یا فون کے ذریعے مندرجہ ذیل معلومات ضرور فراہم کریں۔

☆ **بک اسٹال کا نام جہاں پرچا منسوب ہے۔**

☆ **شہر اور پلاٹے کا نام۔**

☆ **ممکن ہو تو بک اسٹال کا PTCCL ایسٹریٹ فون نمبر**

رابطہ اور مزید معلومات کے لیے

نصر عباس

03012454188

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

سینس، جاسوسی، پاکیزہ، سرگشت

C-63 نیر III ڈسٹری بیوٹرز اتھارٹی مین کو رنگی روڈ، راکھی

ممبر فوٹو گرافی فون نمبر 35802552-35386783-35804200

ای میل: jdpgroup@hotmail.com

ہے ہی دروازہ بجانا شروع کر دیا تھا لیکن میں آرام سے تیار ہو کر سات بجے نکلا۔ اس نے مجھے تاخیر کرنے پر غور کیا تھا لیکن منہ سے کچھ کہا نہیں۔ وہ اپنے ساتھی سمیت مجھے کلیٹک کی عمارت میں لے کر آیا۔ جہاں حسب معمول ڈاکٹر اور گول میٹل نرس میرے منتظر تھے۔ اس دن میں نے پہلی بار اس کمرے کا یہ غور معائنہ کیا۔ یہاں صرف دو کرسیاں اور ایک وہ اسٹریچر بیڈ تھا جس پر میں لیٹ کر خون دیتا تھا۔ یہ زمین سے کوئی تین فٹ اونچا تھا۔ کیونکہ خون لینا تھا اس لیے اسٹینڈ استعمال نہیں کیا جاتا تھا بلکہ خون کی ٹھیلی اسٹریچر کے ساتھ نیچے لٹائی جاتی تھی۔ بیڈ کے نیچے فلائیں تھا بلکہ یہ چاروں طرف سے بند تھا۔ یہ بات مجھے ذرا ہٹ کر لگی تھی ورنہ عام طور سے اس قسم کے بیڈز کے نیچے فلا ہوتا ہے کیونکہ یہ اینگل آئرن سے بنے ہوتے ہیں۔ کرسیاں ڈاکٹر اور نرس کے لیے تھیں اور حیات کا کام کھڑے رہنا تھا اس لیے وہ مستعد کھڑا رہتا تھا۔ ایک چھوٹی سی ٹرائی جی جس پر دو انیاں، پانی اور منرل جوس کی بوتل رکھی تھی۔ یہ سب خون لینے کے بعد میرے لیے تھا۔

گول میٹل نرس نے مجھے بیڈ پر لیٹنے کو کہا اور پھر میرے بازو سے کیونلا منسلک کرنے لگی۔ خون نکالنے کے لیے جو کیونلا استعمال کیا جاتا ہے اس کی سوئی خاصی موٹی ہوتی ہے اور جب اسے نکال لیا جاتا تھا تب بھی کچھ دیر تک سوئی والی جگہ سے ہلکا سا خون رستا تھا جسے اسٹینڈ سپک روٹی پر لگا کر دبانا پڑتا تھا تب کہیں جا کر خون رکتا تھا۔ نرس نے ڈاکٹر کی طرف دیکھا تو اس نے آنکھ پٹی کی ٹکلی کیونلا سے منسلک کی۔ میں نے جھک کر دیکھا وہ ٹھیلی ہی لگا رہا تھا اس کے علاوہ وہاں کچھ نہیں تھا۔ البتہ ٹھیلی سے منسلک ٹکلی خاصی لمبی تھی یہ شاید ڈیزل گھڑی جی جب کہ اس سے نصف لمبی ٹکلی سے بھی کام چل سکتا تھا۔ ٹھیلی منسلک کر کے ڈاکٹر نے اسٹاپر کھولا تو خون ٹکلی سے ہوتا ہوا ٹھیلی میں جانے لگا تھا۔ میں سیدھا ہو کر لیٹ گیا۔ خون جانے کی رفتار اتنی تیز نہیں تھی۔ مگر اسی لمحے میں نے محسوس کیا کہ ڈاکٹر نے پھر اسٹاپر کو پھیرا ہے۔ میں نے جھک کر دیکھا چاہا لیکن گول میٹل نرس جو میرے بائیں طرف کھڑی تھی اس نے میرے سینے پر ہاتھ رکھ دیا۔

”بار بار مت جھکیں اس سے کیونلا پر دباؤ پڑ سکتا ہے۔“

میں سیدھا لیٹ گیا اور اپنی ساری حیات کسی آہٹ یا معمولی سی حرکت پر مرکوز کر لی تھیں۔ ڈاکٹر واپس جا کر اپنی

نشت پر بیٹھ گیا تھا۔ میں آنکھ بند کر کے ساکت لیٹا ہوا تھا۔ یہاں کوئی گھڑی نہیں تھی۔ جس سے مجھے اندازہ ہوتا کہ کتنی دیر تک خون لیا جائے تو ٹھیلی بھر جائے گی۔ مگر مجھے محسوس ہوا کہ خاصی دیر گزر گئی ہے اور یہ وقفہ ٹھیلی کو بھرنے کے لیے کافی تھا۔ اسی لمحے بیڈ کے ساتھ بہت معمولی سی حرکت کا احساس ہوا۔ ایسا لگا جیسے بیڈ سے منسلک کوئی چیز ہل رہی ہو۔ ٹکلی کو ہلنے سے روکنے سے بچانے کے لیے بیڈ کے ساتھ ایک کلب سے فکس کر دیا تھا۔ پھر کیا چیز ہل رہی تھی۔ میں نے ان چیزوں پر پہلے تو بے نیس دی تھی۔ قدرتی طور پر میری توجہ اپنے بدن سے نکلے خون پر مرکوز ہوتی تھی۔ میں نے یہ بھی پہلے نوٹ نہیں کیا تھا کہ گول میٹل نرس ہمیشہ میرے دائیں طرف بالکل ساتھ کھڑی ہوتی تھی۔ جیسے میری نگرانی ہو اور مجھے حرکت کرنے سے روک رہی ہو۔ عام طور سے اس کے چہرے پر نرم تاثرات ہوتے تھے لیکن اس وقت اس کے چہرے پر سخت اور کچھ عجیب سے تاثرات تھے۔ میں نے سہرا کر ڈاکٹر کی طرف دیکھا اور اپنا پایاں پہلو کھیا۔

”پلیز بیس مت۔“ نرس نے کرخٹ لہجے میں کہا۔ ”مجھے خارش ہو رہی ہے۔“ میں نے بدستور پایاں پہلو کھاتے ہوئے اچانک دائیں طرف کروٹ لی۔ ڈاکٹر ہڑپڑا کر اٹھا تھا اور پیچھے سے نرس نے بھی مجھے روکنے کی کوشش کی تھی لیکن اتنی دیر میں میں دھچک چکا تھا۔ بیڈ کے نچلے حصے میں جہاں ٹھیلی ہونی چاہیے تھی وہاں ٹھیلی نہیں تھی بلکہ ٹکلی ایک چھوٹے سے خلا میں جا رہی تھی۔ ظاہر ہے اس خلا میں کوئی تھا جس نے ٹھیلی کو کلی سمیت اندر کر لیا تھا اور مقصد بھی واضح تھا۔ اندر کی اور ٹھیلی میں میرا مزید خون لیا جا رہا تھا۔ یہ دھوکا تھا کہ میرا صرف نصف لیٹر خون لیا جا رہا ہے۔ اس طریقے سے کہیں زیادہ مقدار میں خون لیا جا رہا تھا۔ یہ دیکھتے ہی میں نے کیونلا کھینچ کر بازو سے الگ کر دیا۔ ڈاکٹر میری طرف آتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ ”یہ کیا کر رہے ہو خون ضائع ہو جائے گا۔“

وہ میری زندگی ضائع کر رہے تھے۔ جتنا خون لینا تھا شاید اس سے دو گنا یا تین گنا زیادہ خون لے رہے تھے۔ ڈاکٹر نے دیکھ لیا تھا کہ میں نے ان کا دھوکا پکڑ لیا ہے۔ مگر اسے فکر تھی کہ ٹکلی کھینچنے سے ٹھیلی میں موجود خون نہ ضائع ہو جائے۔ اس دوران میں میں طے کر چکا تھا کہ مجھے کیا کرنا ہے میں نے محسوس کر عجب سے مجھے قابو کرنے کی کوشش کرنی گول میٹل نرس کے نرم وجود سے سر کھایا اور

زبردستی آتے ڈاکٹر کی گردن پر لٹ مارا۔ ایڑی پوری قوت سے اور درست جگہ کی تھی۔ ہڈی جھٹکنے کی آواز آئی اور ڈاکٹر حیات پر جا کر مارا۔ میں تڑپ کر اٹھنے لگا تھا۔ یہ موقع تھا میں حیات سے گمن جھٹکن سکتا تھا۔ ایک بار ہتھیار میرے ہاتھ میں آجاتا تو میں پانسٹا پلٹ دیتا۔

مگر اس موقع پر گول میٹل نرس پیرتھم پابن کر عجب سے چٹ گئی۔ اس نے دونوں ہاتھ میری بٹلوں سے گزارتے ہوئے مجھے جکڑ لیا۔ یہ بڑی نرم گرم اور گدازیت سے بھرپور جکڑ تھی۔ کوئی اور موقع ہوتا تو مجھے اس قید سے آزاد ہونے کی اتنی جلدی بھی نہ ہوتی لیکن اس وقت میری جان پر پنی ہوئی تھی۔ خون نکلنے سے مجھے کسی قدر کمزوری کا احساس بھی ہو رہا تھا اور میں حیات کے کھینچنے سے پہلے اس پر قابو پا جاتا تھا۔ مگر جب خود کمزور سے جھڑانے کی کوشش کی تو پتا چلا کہ یہ اتنا آسان بھی نہیں ہے۔ وہ صرف موٹی نہیں تھی بلکہ اس میں اچھی خاصی قوت بھی تھی اس کے باوجود وہ مجھے اتنی آسانی سے قابو نہیں کر سکتی تھی لیکن جدوجہد کے ساتھ ساتھ ہی مجھے تیزی سے بروہی کا کمزوری کا احساس ہونے لگا اور میرا سر پکڑا رہا تھا۔ میں نے زور آزمائی کے بجائے دوسرا طریقہ اختیار کیا اور نرس کو کہیں مارنے لگا مگر یہ پہلی کوشش کی طرح ہی بروہی میں گزر گیا۔

نرس چلائی۔ ”جلدی کرو۔۔۔ یہ نکل رہا ہے۔“ میں نے ڈاکٹر کی لاش کو ایک طرف دھکیل کر حیات کو اپنا سمت بھینٹے دیکھا۔ ڈاکٹر یقیناً نرم چکا تھا کیونکہ اس کی گردن غیر فطری انداز میں جھول رہی تھی اور اس کا جسم دیوار سے لگا تو سر کھوکھ کر پیچھے آگیا۔ حیات نے شات گن میری طرف کر رکھی تھی اس کے تاثرات سے لگ رہا تھا کہ وہ مجھے ٹوٹ کرنے والا ہے۔ لیکن پاس آنے پر اس نے اس کی بال ٹکھا کر میری بائیں کینٹی پر رسید کی۔ میرا سر جو پہلے ہی پکڑا رہا تھا اس ضرب کی تاب نہ لاتے ہوئے یک دم ہی تار کیوں میں ڈوب گیا۔ ایسا لگا جیسے میں کسی تاریک دلدل میں اتر رہا ہوں۔ یہ احساس تھا تھا اس کے بعد ہر احساس فنا ہو گیا۔ یہ دو چار ہاتھ ہل با م رہ جانے والی بات تھی جب ایک کمزور اور صنف نازک سے حلق کر کے والی نرس نے میری جدوجہد کو ناکام بنا دیا اور میں آزاد ہوتے ہوتے دوبارہ قید ہو گیا تھا۔ اگر مجھے اس کی گرفت سے آزادی مل جاتی تو میں حیات کو بھی ناکارہ کرنے کی کوشش کرتا اور اس سے شات گن حاصل کر لیتا تو اس کے بعد دوسروں کو قابو کرنا

زیادہ مشکل نہ رہتا۔ مگر ہر خواہش اور کوشش کا سیاسی سے ہمتا نہیں ہوتی ہے۔

☆☆☆

مجھے ہوش آنے لگا تو پہلا احساس شدید تکلیف کا تھا۔ سر میں درد یوں حرکت کر رہا تھا جیسے وائبریلوں کے غباروں میں پانی حرکت کرتا ہے۔ بہت تیز اور تند انداز میں۔ ایسے ہی درد کھوپڑی کی شاید بہت جگہ ہوجانے والی دیواروں سے ٹکرا رہا تھا اور ایسا لگ رہا تھا کہ ابھی کھوپڑی تو ڈکر پانی کی طرح بہہ نکلے گا۔ میں نے اٹھنے یا آنکھیں کھولنے کی کوشش نہیں کی۔ میں درد کے قابل برداشت ہونے کا انتظار کر رہا تھا ورنہ مجھے لگ رہا تھا کہ میں نے آنکھ کھولی یا اٹھا تو دردی شدت مجھے دوبارہ بے ہوش کر دے گی۔ اس وقت مجھ سے سوچا بھی نہیں جا رہا تھا اس لیے یہ بھی یاد نہیں تھا کہ میرے ساتھ ہوا کیا ہے اور میرے سر پر کیا قیمت گزری ہے؟ شاید اس وقت مجھے اپنی شخصیت بھی یاد نہیں تھی۔ میں سب بھولا ہوا تھا بس درد اور تکلیف کا احساس تھا۔ میں سانس بھی لیتا تو درد بھر جاتا اس لیے سانس بھی بہت سنبھل کر اور آہستگی سے لے رہا تھا۔ رفتہ رفتہ درد میں کمی آنے لگی۔

میں سوچنے کے قابل ہوا تو مجھے سب سے پہلے یہ یاد آیا کہ میں کون ہوں اور پھر یاد آیا کہ میرے ساتھ ہوا کیا تھا؟ مجھے آغاز سے دھوکا دیا جا رہا تھا اور اس دھوکے میں۔۔۔ ممتاز بھی شامل تھا۔ نہایت چالاکی سے مجھے پاور کرایا گیا کہ ہر ہفتے میرے جسم سے صرف نصف لیٹر خون لیا جائے گا۔ مگر اس طرح سے یقیناً نصف لیٹر سے زیادہ ہی خون لیا جا رہا تھا۔ نصف لیٹر تو بے ظاہر لیا جاتا۔ بیڈ کے اندر خالی حصے میں کوئی پہلے سے موجود ہوتا تھا اور جب میں سیدھا لیٹ جاتا تو وہ چھوٹا سا خانہ کھول کر ٹھیلی کو کلی سمیت اندر کھینچ لیتا اور ٹکلی کو الگ کر کے دوسری ٹھیلی سے لگا دیتا تھا۔ جب وہ بھر جاتی تو ٹکلی دوبارہ نصف لیٹر والی ٹھیلی سے لگا دیتا اور دوبارہ اس کی جگہ لگا کر خانہ بند کر دیتا۔ ڈاکٹر چالاکی سے اسٹاپر کو پورا کھول دیتا تھا اور مجھے علم ہی نہیں ہوتا تھا کہ میرا کتنا خون لیا جا رہا تھا۔ اسی وجہ سے میں دوسری بار ہی خون دے کر کمزوری محسوس کرنے لگا تھا اور تیسری بار تو میں واضح کمزور ہوا تھا۔ اس دن مجھے نہیں معلوم کہ میرا کتنا خون نکالا گیا تھا۔ سر کی چوٹ نے مجھے ویسے ہی کمزور کر دیا تھا اس لیے بھی میں اندازہ نہیں کر پا رہا تھا کہ خون نکلنے سے ہونے

والی کمزوری کتنی ہے۔ میرا اندازہ تھا کہ ہر دفعہ میرا ڈیڑھ لیٹر خون نکلا گیا تھا۔ ورنہ پچھلی بار ایک لیٹر خون دینے سے اتنی کمزوری نہیں ہوتی تھی اس لیے لازمی اس سے زیادہ خون لیا جا رہا تھا۔

درد اب قابل برداشت حد میں آ گیا تھا۔ اس لیے میں نے پہلے آنکھیں کھولیں۔ میں ایک تار تک کمرے میں تھا۔ دیواروں کا رنگ بھی سفید تھا مگر اب میلا ہو گیا تھا۔ چھت پر لکڑی کی بلیوں کے سہارے سینٹ شیٹ کی چھت تھی۔ میں ایک کھات نما بستر پر بڑا تھا جس پر پتلا سا لکڑا تھا اور اس سے تا کواری پوٹھ رہی تھی۔ میری طبیعت ایسی ہو رہی تھی کہ یہ ہلکی سی ہونچھی چھری تھی۔ میں یقیناً ممتاز باؤس میں نہیں تھا وہاں اس جیسے کمرے کا تصور بھی محال تھا۔ کمرہ بہت چھوٹا تھا۔ شاید دس پانی آٹھ کا تھا۔ جب میں نے محسوس کیا کہ اب میں درد میں اضافے کا خطرہ مول لے بغیر اٹھ سکتا ہوں تو میں اٹھ بیٹھا اور فوراً لیٹ گیا تھا۔ سر چکرایا تھا اور آنکھوں کے آگے اندھیرا آ گیا تھا۔ یقیناً میرا اتنا خون نکال لیا گیا تھا کہ میں کمزوری کا شکار ہوا تھا اور اس کے بعد میری توانائی کیا بحال کی جاتی اننا میرے سر پر چوت برداشت کرنا پڑی تھی۔ میں نے سر چھپوا تو کینٹی سے کھال پھٹ گئی تھی۔ یہاں بلکہ بال تھے اس لیے چوٹ شدید آئی تھی اور خون بہہ کر جم گیا تھا۔

کچھ دیر میں ہمت کر کے اٹھ بیٹھا۔ اگر میری طبیعت ٹھیک نہیں تھی تو اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ میں لینا ہی رہتا۔ دشمن کی قید میں رہے ہوئے آرام کرنا عقل مندی نہیں تھی۔ کھڑا ہوا تو چکر آیا تھا مگر میں نے دیوار کا سہارا لے لیا۔ بستر لکڑی کا تخت تھا جس پر روئی کا پتلا سا لکڑا اچھا ہوا تھا۔ کمرے میں اس کے سوا کچھ نہیں تھا۔ ایک طرف چھوٹے سے روشن دان سے دن کی روشنی جھلک رہی تھی۔ روشن دان زمین سے سات فٹ سے زیادہ اونچے تھا اور نہیں تھا اور تقریباً چھت سے لگ رہا تھا۔ فرش کے سینٹ کا تھا۔ یہ ظاہر یہ جگہ کسی دیہاتی ڈپرے میں تھی اور انداز بھی غریبانہ تھا۔ ابھی میری حالت بہتر نہیں ہوئی تھی اور سر کا درد وہ کراٹھ رہا تھا۔ چکروں میں کی آئی تھی مگر یہ اب بھی ذہن پر حملہ کر رہے تھے۔ ایڈیڈر سے پہلے ضروری تھا کہ میں اپنی حالت بہتر کر لوں۔ اس لیے واپس تخت پر بیٹھ گیا اور سانس کی مشق کرنے لگا۔

اب سوال یہ تھا کہ حیات نے مجھ پر قابو پا لیا تھا تو وہ

مجھے کہاں لے آیا تھا اور یہاں کس کی اجازت سے منتقل کیا گیا تھا۔ ممتاز باؤس میں قید خانوں کی کوئی کمی نہیں تھی۔ جس کمرے میں میں تھا وہ بھی اچھا خاصا قید خانہ تھا۔ جب نیچے ایسی کی جگہ منتقل کرنے کی کیا وجہ ہو سکتی تھی؟ کیا یہ ممتاز کے حکم سے ہوا تھا؟ اگر وہ مجھے اپنی قید میں رکھنا چاہتا تھا تو کسی اور جگہ بھیجے کی ضرورت نہیں تھی۔ سانس کی مشقوں سے میری حالت خاصی بہتر ہوئی تھی اور اب میں بہتر طور پر سوچنے سمجھنے کے قابل ہو گیا تھا۔ جیسے جیسے میری سوچنے سمجھنے کی صلاحیت بہتر ہو رہی تھی مجھے یقین ہوتا جا رہا تھا کہ اس کارروائی میں شاید... ممتاز کا اتنا ہتھ نہیں تھا۔ اس کے پس پشت حیات اور وہ ڈاکٹر تھا جو میرے ہاتھوں جہنم رسید ہوا تھا۔ اب سوال یہ تھا کہ اس میں ان کا کیا مفاد تھا تو اس کا جواب بہت سادہ تھا ان کا مفاد تو تھے اور یہ تو انہیں راج کنور سے ملے تھے اس لیے وہ معاہدے سے ہٹ کر میرا زیادہ سے زیادہ خون نکالنے پر راضی ہو گئے تھے اور یہ سارا کام... ممتاز اور مجھ سے چھپا کر کیا جا رہا تھا۔

ان کی بد قسمتی کہ میں نے کڑبڑ بھانپ لی اور پھر اسے دیکھ بھی لیا۔ ڈاکٹر کی وفات نے الگ مصیبت پیدا کر دی ہو گی۔ اس لیے حیات نے مناسب سمجھا کہ مجھے ممتاز باؤس سے کہیں اور منتقل کر دے اور یہ کام اس کے لیے مشکل نہیں تھا۔ وہ... ممتاز کا معتد ترین شخص تھا اور یقیناً ممتاز باؤس کے بہت سارے رازوں سے واقف تھا۔ ممکن ہے وہ خیر رائے سے بھی واقف ہو جس کے بارے میں مٹی کا یقین نہ تھا تھا کہ صرف وہی تین اس کے بارے میں جانتے تھے لیکن پہلے بانو اور پھر میری کم شرمی سے واضح تھا کہ کوئی اور بھی اس رائے سے واقف تھا۔ بانو سے مجھے خیال آیا اور میں چونک گیا۔ کہیں بانو کی کم شرمی میں بھی حیات کا ہاتھ تو نہیں تھا۔ وہ جس طرح جم میں بانو کے میرے ساتھ اکیلے ہونے پر خار کھاتا تھا اس سے لگ رہا تھا کہ شاید اس کی بانو پر نظر بھی اور جب یہ بات اس کی برداشت سے باہر ہوئی تو اس نے اسے غائب کر دیا۔

حیات کی طرح یہ رسک نہیں لے سکتا تھا کہ میں اس کا پول کھول دوں۔ وہ ممتاز کا کتنا ہی معتدج لیکن اگر وہ غدار نکلتا تو اس کا انجام عبرت ناک ہی ہوتا۔ اب ممکن طور پر حیات نے ڈاکٹر کی موت میرے کھاتے میں ڈال کر مجھے مفروضہ ظاہر کیا ہوگا۔ نرس زندہ تھی لیکن وہ اس کام میں براہر کی شریک تھی اس لیے وہ کسی صورت حقیقت نہیں تھی

تھی۔ کچھ دیر آرام کے بعد میری حالت اتنی بہتر ہو گئی تھی کہ میں روشن دان تک آیا اور دونوں ہاتھ اس کے کنارے بجا کر خود کو اپر کیا اور باہر جھانکا۔ اس طرف شاید چھوٹا کھن تھا کیونکہ سامنے ایک دیوار دکھائی دے رہی تھی اور نیچے کئی زمین تھی۔ کچھ سارا بڑا تھا جیسے وہاں صفائی معمول نہ ہو اور دیوار پر مٹی کی تھی۔ اگر یہ کسی احاطے کی دیوار تھی تو یہ بہت معمولی سا ڈیرا تھا۔ شاید مجھے اس لیے یہاں رکھا گیا کہ کسی کا شک اس طرف نہ جائے۔ یہ تو طے تھا کہ اگر میرے ذرا کی کہانی سنانی تھی تب بھی... ممتاز کے آدمی مجھے شکاری کتوں کی طرح قرب و جوار کے علاقوں میں تلاش کر رہے ہوں گے۔ یہ اور بات ہے کہ میں ان کی پہنچ سے دور ہی ہوں گا۔ یہ جگہ محفوظ ہوگی اس لیے ہی حیات نے مجھے یہاں رکھا تھا اسے یقین ہوگا کہ نہ تو کوئی مجھے یہاں تلاش کر سکے گا اور نہ میں یہاں سے فرار ہو سوں گا۔

میاں ممتاز کے شکاری کتوں کے ساتھ یہی مجھے بیٹہ کا خیال آیا اور میں جو کسی قدر سکون میں آ گیا تھا پھر سے اضطراب ہو گیا۔ اگر حیات نے میری کم شرمی کو فرار بتایا ہوگا تو اس وقت بیٹہ اس کی سزا بھگت رہا ہوگا۔... ممتاز کے نزدیک بیٹہ مجھ پر صرف دباؤ ڈالنے کا ایک حربہ تھا اور اس کی کوئی اور اہمیت نہیں تھی۔ میں اس کے ہاتھ سے نکل گیا اور اس کی راج کنور سے مفروضہ ذیل خطرے میں پڑی تو اس کا اقامت بیٹہ سے لیا جاتا تو وہ یقیناً اس وقت مشکل سے گزر رہا ہوگا۔ ممکن ہے... ممتاز نے اسے فوری کوئی تکلیف نہ دی ہو لیکن اگر میں اسے نہ ملتا یا اسے حقیقت کا پتا نہ چلتا تو بیٹہ اس کے لیے بے مصرف ہو جاتا اور ایسے لوگ بے مصرف قرار دیے جاتے ہیں اور انسانوں کے ساتھ کیا کرتے ہیں یہ میں اچھی طرح جانتا تھا۔ یہ سب سوچتے ہوئے میرے جسم میں خوف کی سرد لہری دوڑ گئی تھی۔ پتا نہیں وسم اور عبداللہ کی تلاش کہاں تک پہنچی ہوگی یہ بات تو یقینی تھی کہ وہ پوری کوشش کر رہے ہوں گے۔ وسم اب تک لازمی واپس آ چکا ہوگا میری کم شرمی کا اس کے لیے حوالی میں بیٹھ رہنا ممکن ہی نہیں تھا اس کا زخم بھی اب بھر گیا ہوگا اس لیے وہ پوری کوشش سے میری تلاش میں ہوگا۔ اگر وہ اب بھی پتا چلا میں تو کم سے کم بیٹہ کو چھڑا سکتے تھے۔

میں واپس تخت پر آ کر بیٹھ گیا بلکہ لیٹ گیا۔ باہر کی روشنی سے ایسا لگ رہا تھا کہ سورج مغرب کی طرف جھکتا تھا ہو گیا تھا یعنی دوپہر کے دوپہر میں بیٹھ رہے تھے اور اس

بند کمرے میں کسی قدر گرمی تھی۔ میرے جسم پر وہی لباس اور جوتے تھے جو میں نے بے ہوش ہونے سے پہلے پہنے تھے۔ کمرے کے باہر اور آس پاس خاموشی تھی۔ میں نے اب تک جو حرکت کی تھی وہ پناہ آہٹ کے کی تھی۔ ممکن ہے جیسے میں خاموش تھا اسی طرح کوئی باہر بھی خاموشی سے موجود ہو اور اگر میں کوئی آواز پیدا کروں تو وہ جان جائے کہ میں ہوش میں آ گیا تھا جب کہ میں ایسا نہیں چاہتا تھا۔ سر کا درد بہتر تھا لیکن اب مجھے پیاس لگنے لگی تھی اور ہرگز رتے لمحے اس کی شدت میں اضافہ ہو رہا۔ خون نکلنے سے میرے جسم میں دیرے پانی کی کمی ہو گئی تھی۔ پھر گرم موسم اور سر کی چوٹ، یہ سب ل کر پیاس کو رفتہ رفتہ انتہا کی طرف لے جا رہے تھے۔ مگر میرے پاس سوائے برداشت کرنے کے اور کوئی چارہ نہیں تھا۔ پانی حاصل کرنے کے لیے مجھے دروازہ بجانا پڑتا اور میں نہیں چاہتا تھا کہ قید کرنے والوں کو میرے ہوش کی خبر ہو۔ اگر تین بج رہے تھے تو مجھے بے ہوش ہونے پونے نو گھنٹے ہو گئے تھے۔ یہ مدت کافی سے زیادہ ہوتی ہے اور میری طویل بے ہوشی دیکھنے کے لیے کسی نہ کسی کو آتا تھا۔ مگر ایسا لگ رہا تھا کہ مجھے یہاں ڈالنے والے جیسے ڈال کر بھول گئے تھے۔ یہاں شاید کوئی نہیں تھا۔ میں نے کمرے کا جائزہ لیا کہ یہاں کوئی ایسی چیز مل جائے جس سے میں ہتھیار کا کام لے سکوں لیکن وہاں ایسی کوئی چیز نہیں تھی۔ تخت ٹیکر اور پڑل کی لکڑی کا بنا ہوا تھا اور یہ ساری لکڑی نہایت مضبوطی سے آپس میں جڑی ہوئی تھی میں خالی ہاتھ سے تخت سے لکڑی الگ نہیں کر سکتا تھا اگر میں کوشش کرتا تو اس سے بہت شور ہوتا۔ باقی کمرہ خالی تھا۔ تخت کے نیچے تار کی کٹی لیکن میں نے ہاتھ سے ٹٹول کر تسلی کر لی تھی کہ وہاں کچھ نہیں تھا سوائے بدلتوں سے جمع ہونے والی گرد کے۔ یہاں شاید صفائی کا کوئی رواج نہیں تھا اس لیے کوٹھری گرد آلود ہو رہی تھی۔ بستر شاید اس لیے صاف تھا کہ استعمال ہوتا تھا ورنہ اس پر بھی مٹی جمی ہوتی۔ مگر گدے سے آتی بو بتا رہی تھی کہ اسے استعمال کرنے والا کوئی گندہ آدمی تھا ورنہ انسان اپنے ذاتی استعمال کی چیز تو صاف رکھ سکتا ہے۔ یہ کوٹھری اور اس کا محد و سامان بتا رہا تھا کہ یہاں کوئی بہت ہی نچلے طبقے کا فرد رہتا ہے۔

نہ جانے کیوں مجھے لگ رہا تھا کہ میں عارضی طور پر یہاں قید کیا گیا تھا۔ ورنہ یہ جگہ باقاعدہ قید خانہ نہیں تھی۔ تقریباً دو گھنٹے بعد میں نے دوبارہ روشن دان سے

جھانک کر دیکھا تو محن میں کسی درخت کا طویل ہوتا سا یہ نظر آیا۔ اس سے لگ رہا تھا کہ سورج واضح طور پر مغرب کی طرف جھک چکا تھا۔ کچھ دیر میں سورج غروب ہو جاتا اور یہاں اندھیرا چھا جاتا جب کہ یہاں بجلی بھی نہیں تھی۔ تم سے کم اس کوٹھری میں مجھے ایسی کوئی چیز نظر نہیں آ رہی تھی۔ ایک طرف دیوار سے نکل ہوئی کھوٹی تھی جس سے شاید لائین لٹکانی جانی ہوگی۔ میں نے احتیاط سے دروازہ ہلانے کی کوشش کی لیکن یہ نہایت مضبوط لکڑی سے بنا دو پٹ کا دروازہ تھا جس میں نہیں خلا بھی نہیں تھا کہ باہر جھانکا جا سکتا۔ اگر اس میں کنڈی لگی تھی تو وہ خاصی بڑی اور مضبوط تھی جس نے دروازے کو مکمل طور پر بند کر دیا تھا۔

کچھ دیر میں اندھیرا چھا گیا۔ رات بہت تیزی سے آئی تھی۔ اندر تو تقریباً تاریکی تھی بس روشن دان سے کسی قدر روشنی چھلک رہی تھی جو ستاروں کی تھی۔ چاند کی ابتدائی تاریکی تھی اور ابھی چاند نکلا بھی نہیں تھا اس لیے روشنی بہت کم تھی۔ اب مجھے تشویش ہونے لگی تھی کہ کیا مجھے اس جگہ بند کر کے وہ لوگ بھول گئے تھے۔ اتنی دیر میں مجھے نہ تو کسی انسان کی آواز آئی تھی اور نہ کسی جانور کی، کبھی بھی کسی برندنے کی آواز آئی تھی۔ ہوا میں نباتات کی مہک تھی مگر کوئی مخصوص خوشبو نہیں تھی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ یہ جگہ کسی ویرانے میں تھی۔ ایک بار میں نے تخت پر کھڑے ہو کر چھت پر زور آزمائی کی لیکن وہ بھی ٹس سے مس نہیں ہوئی۔ سینٹ کی شیٹ مضبوط تھی لیکن ساتھ ہی ایسا لگ رہا تھا کہ اس پر خاصا بوجھ رکھا ہوا تھا اور اسے اٹھانا میرے بس کی بات نہیں تھی جھک کر بارک میں لیٹ گیا اور اپنی توانائی برقرار رکھنے کے لیے سانس کی مشق کرنے لگا۔ اس سے میرے سر درد میں بہت آفاقہ ہوا تھا۔ مگر اس قید سے گھبراہٹ ہونے لگی تھی۔

اچانک ہی ایسا لگا کہ ہمیں دور کوئی بول رہا ہے۔ پہلے میں اسے اپنا وہم سمجھا تھا لیکن جب آواز دوبارہ اور واضح آئی تو میں اٹھ بیٹھا۔ یہ دو افراد تھے۔ ان میں سے ایک بلند آواز میں بول رہا تھا اور دوسرا وہی آواز میں کچھ کہہ رہا تھا۔ بلند بولنے والا اسے قہار رہا تھا کہ وہ نشہ کر کے سو رہا تھا اگر قیدی یعنی میں فرار ہو جاتا تو بایاں دونوں کی کھال کھینچ لیتا۔ وہی آواز والا منمننا کر وضاحت کر رہا تھا۔ یعنی میں یہاں اکیلا نہیں تھا بلکہ ایک عدد گمران تھا اور وہ سو رہا تھا۔ آنے والا کوٹھری کے پاس آیا۔ مگر اس نے کوٹھری کھول کر اندر جھانکنے کی زحمت نہیں کی کہ میں کس حال میں تھا۔

دونوں پختائی میں بات کر رہے تھے اور مجھے ان کے انداز میں کوئی بات کھٹک رہی تھی۔ آنے والے نے کسی کا بول کا ذکر کیا تھا جو ان دونوں کی کھال کھینچ لیتا اگر یہ خاکسار خوش کر کے یہاں سے شارت ہو جاتا۔ مگر میں نے موقع گنوا دیا کہ کوشش ہی نہیں کی۔

میں سوچ رہا تھا کہ مجھے یہاں حیات نے قید کیا لیکن یہاں کوئی باہر نکل آیا کیا، وہ حیات کا کرکا تھا۔ اتنا مجھے یقین تھا کہ میری یہاں موجودگی کے پیچھے حیات کا ہاتھ تھا۔ اب پیاس ناقابل برداشت ہوئی جا رہی تھی۔ پھر باہر دو افراد کی موجودگی بھی ثابت ہو گئی تھی اور ان کا انداز آنے کا کوئی ارادہ بھی نظر نہیں آ رہا تھا کہ میں آزاد ہونے کی ایک کوشش ہی کرتا۔ اس لیے اب میں نے دروازہ بجانے میں کوئی کھٹک نہیں کیا اور ایسے بجایا جیسے توڑنے کی کوشش کر رہا ہوں بلند آواز والا بولنے لگا۔ ”اے کی ہے آرام نالے۔“

”مجھے پانی دو۔“
”کوئی پانی نہیں اے۔“
”جب میں اسی طرح دروازہ بجاتا رہوں گا۔“
میں نے کہا اور پھر دروازہ پیٹنے لگا۔ اگرچہ میرا اپنا دماغ خراب ہو رہا تھا مگر میں مستقل مزاجی سے بجاتا رہا۔ حتیٰ کہ بلند آواز نے چلا کر کہا۔ ”اے لانا ہوں.... بند کر شو۔“
میں نے ہاتھ روک دیا۔ میرا خیال تھا کہ دروازہ کھلے گا۔ مگر اس کے بجائے دروازے کے اوپر جسے میں ایک چھوٹی سی کھڑکی کہتی تھی۔ مشکل سے دس پانی سات انچ کی دس کھڑکی کو الگ سے پٹ میں ایک تختہ لگا کر بنا گیا تھا اور ہا نہیں اس کا کیا مقصد تھا بہر حال اس سے اس وقت ایک گلاس سائے آیا۔ ”لے پانی، بن چپ کر کے پیئیں۔“

یہ بڑا سا پتیل کا گلاس تھا جیسا کہ عام طور سے گاؤں دیہات میں کمی یا دودھ پینے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ گلاس کے پیچھے ایک ہاتھ تھا لیکن بندہ کوئی نظر نہیں آیا تھا۔ میں نے فوری پانی نہیں پیا بلکہ پیاس ایسی تھی کہ میں پورا گلاس ایک بار میں پی جانا چاہتا تھا۔ مگر میں دل پر جبر کر کے چسکی لینے کے اعزاز میں ٹھوڑا ٹھوڑا پینے لگا۔ اگر میں ایک ساتھ پیتا تو میں ممکن تھا خالی پیٹ پیچھے اٹھی ہو جاتی۔ اس طرح میری پیاس میں کمی آئی اور سر کا درد بھی بہتر ہوا تھا۔ نصف گلاس بچا کہ ایک طرف رکھ دیا۔ میں نہ جانے کیسے لوگوں کے قبضے میں تھا جو مجھے بعد میں پانی دیتے یا یا نہیں۔ پانی پی کر میں نے ایک بار پھر دروازہ بجایا۔ پہلے تو

کوئی اثر نہیں ہوا مگر دوبارہ بجانے پر دھیمی آواز والے نے پوچھا۔ ”کی اسے تینوں چپن نہیں اے۔“
”مجھے یہاں کون لایا ہے اور یہ کون سی جگہ ہے۔“
”چپ کر کے بیٹھ۔“ اس نے ٹھکر کر کہا۔ ”ہن بوا نہ کرنا کیں۔“

مجھے اس کی زبان میں پھر کوئی بات عجیب لگی تھی۔ مگر اس وقت میں سمجھا نہیں تھا۔ ”ٹھیک ہے اب میں دوبارہ نہیں بولوں گا۔ لیکن اگر کھانے کو کچھ دے سکتے ہو۔۔۔۔۔“

اس نے جواب نہیں دیا مگر چند منٹ بعد دروازے کے اوپر والی کھڑکی کھلی اور ایک چنگیر اندر آئی۔ جیسے ہی میں نے چنگیر کی کھڑکی بند ہو گئی۔ روشن دان سے آتی ہلکی روشنی میں میری آنکھیں کسی حد تک دیکھنے کے قابل ہو گئی تھیں مگر پھر بھی چیزوں کو بارہکی سے نہیں دیکھ سکتا تھا بس یہو لے سے دکھائی دے رہے تھے اس لیے مجھے اندازہ نہیں ہوا کہ چنگیر میں کیا ہے؟ میں نے ٹٹول کر دیکھا تو روشنی کے ساتھ کچھ اجڑا تھا۔ روشنی دہی انداز کی تھی یعنی موٹی اور تندور کی لگی تھی اور کمرے کے چوبیس کھٹنے کی باسی تھی۔ بہر حال کھانے کے قابل تھی۔ پھر اچار کے ساتھ اس نے مزہ دیا تھا۔ جب میں نے کھانا شروع کیا تو مجھے پتا چلا کہ میں کس قدر بھوکا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے دونوں روٹیاں میرے پیٹ میں جھنک ہو گئی تھیں۔ کھا کر میں نے خدا کا شکر ادا کیا اور تخت پر دراز ہو گیا۔ حالات کے بارے میں سوچنا بے کار تھا جو ہوتا سانسے آجاتا۔ ایک بار میں نے کھڑکی والے سے پھر زور آزمائی کی لیکن وہ بھی دروازے پر جتنی مضبوط ثابت ہوئی تھی۔

نصف رات کو میری پیاس سے آنکھ کھلی تو اس نصف گلاس پانی نے مجھے سہارا دیا تھا۔ اگر میں آغاز میں اسے پی جاتا تو اس وقت مارے پیاس کے مجھے دوبارہ نیند نہیں آتی۔ نیند نے میری طبیعت کو تقریباً ٹھیک کر دیا تھا۔ جب میں صبح کے قریب اٹھا تو میرے سر کا درد ختم ہو چکا تھا اور اب فوری بھی محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ بھوک پیاس کا احساس تھا لیکن یہ قابو میں تھا۔ روشن دان سے باہر صبح کی روشنی نمایاں تھی۔ سورج نہیں نکلا تھا مگر نکلنے والا تھا۔ میرے سر کا درد ختم ہو رہا تھا البتہ خون کے ٹکڑے جیسے ہوئے تھے اور انکس صاف کرنے کے لیے میرے پاس کچھ نہیں تھا۔ مجھے یہاں تک لانے والے یا تو نہایت بے حس اور انسانیت سے ماری لوگ تھے یا پھر وہ اتنی جگت میں تھے کہ انہیں

قرون وسطیٰ میں سقوط بغداد (تیرہویں صدی عیسوی) میں اسلامی تہذیب و تمدن اپنے عروج پر تھا۔ خصوصاً علمی و سائنسی میدانوں میں دور دور تک مسلمانوں کا ہم پلہ کوئی نہ تھا۔ دنیاؤ آخرت دونوں پر مسلمانوں کی نظر تھی اور ان دونوں کو بہتر بنانے میں لگے ہوئے تھے۔ یہ وہ دور تھا جب یورپ دشت، بربریت اور جہالت میں ڈوبا ہوا تھا۔ لوگ گارے اور گھاس کے چھو پھڑوں میں رہتے تھے۔ ان کی گھلیاں غلیظ اور جابجا گندے جوہڑوں سے بھری ہوئی تھیں۔ سیاست، حکومت، تمدن اور تہذیب کا کوئی تصور سرے سے وہاں موجود نہ تھا۔ دنیا کی بڑی بڑی تہذیبیں اور تمدن تباہ ہو چکے تھے۔

اس وقت مسلمان اٹھے اور انہوں نے صرف ایک صدی میں ہندوستان سے فرانس اور چین سے افریقا تک کے علاقوں میں ایک ہی ثقافت وارد کر دی، جس کی ابتدا مکہ طیبہ سے، اقتدا اللہ اکبر کے سائے میں اور انجام السلام علیکم تھا۔ مسلمانوں نے جابجا مساجد بنائیں۔ جن کا طرز تعمیر دیگر معابد سے جدا مگر ہر مقام پر ایک جیسا تھا۔ انہوں نے علم و فن کے بڑے بڑے مراکز قائم کیے۔ یونانی، رومی، ہندی اور چینی علوم کو جمع کر کے مرتب کیا۔ نئے نئے نظریات پیش کیے اور نئی نئی دریافتیں کیں۔ جابجا کتب خانے اور درس گاہیں قائم کیں۔ شفا خانے بنوائے، سڑکیں نکالیں، نہریں کھودیں، باغات لگوائے، گلیوں کو پختہ کیا، رات کو روشنی کا انتظام کیا۔ پل اور تالاب بنائے اور دنیا کو ایسی حسین تعمیرات سے بھر دیا، جن کے امتیازی اوصاف چمک، روشنی، صفائی، کشادگی، نقاشی، معموری، سنگ مرمر کا کام، محراب و منبر و مینار، تالاب اور فوارے تھے۔

مرسلہ: انور جردن، کوٹری

میرے زخم کو صاف کرنے کا موقع نہیں ملا اور وہ مجھے یہاں ایسے ہی ڈال کر چلے گئے تھے۔ مجھے سات آٹھ گھنٹے بعد ہوش آیا تھا اور اس دوران میں مجھے ممتاز ہاؤس سے سیکڑوں میل دور لے جایا جاسکتا تھا۔

مجھے دوسری بات درست لگ رہی تھی کیونکہ اگر حیات راج کنور کے لیے کام کر رہا تھا تو لازمی بات ہے ان لوگوں کو میرے خون کی مزید ضرورت تھی اور وہ مجھے جسمانی طور پر کمزور کرنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتے تھے۔ یقیناً کوئی ایسی بھجوری تھی کہ وہ مجھے یہاں بے سروسامانی کی حالت میں چھوڑ گئے تھے۔ ایسا لگ رہا تھا کہ مجھے ہر قیمت پر ایسی کوشش میں محدود رکھنا تھا کیونکہ ان کے پاس ایسا کوئی طریقہ نہیں تھا کہ اس سے باہر نکال کر مجھ پر قابو رکھتے۔ بعد میں میرا اندازہ درست ثابت ہوا۔ صرف یہی کوشش مجھے قید رکھ سکتی تھی۔ کیونکہ کھانا پانی بہت کم میرے پیٹ میں گیا تھا اس لیے ابھی تک اخراج کا مسئلہ پیدا نہیں ہوا تھا مگر میں نے اس کا شور کرنا مناسب سمجھا اس طرح شاید مجھے باہر جانے کا موقع ملتا۔ میں نے دروازہ بجایا تو اسی دھمی آواز والے نے غنود کی کیفیت میں پوچھا۔ ”ہن کی اے؟“

میں نے اسے دیہاتی زبان میں بتایا کہ مجھے کیا تکلیف تھی اور اس کے لیے مجھے یہاں سے باہر نکالنا ضروری تھا مگر اس نے انکار کر دیا۔ ”اندر ہی کر لے۔“ ”تمہارا دماغ درست ہے۔“ میں نے بھتا کر کہا۔ ”یہاں کچھ کیا تو میرا دماغ خراب ہو جائے گا۔“ ”نہیں ہو گا۔“ وہ بدستور پہلے کے سے انداز میں بولا۔ اس نے کوئی تشہر کر رکھا تھا۔ ”میں نہیں کھول سکدا، باہر تالا پیا اے، چالی میرے کول نہیں اے۔“

”اچھا مجھے پانی اور کچھ کھانے کو دو۔“ اس نے کھڑکی کھولی۔ ”گلاس دے، میں پانی لے

آواں، پر ہن کھانے کو کچ نہیں اے۔“ میں نے اسے گلاس تمھارا تو اس نے بھر کر پانی لا دیا۔ میں نے اسے دیکھنے کی کوشش کی لیکن وہ ایک طرف تھا۔ مجھے بس ایک جھلک دکھائی دی۔ وہ سیاہی مائل شخص تھا۔ چہرے پر کھٹی داڑھی تھی۔ اس بار بھی میں نے بہت احتیاط سے پانی پیا۔ اس لیے نہیں کہ پانی ملنے کا امکان نہیں تھا بلکہ اس لیے کہ اخراج کے مسئلے کو تا دیر ٹالا جاسکے۔ میں نے پتلون کی جیب ٹٹولی تو اتفاق سے اس میں رکھا ہوا رومال نکل آیا۔ میں نے اسے پانی سے بیگو یا اور اپنی کن پٹی

پر جما خون صاف کرنے لگا۔ میری توقع کے عین مطابق چوبیس گھنٹے گزرنے کے بعد اندر کا زخم تقریباً خشک ہو گیا تھا صرف اوپر خون جما ہوا تھا۔ وہ صاف ہو گیا۔ مجھے یقین تھا کہ اب زخم مجھ کی قابل توجہ نہیں رہا ہو گا کوئی غور سے دیکھ کر تو اسے محسوس ہو گا ویسے بھی وہ بالوں تلے تھا۔ اس موالی نے خوشخبری شادی بھی کر اب کھانے کو کچھ نہیں ہے۔ اس لیے میں مزید کی توقع نہ رکھوں۔ بہر حال وہ بڑی تندوری روٹیاں کھانے کے بعد اب میں شام تک رہ سکتا تھا۔

میں دوبارہ لیٹ گیا اور آرام کرنے لگا۔ جب ذہن پرسوجوں کی یلغار ہوئی تو سانس کی مشق کرتا اس سے ذہن پرسکون ہو جاتا۔ روشن دان سے باہر روشنی تیز ہوئی جا رہی تھی۔ صبح دروازہ بجانے پر موالی کے آنے سے لگتا تھا کہ بلند آواز والا یہاں نہیں تھا۔ شاید وہ صرف دیکھنے آیا تھا اور رات کو ہی یہاں سے چلا گیا تھا۔ اب یہاں موالی چوکیدار کے طور پر موجود تھا۔ مجھے یہاں بند کرنے والوں کو یقین تھا کہ میں کسی صورت یہاں سے نہیں نکل سکوں گا سوائے اس کے کوئی میری باہر سے مدد کرے اور باہر سے مدد کے امکانات کو ختم کرنے کے لیے ہی مجھے یہاں رکھا گیا تھا۔ اب تک وہ اپنے مقدمہ میں کامیاب تھے۔ باہر میری تلاش جاری تھی اور شاید اس کھنڈر نما احاطے کی طرف کسی کا ذہن نہیں گیا ہو گا۔ اچانک مجھے خیال آیا کہ اگر... ممتاز کے آدمی مجھے تلاش کر رہے ہوتے تو وہ مجھے لاہور جانے والی سمت میں تلاش کرتے کیونکہ آزاد ہونے ہی میں شہر جانے کی کوشش کرتا۔ تاکہ اپنے ساتھیوں سے رابطہ کر سکوں۔

میرا ذہن الجھنے لگا۔ اگر مجھے... ممتاز سے بچانے کے لیے یہاں رکھا گیا تھا تو اب خاصی دیر ہو گئی تھی۔ اگر ایسا نہیں تھا تو پھر ان لوگوں کا کیا مقصد ہو سکتا تھا۔ جب میں لینے لینے تک گیا تو اٹھ کر کوشش میں چہل قدمی کی کوشش کی۔ اسے کوشش یہاں جاسکتا تھا یہاں چہل قدمی کی گنجائش نہیں تھی۔ میں دروازے کے پاس تھا تو مجھے لگا جیسے باہر کوئی دور سے کچھ کہہ رہا ہو۔ آواز پارک کی تھی مگر میں نے سنی تھی۔ میں نے دروازے سے کان لگا دیا۔ آواز بس ایک لمبے کو آئی تھی۔ اگر یہ سچ کی کسی آواز تھی تو اسے دوبارہ آنا چاہیے تھا۔ مگر جب جی منٹ گزرنے کے باوجود آواز نہیں آئی تو میں نے دروازے سے سر ہٹانا چاہا اور اسی لمحے مجھے کسی عورت کی آواز سنائی دی۔

”خدا کے لیے مجھے پانی دو۔“

آواز بہت مدھم اور دور کی تھی لیکن الفاظ صاف سنائی دے گئے۔ میں شناخت نہیں کر سکا کہ آواز بانو کی تھی یا نہیں کیونکہ اس میں ایک محسن اور درد والی کیفیت بھی شامل ہو گئی تھی۔ مجھ پر پوری قوت سے پول رہی تھی اور ایسے میں آواز کا تبدیل ہونا لازمی تھا۔ بانو کا ذکر میں نے یوں کیا کہ یہ لہوائی آواز سننے ہی میرے ذہن میں بانو کا خیال آیا تھا۔ وہ بھی میری طرح غائب تھی۔ اس لیے یہاں اس کی موجودگی بھی ممکن تھی۔ مجھے پہلے بھی حیات پر شبہ تھا کہ بانو کی کم ہنسی میں اس کا ہاتھ تھا اور وہ جس طرح مجھے ممتاز ہاؤس سے نکال کر لے گیا تھا اس سے یہ شبہ تقریباً یقین کو پہنچ گیا تھا۔ اس لیے عورت کی آواز سننے ہی مجھے بانو کا خیال آیا۔ میں واپس آتے آتے رک گیا اور دوبارہ کان دروازے سے لگا دیا۔

عورت کی آواز سے ایسا لگ رہا تھا کہ وہ خاصی دور تھی۔ میرا نہیں خیال تھا کہ یہ احاطہ اتنا بڑا ہے کہ اس میں کسی کو دور بھی رکھا جاتا ہو۔ یہ تھک کوشش کا سزا اور روشن دان سے نظر آنے والے محسن سے آیا تھا لیکن اس کا بھی امکان تھا یہ احاطہ خاصا بڑا ہوتا اور اس میں کہیں اور بھی تعمیرات تھیں۔ جہاں کسی اور کو رکھا جاسکتا تھا۔ عورت کی آواز پھر نہیں آئی مگر اس کے ایک جملے سے واضح تھا کہ وہ تقریباً میری ہی جیسی صورت حال سے دوچار تھی اور شاید اس کا کھانا پانی بھی بند تھا۔ یہاں پانی تھا مگر موالی کو اٹھ کر دیتے ہوئے موت آتی تھی۔ کھانے کا اس نے منع کر دیا تھا اور اس کا کسی صورت پتا نہیں لگایا جاسکتا تھا کہ وہ کچ کہہ رہا ہے یا اسے کھانا دیتے ہوئے بھی موت آ رہی تھی۔ میں نے بے شک وشور پچایا تھا مگر اس عورت میں شاید اس کی جرأت تھی کہ اسے اور وہ صرف فریاد کر رہی تھی۔ جب دوبارہ اس کی آواز نہیں آئی تو میں بھی آکر بستر پر لیٹ گیا۔

دوپہر ہو چکی تھی اور رات کا کھانا بے مقصد ہو چکا تھا اس لیے معذرت سے فریاد شروع کر دی تھی مگر یہ اب بلند آواز نہیں تھی۔ پھر بھی میں نے شور کرنا مناسب سمجھا۔ دروازہ بجانے پر موالی آیا اور خشکی سے بولا۔ ”تینوں جگہ نہیں اے۔“ ”مجھے کچھ کھانے کو دو ورنہ میں اسی طرح شور کرتا رہوں گا۔“ میں نے مکث نہ کرکے بلند آواز میں کہا۔ ”ہن کی کچ نہیں اے۔“

”نہیں ہے تو مگواؤ، ورنہ میں دروازہ بجاتا ہوں گا۔“

”میں سر توڑ دوں گا۔“

”اس کے لیے تمہیں اندر آنا پڑے گا اور ایک بار تم اندر آ گئے تو تمہارا صرف سر نہیں ٹوٹے گا میں گردن بھی توڑ دوں گا۔“

”او میرے بیو، میں دی بھوکا واں۔“ اس نے عاجزی سے کہا۔

”تم یہاں اکیلے ہو؟“

وہ جھٹکا ہو گیا۔ ”تو کیوں پچھرا یا اے؟“

”میں نے ابھی کسی عورت کی آواز سنی تھی وہ پانی مانگ رہی تھی۔“

”اس نوں وی پانی دے دیتا اے۔“

”تم یہاں چوکیدار ہو؟“

”آہ۔“ وہ جان چھڑانے کے انداز میں بولا۔ ”ہن مینوں تنگ نہ کریں۔“

”تم اس عورت کو جانتے ہو۔“

”نہیں جی اس نوں دی تیری طرح لائے سی۔“

”کون؟“

اس نے صاف انکار کیا۔ ”اے میں نہیں دس سکدا۔“

”اچھا لڑکی نے نیلی فراک پہنی ہے جس پر پہلے پھول کا ڈھسے ہوئے ہیں؟“

وہ حیران ہوا۔ ”تینوں کیوں پتا چلیا۔“

”وہ میری ساتھی ہے۔“ میں نے کہا۔ ”مجھے تم غریب آدمی لگ رہے ہو نہیں یہاں لانے والے جرائم پیشہ ہیں۔ اگر کوئی مصیبت آئی تو تم مارے جاؤ گے اور یہ سچ جائیں گے۔“

”کیسی مصیبت؟“ وہ فکر مند ہو گیا۔

”فرض کرو میں چھڑانے کے لیے یہاں پولیس نے چھاپا مارا تو تم ہی پکڑے جاؤ گے۔“

”میں کیوں۔“ وہ بدکا۔

”کیونکہ تم ان کے ساتھی ہو۔“ میں نے کہا۔ ”ویسے یہ جگہ کہاں ہے؟“

”تو نہیں جانتا؟“ اس نے الٹا سوال کیا۔

”میں جانتا تو تم سے کیوں پوچھتا ویسے یہ... ممتاز کا علاقہ ہے؟“

وہ حیران ہوا۔ ”کون... ممتاز؟“

”تم میاں ممتاز کو نہیں جانتے وہ بہت بڑا جاگیردار ہے۔“

”اتھے کوئی... محتاج نہیں اے۔“ اس نے صاف انکار کیا۔

اس کا مطلب تھا کہ مجھے کسی بہت دور دراز جگہ لایا گیا تھا۔ امکان یہی تھا کہ میں لاہور کی حدود سے باہر تھا۔ مجھے موالی کو... ممتاز کا علم نہیں تھا۔ وہ یہاں سے عام طور سے لوگوں کو چالیں کوس تک پائے جانے والے تمام مشہور افراد کی پوری ہسٹری مع خاندانی تاریخ کے زبانی یاد ہوتی تھی۔ جب کہ یہ نام بھی نہیں جانتا تھا۔ اس خیال سے ایک سوال اور پیدا ہوا کہ اگر مجھے اتنی دور لے آیا گیا تھا کہ یہاں... ممتاز کے آدمی نہیں پہنچ سکتے تھے تو پھر اس طرح رکھنے کا کیا جواز تھا؟ اگر حیات راج کنور کے لیے کام کر رہا تھا تو مجھے اس طرح رکھنے کا جواز نہیں تھا۔ اگر وہ... ممتاز سے بچا رہا تھا تب بھی ضروری نہیں تھا۔ اب ایک ہی صورت رہ جاتی تھی کہ حیات مجھے انتقال یہاں لے آیا تھا۔ وہ خود یا نو کے چکر میں تھا اور اس کے خیال میں میرے باؤسے غلط قسم کے تعلقات تھے۔ اسی لیے باؤسے جم سے نکال کر میرے ساتھ وہاں رہ جاتی تھی۔ مگر یہ بھی ایک مفروضہ تھا اور یہاں قید رہ کر میں صرف مفروضے قائم کر سکتا تھا حقیقت اپنے وقت پر میرے سامنے آتی۔

اب مجھے جھٹلاہٹ ہونے لگی تھی۔ آج تک میرے کسی دشمن نے مجھے اتنی بے نیازی سے قید نہیں کیا تھا کہ پلٹ کر پوچھنا بھی بھول جائے۔ ایسا لگ رہا تھا مجھے قریضہ میں ڈال دیا گیا ہے۔ اگرچہ اس قید میں مجھے سوائے بھوک پیاس کے اور کوئی تکلیف نہیں تھی۔ مگر اب میں اس سے گلنا چاہتا اور اس کے لیے باہر موجود کسی مشکل کا سامنا کرنے کے لیے بھی تیار تھا۔ مگر میرے بس میں کچھ نہیں تھا۔ ان حالات میں ہونا وہی تھا جو میرے دشمن چاہتے یا جو انہوں نے میرے لیے سوچ رکھا تھا۔ دن ڈھلنے لگا۔ دوپہر کے بعد سورج مغرب کی طرف جھکا۔ روشن دان کے دائیں طرف مغرب کی سمت تھی اور بائیں طرف مشرق کی سمت تھی۔ اگرچہ مجھے اس معلومات کا فائدہ نہیں تھا۔ جب تک میں آواز نہ ہو جاتا۔

آج بھی ابھی تک کوئی ایسی آواز نہیں آئی تھی جس سے اس جگہ کے بارے میں کچھ اندازہ ہوتا۔ مجھے یاد تھا کہ کل جب بلند آواز والا آیا تھا تب بھی کوئی ایسی آواز نہیں آئی تھی جسے شبی انجن کی آواز سمجھا جاتا۔ وہ پیدل آیا تھا یا سائیکل نما کسی خاموش سواری پر آیا تھا۔ اگر وہ کسی کھوڑے یا جانور پر آیا تھا تب بھی اس نے اسے یہاں سے دور چھوڑا تھا۔

سوچ سوچ کر میرا دماغ خراب ہونے لگا تھا۔ اس بات سانس کی مشق کرنے کو بھی دل نہیں چاہ رہا تھا۔ میں نے انکی جھنجھلاہٹ بہت کم محسوس کی تھی۔ حالانکہ اس سے پہلے بھی میں ایسے صبر آزما مواقع سے دوچار ہوا تھا۔ شاید خون نکالنے سے میں کمزور ہوا تھا اور جب انسان کا جسم کمزور ہوتا ہے تو اس کے اعصاب خود بہ خود کمزور ہو جاتے ہیں۔ پھر انسان اسی وجہ سے زیادہ غصہ کرتا ہے۔ اوپر سے ان لوگوں کا رویہ بھی ایسا تھا۔ یہ مجھے کسی پوری کی طرح یہاں ڈال کر بھول گئے تھے۔ جب مجھے اپنی جھنجھلاہٹ کا احساس ہوا تو میں اس پر قابو پانے کی کوشش کرنے لگا۔ میں نے اپنا ذہن موجودہ معاملے سے ہٹانے کے لیے اپنے ساتھیوں اور پیاروں کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا۔ یہ حربہ بہتر رہا۔ خاص طور سے جب سوچوں کا رخ سویرا کی طرف آیا۔ پھر مجھے پتہ چلی کہ وہ کس وقت کس طرح گزر گیا تھا۔

پھر سے آئی آوازوں نے مجھے چونکایا۔ باہر تاریکی چھا رہی تھی اور کوشری کے اندر تاریکی چھا چکی تھی۔ بہت معمولی سا نظر آ رہا تھا۔ میں اٹھ کر دروازے تک آیا۔ اس بار بولنے والوں کی تعداد دو سے زیادہ تھی اور پھر ان میں حیات کی آواز سن کر میری رگوں میں خون تیز ہو گیا تھا وہ موالی اور بلند آواز والے سے بات کر رہا تھا۔ شاید وہ ان سے رپورٹ لے رہا تھا کیونکہ اس کا انداز تجسّس تھا۔ وہ میرے بارے میں پوچھ رہا تھا۔ موالی دبی زبان میں اسے بتا رہا تھا کہ اس دوران میں میں نے کیا کیا۔ پھر حیات نے حکم دیا۔ ”اسے نکال کر لاؤ۔“

چند لمحوں بعد دروازے پر اتنی کھٹ پٹ ہوئی اور تالا اٹکنڈی ٹھٹھکی۔ دروازہ کھلتے ہی جیسے روشنی کا سیلاب اندر آیا تھا کیونکہ سورج اسی سمت میں غروب ہونے والا تھا اور اس کی آخری کرنیں براہ راست کوشری میں گھس آئی تھیں۔ چند لمحوں کے لیے میری آنکھیں چکا چوند ہو گئیں۔ جب میں کسی قدر دیکھنے کے قابل ہوا تو میں نے دو افراد کو سامنے پایا جن کی داڑھیاں بے ترتیبی سے بڑھی ہوئی تھیں اور سر پر ٹھونڈے مخصوص ساخت کی پگڑیاں باندھ رکھی تھیں۔ میں چونک گیا کیونکہ وہ مکہ تھے۔ اب میں سمجھا کہ مجھے ان کی زبان کیوں عجیب لگ رہی تھی وہ شخصوں والی پنجابی بول رہے تھے جو ہماری پنجابی سے کسی قدر مختلف ہوتی ہے۔ یہ فرق الفاظ سے زیادہ بولنے کے انداز کا ہوتا ہے۔ ان میں سے ایک نے چھوٹی نال والا برٹا اٹھا رکھا تھا۔ اعضاء پر ان کی کامیٹا

دیکھ کر چند مہلک ترین ہنڈ گتوں میں شمار ہوتا ہے۔ وہ بلند آواز والا تھا اس نے مجھے حکم دیا۔ ”باہر آؤ۔“ میں آنکھوں پر ہاتھ رکھتا ہوا باہر آیا۔ میری توقع کے خلاف یہاں بہت بڑا کچا احاطہ تھا اور میں جس کوشری میں قید تھا وہ اس احاطے میں بالکل الگ تھلک تھی۔ اس کے تین اطراف میں بلند قامت درخت تھے اور دور درستی طرف چند کوشریاں اور نظر آ رہی تھیں درمیان میں درختوں تلے کئی چار پائیاں پڑی تھیں، اس کے علاوہ یہ احاطہ بالکل خالی تھا جو کم سے کم دو کنال رقبے پر پھیلا ہوا تھا۔ مغرب کی سمت احاطے میں ایک چھوٹا سا کنوی کا دروازہ تھا۔ چار پائیوں پر حیات کے ساتھ اس کا وہی ساتھی موجود تھا جو ممتاز باؤس میں میری عمرانی کرتا تھا۔ گویا وہ غدار کی حیات کے ساتھ شریک تھا۔ لازمی بات بھی حیات کیلئے نہیں تھا تو اور مجھے وہاں سے بہ حفاظت اور کسی کی نظروں میں لانے بغیر نکالنے کے لیے اسے یقیناً کئی افراد کی مدد حاصل رہی ہوگی۔ لیکن تھا کہ اس سانولے رنگ کے شخص کے علاوہ بھی وہاں اس کے کئی ایک ساتھی ہوں۔ بلند آواز والے نے مجھے لے جا کر حیات کے سامنے پیش کر دیا۔ اس نے مذاق آڑانے والے انداز میں میرا جائزہ لیا اور مڑے لیے مجھ میں بولا۔ ”کیا حال ہیں سویرا...؟“

”اللہ کا شکر ہے وہ جس حال میں بھی رکھے۔“

”تم لوگ اپنے اللہ کا ذکر بہت کرتے ہو۔“ اس کے انداز میں طنز پر بڑھ گیا تھا۔

”کیوں تمہارا اللہ نہیں ہے؟“

”اس نے میرا سوال نظر انداز کیا اور بولا۔“

”اندر ہے کہ تم کہاں ہو؟“

”اندر ہے کہ تم کہاں ہو؟“

رابرٹ بریٹل اپنی کتاب ”تھکیل انسانیت میں“ لکھتا ہے کہ عربوں کے ہاں اتنے نفس سوئی، اونٹ اور شبی لباس تھے جنہوں نے نیم عریاں لوگوں کو لباس کا شوقین بنا دیا۔ پروفیسر براؤن ”تاریخ ادبیات عربی“ میں لکھتا ہے کہ سلاطین علما اور فضلاء کی عہدی کیا کرتے تھے۔ دنیا کا سب سے پہلا باقاعدہ تعلیمی نظام ”نظامیہ“ کا تھانے نظام الملک نے مرتب کیا تھا۔ بغداد میں نظامیہ سلسلے کے تحت تیس کالج تھے۔ یہی حال اہلین کا تھا۔ ڈاکٹر ڈیپر، محرک مذہب و سائنس، میں لکھتے ہیں کہ جب یورپ جہالت کے اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا تو قرطبہ اور غرناطہ کی درس گاہوں میں حصول علم کے بڑے بڑے قافلوں جگمگا رہے تھے۔ کب کب اٹھی کرنے کا جنوں مسلمانوں میں عام تھا۔ سلاطین اور امراء تو کیا عام مسلمان بھی کتابوں کا ذخیرہ کرنا ثقافت و تہذیب کا جزو سمجھتا تھا۔ ”الغیر ست“ میں ابن ندیم لکھتا ہے کہ بغداد میں محمد بن حسین ابی بکر کا کتب خانہ کا جواب تھا۔ یا قوت مووی، ”معم البلدان“ میں قطر اذ ہے کہ سلطان بہاء الدولہ کے وزیر ابو نصر ساریور کے کتب خانے سے بہتر کوئی کتب خانہ نہ تھا۔ الفجری کے بقول آخری عباسی خلیفہ مستعصم کے وزیر مویہ الدین کی ذاتی لائبریری دس ہزار کتب پر مبنی تھی۔ یقیناً بڑی کے بقول غلغلاے قلمی کے ہاں چھ لاکھ کتابیں تھیں۔ اور ڈاکٹر ڈیپر کے بقول جب نوح بن منصور سامانی نے صاحب بن مہاد کو وزارت کی دعوت دی تو اس نے چار سو اونٹ کتابیں اٹھانے کے لیے طلب کیے۔ تھون عرب ”کا مصنف لیان لکھتا ہے کہ جب منگولوں نے اہل بغداد کی کتابیں دریائے دجلہ میں پھینک دیں تو وہاں ایک بلی سامنے گیا جس پر لوگ پیدل چل سکے تھے۔ اور دریا کا پانی سیاہی مائل سے کالا ہو گیا۔ ہمارے باہت اسلاف کی تصانیف کی تعداد سو سے اوپر ہے۔ مثلاً امام غزالی دوسو، ابن عربی اڑھائی سو، ابن تیمیہ پانچ سو، جلال الدین سیوطی ساڑھے پانچ سو اور ابن طولون دس سو سات سو کتابوں کے مصنف تھے۔ ہالینڈ کی ایک فرم ای جے برل نے کئی ہزار عربی کتابوں کا ذکر کیا ہے۔ ڈاکٹر ڈیپر، رابرٹ بریٹل، لیان، قلف، ہٹی، بکھال، بکھن، براؤن، دل ڈیوران، آرٹلڈ، چارلس مور اور اسکاٹ وغیرہ ایسے کئی مستشرقین ہیں جنہوں نے اس امر کے دستاویزی ثبوت بہم پہنچائے ہیں۔

مرسلہ: ناصر حسین زیدی، ملتان

تھا۔ ”اگر میرے پروا کرنے سے میں واپس اس طرف جا سکتا تو تم مجھ سے زیادہ پریشان کی کو نہ پاتے۔“
 ”یہاں تمہارے خلاف بے شمار مقدمات ہیں۔“
 اس نے ڈرانے والے انداز میں کہا۔ ”ہر کیس میں تم کو کم سے کم سزائے موت ہوگی۔“

”یہاں پاکستانیوں کو بغیر کسی جرم کے بھی سزائے موت ہو جاتی ہے۔“ میں نے استہزائیہ انداز میں کہا۔ ”اس لیے مجھے ڈرانا بیکار ہے۔ دو میں سے ایک ہی بات ہوگی یا تو میں یہاں سے بچ کر واپس چلا جاؤں گا یا انہیں بچ سکوں گا۔ تیسری کوئی صورت نہیں ہو سکتی ہے۔“

میں حیات اور اس کے ساتھیوں کے سامنے خود کو بے خوف ظاہر کر رہا تھا اور درحقیقت مجھے خوف نہیں تھا کیونکہ جو میں نے کہا تھا وہ الفاظ نہیں میرا ایمان تھا لیکن میں فکر مند ضرور ہو گیا تھا۔ جس جگہ اتفاقاً آنے کے بعد میں کتنے جتن کر کے نکلا تھا ایک بار پھر ایک غدار کی وجہ سے وہیں آچھا تھا۔ حیات نے صرف ... ممتاز سے غدار کی نہیں کی تھی اس نے اپنی زمین سے بھی غدار کی تھی۔ غداروں کا انجام اچھا نہیں ہوتا ہے لیکن فی الحال وہ مزے میں دکھائی دے رہا تھا اس نے غور سے مجھے دیکھا۔ ”تم جانتے ہو تمہیں یہاں کیوں لایا ہوں؟“

”ظاہر ہے تم راج کنور کے زرخیز ہواور یہاں اسی کے لیے مجھے لائے ہو۔ وہاں بھی میرا خون لیا جا رہا تھا اور یہاں بھی تم میرا خون نکالو گے۔“
 ”اور اس کے بعد...؟“ اس نے معنی خیز لہجے میں پوچھا۔

”اس کے بعد... مجھے کسی بھارتی ایجنسی کے حوالے کر دیا جائے گا۔“ میں نے سٹات لہجے میں کہا۔
 ”تمہیں خوف نہیں ہے؟“

”کیوں نہیں ہے، جب کہ میں جانتا ہوں کہ ان کے مقابلے میں جنگل کے درندے بھی رحم دل ہوتے ہیں۔ مگر سوال وہی ہے خوف زندہ یا پریشان ہونے سے میری بچت ہو جائے گی؟“

حیات کے علاوہ اس کے دو ساتھی بھی مسلح تھے۔ انہوں نے اپنے ہتھیار ریڈی پوزیشن میں رکھے تھے۔ گویا وہ مجھ سے اچھی طرح واقف تھے۔ صرف موالی خانی ہاتھ تھا اور اس کی شاید کوئی حیثیت نہیں تھی اگر میں اس پر قابو پا بھی لیتا تو اس کے مرنے سے انہیں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میں نے محسوس کیا

کہ میری بے خوفی سے وہ دونوں کچھ متاثر ہوئے تھے خاص طور سے موالی جو اب مجھے قابلِ تحسین نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ میں نے کہا۔ ”البتہ ایک بات سمجھ میں نہیں آئی ہے؟“
 ”کون سی بات؟“

”میں کہہ رہا تھا کہ تمہیں کھنے سے مجھے یہاں کیوں رکھا گیا ہے اب تک تو مجھے کنور خاندان کے کسی زندان میں ہونا چاہیے تھا۔“

”جلد ایسا ہی ہوگا۔“ حیات نے کہا۔ ”اصل میں مجھے ممتاز ہاؤس کے معاملات نمٹا کر آنے میں کچھ وقت لگا ہے۔“
 ”وہاں کیا ہوا؟“ میں نے پوچھا۔ ”وہیں میرا اندازہ ہے کہ ڈاکٹر کی موت اور پھر فراہم کا الزام مجھ پر لگا کر تم صاف کر دیے ہو گے۔“

”وہ مسکرایا۔“ ”تم آسانی سے نہیں... ممتاز نے مجھے بھی رگڑ دیا تھا۔ مجھے ایک مصنوعی زخم بھی بنانا پڑا تھا۔ بہر حال کسی نہ کسی طرح جان چھوٹ گئی۔“ اس نے اپنی قبض کی آستین الٹ کر زخم دکھایا جس پر پٹی بندی ہوئی تھی۔ ”تم سوچ بھی نہیں سکتے کہ تمہارے اس طرح غائب ہونے سے... ممتاز کس طرح تھلا رہا تھا۔“ اب اس کے لیے مجھ... ممتاز کے لیے کوئی احترام نہیں تھا جب کہ ایک وقت اس نے مجھے کہا تھا کہ میں... ممتاز سے بچو واپس سے بات نہ کرو۔

”مگر تم یہاں ہو، اس طرح غائب ہونے سے بڑے صاحب کو شک نہیں ہوگا؟“
 ”ہوتا رہے اب مجھے واپس تو نہیں جانا ہے۔“ اس نے شانے اچکا۔
 ”میرے ساتھی کا کیا ہوا؟“

”وہ... ممتاز کے پاس ہے اسے دوسری جگہ رکھا گیا تھا اور وہاں بندے میرے قابو میں نہیں تھے اس لیے اسے نہیں لایا۔ کاوندہ اسے بھی لے آتا۔“
 ”اسے کیوں؟“
 ”وہ بھی کنور جی کا مجرم ہے۔ باغی قبائل سے تعلق رکھتا ہے۔“

میں نے سکون محسوس کیا کہ وہ بیوقوفانہ میں ناکام رہا تھا ورنہ اسے یہاں سوائے موت کے اور کچھ نہ ملتا۔ راج کنور اسے فوری سزا دیتا البتہ مجھے وہ زندہ رکھنے پر مجبور ہوتا۔ اگر حسیہ ممتاز سے بھی امید نہیں تھی کہ وہ بیٹے کوئی اچھا سلوک کرے گا یا اسے آزاد کر دے گا مگر یہاں

بے پروا ہی ہوتا۔ میں نے محسوس کیا کہ مجھے بلا وجہ اس کوئی نہیں لگا لایا گیا تھا۔ شاید حیات مجھے لے جانے کے لیے آیا تھا۔ میرا اندازہ درست نکلا جب وہ اٹھ کھڑا ہوا اس نے اپنے ساتھیوں کو حکم دیا۔ ”اس کے ہاتھ پشت پر لٹا دو۔“

تین نکون کے سامنے مزاحمت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوا تھا میرا خیال تھا کہ وہ رسی سے ہاتھ باندھیں گے لیکن انہوں نے جدید ترین اسٹیل اور ٹانگون کی بنی ہوئی ہتھیاریاں میرے ہاتھ میں ڈال دیں۔ پھر ایسی ہی بیڑیاں ڈالیں۔ ان کے درمیان ایک فٹ کی ٹانگوں کی ڈاکٹر کی میٹ میں زیادہ قدم اٹھا کر نہیں چل سکتا تھا۔ جب مجھے اندازہ ہوا تو حیات نے موالی کو حکم دیا۔ ”اسے بھی لے آ۔“

موالی سچ موالی ہی لگتا تھا وہ دہلا پلا لیکن لمبا اور بہت غلیظ تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ وہ کئی مہینوں سے نہیں کھانا کھا اور اس کے پاس سے بدبو آ رہی تھی۔ مجھے بے سوچ کر ہاتھ پڑا تھا کہ اسی نے مجھے کھانا پانی دیا تھا۔ شکر ہے کھانے کی گشت والی کوئی چیز نہیں تھی ورنہ وہ حرام ہوتی اور مجھے کیا حکم ہوتا کہ میں کہاں تھا اس لیے میں تو کھا لیتا۔ وہ کوئی کھانا کھڑیوں کی طرف گیا تو مجھے عورت کا خیال آیا جس نے ہارنے کی آواز آئی تھی۔ موالی نے لباس کی حد تک کھینچ کر دی تھی کہ وہ بانو ہی تھی مگر پھر بھی ایک شبہ باقی تھا کہ اس تصدیق ہونا باقی تھی۔ حیات نے شاید اسے لانے کا حکم دیا تھا۔ میری نظر کھڑیوں کی طرف تھی۔ موالی نے دیوان والی کھڑی کا دروازہ کھولا۔ موالی نے اندر موجود کمرے کو بازو سے پکڑ کر باہر نکالنا چاہا تو وہ خوف سے چلنے لگا۔ ”پھوڑ مجھے... کتنے... ذلیل۔“

اس بار میں واضح پہچان دے بانو ہی تھی۔ موالی اسے کھینچ کر باہر لایا اور حیات کے پاس لاکر پکا سا دھکا دیا۔ وہ کمرے میں لے گئی تھی کہ حیات نے اسے سنبلایا۔ مگر اس نے ایک ہتھکے سے اپنا بازو چھڑ لیا۔ وہ زہریلے لہجے میں کہنے لگا۔ ”تم ہاتھ لگاؤ مجھے۔“

حیات نے برا نہیں مانا اور ہنس کر بولا۔ ”اچھا نہیں لگتا ہے جلد تیرے ہر طرح سے ہاتھ لگاؤں گا اور تو مجھے نہیں ڈرے گی۔“
 بانو کی حالت سے لگ رہا تھا کہ وہ بھوکے تھی شاید اسے کھانا پانی نہیں دیا جا رہا تھا۔ مسلسل خوف اور آرام لانے کے اس کے چہرے کی رونق ختم کر دی تھی اور آنکھوں

مسلمان وہ پہلے لوگ تھے، جنہوں نے سائنس پر کما حقہ توجہ دی۔ بقول رابرٹ بریٹن سائنس سے مراد تحقیق کی نئی روح تھیں جسے نئے طریقے، پیمائش و مشاہدہ کے نئے اسلوب ہیں۔ جن سے یونانی بے خبر تھے۔ یورپ میں اس روح اور اسباب کوران کرنے کا سہرا یوں کے سر ہے۔ یوں تو مسلمانوں کے طبقے کا ناموں کی فہرست کافی طویل ہے۔ مگر بقول ڈاکٹر غلام جیلانی برقی تحفہ آری کہ انہوں نے روشنی، نظر، کسوف، خسوف، باد و باران، حیوانیات، نباتات، خواص اشیاء وغیرہ پر لاتعداد کتب لکھیں۔ گندھک اور شہرے کا تجزیہ اب بنایا۔ انکس سے کام لیا۔ جرجنل کے قوانین پر روشنی ڈالی۔ ملاحات معاون اور سیلاب وغیرہ کا وزن معلوم کیا۔ نیز پہاڑوں اور سمندروں کے ذخائر پر بحث کی۔

طب میں اسلام نے ہزار ہا علم پیدا کیے۔ جبریل بن ختیشور یوحنا بن ماموہ، الکندی رازی، ابن سینا، ابو القاسم، ابن زہر، ابن خلیفہ اور ابن رشد جیسے سیکڑوں طبیبوں نے علم طب کو کہیں کا نہیں پہنچا دیا۔ ڈاکٹر ذریعہ لکھتا ہے کہ چیچک کا ٹیکا اور آپریشن کے کئی طریقے مسلمانوں کی ایجاد ہیں۔

قلندری دیگر علوم با بعد الطبیعیات میں مسلمانوں نے پیش قیمت اضافے کیے۔ یورپ میں صدیوں تک الکندی، ابن رشد، جاحظ، ابن طفیل، ابن غزالی اور ایسے کئی مسلمان مفکرین کا فلسفہ پڑھایا جاتا رہا۔ ریاضی میں عمر خیام، الخوارزمی، ابو الوفاء، ابن النیم اور مولیٰ بن شارک جیسے علماء کا کوئی جواب نہ تھا۔ الجبرا، مثلثات اور دیگر کئی علوم ریاضی مسلمانوں ہی نے ایجاد کیے۔ علم طب میں مسلمانوں کی اہم ایجاد طرلاب تھی جس سے ستاروں کا فاصلہ پتا چا جاتا تھا۔ علم تاریخ میں بھی بار مسلمانوں ہی نے سچ اور سائنسی بنیادوں پر مدون کیا۔ وادی ابن سعد بلا ذری، ابن اثیر، طبری، ابن خلدون، ابن حجر، ابن عساکر اور ابن خلدون جیسے سیکڑوں مورخین نے وہ کام کیے جو آج بھی سند کی حیثیت رکھتے ہیں۔ علم لغت، ادب، شاعری، تصوف، موسیقی، حدیث، فقہ، علم الکلام اور ایسے سیکڑوں علوم میں مسلمان بڑی دسترس رکھتے تھے۔ قرون وسطیٰ کی ثقافت میں علم کی فراوانی کا یہ حال تھا کہ لوگ تحصیل علم کو فرض اولین اور کب معاش کو فرض دوم سمجھتے تھے۔ خصوصاً علم دین اور تصوف میں مسلمانوں نے وہ کمال حاصل کیا کہ آج تک دیگر علوم کے ارباب بست و کشاد اس مقام تک نہیں پہنچ سکے۔

مرسلہ: یعقوب عثمانی، کراچی

(ایم افضل کمرل ننگانہ کا جواب)

فتح حسن خان..... ڈیرہ مراد جہاںی

یہ دنیا ظالم دنیا ہے یہ بات بہت پھیلائے گی
تم سب کے سامنے چپ رہنا اور چپکے چپکے رو لینا
رضا تقویٰ..... بکھر

یہاں اہل محبت عمر بھر برپا دے رہے ہیں
یہ دریا ہے اسے کچا گھڑا اچھا نہیں لگتا
واٹس احمد..... طلات

یا اندھیرے خلاؤں میں دم گھونٹ دو
یا ہواؤں کو پھر تازگی بخش دو
نادر خان..... ڈی آئی خان

یہ خواب یہ خوشیوں بھرے ہستے ہوئے یہ خواب
یہ خواب میرے دل پہ اثر کیوں نہیں کرتے
زیب کھلیب..... گوجرانوالہ

یہ شہر بہت جلد اجڑنے والا ہے
دکھناور و خریدار جھوٹ بولتے ہیں
انظہار اقبال..... لاہور

یوں تو ہر سرتے شہر میں ہنگامہ ہے
اور پھر بھی ہے ہر اک شخص اکیلا
(شائستہ زریں شیخ پورہ کا جواب)

سعید احمد چاند..... کراچی
یاد کر کے اور بھی تکلیف ہوتی تھی عدم
بھول جانے کے سوا اب کوئی بھی چارہ نہ تھا

نعمان فرحت قادری..... ساہیوال
یہ اور بات کہ تقدیر سو سہمی قابل
وگرنہ دیدہ بیدار ہم بھی رکھتے ہیں

(نیم حیدر ناز مظفر گڑھ کا جواب)
غلام اکبر ساقی..... نورنگہ میانوالی
راہطوں میں کی ہے ترک تعلق نہ ہوگا بھروسہ رکھ

ترے سوا ہے ہی کون میری ذات سے تخلص
(ناصر سعید فیصل آباد کا جواب)
مرزا ہادی بیگ..... حیدر آباد

وہ کون ہیں جنہیں توبہ کی ٹل مافی فرصت
ہمیں گناہ بھی کرنے کو زندگی کم ہے

طحا یاسین..... حیدر آباد

وہ دیکھ شام کے بستر پہ گر گیا سو رہا
بدن سے چھوٹ رہی ہے نکان کی خوشبو
افروز نگیل..... مظفر گڑھ

وہ دیوانہ ہوں میں جب سے بسایا میں نے زعمان کو
نہ صحرا میں اگے کاٹنے نہ نگلشن میں بھار آئی
نصیر الدین..... میرپور خاص

اہل اس کی بلندی کو چھو نہیں سکتی
وہ زندگی جسے احساس زندگی ہو جائے
محمد امتیاز حسن..... سرگودھا

انساں سے محبت کی سزا کتنی بڑی تھی
نفرت کے طمانچے میرے رشاک تک آئے
ناصر..... حسن ابدال

اس کی ہنسی میں چھپے درد کو محسوس تو کر
وہ تو یونی ہنس ہنس کے خود کو سزا دیتا ہے
وہاب اللہ سرہندی..... جہلم

آ کہ نہ جانے تجھ بن کب سے
روح ہے لاشہ جسم ہے مرض
(نگار سلطان لاہور کا جواب)

اشفاق حسین..... پشاور
یہ خود شناسی بھی آخر کہاں پہ لے آئی
کہ اپنے آپ سے لگنے لگا ہے ڈر مجھ کو

ناز افروز..... راولپنڈی
یہ مانا کہ تغافل نہ کرو گے دیکھو
خاک ہو جائیں گے ہم تم کو خبر ہونے تک

بیت بازی کا اصول ہے جس حرف پر شعر ختم ہو رہا
ہے اسی لفظ سے شروع ہونے والا شعر ارسال کریں۔
اکثر قارئین اس اصول کو نظر انداز کر رہے ہیں۔ نتیجتاً ان
کے شعر تلف کر دیے جاتے ہیں۔ اس اصول کو نظر رکھ کر
ہی شعر ارسال کریں۔

علمی آزمائش۔ 93

۱۵۱۰

ماہنامہ سرگزشت کا منقرضہ انعامی مسلہ

علمی آزمائش کے اس مفروضے کے ذریعے آپ کو اپنی معلومات میں اضافے کے ساتھ انجام دیتے کاموقع بھی ملتا ہے۔ ہر ماہ کی آزمائش میں دیے گئے سوال کا جواب تلاش کر کے پھیل بچھوایے۔ درست جواب صحیحیے والے پانچ کارکن کو ماہانہ ممبر کی شہادت سب سے بہتر ڈائجسٹ، جاسوسی ڈائجسٹ اور ماہانہ مہیا کیزہ میں سے ان کی پسند کا کوئی ایک رسالہ ایک سال کے لیے جاری کیا جائے گا۔

ماہنامہ سرگزشت کے قاری ”عیسیٰ سرگزشت“ کے عنوان تلے منفرد اعزاز میں زندگی کے مختلف شعبوں میں نمایاں مقام رکھنے والے کسی معروف شخصیت کا تعارف پڑھتے رہے ہیں۔ اسی طرح ہر مرتبہ کی انی اس آزمائش میں دریافت کر دہ فرد کی شخصیت اور اس کی زندگی کا خاکہ لکھ دیا گیا ہے۔ اس کی مدد سے آپ اس شخصیت کو بخوبی کی کوشش کریں۔ پڑھیے اور پھر سوچئے کہ اس خاکے کے پیچھے کیا چھپا ہوا ہے۔ اس کے بعد جو شخصیت آپ کے ذہن میں ابھرے اس آزمائش کے آخر میں دیئے گئے نوین پروردگار کے اس طرح ہر ذوق رکھنے والے آپ کا جواب ہمیں 28 جون 2013ء تک موصول ہو جائے۔ درست جواب دینے والے قارئین انعام کے مستحق قرار پائیں گے۔ تاہم پانچ سے زائد افراد کے جواب درست ہونے کی صورت میں بذریعہ قرعہ اعزازی انعام یافتگان کا فیصلہ کیا جائے گا۔

اب یڑھے اس ماہ کی شخصیت کا مختصر خاکہ

1947ء میں وہ بھارتی ریاست گجرات سے پاکستان آئے۔ اسی دوران ان کی... والدہ اپان ہو گئیں۔ وہ دو اداؤں کی خاطر پھر بھاگتے تھے، مگر اپنی والدہ کو بچانہ سکے۔ ماں کی موت کے بعد انہوں نے عہد کیا کہ اب وہ کسی طرح مر نہیں دیں گے اور انہوں نے 1950 میں گجراتی برادری کے لیے سماجی خدمت کا کام شروع کیا۔ چندہ جمع کر کے پہلے کلکتہ کھولا پھر ایک ایسوسی ایٹس فراہمی کی۔ چندہ خدمت کی وجہ سے دیکھتے ہی دیکھتے ایسوسی اٹس کی تعداد بڑھنے لگی۔ 2002ء میں ورلڈ ٹریڈ سینٹر کے متاثرین کی اداؤں کے لیے ایک لاکھ ڈالرز بھیجے۔

علمی آزمائش 91 کا جواب

شہید حسن جوش آبادی 1892ء میں یوپی کے شہر فتح آباد میں پیدا ہوئے مگر پنهان تھے۔ غصے کے تیز تھے مگر شاعری میں جواب نہ تھا۔ زندگی بھر غزل نہ لکھی۔ الفاظ سے خوب کھیلے تھے۔ پاکستان آنے تو گروہ بندی کا شکار ہو گئے تھے ایک رسالے نے ان کی مخالفت میں خاص نمبر نکالا۔ آپ نے ”یادوں کی برات“ لکھی تو وہ قلمی تنازع ظہری۔ پاکستان میں ہی انتقال ہوا۔

انعام یافتگان

- 1- ارشد الیاس خان، دینہ جہلم 2- نادر صدیقی شیخ، چنیوٹ 3- فیروزین محمود، کراچی

- 4- آفتاب خان، اسلام آباد 5- زریاب خان، کوئٹہ

ان قارئین کے علاوہ جن لوگوں کے جوابات درست تھے۔

میرپورخاص سے مرزا طاہر احمد دین بیگ، چاچا علی ایس جی نعمان شیخ، احمد سعید قائم خانی، کراچی سے سید عزیز الدین شیخ ملتان
 احمد کمال - زاہد تنیم، غزالہ اقبال رضوی، راجہ رفیق، وجاہت وکیل، عثمان خان، شاہد آفتاب، وکیل الرحمن، محمد عثمان خان، محمد علی شاہد،
 سعید احمد چانہ، نصرت حیدر بختیار شاہ، عارف سلطان، خالد عثمانی، کبکشاں، تنیم عمر و سوار، عروج عالم، سید عزیز الدین، عنایت مسیح علی احمد،
 رجب علی مرزا، نجم الدین حیدر، نصرت فاروقی، قیوم احمد، انعام خان، افتخار احسن، وجاہت علی، کاوش اختر بخاری حسین زیدی، نواز علی شاہ،
 نذیر اقبال رضوی، ناصر افروز ممتاز احسن، وجاہت شاہ، انصار حسین، قاسم علی، ابرار احمد، نجم الدین حیدر، حکیم الدینی، منور علی، ملک سرشار،
 گل، کاشف حیدر، چاچا علی مظفر محسن، پیام فاروقی، ناظم پاشا، کائنات فاطمہ، خالد خان، شمیم احمد، سمیع عزیز، ذوالفقار احمد خان، وجاہت
 وکیل، عثمان خان، محمد علی شاہ، سرسبز سے عظمت علی رحمت علی - خانیوال سے افتخار شاہ - دیندے سے طاہر احسن - صادق آباد سے عطاء اللہ

ان۔ ابراہیم اقبال رضوی، محمد علی شاہ، فرزانہ پروین، انصار حسین، یحییٰ احمد، سرور احسن صدیقی، علیہ قوین، نیاز خانجی۔ لاہور سے
صائمہ عمران، منظر علی خان، ہسرت اسلم (جنگ ٹمر)، نعمان حیدر، کاشف عزیز، فرحت جول، ایم بی اسلم، ابراہیم الحسن، قدیر اللہ، ناصر
فاروق، دوش نسیم، کاشان صدیقی، الریثیو آرائیں، گل زیب، پروین فیاضی، بشارا اختر، ارشد علی، اسماعیل شرق، ممتاز الحسن، عقیل سندھو، نعمان
شرق، خالد قادی، ارباز خان، اکرم صدیقی، ابراہیم انعام، تابش عطاری، نیاز احمد ملک، برق فیاضی، الدلی، احمد بشیر، ث، مجید رزا،
صدیقہ شرف، ملک واحد الحق، ابراہیم، ناز خان، ہما جمیل، مجیرا خاتون، ممتاز الحسن، زبیر اسلم، ناز حسین، تابش اطہر، مظفر کوہ سے
محمد عیاد (شاہ جمال)، کھاناں سے سلیمہ کامریڈ۔ مچاوالی سے غلام اکبر سانی، حکیم محمد رشاد، شاہ نقوی (نورنگہ) عبدالحق (محمی خیل)۔

راہنمائی سے ڈاکٹر سعادت علی خان، رضوان احمد ہاشمی، شیراز ملک، ڈاکٹر عظیم یاسین، ناصر شاہ، تنسیم فاروق آرگرا، صادق حسن، جرجی سلی، زاهد خان، ذہیر شاہ اشرفی، خاقان خان، ذویا بخاری، سید محمدی، تنویر الحسن، منصور شیرازی، نسرین اشرف، کائنات بانو، رانا نجات، یاب، زاہد عباسی، اسلام آباد سے عالیہ فاطمہ، حسن خان، فیصلہ فرشتا، احمد خالد ممتاز، برکت اللہ ممتاز احمد، کوشو جہاں، توصیف احمد، صدیقی الرحی، نعت اللہ خان، حفتر حیات عباس، خٹا، ناز شاہین اشفاق، الور یوسف زئی، سعید اختر، درامتاز، الور یوسف زئی، شیراز فیضی، محمد حسین، شیراز فاروقی، محمد شہزاد، بیدری اکرم، سلمان سے محمد حسین، یورین افشار، محمد بلال اقبال، محمد مجتبیٰ، یورین افشار، ایما سومو، زندان خان، عظیم اللہ چنگا، ذیشان ملک، فرحت مغر، قدوس بخش، سعیدہ جلال، فاضلہ خان، پیکزلی، اعلیٰ تعمیر، رضوان اختر، اللہ دت، محمد حسین، غفرانہ ملک، رب چوان، قدوس بخش۔ جہلم سے ارباز خان، ملک، مرفراز، عبدہ امتیاز۔ فیصل آباد سے محمد زہرا، عبدالعزیز (سمندری) شوکت علی چاند۔ جگ سے فرحت بیگ۔ گوجرانوالہ سے نسیم شاہ۔ چکوال سے رمضان ڈو، ارشاد حسین۔ واہ کیٹ سے نور افضل خان، شیک، مسرت انسانی۔ منڈی بہاؤ الدین سے غرم جہانزیب۔ کوئٹہ سے حبیب الحسن، ناصر پیکزلی، نعمان خان، حسن سکری، زاہد علی، فرحت باہر، خاقان بک، راز شاہ، ارباز خان، فیض اللہ خان، فضلہ سوری، پیکزلی، نگار، صالحہ، نعت پیکزلی، سرگودھا سے انعام اللہ انعام،

کبر خان، اشرف ممتاز، زاهد حسن، نادر شاہ، جات خان، فصیح الزمان، حکمی، اعلیٰ نواز، خلیق الزمان، مختصر حیات، شہید نور علیف، شجاع آباد
 حسن علی زیدی، جمیع اللہ، نصیر جونی، خانیوال سے طارق شہزاد، سید ایشام اشرف شہیدی۔ حیدر آباد سے مرزا ہادی بیگ، بابر خان، ط
 یکن۔ میر پور خاص سے مرزا طاہر الدین بیگ۔ پاک پتن سے زاهد علی خان۔ ساہیوال سے سرفراز ملک۔ حاصل پور سے نعمان
 بیگ۔ جہلم سے عیدہ۔ اقبال۔ بہاولپور سے حمیرا کوکب واسطی، قاضی عدنان احمد، آنت ملک۔ بہاولنگر سے معظم علی، احتیاج
 (ایضاً)۔ اڈکڑہ سے سید احسن محمود، اظہار الدین، سعید احسن محمود، نعمان بشیر، صاحب خان، راجا احسن، ملک صفدر، اظہار الدین۔ باڑی
 مہم مردان سے انور، ہری پور سے خورشید احمد۔ سیالکوٹ سے نوید شہزاد خواجہ، اعصف ملک، اقرار احسن، عبد فیصل بھٹک، نصرت مرزا محمد رضا،
 احتشام اسلام الدین، ارباز ملک، لیاقت علی، ضامن رند، ظہیر فراتی۔ ایک سے خالد جوہدری، ذہیر اللہ خان، فیض اختر، شاہ جبران، خورشید
 اختر، ذہیر اللہ مروت فاطمہ ملک، مرفوز اعلیٰ، شہناز اللہ فرحت بابر زان، سعیدہ بھٹی، باغ فراز، سید اختر، سعید خان، فصیح شاہ، ذہیر اللہ مروت، اکرم
 خان۔ سرسہ سے عظمت علی رحمت علی۔ حافظ آباد سے نعمان حسن خان، فرحت جان، خالد جاوید، شیریں فاطمہ، نسreen رانا، محمد قحیل چٹھہ محمد
 ابریم، محمد صدیق ستری۔ نواب شاہ سے عزیز حسن، ارشد شاہ، عزیز الدین۔ شہر سلطان سے سنجیدہ احمد، باز بخاری، ارشد حسن، نوید
 نصاریٰ، عباس علی، ارباب خان، راجا یونس۔ میر پور آزاد کوئٹہ سے کاشف حسین، نعمان سلطان، کمال احمد کمال، احسن بھٹ، نصرت خان،
 یونس ایاز۔ چکوال سے محمد جہانگیر۔ سیالوالی سے نعمان نیازی (ملہ گنگ) احمد علی قوٹی، ایاز علی رند، ملک سرفراز، نجیر الدین کھر، ضامن خان
 شرٹی، بھکر سے حسن چنگیزی، غازی شاہ، شاہد احسن خان، نیاز احسن، زہاد اسلم چٹھہ، ملک سرفراز منگیر، ازہیر شاہ، تقی بخش۔ ننڈو آدم سے
 طاہر عباسی، نیاز کافانی، خالد خان چٹالہ، ناصر بھٹکی، نیاز عباس۔ مردان سے ابراہار خان۔ کالیہ سے محمد کمال، ذیشان مجاہد، ناصر ملک، فہد حسن،
 ابراہان بٹالوی، جمیل عثمانی، مرفوز بشیر، ابراہار خان، اعظم، ظہیر الدین۔ لیہ سے روقی عظم، شہاب الاسلام، شجاعت خان، راجا ابراہار، سردار
 رفیق، انصار حسین، مالک حسن ملک۔ گولارچی سے ارشد خان، شاہ جمال سے فہد مشتاق، نارودال سے انعام احسن، سکائی۔ تربیلہ ڈیم
 سے حسن بیگ، جمیع اللہ فاروقی۔ نوشہرہ سے فضل محمد فضل محمد بشیر افضل۔ ڈیرہ اسماعیل خان سے سرفراز احسن، صفدر حسن، جواد حسین، بھٹی، خالد
 خان، ناصر احمد، ابراہار حسن زئی۔ ڈیرہ غازی خان سے احمد علی واصف احمد۔ پشاور سے غازی توقیق، مظہر حسین، مالک اسلم، نوید ملک، نسیم نیاز
 محمد، خالد کنول، وقار احمد، قیصر حسن، توقیق الاسلام، افضل میو، بشو وقار، شہنشاہ زیدی، ایشام رضا خان، نسیم شیرازی، نجر الاسلام، سردار علی
 بیگل، مرقان اختر، نسیم انجکزی، بینش ملک، نسیم فروس، نادر خان، اشرف حسن زئی، بگل خان، ارباب خان، جوہر، بھٹک، خان، نسیم احسن،
 ارقان اختر شرواز، اظہار نواز، نسیم فاروقی، ضیاء الحق، اظہار شاہ، ضیاء الحق، جمال شاہ، فراست خان، نوید جمیع، اصرہ طوری، بخش، محمود چکزی،
 زائدہ شاہ، ارباب خان، وردانہ شاہ، نسیم نیازی۔ وزیر آباد سے عیدہ اکبر۔ چشتیان سے معظم علی۔ مردان سے نصیر خان۔ مہمالک غیر سے انور
 اسدانی (عیدہ سوہبہ) نسیم نیازی، وریشو (کینڈا) اسلم فقیر پوری (بوکے) فہد مصطفیٰ (جری)

محسنہ

جناب ایڈیٹر سرگزشت
السلام علیکم !

آپ کے پاس ہر روز دس بیس آپ بیتیاں آتی رہتی ہوں گی لیکن میری
آپ بیٹی سب سے الگ ہے آپ خود بھی چونک جائیں گے۔

نگار عابد رحمٰن
لاہور

عابد رحمٰن سے میری شادی عام رسم و رواج سے ذرا
بہت کر ہوئی تھی۔ ذرا بہت کر یوں کہ عابد رحمٰن پہلے بھی ایک
بار شادی شدہ رہ چکے تھے۔ ان دنوں میں گرجوئیٹ کرنے
کے بعد ایک پرائیویٹ اسکول میں ٹیچر کی جاب کر رہی
تھی۔ جاب کرنے کی دو وجوہات تھیں ایک تو میں فارغ التحصیل
اور پور ہوئی تھی۔ کالج لائف بہت ہی بھرپور اور ہنگامہ خیز
تھی۔ بے شمار دوستیں اور بے شمار تقریبات تھیں جو ان چار
سالوں کا حصہ تھیں۔ کالج بہت اچھا تھا۔ معیار تعلیم کے
ساتھ وہاں ہونے والی دوسری سرگرمیوں کا معیار بھی اچھا
تھا۔ ہم ڈراموں اور پروگراموں میں حصہ لیتے تھے۔ ہماری
ٹیچرز ہماری حوصلہ افزائی کرتی تھیں۔ تقریباً ہر دوسرے
تیسرے مہینے کالج کی طرف سے کہیں نہ کہیں پبلک کا
پروگرام بناتا تھا۔ کالج میں میلے لگتے تھے۔ چار سال کیسے
گزرے پتا ہی نہیں چلا اور پھر فاضل آگیا۔

امتحان دے کر جب چند دن گھر میں بیٹھنا پڑا تو میں
بوکھلا گئی تھی۔ گھر خالی نہیں تھا، مجھ سے بڑی دو بہنیں بچائی جا
چکی تھیں لیکن دو چھوٹی ابھی باقی تھیں، پھر دو بڑے بھائی تھے
اور دونوں شادی شدہ تھے۔ اباجان اور امی تھیں۔ اس کے
بادجو کو مجھے کائنات کو دوڑتا تھا اور خاص طور سے صبح کے
وقت جب بینٹیں، اباجان اور بھائی دفتر اور کالج جا چکے
ہوتے تھے۔ اباجان ایک پرائیویٹ فرم میں اکاؤنٹنٹ

پڑھانے اور ان کے ساتھ کھیلنے میں بہت مزہ آتا تھا۔
ایک بچے سے پہلے میں گھرا جاتی تھی جب کہ کالج سے
دو بچے واپس ہوتی تھی۔ صبح کا ناشا اور دوپہر کی ہانڈی امی بناتی
تھیں جب کہ روٹی یا چاول میں آکر بناتی تھی بھجرات کا کھانا
ہم بیٹوں بینٹیں مل کر تیار کرتیں اور گھر کے دوسرے کام نشانی
تھیں۔ چھٹی والے دن پورے گھر کی صفائی کرتیں اور سنبھرتے بھر
کے کپڑے دھویا کرتی تھیں۔ اسی دن ملنے جلنے والے بھی آتے
تھے اس لیے مہمان نوازی بھی کرنا پڑتی تھی۔ وقت ایک بار پھر
معروفیت میں گزرنے لگا۔ میں تو آگے پرائیویٹ ماسٹرز بھی
کرنا چاہتی تھی لیکن امی نے صاف منع کر دیا۔ ”کوئی ضرورت
نہیں ہے نگار، اب تمہاری شادی کرنی ہے اور ہمارے پاس
کوئی فائو رقم نہیں ہے۔“

”امی اتنا خرچ نہیں ہوتا ہے پرائیویٹ
پڑھنے میں۔“

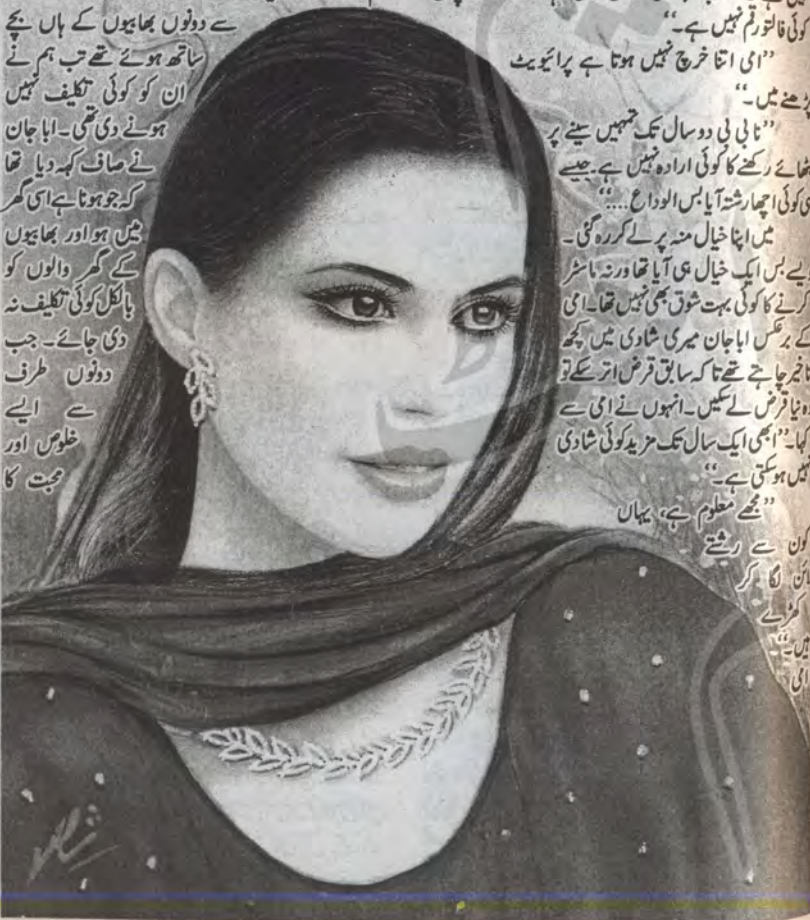
”نانی بی دو سال تک تمہیں سینے پر
بٹھائے رکھنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ جیسے
کوئی لکڑی اچھا رشتہ آیا بس الوداع۔“

میں اپنا خیال منہ پر لے کر رہ گئی۔
وہ بے بس ایک خیال ہی آیا تھا ورنہ ماسٹرز
کرنے کا کوئی بہت شوق بھی نہیں تھا۔ امی
کے برعکس اباجان میری شادی میں کچھ
تأخیر چاہتے تھے تاکہ سابق قرض اتر سکے تو
وہ نیا قرض لے سکیں۔ انہوں نے امی سے
کہا۔ ”ابھی ایک سال تک مزید کوئی شادی
نہیں ہو سکتی ہے۔“

”مجھے معلوم ہے، یہاں

کون سے رشتے
لاگ کر
کروا دیے
ہیں۔“

نے جل کر کہا۔ ”آٹے آٹے بھی سال تو لگ ہی جائے گا۔“
میں نے سنا تو خوش ہو گئی۔ میں بھی سال دو سال سے
پہلے اس گھر سے نہیں جانا چاہتی تھی۔ خوش قسمتی سے بھابیوں
بہت اچھی ملی تھیں اور ہم نے ان کے ساتھ ایسا سلوک کیا تھا
کہ وہ بھی ہم سے اتنی ہی خوش تھیں۔ اول تو انہیں شادی کے
فوراً بعد اپنا گھر مل گیا تھا اور وہ اپنے گھر میں خود مختار تھیں۔ ہم
ان کے کسی معاملے میں دخل نہیں دیتے تھے۔ دونوں بھائی
اچھی جاب کر رہے تھے اور وہ خود سے امی کو ہر مہینے ایک
مخصوص رقم دیتے تھے۔ امی اس رقم سے بیسی ڈال کر ہم بھائیوں
کے لیے تیاری کر رہی تھیں۔ اس طرح بھابیوں مواقعوں پر
کام اور ڈوٹے داریاں اٹھانے میں آگے رہتی تھیں۔ اتفاق



معاملہ ہو تو پھر گھر خود بہ خود جنت کا نمونہ بن جاتے ہیں۔
مجھے جاب کرتے ہوئے سال ہونے کو آیا تھا۔ میری
کلاس میں ایک بچہ راس پڑھتا تھا۔ وہ صرف پانچ سال کا
تھا اور بہت پیارا اور معصوم سا بچہ تھا لیکن وہ کچھ ڈرا سہا پڑتا
تھا اور کوئی اس سے ڈرا زور سے بات کر لے تو وہ ڈر کر
رونے لگتا تھا۔ مجھے اس سے خاص انسیت ہو گئی تھی، اس
لیے میں اس کا خیال رکھتی تھی اور جو بچے اسے تنگ کرتے
تھے ان سے راس کو بچاتی تھی۔ جب اس نے میری انسیت
محسوس کی تو خود بھی میرے ساتھ رہنے لگا۔ کلاس میں وہ
سب سے آگے میرے سامنے بیٹھتا تھا۔ جب ہاف ٹائم ہوتا
تو دوسرے بچوں کی طرح باہر جانے کے بجائے میرے ساتھ
لگا رہتا تھا۔ میں باہر بھی بچوں کو دیکھتی تھی۔ جب دوسرے
بچے جھولوں، بھلونوں اور کھانے پینے میں مگن ہوتے تو وہ
میرے ساتھ ہوتا۔ میں اسے لچکراتی جو وہ اپنے چھوٹے
سے لچکس میں لٹا تھا۔ ایک دن میں نے پوچھا۔
”آپ کی امی کیا کرتی ہیں؟“
”وہ ابو سے لڑتی ہیں۔“ اس نے معصومیت سے
جواب دیا۔
مجھے حیرت ہوئی۔ ”ابو سے لڑتی ہیں لیکن کیوں؟“
”پتا نہیں۔۔۔ وہ بس ابو سے لڑتی ہیں اور مجھے ڈانٹتی
ہیں۔ مجھ سے بات بھی نہیں کرتی ہیں۔“
مجھے خیال آیا کہ راس کہیں اسی وجہ سے تو ڈرا سہا
نہیں رہتا ہے۔ ”آپ کے ابو بھی آپ کو ڈانٹتے ہیں؟“
”نہیں۔“ اس نے زور و شور سے سر ہلایا۔ ”ابو تو بہت
اچھے ہیں۔ مجھ سے بہت پیار کرتے ہیں۔ میں جو کہتا ہوں
مجھے لا کر دیتے ہیں لیکن امی مجھ سے پیار نہیں کرتی ہیں۔“
”آپ کے ابو کیا کرتے ہیں۔“
”وہ کام کرتے ہیں۔“ راس نے کہا لیکن وہ واضح
نہیں کر سکا کہ اس کے ابو کیا کرتے ہیں۔ شاید وہ کہیں جاب
کرتے تھے یا کوئی برنس کرتے تھے۔ یہ اسکول اسٹینڈرڈ کا
تھا اور یہاں فیس خاصی زیادہ تھی اس لیے یہ تو طے تھا کہ
راس کے والد کھاتے پیتے آدمی تھے۔ راس شروع میں
پڑھنے میں اتنا تیز نہیں تھا لیکن میری توجہ کی وجہ سے وہ جلد
دبجی سے پڑھنے لگا تھا۔ تھرڈ ٹرم میں اس نے کلاس میں
دوسری پوزیشن لی تھی۔ رزلٹ کی تقریب میں اس کے والد
آئے تھے اور تب میں نے عابد رحمن کو پہلی بار دیکھا تھا۔ وہ
تقریباً تیس تیس برس کے سرخ و سفید اور باوقار نظر آنے

والے شخص تھے۔ راس ان کے ساتھ بیٹھا ہوا بہت خوش نظر
رہا تھا۔ جب رزلٹ کی تقریب ختم ہو گئی تو وہ خاص طور سے
مجھے ہاتھ سے پکڑ کر کھینچتا ہوا عابد رحمن کے پاس لے گیا۔
”ابو یہ میری کس نگاہ ہیں۔“ اس نے بتایا۔
”کیسی ہیں آپ۔“ عابد رحمن مسکرائے۔ ”راس
آپ کا ذکر کرتے نہیں تھکتا ہے۔“
”نہ جانے کیوں میں شرملا گئی انا کھانا ان کے لیے
کوئی خاص بات نہیں تھی۔“ یہ خود بہت پیارا بچہ ہے۔
”میں آپ کا شکر گزار ہوں آپ نے راس پر
خصوصی توجہ دی۔ یہ توجہ چاہتا ہے جو بد قسمتی سے اسے نقص
مل سکی۔“
”اس کی مام کی طرف سے؟“ میں غیر ارادی طور
پر بولی۔
”انہوں نے سر ہلایا۔“ اس کا مطلب ہے آپ نے
اندازہ لگ لیا ہے۔ راس ہماری ایک ہی اولاد ہے جن
رخسانہ اس پر بھی توجہ نہیں دیتی ہے۔“
”وہ آپ سے بھی لڑتی ہیں۔“ میرے منہ سے پھر نکلا
اور میں دل ہی دل میں خود کو برا بھلا کہنے لگی کہ آج مجھے کیا ہو گیا
ہے۔ میں وہ باتیں کر رہی تھی جو مجھے نہیں کرنا چاہیے تھیں۔
”ہاں وہ کسی حال میں خوش نہ ہونے والی عورتوں
میں سے ہے۔“ خلاف توقع عابد رحمن نے میری احتیاط
بات کا جواب بھی دیا تھا۔ ان کا لہجہ اور انداز تھا کہ ہوا اور دھوپ
تھا۔ ”آج دیکھو، راس نے پہلی کلاس پاس کی ہے اور اس
کی ماں نے اتنی زحمت نہیں کی کہ اپنی نیند قربان کر کے
یہاں آجائے۔“
مجھے راس اور عابد رحمن آنے لگا جو ایک ناقدہ بچی
اور ماں کو ہیٹ کر رہے تھے۔ واقعی آج کے دن سب بچوں کے
ماں باپ آئے ہوئے تھے اور صرف راس تھا جس کا باپ آیا
تھا۔ جب تصویر کھینچوانے کا وقت آیا تو راس پھر میرے پاس
آیا۔ اس نے التجا آمیز لہجے میں کہا۔ ”مس آپ میرے
ساتھ تصویر بنوائیں، میری ماما تو آئی نہیں ہیں۔“
میں چٹکپاتی مجھے عجیب سا لگ رہا تھا کیونکہ یہ تو پہلی
فوٹو سیشن تھا مگر مجھ سے اس معصوم بچے کا دل نہیں توڑا گیا
تھا۔ اس لیے میں وہاں آگئی جہاں تصویریں لی جا رہی
تھیں۔ عابد رحمن نے مجھ سے معذرت کی۔ ”سوری میں نے
راس کو منع کیا لیکن یہ نہیں مانا۔“
”کوئی بات نہیں۔“ میں نے اس کے برابر میں

کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ راس اپنی شیلڈ اور رزلٹ اٹھا
کر ہمارے سامنے کھڑا ہو گیا اور ہم نے اس کے شانوں
پر ہاتھ رکھ لیے تھے۔ مجھے شرم بھی آ رہی تھی لیکن نہ جانے
کیوں اچھا بھی لگ رہا تھا۔ تصویر اتر گئی تو میں سینے آئی۔
وہاں میری ساتھی ٹیچر ممتی خیز انداز میں مجھے دیکھ رہی تھیں
بلکہ ایک دو نے تو مجھے بھی چست کیے لیکن میں نے انہماں
بن کر نظر انداز کر دیا۔ جانے سے پہلے عابد رحمن نے ایک بار
پھر میرا شکریہ ادا کیا تھا۔ اس دن کے بعد سے میں راس کا
اور بھی خیال رکھنے لگی تھی۔ وہ ماں کے ہوتے ہوئے بھی بہن
ماں کے بچوں کی طرح چل رہا تھا۔ وہ دیکھ ہوتا تھا لیکن اپنا
دکھ چھپاتا تھا۔ کتنی بار ایسا ہوا کہ وہ اسکول آیا تو اس کی
آنکھوں میں آنسو لڑ رہے ہوتے تھے۔ میں کوشش کر کے
اسے ہنساتی اور اس کا دل بہلاتی تب کہیں جا کر اس کی
آنکھوں سے آنسو غائب ہوتے تھے۔ راس چھٹی نہیں کرتا
تھام سے کم میں نے اسے چھٹی کرتے نہیں دیکھا تھا۔
لیکن نئے سیشن کے آغاز میں ہی وہ لگا کر دو دن
اسکول نہیں آیا اور نہ ہی اس کی کوئی لیو آئی۔ تیسرے دن
میں نے اسکول کے ریکارڈ سے اس کے گھر کا نمبر نکالا
وہاں کسی خاتون نے کال ریسیو کی۔ ”میں راس کی کلاس
نچھرا کر رہی ہوں وہ دو دن سے اسکول نہیں آیا ہے۔“
خاتون نے جواب دیا۔ ”اسے بخار ہو گیا تھا، وہ
اپتال میں داخل ہے۔“
”اپتال میں۔“ میں بے چین ہو گئی۔ ”اس کی
طبیعت اتنی خراب ہے، کون سے اپتال میں ہے؟“
اس نے سپاٹ سے انداز میں اپتال کا نام بتایا اور
فون رکھ دیا۔ مجھے شبہ ہوا کہ وہ راس کی ماں تھی۔ چھٹی کے
بعد میں پہلے گھر گئی اور پھر امی کو بتا کر اپتال کے لیے روانہ
ہوئی جو شش اقبال میں ہمارے گھر سے کچھ دور تھا۔ میں
آسانی سے رکشے میں وہاں پہنچ گئی۔ ریسپشن پر مجھے راس
کا کمر معلوم کرنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی تھی۔
میں نے اپتال کے سامنے فلاور اسٹال سے ایک چھوٹا سا
بوکے لے لیا تھا۔ یہ پرائیویٹ روم تھا اور اندر عابد رحمن کو
موجود پا کر میں چٹکپاتی جو کہانیوں کی ایک کتاب ہاتھ میں
تھا۔ راس کو کہانی سننا ہے مجھے سمجھے دیکھ کر اس کا چہرہ تو
چمک اٹھا تھا لیکن ساتھ ہی عابد کے چہرے پر جو تاثر آئے
تھے مجھے یقین ہے میرا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔ ”آپ۔۔۔“
انہوں نے کہا۔

”مس آئی ہیں۔“ راس مارے جوش کے اٹھ بیٹھا۔
میں نے جلدی سے آگے آ کر اسے دو بارہ لٹایا۔
”انہیں مت۔۔۔ آپ کی طبیعت ٹھیک
نہیں ہے۔“ میں نے اسے لٹا کر عابد رحمن سے سلام دعا کی
اور بو کے راس کے سر ہانے رکھ دیا۔
”جھیک یو مس، آپ کو کس نے بتایا مس کہ میری
طبیعت خراب ہے۔“
”میں نے آپ کے گھر کال کی تھی۔“ میں نے اسے
پیار کیا چند دن پہلے وہ مجھ کا کرہ گیا تھا۔ ”وہاں سے آپ کی
مانا نے بتایا کہ آپ اپتال میں ہیں۔“
میری بات پر راس اور عابد رحمن دونوں کا انداز عجیب
سا ہو گیا تھا۔ میں نے اتنی شدت سے اس بات کو محسوس کیا
کہ موضوع بدل دیا۔ ”آپ کو کیا ہوا؟“
”بخار ہوا تھا اور پھر کسی طرح اتر ہی نہیں رہا تھا اس
لیے میں اپتال لے آیا۔“ عابد رحمن نے بتایا۔ ”اللہ کا شکر
ہے اب بہت بہتر ہے لیکن کمزوری ہے۔“
”یعنی راس اب بھی کچھ دن اور اسکول نہیں آئے گا؟“
میں نے راس کی طرف دیکھا تو عابد رحمن نے سر ہلایا۔
”ڈاکٹر نے تین دن کا میڈر لیسٹ کہا ہے۔“
”اس طرح تو راس کا بہت نقصان ہوگا۔ ابھی کلاس
کا آغاز ہوا ہے اور یہ پیچھے رہ جائے گا۔ میری خواہش ہے
اس بار یہ کلاس میں فرسٹ آئے۔“
”مس میں گھر میں ابو سے پڑھ لوں گا۔“
”نہیں، ابھی آپ آرام کریں جب آپ اسکول
آئیں گے تو میں خود آپ کو پڑھاؤں گی۔“
”میں آپ کا شکر گزار ہوں گا۔“ عابد رحمن نے
کہا۔ ”میں اس وجہ سے بھی پریشان تھا۔“
میں کچھ دیر وہاں بیٹھی اور پھر جانے کے لیے اٹھی تو
عابد رحمن نے پیشکش کی۔ ”میں آپ کو چھوڑ آتا ہوں۔“
”نہیں، میں چلی جاؤں گی میرا گھر یہاں سے زیادہ
دور نہیں ہے۔ باہر آرام سے رکشالٹ جائے گا۔“
”چلں میں آپ کو نیچے چھوڑ آتا ہوں۔“ عابد رحمن
نے اصرار کیا تو میں مان گئی۔ ہم کمرے سے باہر آئے تو انہوں
نے کہا۔ ”آپ نے رخسانہ سے بات کی تھی۔“
”انہوں نے نام نہیں بتایا تھا۔“
”وہ گھر میں ہے۔ وہ ایک باہر بھی راس کو دیکھنے نہیں
آئی۔“

میں حیران رہ گئی۔ ”وہ کس قسم کی ماں ہیں.... ہمیں تو اتنے بڑے ہو کر کھائی آجائے تو میری امی اتنی پریشان ہو جاتی ہیں کہ رات کو بھی ہمیں بار بار دیکھنے آتی ہیں۔“

”ساری دنیا کی مائیں ایسی ہی ہوتی ہیں لیکن رخصانہ بالکل مختلف عورت ہے، اسے اپنے شوہر اور بچے سے کوئی لگاؤ نہیں ہے۔“

”اس کی کوئی وجہ تو ہوگی؟“

”وجہ؟“ عابد رحمن نے گہری سانس لی۔ ”اصل بات یہ ہے کہ اسے میں ہی پسند نہیں ہوں۔“

”آپ پسند نہیں ہیں۔“ میں دم بہ خود رہ گئی اور پھر میرے منہ سے نکل گیا۔ ”کوئی آپ کو بھی ناپسند کر سکتا ہے۔“

”ہاں رخصانہ مجھے پسند نہیں کرتی ہے کیونکہ وہ بہت حسین و جمیل اور دولت مند خاندان سے ہے۔“

میں نے سوچا مجھے نہیں تھا کہ کسی عورت میں اتنا غرور و تکبر ہو گا کہ وہ اپنے شوہر اور بچے کو بھی پسند نہ کرتی ہو۔ عابد رحمن میں کوئی کی نہیں تھی۔ لڑکیاں اور عورتیں ایسے مردوں کی خواہش کرتی ہیں کہ وہ ان کے شوہر بنیں اور پھر راس جیسا بچہ جس پر ہر ماں فخر کر سکتی تھی۔ پتا نہیں یہ رخصانہ کیسی مائی تھی۔ پھر جس دن راس اسپتال سے گھر گیا اسی دن رخصانہ عابد سے بھڑکا کر اسے اپنے ماں باپ کے گھر چلی گئی۔ یہ بات مجھے راس نے بتائی۔ اس دن وہ ماں کے لیے دھکی نہیں بلکہ غصے میں تھا۔ اس نے کہا۔ ”میں مجھے اپنی ماما بالکل پسند نہیں ہیں وہ میرے ابو کو بہت تنگ کرتی ہیں۔“

یہ بات چند دن بعد مجھے عابد رحمن سے پتا چلی کہ رخصانہ صرف گھر چھوڑ کر نہیں گئی ہے بلکہ اس کے دیکل نے خلع کا نوٹس بھی بھیج دیا ہے۔ میں اس دن کپڑے لینے نزدیک ہی مارکیٹ گئی تھی وہاں اتفاق سے عابد رحمن مل گئے اور گفتگو میں یہ بات نکل آئی۔ میں راس کے حوالے سے فکر مند ہو گئی۔ ”تب آپ کیا کریں گے اور اگر آپ دونوں الگ ہو گئے تو راس پر اس کا بہت برا اثر پڑے گا۔“

”راس پر جتنا برا اثر پڑتا تھا پڑ گیا۔ ماں کی موجودگی میں اسے کون سا سکہ ملا ہے جو اس کے جانے سے وہ دھکی ہو گا۔“ عابد رحمن نے تلخ لہجے میں کہا۔ ”مجھے اپنے بچے کی فکر ہے، میں بزنس میں ہوں بزنس دیکھوں یا گھر۔ ایک ملازمہ ہے لیکن وہ ماں کا نعم البدل تو نہیں ہو سکتی،“

اس دن پہلی بار مجھے خیال آیا کہ اگر عابد رحمن میرے شوہر اور راس میرا بیٹا ہوتا تو میں اپنی زندگی کو جنت سے کم

نہ سمجھتی۔ لیکن ایسا تھا نہیں۔ یہ نعت رخصانہ کو ملی تھی اور وہ اس کی قدر نہیں کر رہی تھی۔ میں نے صدق دل سے دعا کی کہ وہ واپس آجائے اور راس کو اس کی ماں واپس مل جائے۔ مگر بعض دعائیں قبول ہونے کے لیے نہیں ہوتی ہیں۔ ایک مہینے بعد عابد رحمن اور رخصانہ میں قانونی علیحدگی ہو گئی۔ رخصانہ کو خلع مل گیا تھا اور اس کے بدلے وہ اپنے حق منہ اور حق نان نفقے کے ساتھ راس سے بھی دست بردار ہوئی۔ اس کا پتا مجھے یوں چلا کہ ایک دن بچوں کو لینے والی دین نہیں آئی تھی۔ اسکول انتظامیہ نے بچوں کو روک لیا اور ان کے ماں باپ کو اطلاع دینے لگے لیکن عابد رحمن کے گھر خلع جاری تھی اور وہاں کوئی کال ریسیڈ نہیں کر رہا تھا۔ پتا لگش کا تھا میں نے پتا دیکھا اور پرہیز کر رہا تھا۔

”راس کو میں اس کے گھر چھوڑ دیتی ہوں۔“

ہم روانہ ہوئے اور کچھ دور گئے ہوں گے کہ راستے میں عابد رحمن مل گئے۔ ”ٹھیکس گاڈ..... جب راس مقررہ وقت پر نہیں آیا تو میں اسے لینے جا رہا تھا۔“

”اسکول کی دین نہیں آئی تھی اور آپ کے گھر کوئی کال ریسیڈ نہیں کر رہا تھا۔“

”گھر کا فون خراب ہے، میں نے کپلین کرائی ہے اور میں نے موبائل فون لیا ہے، اس کا نمبر آپ کو دے دیتا ہوں۔ آپ اسے اسکول کے ریکارڈ میں شامل کر لیں۔“ اس زمانے میں موبائل فون دولت مندوں کے پاس ہوتا تھا۔

”یہ تو اچھی بات ہے۔“

”آئیں میں آپ کو گھر چھوڑ دوں۔“

”میں چلی جاؤں گی۔“

”پلیز... میں آپ سے کچھ بات کرنا چاہتا ہوں۔“ انہوں نے اس طرح کہا کہ میں مجبور ہو گئی۔

”ٹھیک ہے لیکن آپ مجھے میرے گھر کے پاس پارک پر اتار دیجئے گا۔“

عابد رحمن نے گاڑی اور بات آگے بڑھائی۔ ”میری اور رخصانہ کی علیحدگی ہو گئی ہے۔“

مجھے جھٹکا لگا۔ ”علیحدگی ہو گئی ہے اور راس....“

”یہ میرے پاس رہے گا۔ میں نے اسی شرط پر اسے خلع دیا ہے۔“

”اب راس کی دیکھ بھال کون کرے گا؟“

”اسی لیے تو میں پریشان ہوں۔“ انہوں نے گہری

سانس لی۔ ”ابھی تو ایک ملازمہ ہے لیکن میں راس کو کسی ملازمہ پر نہیں چھوڑ سکتا۔“

”تو پھر آپ نے اس کا کیا حل سوچا ہے؟“

”مجھے دوسری شادی کرنی ہوگی۔“ انہوں نے گاڑی روکے ہوئے کہا تو میں چونک گئی۔ پارک آ گیا تھا۔ مجھے عابد رحمن کی دوسری شادی کا ارادہ سن کر جھٹکا سا لگا تھا۔

”پکار میں اسی معاملے میں آپ سے بات کرنا چاہتا ہوں، پلیز کیا آپ کہیں مجھ سے مل سکتی ہیں بس کچھ دیر کے لیے؟“

اس کا لہجہ بچی ہو گیا۔ میں نے دو ٹوک انداز میں کہا۔

”عابد صاحب میرے گھر والے مجھ پر اعتماد کرتے ہیں۔ میں کسی سے بھی آج تک ان سے چھپ کر نہیں ملی۔“

”پلیز.... میرا مقصد برا نہیں ہے۔ بس چند منٹ چائیں۔“

یہ سچ ہے کہ مجھے باہر ملنے کی بات بالکل اچھی نہیں لگی تھی لیکن میں ان کی التجا ٹھکراتا بھی نہیں چاہتی تھی۔ میں نے سر ہلایا۔ ”ٹھیک ہے میں کل راس کے ہاتھ آپ کو ملاقات کا نوٹس بھیج دوں گی اور آپ آکر اسکول میں مجھ سے مل لیجئے گا۔“

”اسکول میں؟“

”ہاں وہاں ایک بیزنس روم بھی ہے، اگر کسی سٹے پر بچے کے والدین کو بلایا جاتا ہے تو متعلقہ پھر ان سے وہیں ملے ہیں اور کوئی نہیں ہوتا ہے۔ آپ وہاں آرام سے بات کر سکتے ہیں۔“

عابد رحمن مطمئن تو نہیں تھے لیکن انہیں ماننا پڑا۔ اگلے دن میں نے راس کے ہاتھ ملاقات کا نوٹس بھجوایا۔ اسکول میں پھر کوآزادی تھی کہ وہ کسی بچے کے والدین کو بلا کر ان سے بات کر سکتی تھیں۔ پرنسپل یا ایڈمنسٹریشن کا اس معاملے میں کوئی مل جل نہیں ہوتا تھا۔ اس سے اگلے دن عابد رحمن آگئے اور میں انہیں بیزنس روم میں لے آئی۔ ”جی فرمائیے۔“

”گھر میں کچھ کہنے سے پہلے اپنے بارے میں آپ کا خیال جانتا چاہوں گا؟“

”کیسا خیال؟“

”میں کیسا شخص ہوں؟“

”آپ ایسے آدمی ہیں۔“ میں نے گڑبڑ کر کہا۔

”اگر میں دوسری شادی کرنا چاہوں تو کسی بھی اچھے گھرانے کی لڑکی کا رشتہ مجھ مل سکتا ہے؟“

”اس بارے میں تو لڑکی یا اس کے گھر والے ہی بہتر بتا سکتے ہیں۔“

”فرض کریں وہ لڑکی آپ ہوں۔“

میں اتنی گڑبڑائی کہ خاصی دیر میرے منہ سے آوازی نہیں نکلی تھی۔ پھر میں نے بہ مشکل کہا۔ ”یہ تو میرے گھر والے ہی بتا سکتے ہیں۔“

”آپ کا کیا خیال ہے میرے بارے میں؟“

”بتانا تو ہے آپ اچھے آدمی ہیں۔“

”یعنی میں آپ کے گھر رشتہ بھیجوں تو آپ کو کوئی اعتراض نہیں ہوگا؟“

”نہیں۔“ اس بار میں نے خاصی مشکل سے کہا تھا، مجھے بہت شرم آ رہی تھی۔

”گھر میں آپ سے یہی بات کہنے آیا تھا۔ جب میں نے پہلی بار آپ کو دیکھا تو بے اختیار خیال آیا کہ کاش رخصانہ کے بجائے آپ میری زندگی میں آتی ہوتیں۔ پھر راس آپ سے مانوس ہے۔ اس لیے میں نے مناسب سمجھا کہ پہلے آپ کی رضامندی لوں۔“

میں نے خود کو سنبھال لیا اور صاف گوئی سے بولی۔ ”مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے لیکن میرے رشتے کا معاملہ میں نے اپنے ماں باپ پر چھوڑ رکھا ہے وہ جو چاہیں گے وہی میری مرضی ہوگی۔“

”لیکن وہ آپ سے پوچھیں تو آپ اتنا تو کہہ سکتی ہیں کہ آپ کو کوئی اعتراض نہیں ہے۔“

”ہاں بہ شرط کہ میرے ماں باپ کو بھی کوئی اعتراض نہ ہو۔“

گھر آ کر میں نے امی کو عابد رحمن کے بارے میں بتا دیا۔ امی نے خاموشی سے سنا اور مجھے گلے لگا کر بولیں۔ ”تم نے ٹھیک کیا میری بیٹی.... اب یہ معاملہ ہم پر چھوڑ دو۔“

میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ ”امی مجھے معلوم ہے آپ لوگ میرے لیے بہتر کریں گے۔“

مجھے نہیں معلوم کہ عابد رحمن نے کس طرح میرے ابو سے رابطہ کیا اور پہلے ان سے بات کی۔ ابو کچھ پائے تھے لیکن انہوں نے انکار نہیں کیا اور معاملہ امی اور بھائیوں کے سامنے رکھ دیا۔ عابد رحمن ایک پڑھے لکھے خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے والد اور چچا اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے اور اکثر یونیورسٹیوں میں پروفیسر رہے تھے۔ عابد رحمن کی ایک چھوٹی نورنہ یونیورسٹی میں انڈیا پاک ہسٹری پڑھاتی تھیں۔ خود

عابد رحمن ایم بی اے تھے اور اپنی فرم چلا رہے تھے۔ وہ ایپورٹ ایکسپورٹ کاربنس کرتے تھے۔ گلشن اقبال میں اپنا بنگلا تھا جو چار سو گز پر بنا ہوا تھا۔ سنے ماڈل کی کارگاہی۔ مالی لحاظ سے وہ ہم سے کہیں بہتر تھے۔

بدقسمتی سے شادی رخسانہ سے ہوئی جو ارب پتی خاندان سے تعلق رکھتی تھی اور اس کا دامغ ہمیشہ آسان پر رہتا تھا۔ اس کی عابد رحمن سے بھی نہیں بنی تھی۔ انہوں نے ابا جان کو یہ سارے حالات بتا دیے تھے۔ مسئلے صرف دو تھے ایک عابد رحمن عمر میں مجھ سے کوئی دس سال بڑے تھے دوسرے وہ ایک بچے کے باپ تھے بلکہ اصل مسئلہ یہی تھا کیونکہ خود میری امی ابا جان سے گیارہ سال چھوٹی تھیں۔ امی، ابا جان اور بھائیوں کے ساتھ بہنوں کی بھی کئی میٹنگز ہوئیں۔ اس میں تمام پہلوؤں پر اچھی طرح غور کیا گیا۔ عابد رحمن کے ماں باپ حیات تھے اور کئی بہن بھائی بھی تھے۔ مگر وہ الگ رہتے تھے۔ ماں باپ ان کے بڑے بھائی صادق رحمن کے ساتھ رہتے تھے۔ عابد رحمن نے کہا تھا اگر میرے گھر والے مان گئے تو پھر ان کے ماں باپ رشتہ لے کر آئیں گے۔ ایک رات امی نے مجھے الگ بلایا۔

”نثار ہم نے عابد رحمن کے رشتے پر غور کیا ہے اور ہمیں سوائے پہلی شادی اور ایک بچے کے اس میں کوئی نقص نظر نہیں آ رہا ہے۔ بلکہ دیکھا جائے تو خاندان اور خود عابد رحمن کی شخصیت اور اسٹیشن کے لحاظ سے یہ بہت اچھا رشتہ ہے۔ اس لیے ہم نے اپنی رضامندی کے ساتھ یہ فیصلہ تم پر چھوڑ دیا ہے۔“

یہ سن کر میرا دل دھڑک اٹھا تھا لیکن میں نے کہا۔ ”امی جب آپ سب رضامندی میں تو مجھ سے پوچھنے کی کیا ضرورت ہے۔“

”ضرورت ہے نثار، اگر عابد رحمن پہلے سے شادی شدہ اور ایک بچے کا باپ نہ ہوتا تو ہم صرف اپنا فیصلہ سناتے لیکن اب پوچھنا ضروری ہے۔ تم آرام سے سوچ لو، ہمیں تمہاری خوشیاں سب سے زیادہ عزیز ہیں۔“

میں نے دو دن بعد ہاں کر دی۔ میں نے محسوس کیا کہ امی اور سب اس فیصلے سے خوش تھے۔ ان سب کو عابد رحمن پسند آئے تھے اور کیوں نہ آتے ان میں پسند کرنے والی کوئی چیز نہیں تھی۔ جہاں تک راس کا تعلق تھا تو وہ میرے لیے اچھی نہیں تھا۔ اسے سنبھالنا اور خود سے رضامندی

کرنا میرے لیے مسئلہ نہ ہوتا اور ایسا ہی ہوا۔ جب عابد رحمن کے ماں باپ رشتہ لے کر آئے تو راس ان کے ساتھ تھا اور وہ آتے ہی مجھ سے لپٹ گیا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ میں اس کے گھر آنے والی ہوں اور وہ ابھی سے بہت خوش تھا۔ عابد رحمن کے گھر والے ابھی بہت سلجھے ہوئے اور اچھی طبیعت کے لوگ تھے۔ انہوں نے کہا کہ وہ دیوں رشتہ لائے ہیں جسے ان کے بیٹے کی شادی پہلی بار ہو رہی ہو اور وہ اپنے بیٹے کے تمام ارمان پورے کریں گے۔ سچ سچ میری اور عابد رحمن کی شادی اتنے اچھے طریقے سے اور اتنی محوم دھماکے سے ہوئی کہ پہلی بار شادی کرنے والے کی بھی کیا ہوتی ہوئی۔ بری میں اکاون سوٹ جو سب اعلیٰ درجے کے تھے اور دو ڈائمنڈ سیٹ اور دو گولڈ سیٹ تھے۔ ہر چیز لا جواب تھی۔ میک اپ کا سامان باہر سے منگوا لیا تھا۔ ہر سوٹ کے ساتھ میچنگ کی سینڈل اور پرس تھا۔ ویسے شیرٹن میں ہوا تھا۔

پہلی ہی رات عابد نے کچھ ایسے والیانہ جذبات کا اظہار کیا کہ میں جیسے ہواؤں میں اڑنے لگی تھی۔ اس سے پہلے میں نے خود کو کبھی خاص نہیں سمجھا تھا لیکن عابد نے مجھے مغرور کر دیا تھا۔ راس تو تھا ہی میرا دیوانہ، وہ بھی کم نہیں نکلتے تھے۔ اگلے دن میں امی کے گھر آئی تو راس میرے ساتھ تھا۔ اس نے مجھے اکیلے جانے کی اجازت دینے سے انکار کر دیا تھا اور میں اسے ساتھ لے آئی۔ میری مٹی رنگت گھر والوں کو بتانے کے لیے کافی تھی کہ میں کتنی خوش تھی۔ امی اور بہنوں نے سکون کا سانس لیا تھا۔ عابد دل کے اتنے اچھے تھے کہ انہوں نے جلد میرے گھر والوں کا دل جیت لیا اور ایسے ہو گئے جیسے داماد نہیں بلکہ بیٹے ہوں۔ خاص طور سے ابا جان سے ان کی بہت بے تکلفی ہو گئی تھی۔ اتفاق سے ابا جان کا دفتر عابد کے دفتر کے پاس تھا۔ اکثر شام کو ان سے ملاقات ہو جاتی تھی۔ پھر وہ ہر دوسرے تیسرے دن مجھے ملانے کے لیے گھر لاتے تھے۔

شادی کے بعد میں نے چاب چھوڑ دی اور گھر سنبھال لیا۔ البتہ راس کو میں پڑھاتی تھی۔ وہ ڈین پچھتا تھا لیکن گھر کی پریشانیوں نے اس کا ذہن منتشر کر دیا تھا اب اسے اچھا ماحول ملا تو اس کے جوہر سامنے آئے اور اس نے دوسری کلاس میں فرسٹ پوزیشن حاصل کی تھی۔ ان دنوں طبیعت ٹھیک نہیں تھی لیکن راس کی تعلیم پر پوری توجہ دیتی تھی۔ شادی کے چار مہینے بعد تک جب کوئی آثار نظر نہیں آئے تو عابد میرے گھنے سے پہلے مجھے ایک لیڈی ڈاکٹر کے پاس لے گئے اس

نے معائنہ کر کے بتایا کہ مجھ میں کچھ کمزوری تھی۔ کمزوری دور کرنے کے لیے اس نے طاقت کی دوا میں دیں اور ان کا اثر ثبت ہوا تھا۔ شادی کے چھ مہینے بعد میں امید سے ہوئی۔ عابد بہت خوش تھے انہیں بچوں کی خواہش تھی۔ رخسانہ نے راس کو بڑی مشکل سے جنم دیا تھا۔ وہ تو بچہ پیدا کرنے کو کبھی تیار نہیں تھی لیکن راس کا علم دیر سے ہوا تھا اور وہ مجبور ہو گئی۔ اس کے بعد اس نے صاف انکار کر دیا تھا۔ بلکہ عابد کی لاعلمی میں آپریشن بھی کر دیا تھا۔ راس سے محبت کے ساتھ ساتھ مجھے اپنے بچوں کی بھی خواہش تھی۔ لیکن جب شامیر پیدا ہوا تو ہم دونوں سے زیادہ راس خوش تھا۔ اب تک وہ اکیلا تھا اور اب اسے ایک بھائی مل گیا تھا۔ اسکول سے آتے ہی وہ شامیر کے ساتھ لگ جاتا تھا۔

شامیر کے تین سال بعد رومی پیدا ہوا۔ اس کے تین سال بعد ہی ایلا دنیا میں آئی تو جیسے ہماری دنیا مکمل ہو گئی۔ شادی کو دس سال سے زیادہ عرصہ گزر جانے کے بعد بھی عابد میرے اسی طرح دیوانے تھے۔ میری ایک ایک اور معمولی سی خواہش کا بھی یوں خیال کرتے تھے کہ میں خود پر ناز کرنے لگتی تھی۔ میرے اپنے تین بچے تھے لیکن میں سب سے زیادہ اہمیت راس کو دیتی تھی۔ ایک وجہ تو یہی تھی کہ کہیں اسے خیال نہ آئے کہ وہ میری اولاد نہیں ہے اور دوسرے مجھے اس سے سچ محبت زیادہ محبت تھی۔ اس کا اعزاز مجھے اس وقت ہوا جب سائیکل چلائے ہوئے گرنے سے راس کے ہاتھ میں فرنیچر ہو گیا تھا اور اس کی حالت دیکھ کر میری اپنی حالت خراب ہو گئی تھی۔ وہ آپریشن کی وجہ سے دو دن اسپتال میں رہا اور میں اس کے ساتھ رہی تھی۔ حالانکہ وہ بہت باہک میں گھر جاؤں وہاں بچے اکیلے تھے لیکن میرا دل نہیں چاہا کہ اسے اسپتال میں اکیلا چھوڑ کر جاؤں۔ جب تک اس کے ہاتھ پر پلاسٹر رہا میں اس کا ہر کام خود کرتی رہی۔

ایلا کے بعد میں نے عابد سے کہا۔ ”بس اب میں مزید کوئی اولاد نہیں چاہتی۔“

”یو اللہ کی دین ہے۔“ وہ شرارت سے کہتے۔ ”ہاں گڑباز میں ان چاروں پر اپنی توجہ رکھنا چاہتی ہوں۔ راس بڑا ہو رہا ہے اسے زیادہ توجہ کی ضرورت ہے۔“ ”تم پوری توجہ دو دیتی ہو۔“ ”ہاں لیکن آپ نہیں جانتے وہ اس عمر میں ہے جہاں

بچے سوچنا شروع کرتے ہیں۔ ان کے پاس عقل تو ہوتی ہے لیکن تجربہ نہیں ہوتا۔ ایسے میں ان کو گمراہ کرنا بہت آسان ہو جاتا ہے۔ راس اپنی ماں کے پاس اور سنبھال جاتا ہے۔ میں نہیں جانتی کہ وہاں اس سے کس قسم کی باتیں ہوتی ہیں لیکن میں اپنے طور پر ہوشیار رہنا چاہتی ہوں۔ میری ہوشیاری یہی ہے کہ میں راس پر پوری توجہ دوں۔ اسے کسی قسم کی کمی محسوس نہ ہونے دوں۔“

عابد حیران ہوئے تھے۔ ”یہ بات میرے ذہن میں کبھی نہیں آئی۔“

”کیونکہ آپ باپ ہیں اور وہ آپ کے بارے میں جو کہیں گے راس اسے تسلیم نہیں کرے گا لیکن میرے بارے میں اسے بہکایا جاسکتا ہے۔“

عابد نے سوچا اور تسلیم کر لیا۔ ”تم ٹھیک کہہ رہی ہو، واقعی اس معاملے میں ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے ورنہ ہمارے گھر میں مسئلہ ہوگا۔“

پھر خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ میں اس کے بعد امید سے ہوئی بھی نہیں تھی۔ حالانکہ بعض اوقات ہم احتیاط کو نظر انداز بھی کر جاتے تھے۔ بلکہ میرے ذہن میں تھا کہ مزید اولاد کی خواہش نہ ہونے کے باوجود اگر میں امید سے ہوئی تو میں کفران نعمت نہیں کروں گی۔ ایلا کی پیدائش کے وقت شامیر اسکول جاتا تھا اور رومی ایک سال بعد جانے لگا۔ یوں مجھے دو چہر تک صرف ایک بچے کے ساتھ گھر دیکھنے کا موقع مل جاتا تھا۔ میں اس دوران میں سارے اہم کام نمٹا لیتی تھی کیونکہ جب یہ تینوں اسکول سے آتے تو میرا سارا وقت ہی ان کی دیکھ بھال میں صرف ہوتا تھا۔ جب میں بیاہ کر آئی تو اتنے بڑے گھر کی حالت ابھی نہیں تھی۔ کیونکہ رخسانہ کو عابد کی طرح گھر سے بھی کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ سانسے بڑا سالان اجاز پڑا تھا کیونکہ اس کی دیکھ بھال نہیں ہوتی تھی۔ گھر میں فرنیچر اچھا خاصا تھا لیکن بے ترتیب اور بعض جگہ بے جوڑ تھا۔

میں نے سب سے پہلے گھر کی سینک اور فرنیچر بدلا۔ مجھے جھیز میں مکمل بیڈروم سیٹ ملا تھا لیکن باقی فرنیچر اور چیزیں مجھے عابد نے لے کر دیں۔ میں نے سب سے پہلے راس کے بیڈروم کا فرنیچر بدلا۔ اس کی عمر کے لحاظ سے شوخ رنگ اور جدید فرنیچر لیا۔ قالین اور پردے بدلے۔ اس کے بعد ڈرائنگ روم کی باری آئی۔ پھر ڈائنگ روم اور آخر میں دوسرے بیڈروم جو اضافی تھے وہاں تبدیلیاں

لائی۔ ہر کمرے میں نیا پیٹ بھی کیا گیا تھا۔ ایک سال کے اندر گھر کی صورت ہی بدل گئی تھی اس دوران میں لان کے لیے ایک تجربے کار مانی کو جڑ دینی رکھا گیا۔ لان اتنا بڑا نہیں تھا کہ کل دینی مانی کی ضرورت پڑتی۔ وہ روز دو گھنٹے کام کر جاتا تھا اور اس نے چند مہینے کے اندر لان کو خوب صورت پودوں سے بھر دیا۔ میں نے اپنی پسند کے پودوں کے ساتھ درخت بھی لگوائے تھے۔ چار دیواری کے ساتھ چاروں طرف سرو لگوائے تھے۔ ڈرائیو سے دو نوں طرف پام کے سیدھے تھوں والے درخت تھے۔ بنگلے کے دائیں بائیں..... دیواروں پر پھولدار بلیں چڑھتی تھیں۔ جن لوگوں نے ایک سال بعد اس گھر کو دیکھا وہ حیران ہوئے تھے۔ لوگ ہمارے گھر کی خوب صورتی اور سجاوٹ کی مثال دینے لگے تھے۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بنگلے کی خوب صورتی اور آرائش میں اضافہ ہوا تھا۔ ہر تین سال بعد فرنیچر بدل دیتی تھی اسی طرح پردے اور قالین کے ساتھ سینک کا انداز بھی بدل جاتا۔ عابد کو یہ سب اچھا لگتا تھا۔ دراصل میں یہ سب کرتی بھی ان کے لیے تھی۔ شادی کے ابتدائی دنوں میں مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ انہیں کیا پسند ہے اور کیا ناپسند اس لیے میں وہ سب کرنے لگی تھی جو انہیں پسند تھا۔ چاہے اس کے لیے مجھے خود پر کتنا ہی بوجھ کیوں نہ ڈالنا پڑے۔ بچوں کے ساتھ گھر کی یہ ذمے داریاں پورا کرنا آسان نہیں تھا۔ مگر عابد کو خوش کرنے کی خاطر میں نے یہ سب بھی کیا اور اپنی خوشی سے کیا کیونکہ انہوں نے مجھے وہ محبت اور مان دیا جو ہر عورت چاہتی ہے۔ خود کو سرتاپا میرے سپرد کر دیا۔ میری خوشی کو اپنی خوشی بنالیا اور میری ناخوشی ان کی ناخوشی بن گئی۔

عابد رخصتی کے سات سال ایک ایسی عورت کے ساتھ گزارے جس نے انہیں کچھ نہیں دیا تھا۔ میں ان گزرے لمحات کی تلافی بھی کرنا چاہتی تھی۔ رامس میں عابد کی جان تھی۔ مجھے شروع میں اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ دنیا میں رامس سے زیادہ کسی سے محبت نہیں کرتے۔ اس لیے مجھے بھی میں نے رامس کو اپنے بچوں سے زیادہ خود سے قریب کر لیا تھا۔ اس نے بھی جواب میں مجھے ماں جیسا مقام اور محبت دی تھی۔ میری ہر بات اس کے لیے پتھر پر کپیر ہوتی تھی اور میرے چہرے کی ڈراما کبیدی اسے بے قرار کر دیا کرتی تھی۔ یہ کیفیت اس وقت بھی رہی جب وہ سولہ سال کا ہو کر کالج جانے لگا تھا۔ کالج سے آتے ہی اور گھر میں داخل

ہوتے ہی وہ ماما کا نفر ہو لگا تا اور اس کے بعد جب تک میں مل جاتی وہ پورے گھر میں مجھے تلاش کرتا تھا۔ کھانا اس وقت کھاتا جب میں اسے میز پر لگا کر دیتی تھی حالانکہ ملازمت تھی۔ میرا گھر میری جنت تھی۔ یہاں سکون تھا اور محبت تھی۔ کوئی کسی سے کینہ نہیں رکھتا تھا۔ شامیر، روی اور سب سے بڑھ کر اہیلا رامس کی دیوانی تھی۔ جب تک وہ گھر میں ہوتا اہیلا اسی کے پاس رہتی تھی۔ جب وہ چلنے کے قابل ہوئی تو خود رامس کو ڈھونڈ لیا کرتی تھی۔ شام کو اس کہیں جاتا تو اہیلا کی بے قراری دیکھنے والی ہوتی تھی۔ جب رامس آتا تو وہ چٹ جاتی اور رات سوئے تک اس کی جان نڈں چھوڑتی تھی۔ میں یہ مشکل اسے بھلا کر لاتی تھی ورنہ وہ رامس کو پڑھنے بھی نہیں دیتی تھی۔ وہ پری میڈیکل میں تھا اور ایم بی بی ایس میں داخلہ لینا چاہتا تھا۔ رامس کو ایک بہت اچھے کالج میں داخلہ ملتا لیکن ایم بی بی ایس میں داخلے کے لیے اسے بہت زیادہ محنت کی ضرورت تھی۔ صبح کالج اور شام کو نیوٹن کے لیے جاتا تھا۔ پھر رات کو بھی پڑھتا تھا اس لیے میری کوشش ہوتی تھی کہ اسے اپنی اسٹڈی کے لیے زیادہ سے زیادہ وقت ملے۔ رامس نے فرسٹ ایئر میں نوے فیصد مارکس لیے تھے اور اگر وہ سیکنڈ ایئر میں بھی یہ تناسب برقرار رکھتا تو اس کا ایم بی بی ایس میں داخلہ بھی ہو جاتا۔

☆☆☆

بعض اوقات جب انسان سوچتا ہے کہ وہ خوش قسمتی کی انتہا پر ہے اور اب اسے اس سے زیادہ اور کیا مل سکتا ہے تب قدرت اسے جھکا دیتی ہے اور تب اسے پتا چلتا ہے کہ اسے اور کیا حاصل تھا جو اب اس کے پاس نہیں ہے۔ میں اللہ کا بہت شکر ادا کرتی تھی کہ اس نے مجھے اتنا اچھا شہرہ اتنے اچھے بچے اور اتنا خوب صورت اور مثالی گھر دیا ہے۔ سب جاننے والے ہم پر رشک کرتے تھے۔ ہمیں مکمل جیوڑا قرار دیتے تھے۔ اب کسی کو یاد بھی نہیں تھا کہ عابد کی یہ دوسری شادی تھی۔ لوگ میرے گھر کے سکون اور ماحول کی مثالیں دیا کرتے تھے۔ کبھی کبھی مجھے خیال آ جاتا کہ کسی عورت کو اس سے زیادہ کیا ملے گا جو مجھے ملا ہوا ہے۔ شوہر بچے اور پھر آسائش زندگی۔ مجھے یاد نہیں رہا تھا کہ یہ سب ایک جھٹکے کی مار ہے۔ جب تک آدمی میں جان ہے تب تک انسان اس کے لیے اہمیت رکھتے ہیں اور وہ انسانوں کے لیے اہمیت رکھتا ہے لیکن جیسے ہی اس سے یہ زندگی جھٹکتی ہے سب اہمیت ختم ہو جاتی ہے۔

ہماری شادی کو بارہ سال ہونے والے تھے۔ عابد نے پروگرام بنایا کہ سالگرہ کا ایک ہم گھر میں کاٹیں گے اور اس کے بعد ہم دونوں ڈنر کے لیے باہر جائیں گے۔ بچوں کے ساتھ ایک کٹ کر ہم ڈنر کے لیے باہر نکلے تھے۔ عابد نے سی ویو کے ایک اوپن ایئر ریسٹوران کا انتخاب کیا تھا۔ مجھے علم ہوتا کہ وہاں میری زندگی کا سب سے بڑا حادثہ ہوا تھا۔ تو شاید میں وہاں قدم بھی نہ رکھتی۔ مگر آدمی کو آنے والے وقت کا پہلے سے علم ہو جائے تو پھر دنیا میں کوئی حادثہ ہی نہ ہو۔ ڈنر کے دوران میں واش روم جانے کے لیے اٹھی تھی۔ واش روم بہت صاف ستھرا اور چمکی نالکوں والا تھا اور یہی کچنی نالکوں میرے لیے مصیبت کی وجہ بنیں۔ میں واش بین میں تھوڑا دھوکا پیچھے پھرتی تھی کہ نہ جانے کیا ہوا، میرا توازن ٹھٹھا اور میں پشت کے بل بیٹھ گئی۔ میرا سر بہت قوت سے فرش سے ٹکرایا اور پھر مجھے ہوش نہیں رہا تھا۔ مجھے ہوش آیا تو میں اسپتال میں تھی۔ میری آنکھیں کھلی تھیں اور میں آس پاس کی آوازیں سن رہی تھی لیکن جب میں نے حرکت کرنا چاہی تو مجھے پتا چلا کہ میرا جسم میرے قابو میں نہیں ہے۔ میں خوفزدہ ہو گئی تھی۔ میری یادداشت پوری طرح بحال تھی اور مجھے فوراً یاد آ گیا تھا کہ میں عابد کے ساتھ ڈنر پر گئی تھی اور وہاں واش روم میں پاؤں پھسل جانے سے گر پڑی تھی۔ میرا سر بہت زور سے فرش پر لگا تھا۔ میں بے ہوش ہو گئی تھی۔ لیکن اب میں ہوش میں تھی اور اس کے باوجود حرکت نہیں کر پا رہی تھی تو کیا اس چوٹ کی وجہ سے میرا جسم مفلوج ہو گیا تھا؟ یہ سوچ آتے ہی میرے جسم میں خوف کی لہر دوڑ گئی تھی۔ نہیں... نہیں، میں نے گھبرا کر سوچا۔ میری آنکھوں کے سامنے سفید چھت تھی اور یہاں دواؤں کی مخصوص بو تھی مگر میرے آس پاس کوئی نہیں تھا۔

پھر دروازہ کھلا اور مجھے عابد کی آواز آئی اور میں تڑپ گئی۔ مگر یہ تڑپ اندر ہی رہی تھی، اوپر سے میں اپنی پلکیں بھی نہیں جھپکا پا رہی تھی۔ اگر ڈراؤر پلک نہ جھپکتی تو آنکھوں میں خارش سی ہوتی لگتی ہے لیکن اس وقت مجھے کچھ محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ حد یہ کہ سر جہاں فرش سے لگا تھا وہاں بھی تکلیف کا کوئی احساس نہیں تھا۔ عابد کسی سے بات کرتے میری طرف آ رہے تھے۔ ”ڈاکٹر... آپ لوگوں نے اب تک کیا کیا ہے...؟“ نگار کی حالت میں کوئی تبدیلی نہیں آئی ہے۔ یہ رات سے اسی طرح ہے۔“

گو یا صبح ہو گئی تھی۔ ڈاکٹر نے جواب دیا۔ ”دیکھیں ان کے وائٹل سائن خطرے کی حد سے باہر ہیں۔“ ”تب یہ ہوش میں کیوں نہیں آ رہی ہے۔ بلکہ یہ ہوش میں ہے دیکھیں اس کی آنکھیں کھلی ہیں لیکن یہ نہ تو بات کر رہی ہے اور نہ کوئی حرکت کر رہی ہے۔“ عابد کا لہجہ بتا رہا تھا کہ وہ سخت جذباتی ہو رہے ہیں اور بڑی مشکل سے خود پر قابو پا رکھا ہے۔ شاید وہ پہلے میرے پاس تھے اور مجھ سے بات کرنے کی کوشش کرتے رہے تھے لیکن اس وقت میں بے ہوش تھی۔ اب مجھے ہوش آ گیا تھا۔ مگر یہ کیا ہوش تھا کہ میں نہ حرکت کر سکتی تھی اور نہ بول سکتی تھی۔ عابد کا چہرہ میری آنکھوں کے سامنے نمودار ہوا۔ پھر ڈاکٹر نظر... آیا اس نے میری آنکھوں میں روشنی ڈال کر دیکھا اور بولا۔

”پتلی روئل دے رہی ہے مگر یہ کس حد تک ہوش میں ہیں اس کا فیصلہ سی ٹی اسکین اور چند دوسرے ٹیسٹوں کے بعد ہی چلے گا۔“ ”یہ ٹیسٹ کب ہوں گے۔“ عابد بہت بے چین تھے۔ ”اب سے چند گھنٹے کے اندر۔“ ڈاکٹر نے جواب دیا۔ ”یہ تو طے ہے کہ سر کے اندر بلیڈنگ نہیں ہوئی ہے۔ مگر چوٹ سے دماغ متاثر ہوا ہے اور بعض اوقات ایسی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔“ ”اس کا کوئی تو علاج ہوگا۔“

”کیوں نہیں لیکن پہلے ہم وجہ کا تعین کر لیں۔“ کچھ دیر بعد مجھے اسٹریچر پر منتقل کر کے دوسری جگہ لے جایا گیا جہاں مجھے سی ٹی اسکین کی شین میں ڈال دیا گیا۔ اسی طرح دو تین گھنٹے تک مشینوں سے میرا معائنہ ہوتا رہا اور میں ہوش میں تھی۔ میں سب سن اور دیکھ رہی تھی اور میرا دماغ درست انداز میں سوچ رہا تھا صرف مجھے اپنے جسم پر قابو نہیں تھا۔ رفتہ رفتہ مجھے گھبراہٹ ہونے لگی تھی۔ سی ٹی اسکین مشین میں ڈالے ہوئے میرے کان اور میری آنکھیں بند کر دی تھیں اس سے میری گھبراہٹ بڑھ گئی لیکن شکر ہے جب باہر نکالا تو نرس نے دوبارہ میرے کان اور میری آنکھیں کھول دی تھیں۔ اس کے باوجود میری گھبراہٹ کم نہیں ہوئی تھی۔ ایک اچھی بھلی چلتی پھرتی اور جوان عورت اچانک یوں معذور ہو جائے تو اس کی جو کیفیت ہو سکتی تھی وہی کیفیت اس وقت میری تھی۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ میں لمبے میں ٹھیک ہو جاؤں اور اٹھ بیٹھوں۔ میں بار بار کوشش کر رہی تھی کہ خود کو حرکت دوں یا اپنی پلکیں جھپکاؤں یا پھر

آنکھیں گھمانے کی کوشش کروں مگر مجھے ذرا بھی کامیابی نہیں ہو رہی تھی۔

پھر مجھے اپنے بچوں کا خیال آیا میں پھر تڑپ گئی تھی۔ باقی تو بڑے تھے لیکن میری ایبلا تو چھوٹی سی تھی۔ آنے والے جنوری میں وہ چار سال کی ہو جاتی۔ وہ میرے بغیر نہیں رہتی تھی گھر میں میں ایک منٹ کے لیے اس کی نظروں سے دور ہو جاؤں تو وہ مجھے تلاش کرتی آ جاتی تھی۔ اگر گھر میں راس نہیں ہوتا یا وہ مصروف ہوتا تو ایبلا لازمی میرے پاس ہی ہوتی تھی۔ پتا نہیں اسے کون سنبھال رہا ہوگا۔ رونی، شامیر اور راس کا کیا حال ہوگا۔ بڑے ہونے پر ان کا یہ حال تھا کہ میرے بغیر ایک دن نہیں رہتے تھے۔ ان کی وجہ سے میں مہینوں بعد بھائیوں کے گھر ایک دن کے لیے رکنے جاتی تھی۔ انہوں نے میرے بغیر رات کیسے گزاری ہوگی۔

میرے ٹیٹوں کے دوران عابد میرے ساتھ ساتھ تھے۔ انہوں نے وہی رات والا سوٹ پہن رکھا تھا اور ان کا چہرہ بتا رہا تھا کہ انہوں نے شاید ایک لمحے کو بھی آرام نہیں کیا تھا۔ مستقل اسپتال میں تھے۔ کئی گھنٹے بعد مجھے دوبارہ اسی کمرے میں منتقل کر دیا گیا۔ یہ بڑا اور صاف سہرا اے سی روم تھا۔ میرے سر ہانے تازہ پھولوں کا گلہ دستہ رکھا تھا جس سے اٹھنے والی خوشبو میں واضح محسوس کر سکتی تھی۔ جب سب کمرے سے چلے گئے تو عابد میرا ہاتھ تمام کمرے گھومتے گئے۔

”پلیز.... تم میری بات سن رہی ہو نا.... پلیز جواب دو.... یوں خاموش نہ رہو.... تم جانتی ہو میں تمہاری ذرا سی خاموشی برداشت نہیں کر سکتا.... بولو نا....“ وہ کہتے کہتے رو دیے تھے۔ میں اپنی حالت کیا بیان کروں میرے بس میں ہوتا تو میں موت کی قیمت پر بھی ان کو ایک بار جواب دیتی۔ مگر میرے بس میں کچھ نہیں تھا۔ میں ویسے ہی ساکت بیٹھ رہی۔ کچھ دیر بعد بچے بھی آ گئے۔ وہ میرے آس پاس جمع تھے۔ وہ مجھے پکار رہے تھے مجھے اٹھانے کی کوشش کر...

رہے تھے اور پھر رو رہے تھے۔ خاص طور سے ایبلا کی پچکیاں بندھ گئی تھیں۔ وہ اتنا بلکہ کر رہی تھی کہ مجھے لگا میرا دل پھٹ جائے گا۔ میں تو اس کی سسکی بھی برداشت نہیں کر رہی تھی اور اب وہ میرے سامنے رو رہی تھی۔ اندر سے میں کسی طوفان سے دو چار تھی اور اوپر سے کسی ساکت سمندر کی طرح تھی۔

وقت گزرتا رہا۔ میرے ٹیٹ جاری تھے۔ روز کی ڈاکٹر مجھے دیکھنے آتے تھے۔ نت نئے علاج تجویز ہوتے

تھے لیکن میری بے حسی ختم نہیں ہو سکی تھی۔ دو ہفتے بعد ڈاکٹروں نے ہار مان لی۔ انہوں نے عابد سے کہا۔ ”ان کی جان کو خطرہ نہیں ہے کیونکہ یہ از خود سانس لے رہی ہیں۔ ان کا دل بھی خود دھڑک رہا ہے۔ جسم کے دوسرے سسٹم بھی کام کر رہے ہیں۔ اس لیے آپ انہیں گھر میں بھی رکھ سکتے ہیں ہمارے بس میں جو تھا وہ ہم رکھ چکے ہیں۔“

”تب یہ کیسے جائے گی؟“

”یہ خود جائیں گی، ممکن ہے یہ اب بھی جاگ رہی ہوں اور ہماری باتیں سن رہی ہوں لیکن جواب دینے سے قاصر ہوں۔ بہتر ہے آپ انہیں گھر لے جائیں اور ان کی دیکھ بھال کے لیے کوئی مستقل نرس رکھ لیں۔“

عابد مجھے اس حالت میں گھر لے جانا نہیں چاہتے تھے لیکن ڈاکٹروں نے مجھے مزید اسپتال میں رکھنے سے انکار کر دیا تھا۔ مجبوراً عابد مجھے گھر لے آئے۔ ہمارے بیڈ روم کے ساتھ والا کمرہ عابد نے اسٹڈی بنا رکھا تھا میرے لیے خالی کر دیا گیا۔ یہاں میرے لیے خاص مریضوں والا بیڈ لگا گیا۔ اس میں پیسے لگے تھے اور حسب ضرورت اس کا کوئی بھی حصہ اور بچھڑا گیا جاسکتا تھا۔ اگرچہ مجھے اس حادثے کے بعد ایک بار بھی آسپین نہیں لگائی تھی اس کے باوجود عابد نے آسپین ٹیک ، ہارٹ بیٹ اور بلڈ پریشر پر نظر رکھنے والی مشین منگوائی تھی۔ مجھے ڈرپ کی مدد سے خوراک دی جا رہی تھی اور ایک کیو لائل مستقل میرے بائیں ہاتھ سے منسلک تھا۔ اسپتال میں صبح شام دو مرتبہ میری فزیو تھراپی ہوتی تھی کہ میرا جسم اپنی معمول کی حالت پر رہے۔ میرے جسم کی صفائی کی جاتی تھی۔

پہلی رات عابد میرے ساتھ رہے تھے۔ لیکن اگلی صبح ایک نرس آ گئی۔ وہ بڑی دلکش اور جوان عورت تھی۔ نرس کا ساوہ لباس بھی اس پر بچا ہوا تھا۔ اس نے عابد کے ساتھ کمرے میں داخل ہوئے ہی مجھ سے اپنا تعارف کرایا۔ میں نیم دراز پوزیشن میں تھی اور پورا کمرہ میری نگاہوں کے سامنے تھا۔ وہ میرے پاس آکر ڈراپ لگائی۔ ”مسز عابد.... میں سحر ہوں آپ کی نرس.... میں بارہ گھنٹے آپ کے ساتھ رہوں گی۔“

ظاہر ہے میں اسے کیا جواب دیتی لیکن نہ جانے کیوں اس پہلی نظر میں وہ مجھے اچھی نہیں لگی تھی۔ شاید اس لیے کہ وہ اس کمرے میں عابد کے ساتھ آئی تھی۔ مجھ سے بات کر کے اس نے پلٹ کر عابد کی طرف دیکھا۔ ”عابد صاحب

آپ بے فکر ہیں میں آپ کی سسر کو سنبھال لوں گی۔ آپ کو کوئی شکایت نہیں ہوگی۔“

”مجھے امید ہے آپ اپنے فرائض بہترین انداز میں انجام دیں گی۔“

ظاہر ہے عابد کو اپنا بزنس بھی دیکھنا تھا۔ وہ سارا دن میرے ساتھ لگے نہیں رہ سکتے تھے۔ اس لیے انہوں نے میری دیکھ بھال کے لیے نرس ہائر کی تھی۔ اس کا نام سحر تھا لیکن وہ دیکھنے میں بھی سارہ لگ رہی تھی۔ بہت خوب صورت براؤن رنگی بال، اس سے لائٹ براؤن فیسول خیز آنکھیں، بہت دلکش ناک، نقش، گلابی رنگت جو اس کے ہاتھ اور ہجروں سے بھی جھلک رہی تھی۔ متوسط قامت اور نرس کے لباس میں چھپاؤ کش ترین بدن۔ مجھے حیرت ہوئی تھی اس خوب صورتی کے ساتھ تو وہ ماڈل بن سکتی تھی، اسے نرس بننے کی کیا ضرورت تھی۔ اگر میں بول سکتی تو اسی لمحے سحر کو بہ طور نرس مسٹر دکتوریٹ لیکن میں تو مردہ بدست زندہ تھی اپنی مرضی سے کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ عابد اسے چھوڑ کر چلے گئے تو اس نے کھڑکی سے پردے سرکائے جہاں سے لان کا دلکش منظر صاف دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے بیڈ کا زویہ بدلا اور میرا کیئر درست کرتے ہوئے بولی۔ ”مسز عابد.... آپ کا گھر بہت خوب صورت ہے، بالکل آپ کی طرح۔“ آپ یقیناً ایک خوش قسمت عورت ہیں۔“

میں نے دل میں سوچا کہ میں ایک خوش قسمت عورت تھی۔ میری قسمت مجھ سے روٹھ گئی ہے ورنہ میں اس طرح بے بس والا چار کیوں بستر پر پڑی ہوتی۔ سحر سارا دن میرے ساتھ رہتی تھی۔ وہ میرا مکمل خیال رکھ رہی تھی۔ حد یہ کہ وہ مجھے صاف سہرا بھی رکھتی تھی۔ اگرچہ مجھے یہ بہت ناگوار لگتا تھا کہ وہ مجھے صاف کرے لیکن میں مجبور تھی، کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ اس دن مجھے خیال آیا کہ قدرت نے بلا وجہ کا ہوش دیا ہے اس سے تو بہتر تھا کہ میں جج جج ہوش و حواس سے ریگانہ ہوتی تو اس اذیت سے تو نہ گزرنا پڑتا۔ صبح آٹھ سے رات آٹھ بجے تک میرے ساتھ ہوتی تھی۔ بعد میں مجھے پتا چلا کہ وہ ایک بہت مہنگے اور بڑے اسپتال میں نرس تھی۔ عابد نے وہاں کی انتظامیہ سے اس کی خدمات حاصل کی تھیں اور اس کے لیے وہ اسپتال کو ہر مہینے پچاس ہزار روپے دیتے۔ اس فیس میں فزیو تھراپی بھی شامل تھی۔ رات کو میں اٹھتی تھی یا جب تک عابد کو نیند نہیں آنے لگتی وہ میرے پاس بیٹھ کر باتیں کرتے تھے۔

بچے صبح اسکول جاتے تھے۔ دوپہر میں واپس آکر ان کو کچھ دیر کے لیے میرے کمرے میں آنے کی اجازت تھی۔ پھر وہ کھانا کھانے اور دوسرے کاموں کے لیے چلے جاتے تھے۔ میں نے ان کاموں کے لیے جو ملازمہ رکھی تھی اب اس نے بچوں کی دیکھ بھال بھی شروع کر دی تھی۔ ایبلا اس کے ساتھ رہتی تھی۔ مگر جب مجھے گھر منتقل کیا گیا اور سحر میری دیکھ بھال کے لیے آئی تو ایبلا اس سے مانوس ہو گئی اور اب وہ دن میں کئی بار میرے کمرے میں آ جاتی لیکن وہ میرے لیے نہیں آتی تھی بلکہ سحر کے پاس آتی تھی۔ وہ اس کے بال بناتی تھی اور بعض اوقات اسے پکڑے بھی تبدیل کر دیتی تھی۔ وہ اس سے باتیں کرتی اور اسے کہانیاں سناتی تھی۔ لیکن یہ سب وہ فارغ وقت میں کرتی تھی جب وہ میرا کام کرتی تو ایبلا کو باہر بھیج دیا کرتی تھی۔

صبح آنے کے بعد سے وہ ایک لمحے کے لیے بھی مجھے اکیلا نہیں چھوڑتی تھی۔ اپنے لیے اس نے ایک آرام دہ... کرسی منگوائی تھی۔ فارغ وقت میں وہ اس پر بیٹھتی تھی۔ کرسی پر بھی وہ الٹ پوزیشن میں بیٹھتی تھی۔ اس نے آتے ہی میرے متعلق ایک چارٹ بنایا تھا کہ کب کیا کرنا تھا۔ جیسے بستر پر میری پوزیشن بدلتی تھی۔ وہ تقریباً ہر لمحے بعد میری پوزیشن بدلتی تھی۔ کبھی سر ہانہ اٹھا دیتی اور کبھی مجھے لانا دیتی تھی۔ دن میں دو بار وہ مجھے ایک ایک گھنٹے کے لیے الٹا لٹا دیتی تھی تاکہ میرا جسم ہر پوزیشن کا عادی رہے۔ کبھی کھڑکی سے پردے ہٹا دیتی تھی اور کبھی پھیلا دیتی۔ مجھے دن بھر میں دو ڈرپ کی بوتلیں دی جاتی تھیں جن میں طاقت بخش ادویات کے ساتھ وہ تمام ضروری منرلز اور وٹامنز بھی دیے جاتے تھے جو ایک انسان کو درکار ہوتے ہیں۔ ہر تیسرے دن وہ... سرے پاؤں تک گیلے آئینچ اور لیو بیڈ سوپ سے میری صفائی کرتی تھی۔ میرا سر خاص پوزیشن میں رکھ کر بال دھوئی انہیں شہیاد اور کنڈیشنر کرتی تھی۔ شام کے وقت جب عابد آنے والے ہوتے تو وہ میرا کچھلکا میک اپ کرتی اور عابد کے آنے پر کمرے سے چلی جاتی تھی۔ عابد کچھ دیر میرے ساتھ رہتے۔ مجھ سے باتیں کرتے تھے اور پھر فریش ہونے چلے جاتے تھے۔ اس کے بعد وہ کھانا کھا کر میرے پاس آتے تھے اور رات دیر تک میرے ساتھ رہتے تھے۔ سحر بے شک پروفیشنل سہی لیکن وہ میری ہر ممکن خدمت کرتی تھی اس کے باوجود پتا نہیں کیا بات تھی کہ وہ مجھے اچھی نہیں لگتی میری رو بہ اول سے اس کے لیے میرے دل

میں جو تاپہندگی آئی تھی وہ برقرار تھی۔ ایک دن عابد کو دفتر سے دیر ہو گئی اور اتفاق سے سحر کو لینے والی گاڑی بھی نہیں آئی تھی۔ اسپتال کی گاڑی روز اسے چھوڑنے اور لینے آتی تھی۔ وہ پریشان ہو گئی اس کے گھر میں صرف ایک ماں تھی اور وہ بھی تائبہ تھی۔ اپنے سارے کاموں کے لیے سحر کی محتاج تھی۔ وہ دیر سے جاتی تو ماں پریشان ہو جاتی۔ عابد آئے اور سحر کو دیکھ کر چونک گئے۔ ”ارے تم کی نہیں ابھی تک بیٹیں ہو؟“

”گاڑی نہیں آئی ہے، خراب ہو گئی ہے اور کوئی دوسری گاڑی بھی نہیں ہے۔ پلینز آپ مجھے اسٹاپ جگ چھوڑ دیں۔“
”میں تم کو گھر تک چھوڑ دیتا ہوں۔“ عابد نے کہا۔
”تھینک یوسر۔“ وہ خوش ہو کر بولی۔ ”آپ بہت اچھے آدمی ہیں۔“

”وٹلم۔“ عابد نے کہا اور بریف کیس رکھنے چلے گئے۔ میں اندر سے سلگ اٹھی تھی۔ سحر کے لہجے میں ایک خاص شوخی اور کھٹک تھی اور میں اچھی طرح جانتی تھی کہ ایک عورت کے لہجے میں یہ شوخی اور کھٹک کب پیدا ہوتی ہے۔ عابد اسے لے کر چلے گئے۔ میرا خیال تھا کہ وہ اسے چھوڑ کر جلد آجائیں گے لیکن وہ پورے دو گھنٹے بعد آئے تھے۔ انہوں نے آتے آتے مجھ سے معذرت کی۔ ”سوری گئی...بحرنے چائے پر روک لیا تھا۔“

میں نے سوچا کہ جائے میں اتنی دیر تو نہیں لگتی ہے۔ جب عابد اتنی دیر سحر کے گھر کیا کرتے رہے۔ عابد تھکے ہوئے تھے اس لیے کچھ دیر بعد سونے کے لیے چلے گئے۔ اب تک یہ تھا کہ عابد سحر سے صرف میرے بارے میں بات کرتے تھے لیکن اس دن کے بعد وہ اس کے بارے میں اور اس کی ماں کے بارے میں بھی بات کرنے لگے۔ اگر شام کو جلدی آجاتے تو اپنی چائے میرے کمرے میں منگوا لیتے اور سحر کے ساتھ کپ شپ کرتے ہوئے چائے پیتے تھے۔ میں نے محسوس کیا کہ سحر عابد کے ساتھ خوش ہوتی تھی۔ ان سے بات کرتے ہوئے اس کے لہجے میں شوخی اور کھٹک آ جاتی تھی۔ وہ انہیں اپنے بارے میں بتاتی تھی۔ اس نے گریجویٹن تک تعلیم حاصل کی پھر رننگ کا کورس کیا اور اپنی تعلیم اور شخصیت کی وجہ سے اسے بڑے اسپتال میں جاب مل گئی۔ یہاں اسے اچھی تنخواہ کے ساتھ سہولتیں اور عزت بھی ملتی تھی۔ ایک دن ایسی ہی ایک نشست کے دوران عابد نے اس سے پوچھ لیا۔

”تم تعلیم یافتہ اور پرمشخص شخصیت کی مالک ہو جاؤ گی ابھی جاب بھی کر رہی ہو تو شادی کیوں نہیں کی؟“
”اس کی دو دو جہات ہیں عابد صاحب۔“ اس نے سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا۔ ”اول میری ماں کا میرے علاوہ کوئی نہیں ہے اور میں شادی کے بعد بھی انہیں ساتھ ہی رکھوں گی۔ دوسرے مجھے آج کل کے نوجوان اچھے نہیں لگتے ہیں۔ ان میں مردوں والی کوئی بات ہی محسوس نہیں ہوتی۔ وہ ابھی تک بچے بنے ہوئے ہیں، ذہنی داری اور مستقبل کی انہیں پروا نہیں ہے۔ کم سے کم مجھے ابھی تک ایک شخص ایسا نہیں ملا۔“

”جب تمہیں کس قسم کے مرد اچھے لگتے ہیں۔“
”مجھے پختہ عمر کے مرد اچھے لگتے ہیں۔ ان میں مردانگی بھی ہوتی ہے، عقل بھی اور ذہنی داری بھی۔“ سحر نے کہا تو مجھے لگا جیسے اس نے خاص طور سے عابد کو سامنے رکھ کر یہ بات کی تھی۔ عابد بے شک تقریباً چوالیس کے ہو چکے تھے لیکن سوائے کن پٹی سے جھلکتے سفید بالوں کے اور کسی چیز سے ان کی عمر کا پتا نہیں چلتا تھا۔ بے داغ چہرہ اور فٹ جسم دیکھ کر کوئی انہیں زیادہ سے زیادہ پختہ نہیں کر سکتا تھا۔

”ہو سکتا ہے تمہیں تمہاری پسند کا آدمی مل جائے۔“ عابد نے کہا اور وہاں سے چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد سحر میری طرف آئی اور نیچے پریمرا ٹھیک کرتے ہوئے بولی۔
”مہر عابد آپ خوش قسمت ہیں کہ آپ کا عابد صاحب جیسا شریک حیات ملا ہے۔“ اس کے لیے میں نے رشک سے زیادہ حد محسوس ہوا تھا۔ وہ اور عابد ہر دوسرے تیسرے دن اسی طرح ایک ساتھ چائے پیتے تھے۔ ان کی آدھ پون گھنٹا نشست ہوتی تھی۔ شروع میں میں بھی ان کا موضوع گفتگو ہوتی تھی لیکن رفتہ رفتہ میں گفتگو سے خارج ہوتی چلی گئی۔ ایک دن عابد جلدی آئے تو سحر نے ان سے کہا۔ ”عابد صاحب مجھے نزدیکی مارکیٹ سے کچھ لینا ہے کیا آپ میرے ساتھ نہیں گئے؟“

مجھے غصہ آیا تھا۔ اسے کیا حق تھا کہ عابد سے اس طرح چلنے کو کہے۔ میرا خیال تھا کہ عابد انکار کریں گے لیکن میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب انہوں نے جواب دیا۔ ”کیوں نہیں... میں بس چھینچ کر کے آتا ہوں۔“

اس دن عابد نے پہلی بار نہ تو میری طرف دیکھا اور نہ ہی مجھ سے مخاطب ہو کر کوئی جملہ کہا اور کمرے سے چلے

گئے۔ میں عابد کے اس سلوک پر آزرہ ہو گئی۔ لیکن مجھے امید تھی کہ ابھی عابد آئیں گے تو وہ میرے پاس آئیں گے مگر وہ تیار ہو کر آئے اور سحر کو باہر سے ہی آواز دے کر بلایا اور دونوں چلے گئے میں نے دور ہوتی آواز میں سحر کی کھٹک دار پسلی تھی اور میرا دل سلگ اٹھا تھا۔ مجھے عابد سے یہ امید نہیں تھی کہ وہ کسی مجھے یوں نظر انداز کریں گے۔ انہیں ذرا بھی خیال نہیں آیا کہ وہ اپنی بیوی کے سامنے ایک غیر عورت کو شاپنگ پر لے جا رہے تھے۔ پھر مجھے خیال آیا کہ وہ مجھے ہوش میں کہاں سمجھتے ہیں؟ مگر اس کا مطلب یہ تو نہیں تھا کہ وہ یوں سحر کو شاپنگ پر لے جاتے۔ اس روز بھی انہوں نے واپسی میں خاصی دیر لگائی اور جب سحر واپس آئی تو اس کے ہاتھ میں کئی شاپرز تھے۔ ایسا لگ رہا تھا اس نے کپڑوں اور جوتوں کی دل کھول کر شاپنگ کی تھی۔ شاپرز ساری تنہائی دکانوں کے تھے جہاں نادل سوٹ اور جوتی بھی ہزاروں میں آتی تھی۔ اس نے اندر آ کر پھولے سانس کے ساتھ کہا۔ ”عابد صاحب سو بیٹھیں۔“

”اس کی ضرورت نہیں ہے آپ بھی تو میرے لیے اتنا کر رہی ہیں۔“

”کاش میں آپ کے لیے اس سے زیادہ کر سکتی۔“ وہ جذباتی لہجے میں بولی۔ ”آپ اچھے نہیں بہت اچھے آدمی ہیں۔“
”تم بھی اچھی لڑکی ہو۔“ عابد نے اس کی جوابی تعریف کی اور اپنے کمرے کی طرف چلے گئے۔ اس بار بھی انہوں نے میرے قریب آنے اور میرا احوال معلوم کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ ان کے اس رویے سے میرے اندر آگ سی بجڑ گئی تھی اور میرا سینہ جل رہا تھا۔ عابد اور سحر میرے سامنے ہی ایک نئے کھیل کا آغاز کر چکے تھے اور اس کا انجام مجھے معلوم تھا۔ بس میں بھی اس دور سے گزرتی تھی جب رخسانہ عابد کی بیوی تھی لیکن میں نے عابد کو اس سے نہیں چھینا تھا بلکہ اس نے خود علیحدگی اختیار کی تھی۔ مگر کمرہ یہ جانتے ہوئے بھی کہ عابد مجھ سے محبت کرتے تھے ان پر اپنا تسلط قائم کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ عابد مرد تھے اور مرد بھی عورت کی چالوں کو نہیں سمجھ پاتا ہے۔ اسے عورت کے معاملے میں ایسا ذہن ملا ہے جو ہمیشہ عورت کا فوور کرتا ہے۔ بس اسے غلط یا چال باز نہیں سمجھتا۔

اس کے دو دن بعد سحر آئی تو بہت تیار ہو کر آئی تھی۔ اس نے نرس کے یونیفارم کے بجائے خوب صورت نیلے رنگ کا فراک اور چوڑی دار پاجامہ پہن رکھا تھا۔ میک

رفعت حسن

بین الاقوامی شہرت یافتہ دانشور
وہ اس وقت امریکا میں اسلام کی صحیح تصویر پیش کرنے کے ساتھ ساتھ انسانی حقوق اور خصوصاً خواتین کے حقوق کے لیے بھرپور انداز میں کام کر رہی ہیں۔ انہوں نے علامہ اقبال کے فلسفے اور تصانیف پر مقالہ تحریر کر کے انگلستان سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری لی۔ 1976ء سے یونیورسٹی آف لوئیز ویل (کیلیفورنیا) سے بطور پروفیسر ذہنی علوم وابستہ ہیں۔ امریکا کی کئی یونیورسٹیوں میں وزیٹنگ پروفیسر کی حیثیت سے بھی خدمات انجام دیں۔ متعدد کتابیں لکھیں۔ اسلامی اقدار سے متعلق کورس کی ایک کتاب بھی لکھی۔
مرسلہ: شجاعت حسن، اوٹارو

اب کر رکھا تھا اور چوڑیوں کے ساتھ ایکی پینٹل جیولری بھی پہن رکھی تھی، سادہ بچی شوز کے بجائے اس نے ایڑی والی سینڈل پہن رکھی تھی۔ وہ معمول سے زیادہ دلکش لگ رہی تھی۔ مجھے حیرت ہوئی کہ وہ آج اتنا تیار ہو کر کیوں آئی تھی۔ عام طور سے وہ مجھ سے باتیں کرتی تھی لیکن جب سے وہ عابد کی طرف زیادہ متوجہ ہوئی تھی مجھ سے باتیں کرنا بند کر دی تھیں اور صرف ڈیوٹی ادا کرتی تھی۔ پہلے وہ روز صبح لان سے پھول لا کر میرے سر ہانے رکتی تھی، یہ معمول بھی بند کر دیا تھا۔

لیکن سحر سے زیادہ مجھے عابد کے رویے پر تکلیف ہو رہی تھی بلکہ مجھے اصل تکلیف ہی ان سے ہوئی تھی۔ دو تین دن سے وہ مجھ سے بگڑا ہوا ہو گئے تھے۔ اگر کبھی پاس آئے بھی تو نہایت روکے اور بھگتے والے انداز میں دو تین باتیں کہیں اور چلے گئے۔ بچوں کو پہلے ہی میرے پاس کم آنے دیا جاتا تھا۔ اب وہ دن میں بس ایک دو بار ہی میرے کمرے میں آتے تھے۔ سوائے رامس کے، وہ کالج سے آتے ہی سیدھا میرے پاس آتا۔ سلام کرتا مجھے ماتھے پر بپا کرتا کچھ دیر میرے پاس بیٹھ کر اپنی پڑھائی اور کالج کی باتیں کرتا اور پھر کھانے کے لیے چلا جاتا۔ اسی طرح وہ شام کو اور رات کو

بھی باقاعدگی سے آتا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ محرکوں پر نہیں کرتا ہے۔ وہ جب آتا اور سحر ہوتی تو اس کے چہرے پر جھنجھلاہٹ اور ناگواری آ جاتی تھی۔ جب سحر نہیں ہوتی تو اس کا موڈ خوشگوار ہو جاتا۔ ایک رات کو وہ آیا تو رو ہانسا لگ رہا تھا۔ سحر جا چکی تھی اور عابد ابھی میرے پاس نہیں آئے تھے۔ اس نے آتے ہی کہا۔ ”ماما پلیز اٹھ جائیں۔۔۔ ہمارے گھر میں کیا ہو رہا ہے۔۔۔ یہ عورت کیوں ہر وقت پاپا کے پیچھے لگی رہتی ہے۔۔۔ ماما وہ مجھے زہر لگتی ہے۔۔۔ لیکن اس نے پاپا کو اپنی منگی میں کر لیا ہے۔ اب پاپا اسے چھوڑنے جاتے ہیں۔“

یہ میرے لیے انکشاف تھا کہ اب عابد اسے چھوڑنے جاتے ہیں۔ تب ہی وہ کئی دن سے دیر سے آتے تھے اور کچھ دیر بیٹھ کر سونے چلے جاتے تھے۔ ان کے انداز میں بیزاری صاف محسوس ہوتی تھی کہ وہ دل پر بھر جبر کے ڈیوٹی بھگتے آئے ہیں۔ اس رور رہا تھا۔ میرا دل تو پٹ پٹا تھا۔ میں نے ہمیشہ اسے کئی اولاد سے بڑھ کر سمجھا تھا اور اب وہ میرے سامنے رور رہا تھا تو میرا دل کیوں نہ تر پڑتا؟ مگر میں اتنی بے بس تھی کہ اسے تسلی بھی نہیں دے سکتی تھی۔ اس کے سر پر ہاتھ نہیں رکھ سکتی تھی۔ اس میں سترہ سال کا ہونے والا تھا اور اب وہ جوان لڑکا تھا اسے معلوم تھا کہ سحر کس چکر میں تھی اور اس کے پاپا کے گرد اپنا گھیرا کس طرح تنگ کر رہی تھی۔ اس نے کچھ دیر بعد آنسو بونچھے اور غصے سے بولا۔ ”ماما آپ جلدی سے ٹھیک ہو جائیں ورنہ میں اس عورت کو دل کر دوں گا۔“

میں وہی کر رہ گئی۔ اس کا غصہ بہت تیز تھا۔ اسے غصہ کم آتا تھا لیکن جب آتا تو وہ بے قابو ہو جاتا تھا اور بڑی مشکل سے اس کا غصہ اترتا تھا۔ اس نے تصدیق کر دی تھی کہ سحر اور عابد کے درمیان کوئی چھڑی یک رہی تھی۔ اس دن سحر کو تیار دیکھ کر میرا ہاتھ ٹھکا۔ عابد شام کو جلدی آگئے اور سیدھے میرے کمرے میں آئے۔ اس لیے نہیں کہ یہاں میں تھی بلکہ اس لیے کہ یہاں سحر تھی۔ اسے دیکھ کر ان کی آنکھوں میں وہ چمک آئی جو کبھی مجھے دیکھ کر آتی تھی۔ ”آج تو تم بہت تیار ہو کر آئی ہو۔“

”ہاں۔۔۔ سحر نے ایک ادا سے کہا۔ ”آج میری برتھ ڈے ہے اس لیے میں نے سوچا ڈرا تیار ہو جاؤں۔ آپ کو اچھا لگا۔“

”بہت اچھا لگا۔“ عابد نے کہا اور پھر انہوں نے سر کے اشارے سے سحر کو باہر آنے کو کہا۔ ان کا خیال تھا کہ میں

بھی اشارہ نہیں دیکھ سکتی تھی لیکن میں نے دیکھ لیا تھا۔ سحر چکر پر بعد یونہی سے انداز میں باہر گئی اور جب وہ واپس آئی تو اس کا چہرہ کھلا ہوا تھا۔ عابد نے باہر بلا کر نہ جانے اسے کیا کیا تھا۔ اس کا موڈ بہت خوشگوار رہا تھا۔ وہ کام کے دوران اور فارغ بیٹھی ہوئی کھانسی لگاتی رہی تھی۔ مغرب کے قریب اس نے اپنا میک اپ تازہ کیا اور میرے بازو میں لگی دوسری ڈرپ کی بوتل نکال دی جو ختم ہو گئی تھی۔ آج اس نے مجھے دوپہر میں دوسری بوتل دے دی تھی۔ گویا اسے جانے کی جلدی تھی۔ اپنا کام مکمل کرتے ہی وہ جانے کی تیاری کرنے لگی۔ چہ بجے یعنی مقررہ وقت سے دو گھنٹے پہلے ہی وہ باہر نکل گئی اور تب میں نے عابد کی ہلکی سی آواز سنی۔ ”نگار کو تو جانا نہیں ہے۔“

سحر نے۔۔۔ ”ان سے چاری کو کیا پتا۔۔۔ اب چلیں نا دیر ہو رہی ہے سیو جا کر آنا جی ہے۔“

عابد اس کی کڑھ ڈے مٹانے سے سیو یو لے جا رہے تھے۔ شاید عابد نے یہی بات کہنے کے لیے اسے اشارے سے باہر بلایا تھا۔ اسی وجہ سے وہ کھل گئی تھی اور اس نے جلدی جلدی اپنے کام نہائے تھے۔ ان کے جانے کے کچھ دیر بعد راس بھرا ہوا کمرے میں آیا۔ ”ماما اب میں برداشت نہیں کر سکتا۔۔۔ پاپا اسے باہر لے جانے لگے ہیں۔۔۔ میں یہاں سے جا رہا ہوں۔۔۔ میں یہاں رہا تو اس عورت کو پاؤں سے دوں گا۔“

میں راس کو روکنا چاہتی تھی کہ وہ یوں نہ جائے۔ یہ اس کا گھر تھا مگر وہ بہت غصے میں تھا۔ وہ رو رہا تھا۔ وہ جس طرح آیا تھا اسی طرح چلا گیا۔ شامیر اور رومی بہت کم آتے تھے لیکن کچھ دیر بعد وہ روٹے ہوئے آئے۔ ”ماما۔۔۔ بھائی جا رہے ہیں۔ انہیں روک لیں۔“

ملازمہ آکر ان دونوں کو لے گئی۔ وہ بھی اس صورت حال پر دھکی نظر آ رہی تھی۔ عابد اپنے اصل روپ میں آگئے تھے۔ انہیں مجھ سے بس اتنی محبت تھی چپ تک میں ٹھیک ٹھاک تھی۔ ان کا گھر اور انہیں دیکھ رہی تھی اب میں ستر پر ایک بے جان لاش کی طرح پڑی تھی تو انہیں میری ضرورت نہیں تھی۔ انہوں نے دوسری عورت تلاش کر لی تھی۔ ٹھیک ہے اس میں سحر کا قصور بھی تھا وہ کیوں ایک شادی شدہ مرد کی طرف جھکی تھی لیکن اصل قصور عابد کا تھا۔ وہ شادی شدہ تھے اور ابھی ان کی بیوی زندہ تھی۔ لیکن وہ اسے نظر انداز کر کے ایک غیر عورت کے ساتھ ہوم پھر رہے تھے۔ میں ان کے

لے پوچھ بن گئی تھی اور اب انہیں ایک زندہ بیوی کی ضرورت تھی۔ میں مارے دکھ کے اندر ہی اندر گھٹ گھٹ کر رونے لگی تھی۔ کیا ہماری محبت اتنی ہی کمزور تھی کہ حالات کا ایک پیچڑا نہ سمجھ سکی؟ کیا عابد کے نزدیک میں صرف ایک خوب صورت عورت تھی۔ اب میں ان کے قائل نہیں رہی تھی تو انہوں نے مجھے نظر انداز کر دیا تھا۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ چن چن مار کر روؤں۔ چاہے عورتوں کی طرح تین کون کے میرا سب لٹ گیا اور میں برپا ہو گئی۔ مگر میں ٹیک نہیں بچھکا سکتی تھی۔ چنچل کیسے مارنی اور پٹن کیسے کرتی؟ میرے تو آنسو بھی خشک تھے اگر آنسو ہی نکل جاتے تو میرے اندر جو آگ لگی تھی شاید اس میں کچھ کی آتی۔

عابد اس رات بہت دیر سے آئے تقریباً ساڑھے گیارہ بجے اور فوراً ہی ان کے چلانے کی آواز آئی، وہ ملازمہ سے پوچھ رہے تھے کہ راس کس کی اجازت سے گھر سے گیا تھا۔ ملازمہ سہی ہوئی آواز میں بتا رہی تھی۔ عابد میرے کمرے میں آئے انہوں نے میری طرف دیکھا۔ ”سنا تم نے رورخوار اب اتنے بڑے ہو گئے ہیں کہ باپ کو ان کی اجازت سے کوئی کام کرنا چاہیے۔“ عابد کا لہجہ بہت سخت تھا۔ ”کیونکہ آپ وہ کر رہے ہیں جو ایک جوان ہوتے بیٹے کے باپ کو زیب نہیں دیتا ہے۔“ میں نے دل میں کہا۔ ”اس کا خیال ہے میں تمہارے ساتھ کوئی نا انصافی کر رہا ہوں۔ کیا میں نے تمہارا خیال نہیں رکھا۔۔۔ تمہارے علاج میں کوئی کمی چھوڑی۔۔۔ اب یہ میرا قصور تو نہیں ہے کہ تم ٹھیک نہ ہو سکیں۔ کیا مجھے سب چھوڑ کر تمہارے پاس بیٹھ جانا چاہیے۔۔۔ بولو نگار۔۔۔ میری زندگی بس یہاں آ کر ختم ہو جانی چاہیے۔ نہیں زندگی اور اس کی خوشیوں پر میرا بھی حق ہے۔“ عابد بولے اور کمرے سے چلے گئے۔

میں اندر سے لرز رہی تھی بالآخر عابد کھل کر سامنے آگئے تھے۔ انہوں نے ڈھکے چھپے انداز میں کہہ دیا تھا کہ انہیں ایک مردہ عورت کی نہیں ایک زندہ عورت کی ضرورت ہے جو زندگی کی مسافتوں میں ان کے ساتھ ساتھ چل سکے۔ میرا بس نہیں چل رہا تھا کہ میں اٹھ کر کھڑی ہو جاؤں اور عابد سے کہوں کہ میں ابھی مری نہیں ہوں۔ میرے جیتے جی آپ کی اور کے نہیں ہو سکتے۔

مگر یہ سارا تلاطم اندر ہی اندر رہا تھا اوپر سے میں راکت تھی۔ رفتہ رفتہ میرا لرز رک گیا۔ اب میں بے آواز رورہی تھی۔ مجھے رہ رہ کر یہ خیال آ رہا تھا کہ عابد ایسا کیوں کر

ہیستے جہاں تک میں نے انہیں جانا تھا یہ ان کی فطرت نہیں تھی۔ پھر وہ ایسا کیوں کر رہے تھے۔ عابد رات کو ہی راس کو لینے رخسانہ کے گھر چلے گئے تھے لیکن اس نے آنے سے انکار کر دیا تھا۔ عابد واپس آئے تو انہوں نے میرے کمرے میں آکر مجھے یہ سب بتایا پھر بہت زہریلے لہجے میں بولے۔ ”وہ رورخوار سمجھتے ہیں کہ میرے باپ بن کر میری زندگی کے فیصلے کریں گے لیکن میں تمہیں اور اسے بتا دوں گا کہ میں اپنے فیصلے خود کرتا ہوں چاہے کوئی اس سے متفق ہو یا نہ ہو اور میں نے فیصلہ کر لیا ہے۔ میں سحر سے شادی کرنے جا رہا ہوں اور یہ شادی بہت جلد ہوگی۔“

یہ کہہ کر عابد دندناتے ہوئے اپنے کمرے میں چلے گئے اور درمیان کار دروازہ بہت زور سے بند کر دیا تھا۔ میں اوپر سے تو سانسکتی تھی ہی عابد کی بات سن کر میں اندر سے بھی سانسکت ہو گئی، مجھے گویا جیسے اب میں سچ سچ مردہ ہو گئی ہوں۔ ایک ایسا مردہ جسے ذہن نہ کیا کیا ہو۔ شاید میں مر گئی تھی لیکن ڈاکٹر مجھے زندہ سمجھ رہے تھے۔ کاش انہوں نے مردہ ہی سمجھا ہوتا اور عابد نے محبت کے ساتھ مجھے دفن دیا ہوتا تو آج رات مجھے یہ عذاب نہ بھگتنا پڑتا۔ اس ساری رات میں پل پل جیتی اور پل پل مرتی رہی۔ مجھے لگ رہا تھا کہ میں مرنے نہیں دیکھ سکوں گی اس لیے جب صبح کی روشنی پھیلی تو مجھے تعجب ہوا تھا کہ میں زندہ تھی۔ بچے اٹھ گئے تھے اور اسکول جانے کے لیے تیار ہو کر میرے پاس آئے۔ ان کے چہرے اترے ہوئے تھے۔ ایلا ابھی سو رہی تھی اور عابد کے کمرے میں خاموشی تھی۔

آٹھ بجے سحر کمرے میں داخل ہوئی تو میرا دل جابا کہ میں زبان سے اسے کچھ کہہ نہیں سکتی تو کم سے کم اپنی آنکھیں ہی بند کر لوں۔ مگر میں چاہنے کے باوجود ایسا نہیں کر سکتی تھی۔ مجھے اس کی صورت سے نفرت ہو رہی تھی۔ اس نے آکر مشینی انداز میں اپنی ڈیوٹی شروع کی۔ اس کے تاثرات سے بھی لگ رہا تھا کہ وہ مجبوراً یہ کام کر رہی ہے اگر اس کے بس میں ہوتا تو انکار کر دیتی۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ میری آنکھوں میں دیکھنے سے گریز کر رہی تھی۔ شاید اسے بھی میری نگاہوں میں اپنے لیے نفرت نظر آ رہی تھی۔ اپنا کام کر کے وہ کرسی پر بیٹھ گئی اس کے چہرے پر کشیدگی صاف جھلک رہی تھی۔ شاید عابد نے اسے تازہ ترین حالات سے خبردار کر دیا تھا۔ کچھ دیر بعد عابد کمرے میں آئے وہ سحر سے

بھی زیادہ مضطرب لگ رہے تھے۔ انہوں نے میری طرف دیکھا اور بولے۔

”لگا رہی نہیں جانتا کہ تم ہوش میں ہو یا نہیں اور میری باتیں سن رہی ہو یا نہیں.... اس کے باوجود میں تمہیں بتا دینا چاہتا ہوں کہ میں اور سحر آج کچھ دیر بعد نکاح کر رہے ہیں۔ اس نکاح کے بعد سحر اپنے گھر میں رہے گی اور کچھ عرصے بعد میں اسے دوسرا مکان لے دوں گا۔ یہ بھلا تمہارا اور بچوں کا رہے گا۔ سحر کا تم لوگوں سے کوئی تعلق نہیں ہو گا۔ اس کا صرف مجھ سے تعلق ہو گا۔“

عابد کہہ کر چلے گئے انہوں نے سحر سے کوئی بات نہیں کی تھی اور نہ سحر نے کوئی بات کی تھی۔ انہیں بات کرنے کی ضرورت بھی نہیں تھی وہ دونوں میں سب کچھ طے کر چکے تھے۔ رات سے اب تک مجھے لگ رہا تھا جیسے میں جیج مرغی ہوں۔ لیکن عابد کی اس بات نے مجھے ہنجوڑ کر رکھ دیا تھا۔ وہ میرے سامنے اور میرے ہی گھر میں مجھ پر سوتن لانے کا اعلان کر رہے تھے۔ مجھے لگ رہا تھا جیسے میرے اندر کوئی آتش فشاں رفتہ رفتہ بیدار ہو رہا ہے۔ یہ آتش فشاں ہر اس عورت کے اندر ابھرتا ہے جس کا شوہر اس کے ہوتے ہوئے اس پر سوتن لانا چاہتا ہو اور وہ اس آتش فشاں کے لاوے میں سب کچھ جلا دینا چاہتی ہے۔ چاہے وہ اس کا گھر کیوں نہ ہو۔ مگر دوسری عورتوں کے مقابلے میں میں بے بس تھی۔ بستر پر پڑی تھی اور اپنی مرضی سے جنس بھی نہیں کر سکتی تھی۔

سحر سامنے بیٹھی مجھ سے آنکھیں چرا رہی تھی۔ میں اپنے گھر والوں کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ وہ پہلے ہی میرے لیے پریشان تھے۔ امی ابو تو گزر چکے تھے لیکن میرے بہن بھائی تھے۔ انہیں معلوم نہیں تھا کہ عابد کیلئے کرنے جارہے تھے ورنہ وہ انہیں روکنے کی کوشش ضرور کرتے۔ مگر جو شخص اپنے بیٹے کے کہنے پر باز نہیں آیا تھا اور اسے پروا نہیں تھی کہ جس بیٹے کی خاطر اس نے دوسری شادی کی تھی اب وہ اسے چھوڑ کر چلا گیا ہے، وہ میرے بہن بھائیوں کو کیوں خاطر میں لاتا؟ اس کی آنکھوں پر تو سحر کے حسن کی پٹی بندھ گئی تھی۔ میں نے دل و جان کی نفرت کے ساتھ اسے دیکھا۔ وہ عابد کو مجھ سے چھین لیتا چاہتی تھی۔ میرے اندر کسی نے سرگوشی کی۔ ”میں ایسا ہونے نہیں دوں گی۔“

لیکن میں انہیں روک بھی نہیں سکتی تھی۔ رامس گھر میں نہیں تھا۔ ملازمہ کا کوئی اختیار نہیں تھا۔ میرے گھر والے

بلکہ عابد کے گھر والے بھی شاید اس فیصلے سے بے خبر تھے۔ انہیں کیوں روکتا؟ حالات عابد اور سحر کے لیے پوری طرح سازگار تھے۔ اب کچھ دیر کی بات تھی ان کا نکاح ہو جاتا اور اس کے بعد کوئی چاہتا بھی تو کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ اس کے باوجود میرے اندر گونجنے والی سرگوشی مسلسل کہہ رہی تھی۔ ”میں ایسا ہونے نہیں دوں گی۔“

سحر اب مضطرب تھی کیونکہ وقت قریب آ رہا تھا اور یہ اس کی زندگی کا سب سے اہم فیصلہ تھا۔ وہ اپنی ٹینشن میں تھی کہ اس نے معمول کے کام بھی نہیں کیے اور نہ میری جسمانی یوزیشن پہنچ کی۔ ایک طرح سے یہ اچھا بھی ہوا کیونکہ میرا دل نہیں چاہ رہا تھا کہ وہ مجھے ہاتھ لگائے۔ مجھے اس خیال سے ہی نفرت ہو رہی تھی۔ شکر ہے اس نے ڈرپ لگنے کے بعد دوبارہ مجھے ہاتھ نہیں لگایا تھا۔ فزولوجی پر اپنی کڑائی والی دس بجے آئی تھی۔ نوبے عابد آئے اور انہوں نے سحر کو کمرے سے باہر بلایا۔ وہ اپنے طور پر سرگوشی میں بات کر رہے تھے لیکن مجھے صاف سنائی دے رہا تھا۔ ”تم تیار رہنا کچھ دیر میں مولانا صاحب آ جائیں گے کچھ غذائی کارروائی مکمل کر کے تمہیں بلائیں گے۔“

”ٹھیک ہے۔“ سحر نے جواب دیا۔ ”لیکن عابد مجھے ڈر لگ رہا ہے۔“

”فکرمات کرو سب ٹھیک ہو جائے گا۔“ عابد نے اسے تسلی دی اور چلے گئے۔ سحر واپس آ کر دوبارہ کرسی پر بیٹھ گئی۔ وہ پہلے سے زیادہ پریشان تھی اور اپنی انگلیاں مردہ رہی تھی۔ میرا بس نہیں چل رہا تھا کہ اس کا کلام مردہ ڈول۔ میرے اندر لگی آگ لمحہ بہ لمحہ بڑھ رہی تھی اور ایسا لگ رہا تھا جیسے آتش فشاں پھٹ جائے گا۔ میں ریزہ ریزہ ہو جاؤں گی۔ آگ کسی کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی تھی لیکن مجھے ضرور مار ڈالے گی۔ اچانک مجھے محسوس ہوا کہ میری آنکھوں پر دباؤ آ رہا ہے۔ کوئی چیز آنکھوں سے باہر آنے کے لیے بے تاب تھی پھر ہی کا ایک قطرہ گوشے سے نکلا اور میرے رخسار پر بہنے لگا۔ چوٹ لگنے کے بعد یہ پہلی حرکت تھی جو میرے ارادے سے ہوئی تھی۔ سحر نہیں دیکھ رہی تھی اور اب میرے آنسوؤں سے بہہ رہے تھے۔ اسی لمحے دروازے پر آہٹ ہوئی اور ملازمہ نے دروازہ کھول کر سحر سے کہا۔

”بی بی آپ کو صاحب جی بلارہے ہیں۔“ سحر تیزی سے کھڑی ہوئی اور اس بار بھی اس نے میری طرف دیکھنے کی زحمت نہیں کی تھی۔ ورنہ اسے بتا چلتا

جاتا کہ میری آنکھیں انگبار ہیں۔ شاید میرے بس میں یہی آتو تھے جو میں اپنی ہونے والی برادری پر بہا سکتی تھی۔ سحر باہر نکل گئی۔ مولانا آچکے تھے اور یقیناً عابد اور سحر کے نکاح کی کارروائی ہونے والی تھی۔ سحر کو ایجاب و قبول کے لیے بلایا گیا تھا۔ میرا غصہ پھٹ پڑنے کو بے تاب تھا۔ آنسوؤں نے پانی کا نہیں پیڑول کا کام کیا تھا۔ میرا ذہن پھر اسی جیلے کی تکرار کرنے لگا۔

”میں ایسا ہونے نہیں دوں گی۔“ میری چشم تصور مجھے دکھا رہی تھی کہ نشست گاہ میں عابد اور سحر قاضی اور گواہوں کے ساتھ موجود ہیں۔ نکاح پڑھایا جا رہا ہے۔ عابد اور سحر نکاح نامے پر دستخط کر رہے ہیں اور پھر قاضی ایجاب و قبول کے لیے کہہ رہا ہے۔ مجھے لگا جیسے میرے اندر ایک دھماکا ہوا ہو اور میں بے ساختہ اٹھ بیٹھی۔ آواز اب جیسے طوفان کا شور بن گئی تھی۔ میں نے زور سے کہا۔ ”میں ایسا ہونے نہیں دوں گی۔“

مارے جوش و جذبات کے مجھے احساس ہی نہیں تھا کہ میرا مفلوج جسم حرکت کرنے لگا ہے۔ میں نے ڈرپ اور اس کے ساتھ کیوں لا بھی اتار پیچکا اور بستر سے اتر آئی۔ ایک لمحے کو لڑکھرائی ممکن ہے میں عام حالات میں اس طرح ٹھیک ہوتی تو شاید اٹھ کر بیٹھ بھی نہیں پاتی کیونکہ ڈیڑھ مہینے سے میرا جسم سکت رہا تھا۔ مسٹر بے جان تھے اور جسم فوری حرکت کرنے کے قابل نہیں تھا لیکن میرے اندر لگی آگ نے مجھے آتش فشاں بنا دیا تھا اور میں پھٹ پڑنے کے لیے بے تاب تھی۔ ایک بار لڑکھڑانے کے بعد میرے پاؤں مضبوطی سے زمین پر جم گئے اور میں قدم قدم کر کے دروازے کی طرف بڑھی۔ دیوار کا سہارا لے کر میں کمرے سے باہر آئی اور دیوار کے سہارے ہی نشست گاہ کی طرف بڑھنے لگی۔ جیسے جیسے میں آگے بڑھ رہی تھی میرا جوش و غصہ بھی بڑھتا جا رہا تھا۔ مگر جب نشست گاہ کے پاس پہنچی تو غلاف توقع مجھے وہاں خاموشی کی تھی۔ اگر وہاں پانچ چھ افراد اتنے قوتی خاموشی کیوں تھی؟ اس سے پہلے میں نشست گاہ میں داخل ہوتی عابد کی آواز آئی۔

”اب مجھ سے برداشت نہیں ہو رہا ہے۔“ ”پڑیں عابد صاحب۔“ سحر نے کہا۔ ”آپ کو برداشت کرنا ہوگا۔“ ”تم نہیں جانتیں.... لگی میرے لیے کیا ہے۔ وہ میرے لیے کیسے جذبات رکھتی ہے۔ وہ مر جائے گی۔“

”اس کے برعکس مجھے یقین ہے انہیں کچھ نہیں ہوگا۔“ گویا عابد کو اب بھی میرا خیال تھا اور سحر اپنی سوچ کا مظاہرہ کر رہی تھی۔ خوش ہونے کے باوجود میرا دل ڈوبنے لگا تھا۔ صرف ان دونوں کی موجودگی کا مطلب تھا کہ نکاح کی کارروائی مکمل ہو چکی تھی اور باقی لوگ جا چکے تھے۔ عابد نے پھر کہا۔ ”نہیں بس بہت ہو گیا.... میں گئی کو اس سے زیادہ تکلیف نہیں دے سکتا۔ مجھے یقین ہے وہ سب سمجھ اور سن رہی ہے۔ وہ پہلے ہی معذوری کی اذیت برداشت کر رہی ہے۔“

”عابد صاحب، یہ ان کی بہتری کے لیے ہے۔“ سحر نے پھر کہا تو میں نے اس کے لہجے پر غور کیا شادی کے بعد بیوی شوہر کو صاحب نہیں کہتی ہے اور نہ ہی اس لہجے میں بات کرتی ہے وہ تو میرے سامنے عابد سے اتنے شوخ انداز میں بات کرتی تھی اور یہاں اس کا لہجہ نارمل تھا۔ جیسے وہ اپنے سے بڑے رتے کے شخص سے بات کر رہی ہو۔ عابد بولے۔

”دیکھو یہ ڈراما دس دن سے جاری ہے۔ اگر لگی پر اس کا اثر ہونا ہوتا تو ہوجا سکتا۔“

”آپ بھول رہے ہیں ڈاکٹر نے کہا تھا کہ کوئی بڑا شاک ہی ان کو دوبارہ سے متحرک کر سکتا ہے۔ ان کے لیے اس سے بڑا شاک کیا ہوگا کہ آپ ان کے سامنے دوسری شادی کر رہے ہیں۔“

”یعنی میں انتظار کروں۔“ ”میرا مشورہ یہی ہے۔ آپ نے خود پرا تاجر کیا ہے، میں نے دل پر پتھر رکھ کر اداکاری کی ہے تو اس کا کوئی نتیجہ تو نکلنے دیں جلد باز ہی نہ کریں کیونکہ صبر کرنے سے کوئی نقصان نہیں ہوگا۔“ بات اچانک ہی ہلٹ گئی تھی۔ تو کیا عابد اور سحر ڈراما کر رہے تھے تاکہ مجھے شاک دے کر ٹھیک کیا جاسکے۔ میرا رک جانے والا دل پھر سے دھڑکنے لگا اور مجھے ٹھیک ہونے سے زیادہ خوشی اس بات کی ہوئی تھی کہ وہ سب ڈراما تھا۔ عابد نے سحر سے شادی نہیں کی تھی۔ وہ بدستور میرے تھے۔ اس خوشی نے میرا جوش اور غصہ ختم کر دیا اور جب یہ ختم ہوئے تو میری کمزوری حاوی آگئی اور میں گرنے لگی تو نشست گاہ کے دروازے پر حائل پردہ تھام لیا۔ پردہ ہلا تو عابد نے دیکھ لیا۔ وہ زور سے بولے۔ ”لگی....! اور بھپٹ کر آگے آئے انہوں نے مجھے سنبھال لیا۔ ”لگی تم خود آئی ہو یہاں؟“

عورت ایک پہلی

مکرمی جناب!

سلام مسنون!

کسی نے سچ کہا ہے کہ ”عورت ایک پہلی ہے“ اس بات کو خود میں نے بھی پور پور محسوس کیا، کہا جاتا ہے کہ عورت کو سمجھنا بہت مشکل ہے۔ میں نے بھی دو عورتوں کو سمجھنے کی کوشش کی۔ پہلی عورت وہ جسے میں نے اپنا سمجھا مگر اس نے میرا سہارا لے کر اپنی زندگی سنواری، دوسری عورت وہ جو مجھے اپنی جاگیر سمجھ رہی ہے۔ امید ہے میری آپ بیتی آپ کو پسند آئے گی۔

عمران

(لاہور)



اکیلا نہیں چھوڑتی تھی۔ اسے یہ گوارا بھی نہیں تھا کہ میں کسی جان بچان کی عورت سے بات کروں۔ میرے دفتر میں کوئی عورت کام نہیں کرتی تھی کیونکہ ناز یہ سے شادی کے بعد مجھے اس کی فرمائش پر تمام ٹیلی اسٹاف کو فارغ کرنا پڑا تھا۔ اسی

نازیہ مجھ سے جنون کی حد تک محبت کرتی تھی۔ میرے قریب کسی عورت کا گزر بھی برداشت نہیں کرتی تھی۔ ایسی تقریبات میں جہاں مں گید رنگ ہوتی وہ مستقل میرے ساتھ چپکی رہتی تھی اور ایک لمحے کے لیے بھی مجھے

سحر نے میری طرف دیکھا اور عجیب انداز میں ہنسی۔ ”اس کی ضرورت نہیں ہے اب آپ کی سز ٹھیک ہوئی ہیں۔“

”نہیں تم ہمارے ساتھ جاؤ گی۔“ میں نے کہا تو وہ رک گئی۔ عابد مجھے ہسپتال لے گئے اور مجھے وہاں چھوڑ کر کچھوڑنے چلے گئے۔ ڈاکٹر نے میرا معائنہ کیا اور مجھے مکمل طور پر صحت یاب قرار دیا۔ وہ حیران تھے کہ ایسا کون سا شاک تھا جس نے مجھے بالکل ٹھیک کر دیا کیونکہ اس قسم کے مریض بہت سست روی سے ٹھیک ہوتے ہیں۔ راستے میں عابد نے مجھے بتا دیا تھا کہ راس اصل میں کان گیا تھا اور وہ بھی اس ڈرامے میں شامل تھا۔ میں بچوں سے ملنے کے لیے بے تاب تھی۔ عابد فون کر کے سب کو میرے بارے میں بتا رہے تھے۔ مختلف ٹیٹ اور قہر ایپوں سے گزار کر ڈاکٹر نے مجھے شام کو گھر جانے کی اجازت دی تھی۔ عابد سحر کو چھوڑ کر آئے تو انہوں نے اس کے بارے میں بات نہیں کی تھی جب کہ میں ان سے سحر کے بارے میں بات کرنے کے لیے بے چین تھی۔

میں گھر پہنچی تو بچوں کے ساتھ میرے بہن بھائی اور دوسرے رشتے دار بھی وہاں موجود تھے۔ راس مجھ سے لپٹ گیا اور کان میں کہا۔ ”سوری ماما۔“ میں نے اسے پیار کیا۔ ”تمہیں تو میں بعد میں بتاؤں گی۔“

لوگوں سے نشتے ہوئے رات ہو گئی تھی۔ سچے مجھے چھوڑنے کو تیار نہیں تھے۔ عابد نے یہ مشکل انہیں ڈانٹ ڈپٹ کر سونے کے لیے بھیجا تھا۔ جیسے ہی عابد مجھے اکیلے میں ملے میں نے ان سے سحر کے بارے میں بات کی۔

”عابد وہ تیار کیسے ہوئی؟“

”میں نہیں جانتا... ڈاکٹر نے مجھے پہلے ہی بتا دیا تھا کہ کوئی شاک تمہیں ٹھیک کر سکتا ہے لیکن یہ خیال سحر کے ذہن میں آیا اور اسی نے مجھے قائل کیا۔ وہ بہت ذہین ہے اس نے سارا ڈراما اس طرح ترتیب دیا کہ تمہیں بالکل حقیقت لگے۔ پھر وہی مجھے مجبور کرتی رہی ورنہ میرا ارادہ ڈالواں ڈول ہو رہا تھا۔ میں جانتا تھا تمہارا لیے یہ سب کتنا اذیت ناک ہوگا۔“

میں نے گہری سانس لی۔ ”لیکن جی اذیت مجھے ہوش میں لے آئی۔ اس کے لیے میں سحر کی شکر گزار ہوں۔“

سحر

ان کی باتوں میں آ کر مجھے یوں لگا جیسے میں پھر سے جی اٹھی ہوں۔ عابد نے مجھے احتیاط سے صوفے پر لٹا دیا اور سحر سے کہا۔ ”ڈاکٹر کو کال کرو۔“

سحر ڈاکٹر کو کال کرنے لگی۔ عابد کی آنکھوں میں آنسو تھے اور میرے آنسو ترک ہی نہیں رہے تھے۔ سحر نشت گاہ سے نکل گئی تھی۔ عابد مجھ سے سواری کر رہے تھے۔ میں نے ان کا ہاتھ تھاما۔ ”سوری تو مجھے کرنا چاہیے جو میں نے آپ کی محبت پر شک کیا۔“

”نہیں تم نے بہت تکلیف سہی.... یقین کرو میں تمہارے پاس نہیں آتا تھا کہ تم سے نظریں نہیں ملا سکتا تھا۔“

سحر اندر آئی۔ ”میں نے ڈاکٹر کو کال کر دی ہے اور پلیر نہیں بستر پر لے چلیں۔“ وہ پروفیشنل بن گئی تھی۔ ”ابھی ان کی کنڈیشن ٹھیک نہیں ہے۔“

عابد مجھے اٹھا کر میرے کمرے میں لے آئے اور بیڈ پر لٹا دیا۔ سحر مجھ سے کہہ کر جسم کے مختلف حصوں کو حرکت دلوانے لگی۔ اس دوران میں ڈاکٹر آ گیا تھا۔ اس نے میرا معائنہ کیا۔ میں سحر سے نظر نہیں ملا رہی تھی میں نے اس کے بارے میں کیا سوچا تھا اور وہ کیا لگتی تھی۔ کسی لڑکی کے لیے یہ بہت بڑی بات تھی کوئی اپنی ذات کے ساتھ اس قسم کا ڈراما برداشت نہیں کرتی ہے۔ ڈاکٹر مطمئن ہو کر عابد کے ساتھ کمرے سے باہر چلا گیا تو میں نے سحر کا ہاتھ تھام کر کہا۔ ”مجھے تم سے بھی سواری کرنی ہے۔“

”ارے نہیں۔“ وہ زبردستی ہنسی۔ ”اس کی ضرورت نہیں ہے۔“

”نہیں تم نے میرے لیے بہت کیا ہے۔ کوئی عورت اپنے ساتھ یہ سب کچھ نہیں کر سکتی جو تم نے میرے لیے کیا ہے۔“

”میں نے کسی کے لیے کچھ نہیں کیا ہے۔“ اس نے آہستگی سے کہا اور دوسری طرف مڑ گئی لیکن میں نے دیکھ لیا تھا اس کی آنکھوں میں آنسو لرز رہے تھے۔ اس نے آنسو صاف کیے اور جب عابد آئے تو اس نے کہا۔ ”عابد صاحب اب میری ضرورت نہیں رہی ہے۔“

”اللہ کا شکر ہے گی ٹھیک ہو گئی ہے۔“ عابد بہت خوش تھے۔ ”میں اور گی تمہارا یہ احسان کبھی نہیں بھولیں گے۔“

”آپ انہیں فوری ہسپتال لے جائیں۔“ سحر نے کہا اور اپنا پرس اٹھا کر جانے کے لیے تیار ہو گئی۔

”رکویں تمہیں چھوڑ دوں گا۔“

طرح میرا جن خواتین سے ملنا چلتا تھا اور صرف دوست کے زمرے میں آتی تھیں ان سے بھی قطع تعلق کرنا پڑا۔ نازیہ نے شادی کی پہلی رات وارننگ دے دی تھی کہ وہ سب برداشت کر سکتی ہے لیکن میرے آس پاس دوسری عورت کا سایہ بھی برداشت نہیں کر سکتی۔ ہماری محبت کی شادی تھی۔ لیکن محبت میں پہل نازیہ نے کی تھی۔ اس نے اعتراف کیا کہ پہلی ملاقات میں وہ سب کچھ میرے نام کر چکی تھی۔

نازیہ کا تعلق فیصل آباد کے ایک بہت بڑے کاروباری خاندان سے ہے۔ وہ ارب پتی نہیں بلکہ کھرب پتی ہیں۔ کاروباری تو ہم بھی ہیں۔ میرے والد نے تیس سال پہلے ایک ٹیکسٹائل یونٹ لگایا تھا جسے محنت کر کے آج ٹیکسٹائل مل میں بدل دیا ہے۔ کیونکہ میں ایک ہی بیٹا ہوں اس لیے بڑس میرا ہے۔ مگر ہم نازیہ کے خاندان جتنے دولت مند نہیں ہیں۔ اگر نازیہ اپنے والدین کی مرضی کے سامنے سر جھکا کر تو اس کی شادی کسی ہم پلہ خاندان میں کی جاتی۔ اس کے والدین اور گھر والے اس رشتے پر راضی نہیں تھے لیکن نازیہ کی ضد کے آگے مجبور ہو گئے تھے۔ یوں ہماری شادی ہوئی۔ نازیہ خوب صورتی میں بلاشرا لاکھوں میں ایک ہے۔ کوئی مرد اس جیسی عورت یا کرنا خوش ہو ہی نہیں سکتا۔۔۔ پھر وہ فطرت اور عادات کی بھی اچھی ہے اس لیے شادی کے دو سال گزرنے کے بعد بھی ہمارے درمیان کبھی کوئی خبیثہ لڑائی یا تنازعہ نہیں ہوا تھا۔

شادی کے بعد وہ یوں ہمارے گھر میں رچ بس گئی جیسے ہمیشہ سے نہیں رہتی آئی ہو۔ اس نے یہاں کے رواج اپنالے اور بھول گئی کہ اس کا تعلق کہاں سے تھا۔ اپنے میکے میں وہ بل کر پانی بھی نہیں پیتی تھی۔ لیکن اس کے باوجود اس نے اپنی ذمے داریاں اتنے اچھے انداز سے نبھائیں کہ ہر طرف اس کی داد وادہ ہونے لگی۔ وہ بیوی میری ہے لیکن مجھ سے زیادہ امی ایو اس پر فریفتہ ہیں۔ ان کی زبان پر نازیہ کا نام ہی رہتا ہے۔ گھر میں کئی ملازم ہیں لیکن میرے سارے کام وہ خود کرتی ہے۔ میں منگ کر دن بھر بھی وہ نہیں مانتی ہے۔ ایک بار اس نے کہا۔ ”عمران آپ نہیں جانتے کہ آپ کے کام کر کے مجھے کتنی خوشی ملتی ہے اور یہ کون سے بہت بڑے کام ہیں۔ سب بیویاں اپنے شوہروں کے کام کرتی ہیں۔“

مجھے بھی اچھا لگتا ہے لیکن میں تمہیں یوں کام کرتے

نہیں دیکھ سکتا۔“

”تو آنکھیں بند کر لیا کریں۔“ وہ ہنس کر کہی۔ البتہ یہی نازیہ جب باہر نکلتی جاتی تو اس کی آنکھیں پوری طرح کھل جاتی تھیں اور وہ مجھ پر یوں نظر کرتی تھی جیسے میں اس کا پاتو جاؤں ہوں اور موقع ملنے ہی رسی تڑاؤں کر ڈال رہا ہوں۔ شاپنگ پر وہ میرے ساتھ ساتھ ہوتی۔ اگر میرے قریب سے کوئی دوسری عورت گزرتی تو وہ جان بوجھ کر اس کے اور میرے درمیان آ جاتی، چاہے اسے کتنی ہی زحمت کیوں نہ کرنی پڑے۔ شاپنگ سینٹر میں بھی کوئی سیلر گرل ہوتی تو نازیہ خود اس سے بات کرتی چاہے جتنے کیوں نہ لگتی ہوتی۔ یہی رویہ اس کا تقریبات اور پارٹیوں میں ہوتا تھا۔ دفتر کا حال میں پہلے ہی بتا چکا ہوں۔ وہاں اب کے زمانے سے ایک خاتون کام کرتی تھیں جنہیں میں عزت سے آنٹی کہتا تھا لیکن نازیہ کی وجہ سے مجھے ان کو بھی نوکری سے جواب دینا پڑا۔ جس کا مجھے بہت افسوس تھا۔ البتہ میں نے یہ کیا تھا کہ ان خاتون کو جاننے والوں کے پاس جاب دلا دی تھی۔

خاندان کی خواتین، جیسے کزنز اور کزنز کی بیویوں کو نازیہ بادل بنا خواستہ برداشت کرتی تھی۔ بلکہ ان سے میرے ہٹنے بولنے پر نظر رکھتی تھی۔ اگر میں کسی سے ذرا بے تکلف ہو کر بات کروں تو اس کا منہ پھول جاتا تھا۔ وہ کبھی کچھ نہیں تھی لیکن اپنے رویے سے ظاہر کر دیتی کہ اسے میری یہ بات پسند نہیں آتی ہے۔ حالانکہ میں ان خواتین کو صرف رشتے دار کی حیثیت دیتا ہوں۔ وہ میری بہنیں اور بھابی ہیں۔ نازیہ بھی یہ بات سمجھتی ہے۔ اسے میرے کردار پر تنقید نہیں ہے۔ یہ اسی کا کہنا ہے۔ ”میں جانتی ہوں آپ کردار کے اچھے آدمی ہیں۔ جس دن مجھے آپ کے کردار پر تنقید ہو اس دن میں آپ کی زندگی میں نہیں رہوں گی۔“

یہ رویہ تو جتنی جاگتی خواتین کے لیے تھا۔ اگر میں کوئی میگزین یا اخبار دیکھتا تو نازیہ کو فکر لگ جاتی کہ میں کبھی اس میں موجود عورتوں کی تصویر تو نہیں دیکھ رہا ہوں۔ بیوی دیکھتے ہوئے اگر میں اس کے ساتھ ہوتا تو کوئی خوب صورت عورت اسکرین پر آتی تو وہ جلدی سے چینل بدل دیتی تھی۔ میں صرف اسپورٹس یا انجمن پلانٹ اور ڈسکو جیسے چینل سکون سے دیکھ سکتا تھا۔ حد یہ کہ خبروں کے چینل پر بھی نازیہ کو اعتراض تھا اس کا کہنا تھا کہ آج کل کی ویڈیوز نے ناظرین کی دلچسپی حاصل کرنے کے لیے طرہ دار

کی نڈکا سٹر رکھ لی ہیں جو ڈریسنگ بھی ایسی کرتی ہیں جن سے مردوں کی توجہ حاصل کی جاسکے۔ شروع میں مجھے اس کے رویے سے الجھن ہوتی تھی لیکن رفتہ رفتہ میں عادی ہوتا چلا گیا کیونکہ میرے دل میں کوئی کھوٹ نہیں تھی اور نہ میں اپنے کسی علاوہ کسی عورت یا لڑکی میں دلچسپی لیتا تھا۔ بلکہ ابھی مجھے یہی آ جاتی تھی۔

مجھے جس دل چسپی لینے والیوں کی کی نہیں تھی۔ کیونکہ مجھے نازیہ لاکھوں میں ایک، اسی طرح میں لاکھوں نہیں تو ہزاروں میں الگ سے نظر آتا ہوں۔ کسی قدر دراز قد، سر کی جسم، سرخ و سفید رنگت اور اچھے نقوش کی وجہ سے صنف نازک شروع سے مجھے جس دل چسپی ملتی آتی ہے۔ جن دنوں میں کالج میں تھا تو میرے حلقہ احباب میں کئی لڑکیاں بھی شامل تھیں۔ لیکن ان سے تعلق ایک حد میں تھا۔ یہ پرانی بات ہے۔ اب میں اس کا سوچ بھی نہیں سکتا ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ میں نے کسی عورت یا لڑکی میں ذرا بھی دل چسپی لی تو نازیہ مجھے نہیں چھوڑے گی۔ وہ تو اتنی جونی ہے کہ اس بات پر کسی کی جان لے سکتی ہے اور اپنی جان دے بھی سکتی ہے۔ یہ بات وہ خواتین بھی جانتی ہیں جو مجھ میں دل چسپی لیتی ہیں اس لیے وہ نازیہ کے سامنے مجھے نظر انداز کرتی ہیں اور جب نازیہ میرے ساتھ نہیں ہوتی تو میری توجہ حاصل کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔ یہ بات نازیہ کو پتا نہیں ہے۔ اگر اسے معلوم ہو جائے تو وہ اسی بات پر اپنا کتا خون جلا لے۔

یہ تین مہینے پہلے کی بات ہے۔ میں اور نازیہ فیصل آباد کے ایک بڑے صنعت کار کی کوٹھی میں ہونے والی پارٹی میں ٹریک تھے۔ یہ ویسی ہی پارٹی تھی جیسی کہ بڑے لوگوں کی ہوتی ہے۔ روشنیاں، رنگ و خوشبو کے ساتھ کھانے اور پینے کے ساتھ پینے پلانے کا انتظام بھی تھا۔ میں کیونکہ اس علت سے دور ہوں اس لیے فی الحال اپنے حلقہ احباب سے بھی دور تھا۔ وہ سب پینے والے کمرے میں جمع تھے اور مجھے ٹراب کی بو سے الرجک ہے۔ اس لیے میں ہال میں تھا۔ اتفاق سے نازیہ کچھ دور اپنی جاننے والیوں میں اس طرح گھر گئی تھی کہ چاہنے کے باوجود میرے پاس نہیں آ سکی تھی۔ میں اس کی بے بسی پر مسکرا رہا تھا۔ ایسے لمحے ہی آتے تھے جب وہ کسی قریب میں مجھ سے دور ہو۔ میں اور نوجوانوں سے غفلت کرتے ہوئے غفلت کا رنگ دیکھ رہا تھا کہ اچانک گلاس میرے ہاتھ سے چھوٹے چھوٹے پچا۔ مجھے اپنی

آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔

وہ وہی تھی۔ میں اسے تقریباً پانچ سال بعد دیکھ رہا تھا۔ مگر نہ پہچاننے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ میں اس کے ایک ایک نقش سے واقف تھا۔ اس کے وجود کا کوئی گوشہ میرے لیے اجنبی نہیں تھا۔ پھر وہ آج بھی ویسی ہی تھی۔ یونا ساقد، شانوں پر لہراتے لائٹ براؤن ریشمی بال، سحر انگیز آنکھیں جن میں جج جج جادو سا لہراتا تھا۔ منہ لہنے والے لب و رخسار اور چھوٹے سے میلا ہو جانے والا رنگ و روپ، اور قیامتیں چھپائے وجود جس کی حشر سامانوں سے میں خوب واقف تھا۔ اس نے دھانی رنگ کی ساڑی باندھ رکھی تھی جس کے تلے کسا ہوا سرخ بلاؤز تھا۔ بلاؤز کی آخری حد کمر سے خاصی اوپر ختم ہو گئی تھی اور اس سے نیچے کا سنہری رنگ یہاں سے بھی صاف دکھائی دے رہا تھا۔ وہ مسرت سے گفتگو کر رہی تھی۔ میں نے نظر بھر کر اسے دیکھا۔ وہ جج جج آج بھی ویسی ہی تھی۔

”کے دیکھا جا رہا ہے اتنے غور سے؟“ اچانک ہی پاس سے نازیہ کی آواز ابھری تو گلاس دوسری بار میرے ہاتھ سے گرتے گرتے پچا۔

”کک... کوئی نہیں۔“ میں نے بوکھلا کر کہا۔ لیکن نازیہ نے اسے دیکھ لیا تھا۔ میری جیسے جان پر بن گئی۔ پھر نازیہ نے مسکرائی۔ ”ہاں ہے تو اس قابل کہ کوئی مرد نظر بھر کر دیکھ لے۔“

اسے مسکراتے دیکھ کر میری جان میں جان آئی تھی۔ ورنہ مجھے لگ رہا تھا کہ ابھی وہ کہے گی۔ میں جانتی ہوں آپ اسے کیوں غور سے دیکھ رہے تھے۔ میں یوں جھینپا جیسے جج جج اس کے حُسن سے متاثر ہو کر اسے دیکھ رہا تھا۔ نازیہ کو کچھ دیر بعد ایک طرف سے آواز آئی اور وہ نظروں ہی نظروں میں مجھ سے خیردار کرتی اس طرف بڑھ گئی۔ میں ایک طرف موجود مردوں کے ایک گروپ کی طرف بڑھ گیا۔ ان میں کوئی میرا قریبی شناس نہیں تھا لیکن ان میں سرفراز شاہ تھا۔ اس کی خاص بات یہ تھی کہ شہر کی کوئی ایسی حسین خاتون نہیں تھی جس کے بارے میں سرفراز نہ جانتا ہو۔ وہ خود بھی دل چاہیچشم کا شخص تھا۔ اس کی ایک لیدر پر ویسینگ فیکٹری تھی۔ اس سے علیک سلیک کے بعد میں نے سرسری سے انداز میں خواتین کا ذکر پھیر دیا اور اس کی باچیس کھل گئیں۔ یہ اس کا لینڈ یہ موضوع تھا۔ وہ زور و شور سے مختلف خواتین کے بارے میں بتانے لگا۔ میں اس کی باتوں میں پوری۔۔۔

دلچسپی لے رہا تھا اور سرسری اشاروں سے وہاں موجود خواتین کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔ پھر میں نے اس کی طرف اشارہ کیا۔ ”یاریہ دھانی ساڑی والی کون ہے؟ اسے پہلی بار دیکھا ہے کی تقریب میں۔“

سرفراز معنی خیز انداز میں مسکرایا۔ ”عمران صاحب! آپ بھی عورتوں کو دیکھتے ہیں۔“

”کیونکہ یہ خود کو دکھاتی ہیں۔“ میں نے سنجیدگی سے کہا۔ ”آپ نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا۔“

اس نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔ ”آپ مزہ ظہیر کو نہیں جانتے؟“

مجھے جھکا لگا۔ ”ظہیر اینڈ کووالے؟“

”ہاں وہی، یہ ان کی مسز ہے۔ بہت طرح دار اور آزاد خیال عورت ہے لیکن شے پر ہاتھ رکھنے نہیں دیتی ہے، اپنی مرضی سے بندھ چکی ہے۔“

مجھے سرفراز کی بات کا پورا یقین ہو گیا۔ ”لیکن ظہیر صاحب تو خاصے عمر رسیدہ ہیں۔ کم سے کم بھی ساٹھ کے ہوں گے جب کہ یہ کسی طرح پینتیس سے زیادہ کی نہیں لگتی۔“

میں نے یوں ظاہر کیا جیسے میرا اندازہ ہو جب کہ مجھے اچھی طرح معلوم تھا کہ اس کی عمر پینتیس سے زیادہ نہیں مگر دیکھنے میں وہ ستائیس اٹھائیس برس سے زیادہ کی نہیں لگتی تھی اور اتنی عمر بھی اس کے کسی قدر بھاری بدن کی وجہ سے لگتی تھی۔ ورنہ پھر سے وہ پچیس سے زیادہ کی نہیں لگتی تھی۔

سرفراز نے بائیں آنکھ دپائی۔ ”وہ بھی شوین ہیں۔ اس سے اس وقت شادی کی گئی جب یہ کانچ گرل تھی شاید انیس برس کی بھی نہیں ہوگی۔ اب تو اس کا بڑا بیٹا اولیول میں ہے۔ اس سے چھوٹی بیٹی بھی جوان ہو رہی ہے۔“

میرا مقصد پورا ہو گیا تھا۔ اس لیے میں سرفراز سے جان چھڑا کر آگے بڑھ گیا۔ میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ مسز ظہیر الدین لنگے کی مگر ساتھ ہی اس انکشاف سے کئی سوالات سامنے آئے تھے۔ سرفراز کا کہنا تھا کہ وہ گزشتہ سولہ سال سے مسز ظہیر الدین چلی آرہی تھی۔ ظہیر اینڈ کو... کا شمار ملک کی چند بڑی الیکٹرانکس اور ایکسٹرنل کی چیزیں تیار کرنے والی فرم میں ہوتا تھا۔ اس کے براڈ نہ صرف ملک بلکہ ایک سے باہر بھی مقبول تھے۔ وہ بلاشبہ کرب پتی تھا اور وہ اس شخص کی بیوی تھی۔ میں کچھ دیر پہلے پارٹی سے لطف اندوز ہو رہا تھا مگر اب میرا موڈ بدل گیا تھا۔ میں نے جانے کا سوچا لیکن پھر خیال آیا کہ نازیہ پوچھے گی اور وہ آسانی

سے مطمئن ہونے والی نہیں تھی اس لیے میں نے فوری طور پر نہیں کہا لیکن ایک گھنٹے بعد میں نے اس سے کہا۔ ”میرا سر میں درد ہو رہا ہے کیا خیال ہے گھر چلیں؟“

”اتنی جلدی! وہ ٹھک کر بیوی۔“ اب تو اصل پارٹی شروع ہوئی ہے۔“

”ٹھیک ہے تم کہتی ہو تو کچھ دیر اور رک جاتے ہیں۔“ میں نے بد دی سے کہا۔ مجھے معلوم تھا کہ اب وہ خود نہیں رے گی اور ایسا ہی ہوا۔ چند منٹ بعد اس نے کہا۔ ”نہیں! چلتے ہیں آپ کی طبیعت کا سن کر اب میرا دل بھی نہیں لگ رہا ہے۔“

ہم واپس آئے تو امی ابوسو چکے تھے۔ جب سے ابو نے بزنس میرے سپرد کیا تھا وہ آرام کے عادی ہو گئے تھے اور اب رات کو بھی دس بجے تک سو جاتے تھے جب کہ کچھ عرصے پہلے جب وہ برس دیکھ رہے تھے تو اکثر دس بجے تو دفتر سے آتے تھے۔ امی صبح لازمی فجر کے لیے اٹھتی تھیں اس لیے وہ شروع سے جلد سونے کی عادی تھیں۔ ہم اپنے کمرے میں آئے۔ میں نے کوٹ ایک طرف ڈالا اور نائی کی گرہ کھولنے لگا۔ نازیہ ڈرائنگ کے سامنے بیٹھی میک اپ صاف کر رہی تھی۔ اس نے اچانک کہا۔ ”وہ دھانی ساڑی والی عورت کون تھی جسے آپ فور سے دیکھ رہے تھے؟“

میں چونکا پھر پھیکے انداز میں مسکرایا۔ ”لگتا ہے وہ اب تک تمہارے سر پر سوار ہے بس ایک دو لمبے کے لیے دیکھا تھا اور مجھے کیا معلوم کہ وہ کون ہے۔“

”اچھا! اس نے گھوم کر میری طرف دیکھا نہ جانے مجھے کیوں لگا جیسے آپ اسے اچھی طرح جانتے ہوں۔“

”وہم ہے تمہارا۔“ میں کہتے ہوئے ہاتھ دم کی طرف بڑھ گیا۔ درحقیقت میں نازیہ سے چہرہ چھپاتا چھپاتا تھا ورنہ وہ شاید تاثرات سے بھانپ جاتی کہ وال میں کچھ کالا ہے۔ میں شاور لے کر آیا تو خاصی حد تک پرسکون تھا۔ لائٹ بجھا کر لینا تو نازیہ نے میرے بازو پر سر رکھ دیا۔ ”آپ کو برا لگا؟“

”کیا؟“

”یہی کہ میں نے اس عورت کے بارے میں پوچھا؟“

میں ہنسا۔ ”نہیں! میں تمہاری عادت جانتا ہوں اس لیے برا ماننے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔“

”آپ جانتے ہیں کہ میں آپ سے کس طرح محبت کرتی ہوں۔ آپ کے ساتھ کسی دوسری عورت کا ذرا سا تعلق بھی برداشت نہیں کر سکتی، چاہے یہ تعلق بھی ماضی میں ہی رہا ہو۔“

میں نے حیرت سے کہا۔ ”ماضی کا تعلق بھی برداشت نہیں ہے۔“

”ہاں اگر ایسی کوئی بات ہے بھی تو مجھے مت بتائیے۔“ مجھ سے یہ بھی برداشت نہیں ہو گا۔ یہ میرا غرور ہے کہ آپ صرف میرے ہیں۔ میرا یہ غرور بھی مت توڑیے گا۔“

نازیہ نے کہا اور سو گئی۔

وہ اپنی بات کہہ کر پرسکون ہو گئی تھی لیکن میں جاگ رہا تھا اور بے چین تھا۔ نازیہ نے واضح کر دیا تھا کہ اگر میرا بھی ماضی میں کوئی تعلق کسی سے رہا تھا تو اسے ماضی کا حصہ ہی رہنا چاہیے تھا، حال میں اور اس کے سامنے نہیں آنا چاہیے ورنہ ہماری ازدواجی زندگی کا یقین ختم ہو جائے گا۔ مجھے نازیہ کی فطرت کا اندازہ تھا، وہ ایسا ہی کرتی۔ اس لیے میں نے فیصلہ کیا کہ اپنی جتنی کو خود تک رکھوں گا اور اس بات کو ہمیشہ کے لیے بھول جاؤں گا۔ بے شک اسے دیکھ کر مجھے شدید دھچکا لگا تھا اور یہ معاملہ بھی ایسا تھا کہ میں اسے بہت مشکل سے نظر انداز کر سکتا تھا لیکن نازیہ کی خاطر میں یہ بھی کرنے کو تیار تھا۔ وہ میری بیوی اور میری محبت تھی۔ میں کسی صورت اس سے دست بردار نہیں ہو سکتا تھا۔ اس لیے اپنے طور پر میں نے یہ معاملہ ختم کر دیا لیکن میں بھول گیا کہ ماضی اتنی آسانی سے چھپا نہیں چھوڑتا ہے۔

☆☆☆

میں دفتر میں بعض ضروری فائلیں دیکھ رہا تھا۔ جنرل فخران پر بعض احکامات چاہتا تھا۔ موبائل فون کی بیل بجی۔ میں نے دیکھا ایک اجنبی نمبر تھا اس لیے میں نے موبائل مائلڈ کر کے دوبارہ فائلوں کی طرف توجہ دی۔ بیل بج کر خاموش ہو گئی۔ پون گھنٹے بعد کام مکمل ہوا تو میں نے کافی کا کہا اور آرام کرنے لگا۔ پھر موبائل کا خیال آیا۔ میں نے نمبر دیکھا اور کال بیک کی۔ چند لمحوں بعد دوسری طرف سے کال رسید کی گئی۔ ”ہیلو۔“

”ہیلو۔“ دوسری طرف سے ایک نسوانی آواز نے جواب دیا۔

میرا دل دھڑکا تھا اور میں نے کسی قدر اضطراب سے کہا۔ ”اس نمبر سے مجھے کال کی گئی تھی میں مصروف تھا۔“

”مجھے معلوم ہے تم مصروف ہو گے۔“ وہ ہنسی تو میں نے پہچان لیا۔ اس ہنسی کو میں خوب پہچانتا تھا۔ ”اس لیے میں نے دوبارہ کال نہیں کی، مجھے معلوم تھا کہ تم فارغ ہو کر کال بیک کرو گے۔“

”تم نے کیسے جانا کہ میں کال بیک کروں گا۔“

”کیونکہ میں تمہیں بہت اچھی طرح جانتی ہوں۔“

اس نے بھول لہجے میں کہا۔ ”بہت قریب سے جانتی ہوں۔“

”تم.... نے کیوں کال کی ہے؟“ میں نے ہچکچا کر پوچھا۔

”میں نے تمہیں پارٹی میں دیکھا تھا۔ تم نے بھی مجھے دیکھا اور میرا خیال تھا کہ تم رابطہ کرو گے۔ لیکن تم نے رابطہ نہیں کیا۔“

”اس سے تم نے اندازہ لگا لیا ہو گا کہ میں نے ماضی کے اس باب کو ہمیشہ کے لیے بند کر دیا ہے۔“

”باب بند ہو جاتے ہیں لیکن کل بھی جاتے ہیں۔“

اس کا لہجہ ترغیب دے رہا تھا۔

”دیکھو سارے یا تمہارا جو بھی نام ہے۔ میں نے غلط کہا تھا میں نے اس باب کو بند نہیں کیا بلکہ اسے سرے سے اپنی زندگی کی کتاب سے پھاڑ کر نکال دیا ہے۔“

”ریکی؟“ اس کا لہجہ چیلنج دیتا ہوا تھا۔ ”کیا تم سچ سچ وہ سب بھول سکتے ہو؟“

جواب میں میں نے کال کاٹ دی۔ میں اس کی بات کا جواب نہیں دینا چاہتا تھا۔ کیونکہ میں اس سے جھوٹ نہیں بولنا چاہتا تھا۔ میں جانتا تھا وہ میرا جھوٹ پکڑ لے گی اور میں شرمندہ ہو جاؤں گا، اس سے بہتر میں نے یہی سمجھا کہ کال ہی بند کر دوں۔ میں نے موبائل رکھ کر سہم لیا۔ اس کا چیلنج میرے اندر گونج رہا تھا ”کیا تم سچ سچ وہ سب بھول سکتے ہو؟“

میں نہیں بھول سکتا تھا۔ وہ سب جو پانچ سال پہلے ہوا تھا اور جو میرے ماضی کا ایک حصہ تھا۔

☆☆☆

ابو نے مجھے دفتر میں بلایا تھا۔ ان دنوں میں ایم بی اے فائل کا امتحان دے کر فارغ ہوا تھا اور دفتر میں بیٹھ رہا تھا۔ ”جی اب آپ نے بلایا ہے؟“

ابو نے کہا۔ ”ہاں بروڈر! میں تم سے ایک خاص بات کرنا چاہتا ہوں۔“

”جی کہیے؟“

”دیکھو! اس اور بزنس منسٹ تو تم دفتر میں رہ کر سیکھ لو گے لیکن میں چاہتا ہوں کہ تم مل جھنٹ پر بھی عبور حاصل کرو۔ اس کے بغیر ہم یہ بزنس آگے نہیں بڑھا سکتے ہیں، اگر تمہارے ساتھ کوئی اور ہوتا تو کام یا بٹا جاسکتا تھا لیکن اب سب تمہیں اکیلے دیکھنا ہے اس لیے تمہیں ہر شے کے بارے میں کچھ نہ کچھ پتا ہونا چاہیے۔“

”آپ چاہتے ہیں کہ میں مل میں بیٹھوں؟“

ابو نے نفی میں سر ہلایا۔ ”ہماری مل اتنی بڑی اور اتنی جدید نہیں ہے، یہاں تمہیں کھنے کا زیادہ موقع نہیں ملے گا۔ اس لیے میں تمہیں کراچی بھیج رہا ہوں۔ احمد صاحب کو جانتے ہو، میرے اچھے دوست ہیں اور ان کی پورے ملک میں کتنی ہی ملیں ہیں۔ ان کی ایک مل حال ہی میں لگی ہے میں چاہتا ہوں تم وہاں کام کر کے تجربہ حاصل کرو تاکہ مستقبل میں اسی پیرن پر اپنے بزنس کو ترقی دے سکو۔“

پوچھا۔

”بس تم تیار کیے کہ جلد از جلد چلے جاؤ۔ میری احمد صاحب سے بات ہو گئی ہے۔ تم جاتے ہی ٹریننگ پر لگ جاؤ گے۔ میرا خیال ہے تم جیسے شخص میں بہت کچھ سیکھ لو گے۔“

میں کراچی جانے کے خیال سے خوش تھا کیونکہ اکھوتا ہونے کی وجہ سے مجھے مشکل سے ہی کہیں جانے کی اجازت ملتی تھی۔ ابو مجھے پڑھنے کے لیے امریکا یا یورپ بھیج سکتے تھے لیکن اسی وجہ سے میں نے تعلیم یہیں حاصل کی تھی۔ اپنے ملک میں میں لاہور اور اسلام آباد سے دور نہیں گیا تھا حتیٰ کہ اسکول، کالج اور یونیورسٹی میں مجھے کلاس فیلوز کے ساتھ ٹورز پر جانے کی اجازت بھی نہیں ملتی تھی کیونکہ اکثر ٹور ناردرن ایریا کے ہوتے تھے اور امی کے خیال میں یہ سارے علاقے بہت خطرناک تھے۔ انہوں نے تو کراچی کا کن کر بھی شور مچایا تھا لیکن ابو نے ان کی مخالفت کے باوجود اپنا فیصلہ نہیں بدلا۔ انہوں نے امی سے کہا۔ ”یہ اس کے لیے ضروری ہے۔ کل کو اسے اکیلے پورا بزنس دیکھنا ہے اور بزنس یہ گھر بیٹھ کر نہیں سیکھ سکتا۔“

یوں میں کراچی روانہ ہو گیا۔ یہاں احمد صاحب کی نئی لگنے والی مل سائنٹ میں تھی۔ رہنے کے لیے مجھے برائی سبزی منڈی کے پاس ایک چھوٹی سی گھنٹی مل گئی۔ گھنٹی بھی احمد صاحب کی تھی۔ بڑا چسکون اور صاف ستھرا علاقہ تھا۔

گھنٹی زیادہ بڑی نہیں تھی۔ شاید دس مرلے پر مبنی اور اس میں صرف چھ گھنٹے کی منزل تعمیر ہوئی تھی جس میں دو بیڑوں کے ساتھ لاؤنج اور ایک بڑا سا ڈرائنگ روم تھا۔ سامنے لان تھا لیکن دیکھ بھال نہ ہونے کی وجہ سے وہ اجازت پر تھا۔ البتہ گھنٹی اندر سے بہترین حالت میں اور پوری طرح آراستہ تھی۔ ہر کمرے میں اے سی تھا۔ چن کے ساتھ ڈرائنگ روم بھی تھا لیکن یہ میرے لیے بیکار کیونکہ میں تینوں وقت کا کھانا باہر کھاتا تھا۔ ناشتا اور چائے مل میں کرتا تھا، دوپہر کینٹین میں بہترین کھانا ملتا تھا اور رات کو میں کسی ریستوران یا ہوٹل چلا جاتا۔ کبھی سوڈا ہوتا تو کھانا گھر منگوا لیتا یا کسی ایسی چیز سے گزارا کرتا جو بر آسانی دستیاب ہو جاتی۔ ایک مہینے میں مل اور دفتر میں کام کرنے والے پورے اپنے جیسے چھترے نو جوانوں سے دوستی ہوئی اور شام کو چھترے کے بعد ہم مل کر کہیں نکل جاتے تھے۔ کھاتے پیتے بگ شب کرتے اور جب تھک جاتے تو اپنے گھروں کا رخ کرتے تھے۔ آمد و رفت کے لیے مجھے ایک مناسب کابلی ہوئی تھی۔ تنخواہ کچھ نہیں تھی لیکن یہاں قیام اور دوسرے اخراجات احمد صاحب نے اپنے ذمے لے لیے تھے۔ اس میں کار بھی شامل تھی۔ میں اکتوبر میں کراچی آیا تھا جب لڑکی کا موسم گزر گیا تھا لیکن میں نے سنا تھا کہ کراچی میں بیابان جیسی گرمی نہیں پڑتی ہے البتہ سردی بھی ویسی نہیں ہوتی ہے، سال کے بیشتر حصے موسم بہت خوش گوار ہوتا ہے۔ لیکن اس سال سرما کے آغاز میں ہی بارشوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ہر دوسرے تیسرے دن بارش ہو جاتی اور موسم ٹھنڈا ہو جاتا۔ سردی اب بھی زیادہ نہیں تھی لیکن انجانے کرنے کے قابل تھی۔ اس روز سب نے مل کر سی ویو جانے کا پروگرام بنایا تھا۔ ڈنر بھی وہیں کرتے۔ وہاں سے آتے آتے رات کے بارہ بج گئے تھے پھر بارش بھی شروع ہو گئی، اس سے بھی دیر ہوئی تھی۔ کراچی میں بارش اتنی نہیں ہوتی لیکن اسی بارش سے ہر طرف پانی کھڑا ہو جاتا ہے اور ایسے میں سب سے مشکل ڈرائیورز کو پیش آتی ہے۔ انہیں بہت احتیاط سے گاڑی چلانی پڑتی ہے ورنہ جا بجا کھلے میں ہول اور ٹھوسے ان کا استقبال کرنے کو تیار ہوتے ہیں۔

میں گھر پہنچا اور ابھی سکون کا سانس بھی نہیں لیا تھا کہ گھنٹی کا گیت کھولنے ہی میرے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ وجہ سامنے پورچ میں بڑی تھی۔ میں جاتے ہوئے پورچ کی لائٹ جلا جاتا تھا تاکہ وہاں میں اندھیرا نہ ملے۔ اسی روشنی

میں عورت صاف دکھائی دے رہی تھی۔ وہ گھنٹی سے بنی ہوئی تھی۔ میں نے جلدی سے گیٹ بند کیا اور اس کی طرف بھاگا۔ میرا دل بڑی طرح دھڑک رہا تھا۔ دل میں خیالات نہ تھے کسی نے اس عورت کو مار کر یہاں ڈال دیا ہے اور اب یہاں چھوٹے گھنٹے میں بیٹھی ہوئی تھی اور اس کے جسم پر ہر ایک کپڑے کا سوا تھا جو بیگ کر نہ ہونے کے برابر رہ گیا تھا۔ اس کے تمام جسمانی خدو خال اس میں نمایاں تھے۔ مگر اس وقت اس طرف دھیان کہاں تھا۔ میں نے ڈرتے ڈرتے اسے سیدھا کیا۔ وہ بے سمجھ رہی بالکل کسی لاش کی طرح۔ پھر میں نے مزید ڈرتے ڈرتے اس کی ہنسی ٹوٹی اور یہ دیکھ کر سکون کا سانس لیا کہ اس کی ہنسی مل رہی تھی۔ اگرچہ بیگ کر سردی میں پڑے رہنے سے اس کا چہرہ بیلا پڑ گیا تھا لیکن وہ زندہ تھی۔

اچانک مجھے احساس ہوا کہ وہ بڑی خطرناک جگہ پر تھی اس پاس کوشیاں تھیں اور کئی منزلہ عمارتیں خوش قسمتی سے سردی کی وجہ سے تمام کھڑکیاں بند نظر آ رہی تھیں لیکن کسی کے شیشے سے جھانکنے پر کوئی پابندی نہیں تھی اور کوئی دیکھ لیتا تو اسے ہوش عورت کے ساتھ میں بھی نظر آ جاتا۔ میں نے جگت میں برآمدے کی روشنی بند کی اور پھر دروازہ کھولا۔ وہاں عورت کے پاس آکر میں کچھ دیر بیٹھا پڑا مگر اسے اندر تولے جاتا تھا۔ میں نے ہمت کر کے اسے اٹھایا۔ اندر لاکر میں نے سوچا اور اسے دوسرے بیڈ روم میں لے گیا۔ یہاں مکمل فرنیچر تھا لیکن یہاں مکمل نہیں تھا وہ میں اپنے بیڈ روم سے لے آیا۔ عورت مکمل طور پر بے ہوش تھی کیونکہ اٹھا کر یہاں لانے کے دوران اس نے قطعی کوئی رد عمل ظاہر نہیں کیا تھا۔ پھر میں گاڑی اندر لایا اور گیٹ لاک کیا۔

میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اب میں کیا کروں۔ عورت کو گھنٹی مدد کی ضرورت تھی۔ میں اسے عورت اس لیے کہہ رہا ہوں کہ جسم سے وہ عورت ہی لگ رہی تھی۔ البتہ چہرہ کی لڑکی جیسا تھا۔ میں سخت کنفیوز تھا۔ پہلے میں نے ڈاکٹر بلانے کا سوچا لیکن پھر یہ خیال مسترد کر دیا۔ اول تو یہاں کوئی ڈاکٹر میرا جائے والا نہیں تھا اور اگر میں تلاش کر کے کسی ڈاکٹر کو لے آتا تو وہ دس سوال کرتا اور معاملہ بالآخر پولیس تک جاتا اور یہ مجھے کسی صورت گوارا نہیں تھا۔ پھر مجھے اس کے منہ پر زخموں سے بانی کے چھیننے مارنے کا آئیڈیا سوچھا اور فوراً ہی عقل بھی آ گئی کہ وہ پہلے ہی بیٹھی ہوئی تھی اور اس مردی میں ٹھنڈے پانی سے کون ہوش میں آتا اسے اصل

میں گرائش کی ضرورت تھی۔ اس کے کپڑے بدلنا بھی ممکن نہیں تھا اگر میں کسی طرح اس کا لباس اتار بھی دیتا تو اسے پہنانے کے لیے یہاں کوئی لباس نہیں تھا سوائے میرے کپڑوں کے اور میں اتنا پرخطر کام کرنا بھی نہیں چاہتا تھا۔ اگر وہ ہوش میں آ جاتی تو نہ جانے کیا بھیجتی اور اس کا رد عمل کیا ہوتا۔ اس لیے میں نے یہ کیا کہ تو لیا سے اس کا لباس ممکن حد تک خشک کر کے اسے سی کا بیڑا کر دیا۔ پھر اس کے لیے دودھ گرم کر کے لے آیا۔ یہاں جانے وغیرہ بنانے کے لیے ڈبا دودھ موجود تھا۔ اس کے لب کھول کر پورے دودھ دیکھا تا شروع کیا تو اس کا خاطر خواہ رد عمل ہوا۔ اس کی گلابی رنگت تیزی سے بحال ہو گئی اور وہ جیسے ہوش میں آنے لگی۔ میں پیچھے ہٹ کر انتظار کرنے لگا۔

وہ بہت حسین تھی۔ رنگت بحال ہوئی اور بال خشک ہوئے تو اس کی حالت ہی بدل گئی تھی۔ اس کے پیروں میں چپل باجوتا تھا اور نہ دو پٹا تھا۔ سویٹر یا کوئی گرم چیز بھی نہیں تھی۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس موسم میں وہ اتنے ہلکے سے لباس میں باہر کیسے نکل آئی تھی؟ اس پر کیا مصیبت آئی تھی؟ یہ سب وہی بات تھی۔ چند منٹ بعد اس نے کراہنا شروع کر دیا تھا اور مزید چند منٹ بعد انکھیں کھول دیں۔ چند لمبے تک وہ چھت کو گھورتی رہی اور پھر ایک جھٹکے سے اٹھ بیٹھی۔ اسی لمحے اس کی نظر مجھ پر پڑی اور وہ چیخ اٹھی تھی۔ اس نے جلدی سے گر جانے والا مکمل سینے تک پہنچ لیا اور سہمی ہوئی نظر سے مجھے دیکھنے لگی۔ میں نے جلدی سے کہا۔

”آرام سے.... آرام سے.... یہاں آپ کو کوئی خطرہ نہیں ہے۔“

”میں یہاں کیسے آئی؟“ اس نے سہمی آواز میں کہا۔ میں نے محسوس کیا کہ اس کی شخصیت کی طرح اس کی آواز بھی دلکش تھی۔ وہ ان عورتوں میں سے تھی جن کی شخصیت کا ہر جز دلکش ہوتا ہے۔ ان سے ملنے والا کوئی مرد ان سے متاثر ہونے بغیر نہیں رہتا ہے۔

”آپ میرے گھر کے پورچ میں بے ہوش پڑی تھیں۔ میں آپ کو اندر لے آیا۔“

”وہ.... میرے.... پیچھے ہیں۔“ اس نے گھبرا کر کہا۔ ”وہ یہاں بھی آ سکتے ہیں۔“

”آپ بے فکر رہیں یہاں آپ بالکل محفوظ ہیں، اگر کوئی آیا تو میں اسے دیکھ لوں گا۔ آپ یہ گرم دودھ پی لیں

اس سے آپ کی حالت اور بہتر ہو جائے گی۔“ میں نے دلیر بن کر کہا لیکن اندر سے میں فکرمند ہو گیا تھا کہ کچھ خطرناک لوگ اس کے پیچھے تھے۔ میں ایک سیدھا سادہ شریف کاروباری گھرانے سے تعلق رکھنے والا نوجوان تھا، امی ابو نے ویسے ہی سچی سے تاکید کر کے بھیجا تھا کہ کسی معاملے میں نہیں پڑنا۔ کراچی خطرناک شہر ہے۔ وہاں اپنے کام سے کام رکھنا۔ مگر اب میں اس کی مدد کر ہی چکا تھا۔ میں پیچھے نہیں ہٹ سکتا تھا۔ دودھ پی کر اس کی حالت سدھرتی تھی۔ ایک گھنٹے بعد وہ نہا دھو کر صاف ستھری ہو کر میرا سلپنگ سوٹ پہنے کبل میں مسمی کا پی رہی تھی۔ اس دوران میں اس نے اپنے بارے میں صرف ایک بات بتائی تھی کہ اس کا نام سارہ تھا۔ اس کی شادی ہوئی تھی لیکن دشمنوں نے اس کے شوہر کو قتل کر دیا اور اب اس کے پیچھے پڑے تھے۔

اس نے کھل کر تو نہیں بتایا تھا لیکن اشاروں کنایوں میں کہا تھا کہ اس نے پسند کی شادی کی تھی اور اس وجہ سے اس کے شوہر کے خاندان والے ان کے دشمن بن گئے تھے۔ اس نے کچھ کھانے سے انکار کر دیا تھا۔ کچھ دیر بعد وہ بھانیاں لینے لگی تو میں کمرے سے نکل آیا اسے نیند آ رہی تھی۔ صبح اتفاق سے چھٹی کا دن تھا۔ اس لیے میں الارم لگائے بغیر سو گیا۔ میرے ذہن کے کسی گوشے میں اس کے بارے میں شک نہیں آیا تھا۔ ممکن ہے میری جگہ کوئی دوسرا ہوتا تو اس پر اتنی آسانی سے اعتماد نہ کرتا۔ میں بے خبر سو رہا تھا کہ اس نے مجھے بیدار کیا۔ وہ اتنے پاس اور اتنی بے تکلف سی تھی کہ میں جھجک گیا۔ اس کی شرٹ کے اوپری بٹن نہ جانے کھل گئے تھے یا اس نے جان بوجھ کر کھولے تھے۔ میں چہرے کے لیے محرزہ سارہ گیا۔ پھر جھینپ کر چوٹا۔

”خیریت...“

اس نے منہ بسور۔ ”دس بج گئے ہیں اور میں بھوک سے مرنے والی ہوں یہاں کچن میں سوائے چائے کافی کے کچھ نہیں ہے۔“

”سوری مجھے خیال نہیں رہا۔“ میں جلدی سے اٹھ گیا۔ منہ پر پانی کے جھینٹے مار کر کونکھی کے پاس ایک بیکری تک گیا۔ بارش رک گئی تھی اور زانے کی سرد ہوا چل رہی تھی۔ بوکھا ہٹ میں مجھے کوئی گرم چیز لینے کا خیال بھی نہیں آیا تھا۔ اس لیے سردی میں ٹھہرتا واپس آیا۔ اسے انڈوں، مارجرین، ڈبل روٹی، مارلیٹ اور حلوہ پوری کا شاپر

کپڑا کر میں خود واش روم چلا گیا۔ جب وہاں سے واپس آیا تو وہ میز پر ناشتا چا چکی تھی اور فارغ بیٹھی تھی۔ میں نے کہا۔ ”آپ نے شروع نہیں کیا؟“

”میں تمہارا انتظار کر رہی تھی۔“ وہ بے تکلفی سے بولی۔ ”ورنہ دل تو چاہ رہا تھا کہ سب کھا جاؤں۔“

ناشتے کے بعد مجھے خیال آیا۔ ”آپ کے...“

”آپ جناب کا تکلف نہیں۔“ اس نے مجھے ٹوکا۔ ”میں عمر میں تم سے بڑی نہیں ہوں۔“

”اوکے... میں کہہ رہا تھا کہ تمہارے پاس لباس نہیں ہے۔“

”میں نے اپنا سوٹ بھی دھو کر ڈال دیا تھا وہ خشک ہو جائے گا۔“

”اب تمہارا کیا ارادہ ہے؟“

وہ اب تک ہنس بول رہی تھی میرے اس سوال پر اچانک مرجھا گئی پھر اس نے گہری سانس لی۔ ”ارادہ کیا ہے تمہارا شکر یہ ادا کر کے یہاں سے نکلوں گی اور پھر جہاں قسمت لے جائے۔“

”کیا مطلب کیا تمہارا کوئی شہ کا نہیں ہے؟“

”ٹھکانا ہوتا تو اس موسم میں رات کو در بدر پھر رہی ہوتی۔ جہاں رہتی تھی وہ جگہ اب دشمنوں کی نظر میں ہے وہاں گئی تو ان کے ہاتھ لگوں گی اور وہ مجھے فوراً قتل کر دیں گے۔“

یعنی اس کے پاس کوئی پناہ گاہ نہیں تھی۔ میں نے کہا۔ ”اس صورت میں تم یہیں رہو۔ یہاں تمہیں کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔“

وہ مسکرائی اور اس کی آنکھیں جھلملانے لگی تھیں۔ میں حیران تھا وہ کسی پل میں روپ بدلنے والی عورت تھی۔ ”میں تمہارا احسان بھی نہیں بھولوں گی۔“

”میں دل سے کہہ رہا ہوں یہ احسان نہیں ہے۔“

”پھر مجھے بھرتو احسان ہے ورنہ مجھے تو لگ رہا ہے کہ اس پناہ گاہ کے باہر میری جان کے دشمن گھوم رہے ہیں۔“

پھر کرید کرید کر پوچھتی رہی اور میں سادگی سے اسے اپنے بارے میں بتاتا رہا۔ میں نے محسوس کیا کہ جب اسے تیار کر کے میرا تعلق فیصل آباد سے ہے تو وہ کچھ فکرمندی ہوئی تھی لیکن یہ تاثر لگتی تھا۔ میں نے اسے پولیس سے رابطہ کرنے کا مشورہ دیا لیکن اس نے انکار کر دیا۔ اس کا کہنا تھا کہ پولیس اسے تحفظ نہیں دے سکتی تھی۔ وہ پھر میں نے اس کے لیے ایک ایسا عبا لیا جس میں چہرے کا نقاب بھی شامل تھا۔ میں واپس آیا تو وہ کھڑکی صفائی کر چکی تھی اور خود گروٹی میں اتنی ہوئی تھی۔ مجھے دیکھ کر وہ ہنسی۔ ”کیسی لگ رہی ہوں؟“

”تم ہر حال میں اچھی لگتی ہو۔“ میں نے کہا اور عبا لیا اس کے سامنے رکھا۔ ”یہ دیکھو تمہارے لیے لایا ہوں۔“

”اچھا ہے۔“ وہ بے دلی سے بولی۔ ”لیکن میں اس کا کیا کروں گی میں ویسے بھی پردہ نہیں کرتی ہوں۔“

”یہ تمہیں چھپانے کے لیے ہے۔ تم ہاتھ لے لو پھر ہم کھانے کے بعد باہر چلیں گے اور تم اپنے لیے کپڑے لیتا۔“

خاہر ہے اس ایک لباس یا میرے سلپنگ سوٹ میں تو گزرا رہا ہوگا۔

اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ ”مجھے اچھا نہیں لگ رہا ہے“

میں تم پر بار ڈال رہی ہوں۔

”ہاں بار ہے لیکن بعض بار ایسے ہوتے ہیں جو آدمی اپنی خوشی سے اٹھنا چاہتا ہے۔ اس لیے تم فکرمند نہ کرو۔“

نہا دھو کر اس نے اپنا ہی لباس پہنا تو اس کا روپ مکمل اٹھ تھا۔ میں نے اسے دیکھا تو دیکھتا ہی رہ گیا تھا۔ وہ شرماتی اور پھر بولی۔ ”ایسے کیا دیکھ رہے ہو؟“

”پتا نہیں کیا دیکھ رہا ہوں، تم تو پل پل میں روپ بدل رہی ہو۔“

”میرے پاس دو پٹا نہیں ہے۔“

میں نے اسے اپنی ایک ہلکی گرم چادر پیش کی جسے اس نے بیک وقت دوپٹے اور شال کی طرح لے لیا۔ کھانے کے بعد ہم باہر جانے کے لیے تیار ہوئے تو میں نے اس کے ہیکڑ کی طرح سفید اور گلابی عیروں کی طرف دیکھا۔

”تمہارے پاس چپل بھی نہیں ہے۔ خیر کوئی بات نہیں راستے میں لے لیں گے۔“

طارق روڈ یہاں سے دور نہیں تھا اور چھٹی والے دن بھی شاپنگ سینٹر کھلے رہتے تھے۔ میں نے پہلے ایک بوتلوں کی دکان سے اس کے لیے خوب صورت سینڈل لیا۔

وہ اسے پورا آیا تھا۔ ایک بوتیک سے اس کے لیے کئی لباس لیے۔ وہ صبح کر رہی تھی لیکن میں ان کی کر کے اپنی مرضی سے کپڑے لیتا رہا۔ ڈیزائن اور رنگ بھی میں نے اپنی پسند سے لیے تھے۔ صرف پندرہ گھنٹے پہلے میں اسے جانتا بھی نہیں تھا اور اب میں اس کے لیے لباس لے رہا تھا۔ میں نے اس کے لیے کئی چیزیں اور بھی لی تھیں۔ وہ صبح کرتی رہی تھی۔ جب ہم واپس گاڑی میں آئے تو اس نے سنجیدگی سے کہا۔ ”عمران تم یہ سب کیوں کر رہے ہو؟“

”اگر تم سمجھ رہی ہو کہ میں یہ کسی غرض سے کر رہا ہوں تو یہ غلط ہوگا، میں ذہنی طور پر تیار ہوں کہ ابھی تم کو ہکی میں جاری ہوں اور پھر ہم کئی کئی مہینے گے۔ بس یہ میری خوشی ہے۔ ہر شخص کی زندگی میں کوئی ایک ایسا واقعہ پیش آتا ہے جو اسے ساری عمر یاد رہتا ہے اور اچھی یا دین جاتا ہے، تمہارا یہ ساتھ میرے لیے ایسا ہی واقعہ ہے۔“

”ہمارا ساتھ عارضی ہے؟“ وہ اہستہ سے بولی۔

”یہ کھلی حقیقت ہے۔“ میں نے جواب دیا۔ ”میں جس جرنیلنگ کے لیے آیا تھا وہ وقت سے پہلے ختم ہونے والی ہے اور زیادہ سے زیادہ ایک مہینے بعد میں یہاں سے واپس چلا جاؤں گا اور ظاہر ہے میں تمہیں ساتھ نہیں لے جا سکتا۔“

”میں تمہیں کسی لگتی ہوں؟“

”میں ایمان داری سے کہوں گا کہ آج تک میں جتنی عورتوں اور لڑکیوں سے ملا ہوں ان میں سے کوئی بھی تمہارے جیسی حسین اور دلکش نہیں ہوگی۔“

وہ کچھ دیر خاموش رہی پھر اس نے موضوع بدل دیا اور اپنے کپڑوں کے بارے میں بات کرنے لگی۔ ”ان کی فٹنگ ٹھیک نہیں ہے لیکن میں ٹیک کر لوں گی۔“

”وہ کیسے؟“

”کونکھی میں ایک سیونگ مشین بھی ہے پرانی ہے مگر چلتی ہے، چلا کر دیکھ چکی ہوں اور مجھے سلائی آتی ہے۔ لیکن میرے پاس گھر میں پہننے والا سلپیر نہیں ہے۔“

ہم نے راستے میں ایک جگہ رک کر اس کے لیے سلپیر لے لیے۔ ہم گھر آئے تو وہ بہت خوش تھی۔ اس نے کہا۔ ”آج میں تمہیں خود کھانا بنا کر کھلاؤں گی۔“

”تمہیں بنانا آتا ہے۔“

”تم کوئی چیز کہو۔“ اس نے چیلنج دینے والے انداز میں کہا۔

”مجھے بریانی اچھی لگتی ہے۔“

گھر۔ اداس۔ ویران

جو اولاد نہیں

آج بھی ہزاروں گھرانے اولاد کی نعمت سے محروم سخت پریشان ہیں۔ اولاد نہ ہونے سے دوسری شادی یا طلاق جیسے گھر گیلو جھگڑے، اداسیاں اور جدائیاں جنم لے رہی ہیں۔ آپ خدا تعالیٰ کی رحمت سے مایوس نہ ہوں کیونکہ مایوسی تو گناہ ہے۔ ہم نے صرف دیسی طبیبی یونانی قدرتی جڑی بوٹیوں پر ریسرچ کر کے ایک ایسا خاص قسم کا بے اولادی کورس تیار کر لیا ہے جس کے استعمال سے ان شاء اللہ آپ کے ہاں بھی خوبصورت اولاد پیدا ہو سکتی ہے۔ آپ کے آنگن میں بھی خوشیوں کے پھول کھل سکتے ہیں۔ آج ہی فون پر اپنی تمام علامات سے آگاہ کر کے گھر بیٹھے بذریعہ ڈاک وی پی VP بے اولادی کورس منگوالیں۔ خدا کے لئے ہمارا بے اولادی کورس ایک دفعہ تو آزمائیں اور خدا را اپنے گھر کے ماحول کو تو جنت بنالیں۔

المسلم دارالحکمت رجسٹرڈ

ضلع حافظ آباد۔ پاکستان

0301-6690383

0300-6526061

فون اوقات

صبح 10 بجے سے عصر 4 بجے تک

مورت ساتھ نہیں لے جاسکتا تھا۔ میرے ذہن میں یہ خیال نہیں تھا مگر وہ بھی اسے سکون سے رہ رہی تھی جیسے اسے ساری عمر میں رہنا تھا۔ جب میں نہیں ہوتا تو وہ گھر کی صفائی کرتی، باہمی پسند کی چیزیں بناتی اور فی وی دیکھتی تھی۔ جب میں آجاتا تو سونے تک اس کا وقت میرے ساتھ گزرتا تھا۔ کئی بار مجھے خیال آیا کہ میں اس سے مستقبل کے بارے میں پوچھوں لیکن پھر اس خیال سے رک گیا کہ کہیں وہ یہ نہ سمجھے کہ میں اس سے بیزار آگیا ہوں اور اب جان چھڑانا چاہتا ہوں۔ ایک رات ہم باہر گئے۔ میں اسے ایک رستوران لے گیا۔ باہر اس نے عایا پہنا ہوا تھا لیکن رستوران میں جا کر اس نے عایا اتار دیا۔ ”یہاں تمہیں ذف نہیں ہے؟“

”نہیں، میرے شوہر کے رشتے دار جس قسم کے لوگ ہیں وہ یہاں نہیں آسکتے۔“ اس نے جواب دیا اور مینو دیکھنے لگی۔ آج اس نے ساڑی باندھی ہوئی تھی اور اتنی دلکش لگ رہی تھی کہ رستوران میں موجود تمام ہی مرد اس کی طرف متوجہ تھے۔ یہ بلیک ساڑی میں نے ہی اس کے لیے لی تھی لیکن اس کا بلاؤز اس نے خود سیا تھا اور یہ اتنا جست اور چھوٹا تھا کہ اس کا شہابی رنگ کچھ زیادہ ہی نمایاں ہو رہا تھا۔ نہ جانے کیوں مجھے غصہ آئے لگا۔ میں لوگوں کو نہیں روک سکتا تھا اس لیے اس سے کہا۔ ”یہاں ٹھیک نہیں ہے میرا خیال ہے میں کسی الگ جگہ بیٹھنا چاہیے۔“

”کیوں یہاں کیا خرابی ہے؟“

”خرابی یہ ہے کہ یہاں موجود لوگ تمہیں دیکھے جا رہے ہیں اور مجھے اچھا نہیں لگ رہا ہے۔“

”کیوں؟“ وہ شوشی سے فنی۔ ”میں تمہاری بیوی تو نہیں ہوں۔“

”لیکن لوگ تو یہی سمجھ رہے ہیں۔“ میں نے خشکی سے کہا اور منتظم کو اشارہ کیا، وہ آہا تو میں نے اس سے جگہ تبدیل کرنے کو کہا۔ ”ہمیں مزید پرائیویسی چاہیے۔“

وہ سمجھ گیا اور ہمیں ایک کونے کی میز کی طرف لے گیا۔ مزید پرائیویسی کے لیے اس کے دو طرف اسکرین لگا دیں۔ یوں ہم باقی ہال سے بالکل الگ ہو گئے تھے۔ میں نے سکون کا سانس لیا مگر وہ سنجیدہ ہو گئی تھی۔ ”تمہیں اچھا نہیں لگا کہ لوگ مجھے دیکھ رہے تھے۔“

”ہاں...“ میں نے اقرار کیا۔ ”میں اس معاملے میں قدامت پسند ہوں۔ بے شک تم سے میرا کوئی رشتہ نہیں

میں نے کمرے کی طرف جاتے ہوئے کہا۔ بے نظیر ہونے کے باوجود اس نے اب تک اپنے بارے میں کچھ خاص نہیں بتایا تھا لیکن میرا اندازہ تھا کہ وہ تعلیم یافتہ ہے۔ کم سے کم کمریوٹ ہے اور اس کا تعلق شاید لاہور سے ہے کیونکہ بولنے کے دوران کبھی بھی اس کے لہجے میں ہندی جھلک آ جاتی تھی۔ اب تک اس نے اردو میں بات کی تھی البتہ انگلش بھی روانی سے بولتی تھی۔ اپنے رکھ رکھاؤ اور انداز سے وہ اداریہ طبقے کی لگتی تھی اور میں نے اس میں بلا کا احترام محسوس کیا تھا۔ وہ میرے گھر میں ٹھیک نہیں اس کے سامنے خود کو اتنا پُر اعتماد محسوس نہیں کرتا تھا جتنا وہ کرنی تھی۔ میں اس کے لیے سب کر رہا تھا اور وہ بہت وقار آمیز شکر کے ساتھ اسے قبول کر رہی تھی۔ اس رات بھی اس نے کھانا بنایا تھا۔ میں کئی طرح کی ڈشز کا سامان ساتھ لے آیا تھا۔ کھانے کے بعد ہم نے لاؤنج میں کچھ دیر باتیں کیں اور پھر سونے کے لیے اٹھ گئے۔

اس کے بعد یہ معمول بن گیا۔ میں دفتر سے آتا تو وہ میرا استقبال کرتی۔ میرے کپڑے استری شدہ رکھے ہوتے تھے۔ جب میں ہاتھ کے بعد پیچ کر کے آتا تو وہ چائے لے آتی اور پھر رات کا کھانا صبح ناشتے کے وقت وہ سو رہی ہوتی تھی۔ میں حسب معمول ناشتا دفتر کی کینٹین میں کرتا تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ اس معمول میں تبدیلی ہو تو میرے دوست چونکا ہو جائیں ویسے وہ حیران اب بھی تھے کہ کہاں میں رات گئے تھیں ان کے ساتھ گھومتا پھرنا تھا اور کہاں اب میں چھٹی ہوتے ہی سیدھا گھر کا رخ کرتا تھا۔ میں نے بہانہ کیا کہ کراچی کے حالات کی وجہ سے امی ابو نے شام کے بعد باہر نکلنے سے منع کیا ہے اور وہ اطمینان کے لیے کوئی کے نمبر پر کال کر کے معلوم کرتے ہیں کہ میں گھر میں ہوں یا نہیں۔ اس پر دوستوں نے مذاق تو اڑایا تھا لیکن ساتھ ہی انہوں نے مجھے مجبور کرنا چھوڑ دیا تھا۔ البتہ مجھے یہ خطرہ تھا کہ ان میں سے کوئی کسی دن گھر پر نہ آپہنچے۔ ظاہر ہے میں انہیں اس سے منع نہیں کر سکتا تھا۔ اگر وہ مین موخ برائیاں دیتے تو میں کوئی بہانہ کر سکتا تھا۔ ورنہ پہلے سے پروگرام بنا لیتے تو مجھے انکار کرنا مشکل ہو جاتا۔

میں سارہ کی گھر میں موجودگی کا عادی ہوتا جا رہا تھا اور میرے ذہن سے یہ خیال محو ہونے لگا تھا کہ وہ میرے لیے ایک اچھی عورت ہے اور کسی دن اسے یہاں سے جانا ہوگا۔ اگر وہ نہیں گئی تو مجھے تو جانا ہی تھا اور میں اسے کسی

”تب میں تمہیں ایسی برائی کھلاؤں گی کہ تم نے آج تک نہیں کھائی ہو بس مجھے چیزیں لا دو۔“

میں نے اسے چیزیں لا دیں اور وہ کچن میں ٹھس گئی۔ اس کی تیاری ہوئی برائی واقعی لا جواب تھی۔ میں نے آج تک ایسی برائی نہیں کھائی تھی۔ میں حیران تھا کہ اس عورت کے پاس ظاہری حسن کے ساتھ اور کتنے حسین پہلو ایسے تھے جو چھپے ہوئے ہیں۔ اسے یہاں آئے ہوئے چوبیس گھنٹے بھی نہیں ہوئے تھے اور وہ ایسی لگ رہی تھی جیسے برسوں سے یہاں رہتی آئی ہو۔ اگلے روز میرا کام پر جانے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔ مجبوراً جانا پڑا۔ چھٹی والے دن دوست فون کرتے رہے کہ کہیں چلتے ہیں مگر میں طبیعت کا بہانہ کر کے انہیں ٹالتا رہا۔ دفتر میں ان سب نے میرا اچھا لیا کہ طبیعت تو ٹھیک لگ رہی ہے کوئی اور چکر ہے۔ یہ مشکل میں نے ان سے پیچھا چھڑا اور نہ وہ آج کے لیے پروگرام بنا رہے تھے۔ میں نے بہانہ کیا کہ آج مجھے ایک رشتے دار کے گھر جانا ہے جو بک سے بلا رہے تھے۔ یوں میری جان چھوٹی۔ چھٹی ہوتے ہی میں گھر کی طرف روانہ ہو گیا اور سارے راستے یہ اندیشہ مجھے پریشان کرتا رہا کہ میں گھر پہنچوں گا تو سارہ وہاں نہیں ہوئی، وہ جا چکی ہوگی۔ میں نے خود گیٹ کا تالا کھولا۔ میں معمول کے مطابق تالا لگا کر گیا تھا اور سارہ کو منع کیا تھا کہ وہ باہر نہ نکلے آس پاس والے جانتے تھے کہ میں یہاں اکٹرا رہا ہوں۔ اس نے ہنس کر کہا۔

”میں نظر آگئی تو تمہاری ریپشن خراب ہو جائے گی؟“

”بھائو میں کی ریپشن یہاں رہنے والے کون سے میرے محلے دار ہیں جن کی فکر کروں۔ مسئلہ یہ ہے کہ کوئی پولیس کو کال نہ کر دے۔“

”ٹھیک ہے میں احتیاط کروں گی۔“

گاڑی کھڑی کر کے میں دھڑکتے دل کے ساتھ اندر آیا اور اسے لاؤنج میں ہی وی میں مگن پا کر سکون کا طویل سانس لیا۔ وہ مجھے دیکھ کر کھل اٹھی جیسے میرا انتظار کرتی رہی تھی۔ پھر خود کو دکھایا اس نے نیا لباس پہنا تھا۔ اسے اپنے ناپ کے مطابق کر لیا تھا۔ ”کیسی لگ رہی ہوں؟“

”ہمیشہ کی طرح خوب صورت۔“ میں نے کہا۔ ”تم لباس سے نہیں جتنی ہولباس تم سے سج جاتا ہے۔“

”تھنک یو۔“ وہ خوش ہو کر بولی۔ ”تمہارے لیے چائے لاؤں۔“

”میری عادتیں مت بگاڑو کہ تمہارے بعد مشکل ہو۔“

ہے لیکن اس وقت تم میرے ساتھ ہو اور مجھے اچھا نہیں لگا کہ لوگ تمہیں اس طرح دیکھیں۔“

وہ چپ ہو گئی۔ ہم نے کھانا خاموشی سے کھایا اور کھانے کے فوراً بعد اس نے کہا۔ ”گھر چلو میری طبیعت ٹھیک نہیں لگ رہی ہے۔“

اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں اور میں نے اس کا ہاتھ تھاما تو وہ بھی گرم تھا۔ کمرے سے چلتے ہوئے میں نے اس سے کہا تھا کہ وہ کوئی گرم چیز پہن لے باہر بہت سردی ہے مگر اس نے صرف عیاں لیا تھا۔ ہم واپس گھر آئے تب تک اس کا بخار بڑھ گیا تھا۔ میں نے اسے دوا دی۔ ”اب تم سو جاؤ.... کچھ دیر پس بخار اتار جائے گا۔“

وہ ڈولتے قدموں سے بیڈروم کی طرف چلی گئی۔ میں اپنے بیڈروم میں آ گیا۔ اس روز واقعی سردی تھی۔ میں لباس بدل کر بستر میں گھسا تو مجھے فوراً نیند آ گئی۔ پھر رات کسی وقت میری آنکھ کھلی تو میں نے سارہ کو بستر کے قریب کھڑے پایا۔ اس کا چہرہ انگارے کی طرح دکھ رہا تھا اور وہ جس حال میں تھی اسے دیکھ کر میں بوکھلا گیا تھا۔ ”سارہ..... یہ تم....“

وہ آگے بڑھی اور میں اسے اور خود کو کسی طرح نہ روک سکا تھا۔ کچھ دیر میں وہ سب ہو گیا جس سے میں شروع سے ڈرتا آیا تھا۔ وہ کسی طوفان کی طرح آئی تھی اور میں اس کے ریلے میں بہہ گیا۔ دوسری بار میری آنکھ اس کی سسکیوں سے کھلی تھی۔ وہ گھٹنوں میں سر دیے رو رہی تھی۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ میں اس سے کیا کہوں۔ اگرچہ اس کا تصور بھی تھا وہ رات کو اس حال میں میرے کمرے میں آئی تھی کہ کسی زاہد خٹک کے لیے بھی خود پر قابو پانا ناممکن ہو جاتا۔ میں تو جوان تھا اور پھر وہ مجھے اچھی لگتی تھی۔ اس کے باوجود میں خود کو تصور وار سمجھ رہا تھا۔ ہمت کر کے میں نے اسے چپ کرانا چاہا مگر وہ روئی رہی۔ تنگ آ کر میں نے کہا۔ ”پلیز سارہ چپ کر جاؤ۔ تم چاہو تو مجھے سزا بھی دے سکتی ہو۔“

اس نے سر اٹھایا تو اس کی آنکھیں اور ناک روٹنے سے سرخ اور متورم ہو رہی تھیں۔ اس نے کہا۔ ”مجھ سے شادی کر لو ابھی اور اسی وقت.... میں گناہ کا یہ وارغ لے کر زندہ نہیں رہ سکتی۔ اگر تم شادی نہیں کر سکتے تو میں خودکشی کر لوں گی۔“

”نہیں تم خودکشی نہیں کرو گی۔“ میں نے مضبوط لہجے میں کہا۔ ”میں آج ہی تم سے شادی کروں گا۔“

پھر میں نے ایسا ہی کیا۔ صبح ہوتے ہی میں نے دفتر فون کر کے چھٹی لی اور کئی نکاح خواں کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔ بڑی مشکل سے ایک نکاح خواں ملا جو بغیر سوالات کے میرا اور سارہ کا نکاح بڑھانے پر راضی ہو گیا تھا اور ساتھ ہی گواہ بھی ساتھ لے آیا۔ اسے اپنی فیس سے غرض تھی جو اصل سے خاصی زیادہ تھی۔ وہ لے کر اس نے میرا اور سارہ کا نکاح پڑھا دیا تھا اور مجھے یقین دلایا تھا کہ دو دن کے اندر نکاح رجسٹرڈ کر کے نکاح نامہ میرے حوالے کر دے گا۔ مجھے ان چیزوں کا اتنا علم نہیں تھا لیکن سارہ سب جانتی تھی اس نے کہا۔ ”جب تک نکاح نامہ رجسٹرڈ نہیں ہو گا اس کی کوئی حیثیت نہیں ہو گی۔“

یہ سب اتنا اچانک ہوا کہ مجھے سوچنے بجھنے کا موقع ہی نہیں ملا تھا اور جب نکاح ہو گیا تو مجھے امی اور ابو کا خیال آیا کہ میں ان سے کیا کہوں گا اور کیا میں ان کو بتا سکتا تھا کہ یہ نکاح کیسے اور کیوں ہوا؟ یہ سوال سامنے آیا تو میرے ہاتھوں کے توتے اڑ گئے تھے۔ امی ابو نے جس طرح میری تربیت کی تھی اور مجھ سے جو توقعات رکھتے تھے اگر انہیں میری لغزش کا پتا چل جاتا تو وہ بھی مجھے معاف نہ کرتے۔ میں اتنا فکرمند ہوا کہ یہ بھی بھول گیا کہ سارہ اب میری بیوی تھی اور مجھے اس پر پورا حق حاصل ہو گیا تھا۔ یہ بات اس نے مجھے یاد دلانی جب رات کو وہ خود میرے کمرے میں آئی اور ٹھوکہ کیا۔ ”میرا خیال ہے اب تمہیں مجھ سے کوئی دیکھسی نہیں ہے۔“

”ایسا نہیں ہے میں تو یہ سوچ کر پاگل ہو رہا ہوں کہ امی ابو سے کیا کہوں گا۔“

”تم اس کی فکر مت کرو۔“ وہ اعتماد سے بولی۔ ”یہ مجھ پر چھوڑ دو میں اس طرح معاملہ ہینڈل کر دوں گی کہ تم پر آج نہیں آئے گی۔“

اس نے مجھے اس طرح اپنی طرف متوجہ کیا کہ میں قہر مچ ساری فکریں اور پریشانیاں بھول گیا۔ مجھے بعد میں احساس ہوا کہ وہ بہت ذہین اور تجربے کار عورت تھی اور اسے معلوم تھا کہ مجھ جیسے نا تجربے کار نو جوان کو کس طرح قابو کیا جاتا ہے۔ اس کی قربت میں میں فکریں کیا سب ہی کچھ بھول گیا تھا۔ اگلے روز میں نے صبح کال کر کے دفتر سے مزید دو دن کی چھٹی طلب کی جو ظاہر ہے مجھے مل گئی کیونکہ میں وہاں ملازم تو نہیں تھا جو میرے نہ جانے سے کام رک جاتا۔ بس مجھے ڈر یہ تھا کہ یہ خبر ابو تک نہ پہنچ جائے کیونکہ وہ

باقاعدگی سے احمد صاحب کو کال کر کے میری پروگریس لیتے تھے۔ یہ دو دن میں نے سارہ کے ساتھ کس طرح گزارے مجھے پتا ہی نہیں چلا۔ ممکن ہے اگر اس سے باقاعدہ شادی ہوئی تو میں اتنا پاگل نہ ہوتا۔ پھر اس نے بھی میری پوری حوصلہ افزائی کی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ مجھے زیادہ سے زیادہ موقع دینا چاہ رہی ہو۔ کیونکہ اس کے بعد اس نے جو کیا تھا اس سے تو کچھ ایسا ہی لگا تھا۔

تین دن وہ میرے ساتھ رہی۔ دوسرے دن نکاح خواں نے حسب وعدہ مجھے نکاح نامہ لا دیا تھا۔ اس کی دونوں کاپیاں اس نے مجھے دی تھیں۔ یہ نکاح رجسٹر کے پاس رجسٹر ہو چکا تھا۔ تیری صبح بیدار ہونے پر ایک اور حیرت میری منتظر تھی۔ سارہ تک سب سے تیار ہو کر بیٹھی تھی جیسے کہیں جانے والی ہو۔ اس نے مجھ سے کہا۔ ”بس اب اٹھ جاؤ میں دو گھنٹے سے تمہارے بیدار ہونے کا انتظار کر رہی ہوں۔“

”تو اٹھا لیا ہوتا۔“ میں نے اٹھڑائی لی۔
”تم رات کو دیر سے سوئے تھے اس لیے میں نے مناسب نہیں سمجھا۔ اب اٹھ جاؤ مجھے بہت اہم کام لینا ہے تم سے۔“
”ایسا کیا اہم کام ہے، نہیں جانتا ہے کیا؟“
”صرف مجھے۔“ اس نے سچ کی۔ ”تمہیں اس طلاق نامے پر سائن کرنے ہیں۔“

مجھے اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا۔ ”کیا... کیا کیا تم نے؟“
”یہ پیپر ز کے ہیں طلاق کے ان پر سائن کرو اور اپنی زبان سے بھی مجھے تین بار طلاق دے دو۔“ اس نے میز پر رکھی فائل کی طرف اشارہ کیا۔

اس بار مجھے سننے میں کوئی غلطی نہیں ہوئی تھی۔ میں نے شک سے اسے دیکھا۔ ”تم مذاق کر رہی ہو؟“

”میں بالکل سنجیدہ ہوں۔“ وہ بولی۔ اس کے تاثرات بالکل بدلے ہوئے تھے۔ بے شک اس وقت بھی وہ غضب کی حسین لگ رہی تھی کیونکہ اس نے ہلکا سا میک اپ بھی کیا ہوا تھا مگر اس کے تاثرات کسی بچہ کی طرح سخت تھے۔ ایسا لگ رہا تھا اس کا چہرہ سنگ مرمر سے تراشا ہوا ہو۔ خوب صورتی کے باوجود پتھر یا پین لیے ہوئے تھی۔ اس کے تاثرات نے مجھے چونکا دیا تھا۔

”کیا مطلب؟“
”وہی جو تم نے سنا ہے۔“ وہ بولی اور ایک بار پھر میز پر رکھی فائل کی طرف اشارہ کیا۔ ”یہ طلاق نامہ ہے اس پر

سائن کرو۔“

”تمہارا دماغ خراب ہے۔“ میں نے کہا اور اس کی طرف بڑھا تھا کہ اس نے ہاتھ آگے کیا۔ میں بری طرح چونکا کیونکہ اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا لیکن صورت سے مہلک نظر آنے والا پتھول تھا۔

”میرا دماغ بالکل ٹھیک ہے۔“ وہ بدستور سکون سے بولی۔ ”تمہارے پاس تین منٹ ہیں اس پر سائن کرو۔“

رفتہ رفتہ مجھے احساس ہونے لگا کہ وہ بالکل بھی مذاق نہیں کر رہی تھی اور پوری طرح سنجیدہ تھی۔ اس نے پتھول نکال لیا تھا، اس سے زیادہ سنجیدہ اور کیا ہو سکتی تھی۔ وہ اس وقت بدلی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ اس مہربان اور محبت کرنے والی سارہ سے بالکل مختلف جو کل رات تک مجھ پر تن من سے ڈار ہو رہی تھی۔ اس نے کچھ دیر بعد کہا۔ ”دو منٹ رہ گئے ہیں۔“

”سارہ تمہیں مجھ سے کیا شکایت ہے۔ اگر ہے بھی تو یہ طلاق مانگنے کا کون سا طریقہ ہے؟“

”میں تم سے بحث کرنا نہیں چاہتی۔ میرا مطالبہ طلاق ہے اور وہ مجھے بہر صورت چاہیے۔“

”اگر میں یہ مطالبہ ماننے سے انکار کروں۔“
”ایک منٹ رہ گیا ہے۔“ وہ بولی۔ ”ایک منٹ بعد میں تمہیں شوٹ کر دوں گی اور پھر مجھے طلاق کی ضرورت باقی نہیں رہے گی۔“

میں نے پھر بے یقینی سے اسے دیکھا۔ ”تم مجھے شوٹ کر دو گی؟“

”ہاں۔“ اس نے کہا اور اچانک گولی چلا دی۔ میں لڑکھڑاکر پیچھے ہٹا۔ ایک لمحے کو مجھے لگا جیسے گولی مجھے لگی ہو۔ گولی چلنے کا دھماکا اتنا نہیں تھا لیکن بند کمرے میں یہ بہت زیادہ محسوس ہوا تھا۔ میں نے خود کو ٹٹولا اور سچ سلامت پاکر خدا کا شکر ادا کیا پھر میں نے برہمی سے اس کی طرف دیکھا۔

”تمہارا دماغ درست ہے۔“
”ہاں... لیکن اب تمہیں اندازہ ہو جانا چاہیے کہ میں سنجیدہ ہوں۔ جو سوراخ پیچھے دیوار میں ہوا ہے وہ تمہارے سینے میں بھی ہو سکتا تھا۔“

میں نے مڑ کر دیکھا واقعی دیوار میں سوراخ تھا۔ میں کانپ اٹھا تھا۔ گولی میرے بالکل پاس سے گزری تھی۔ نہ جانے اس نے سچ بچ گولی چلائی تھی یا مجھے ڈرا رہی تھی۔

”سارہ ایسا کیوں کر رہی ہو؟“
”اگر میں وضاحت کر سکتی تو پہلے ہی کر چکی ہوتی۔“

لیکن مجھے افسوس ہے میں کوئی وضاحت نہیں کر سکتی۔“

”کوئی اور راستہ نہیں۔“

”دوسرا راستہ میں تمہیں بتا چکی ہوں اور یہ تمہارے لیے اچھا نہیں ہوگا۔ بہتر ہے مجھے طلاق دو اور زندہ رہو۔“

”سارہ پلیز۔“

اس نے پتھول کا رخ میرے سینے کی طرف کر دیا۔ ”عمران میں اب تین تک گنوں گی۔ تم مرنا ہی چاہتے ہو تو تمہاری مرضی۔۔۔ ایک... دو۔۔۔“

اس کے تین کنبے سے پہلے میں نے فائل اٹھالی۔ یہ باقاعدہ اسٹاپ پیپر پر ٹائپ کیا ہوا طلاق نامہ تھا۔ اس میں گواہوں والی جگہ خالی تھی اس کے مطابق میں اپنے ہوش و حواس میں سارہ احمد ولد شریف احمد کو طلاق دے رہا ہوں۔ اس کا اور میرا ان آئی کی نمبر اور اس کی کاپی بھی تھی۔ میں نے اس پر سائن کیے اور فائل اس کی طرف پھینک دی۔ ”تم نے کسی مفید کے تحت مجھ سے شادی کی تھی؟“

”ظاہر ہے۔“ وہ فائل اٹھا رہے ہوئے بولی۔ ”مگر اطمینان رکھو اس سے تمہیں کوئی نقصان نہیں ہوگا اور نہ ہی مستقبل میں بھی ہماری ملاقات ہوگی۔ تمہارے ساتھ اجماعت گزارا کیونکہ تم سچ بچ بہت اچھے انسان ہو۔ کاش میں ہمیشہ تمہارے ساتھ رہ سکتی۔“ اس کے لہجے میں حسرت آ گئی تھی۔

”ہمیشہ رہنے والی یہ حرکت نہیں کرتی ہے۔“
”میں جانتی ہوں۔“ اس نے ٹھنڈی سانس لی۔ ”سچ بات یہ ہے کہ میں تمہارے قابل نہیں ہوں۔ مجھے یقین ہے تمہیں اچھی بیوی ملے گی۔ اب ذرا اپنے منہ سے بھی تین بار طلاق کہہ دو۔“

میں طلاق کے پیپر ز پر سائن کر چکا تھا۔ اس لیے زبان سے کہہ دینے میں بھی کوئی حرج نہیں تھا۔ میں نے اسے تین بار طلاق دے دی۔ وہ کھڑی ہو گئی۔ فائل اپنے بڑے سے بیگ میں رکھی۔ ”میں یہاں سے کچھ نہیں لے کر جا رہی ہوں سوائے تن کے ان کپڑوں کے۔۔۔ ہاں نکاح نامے کے لیے زحمت مت کرنا اس کی دونوں کاپیاں میرے پاس ہیں۔“

وہ کمرے سے نکل گئی۔ ایک منٹ بعد میں باہر نکلا تو گیت کے سامنے ایک سفید کار کی جھلک دکھائی دی۔ میں گیت سے نکلا تو ایک وائٹ کیب گلی سے مڑ رہی تھی۔ یعنی اس نے ٹیکسی بھی پہلے سے مست گوانی ہوئی تھی۔ میں واپس آیا اور اپنی چیزوں کی تلاشی لی۔ ہر چیز اپنی جگہ تھی کچھ نہیں

غائب تھا۔ سوائے سارہ کی چیزوں کے۔ نکاح کے موقع پہرے پاس اس کا شناختی کارڈ آگیا تھا لیکن میں نے غور نہیں کیا تھا اور نہ اس کا پتا وغیرہ دیکھنے کی زحمت کی تھی۔ میرا دماغ اڑا ہوا ہو رہا تھا۔ ہاں اس کے کپڑے وہاں موجود تھے جن میں اس کے وجود کی خوشبو بکھری تھی۔ وہ خوشبو جو کل رات تک میری تھی اور چند منٹ میں میری نہیں رہی تھی۔ وہ جس طرح میری زندگی میں اچانک آئی تھی اسی طرح اچانک نکل گئی۔ بغیر کوئی نام، پتہ اور نشان چھوڑے۔

کئی دن میں ہالوں کی طرح سوچتا رہا کہ اس نے میرے ساتھ ایسا کیوں کیا۔ وہ مجھ سے کچھ لے کر نہیں گئی تھی بلکہ اس نے مجھے اپنا آپ دیا تھا۔ پھر اچانک ہی سب واپس لے لیا اور چھوڑ کر چلی گئی اگر اس کا کوئی مقصد تھا تو اس نے مجھے ہی کیوں استعمال کیا تھا؟ ان سوالوں کا میرے پاس کوئی جواب نہیں تھا اور اسی وجہ سے میرا دماغ زیادہ خراب ہو رہا تھا۔ لیکن پھر رفتہ رفتہ مجھے صبر آنے لگا۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ اس واقعے کا کسی کو علم نہیں ہوا۔ چند دن بعد میں نے دفتر جانا شروع کیا اور پھر میرا دل نہیں لگا تو میں نے ابو سے کہا کہ میں واپس آ رہا ہوں میں نے جو کھینا تھا کھیا لیا تھا۔ امی ابو بھی اب میری جدائی برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں تھے اس لیے مجھے واپسی کی اجازت مل گئی۔

واپس آنے کے بعد میں ابو کے ساتھ بزنس میں لگ گیا۔ کچھ عرصے سارہ کی یاد تازہ رہی لیکن پھر یہ یاد دل کے نہاں خانوں میں اترتی چلی گئی اور بس ایک بھولی بھری چیز بن کر رہ گئی۔ تین سال بعد جب میں بزنس کو پوری طرح سمجھ چکا تھا تو امی ابو نے میری شادی کر دی۔ نازیہ میری پسندھی۔ نازیہ کے ماں باپ شروع میں اس رشتے پر آمادہ نہیں تھے لیکن بعد میں وہ بھی راضی ہو گئے تھے۔ نازیہ میری زندگی میں آئی تو میں سب بھول گیا تھا۔ لیکن سارہ کے اچانک سامنے آنے سے ماضی کی بھولی یاد دوبارہ تازہ ہو گئی تھی۔ مگر اب اس یاد میں ایک خوف شامل ہو گیا تھا کہ کہیں یہ بات نازیہ تک نہ پہنچ جائے۔ میں نے کال بند کر دی تھی لیکن اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ سارہ مجھ سے دوبارہ رابطہ نہ کرتی۔ میں نے محسوس کیا کہ مجھے اس سے بات کرنا پڑے گی۔ ورنہ کہیں اس کی طرف سے رابطے کی کوئی کوشش میرے گلے نہ پڑ جائے۔ میں نے شام کو دفتر سے اٹھنے سے پہلے سارہ کے نمبر پر کال کی۔ ”میں تم سے ملنا چاہتا ہوں آخری بار۔“

”پہلے کیوں کال کاٹ دی تھی؟“

”اس وقت میں ٹینشن میں تھا۔“

”تو اب کیوں ملنا چاہتے ہو؟“

”معاملہ کلیئر کرنے کے لیے تاکہ مستقبل میں ہم

دونوں کی زندگی میں کوئی مشکل نہ آئے۔“

”ٹھیک ہے کہاں ملو گے؟“

”کسی ریسٹوران یا ہوٹل میں ملنا خطرناک ہو سکتا

تھا۔ یہ میرا شہر تھا اور یہاں ہر جگہ میرے جاننے والے

تھے۔ کوئی دیکھ لیتا تو میرے لیے مسئلہ بن سکتا تھا۔ میں نے

لاہور جانے والی ایک پریس دے پراوائے ایک ریسٹوران کا

نام لیا۔ وہ دور دراز جگہ تھی اور وہاں پرائیویسی بھی تھی۔ وہ

راضی ہو گئی۔ ”میں چھپتے تمہارا انتظار کروں گا۔“

وہ ٹھیک وقت پر آئی اور میں اسے دیکھ کر حیران ہوا تھا

کیونکہ اس نے عیاں یا پن رکھا تھا اور چہرے پر نقاب تھا۔ میں

نے ایک بوتھ لیا تھا وہاں صرف ہم ہوتے۔ ہم بوتھ میں آئے

تو اس نے عیاں اور نقاب اتار دی۔ اس نے جدید تراش کا

چست لباس پہن رکھا تھا جو اس کے بدن کے تمام بیچ و خم

نمایاں کر رہا تھا۔ میں نے پانچ سال بعد اسے قریب سے

دیکھا تھا اور مجھے لگا کہ ان پانچ سالوں کا اگر اس پر کوئی اثر

ہوا تھا تو وہ مثبت ہی ہوا تھا۔ وہ پہلے سے زیادہ دلکش اور حسین

ہو گئی تھی۔ وہ شرمائی۔ ”ایسے کیا دیکھ رہے ہو؟“

میں جھینپ گیا۔ ”سورٹی میں بھول گیا تھا کہ اب میرا

تم پر کوئی حق نہیں ہے۔“

”وہ تو اب بھی ہو سکتا ہے۔“ اس نے معنی خیز لہجے

میں کہا۔

”پلیز.... جو پانچ سال پہلے ہوا تھا مجھے اس پر آج

بھی شرمندگی ہے۔ ہاں تمہارے ساتھ جو وقت گزرا وہ اچھا

تھا۔ مگر میرے لیے وہ بھی دفن شدہ ماضی کا ایک حصہ ہے۔“

میرے کھر دے لہجے پر وہ سنجیدہ ہو گئی۔ ”تب مجھے

کیوں بلایا ہے؟“

”دون باتوں کے لیے، ایک وہ سب کیا تھا جو تم نے

میرے ساتھ کیا تھا؟ دوسرے اب ہم دونوں اپنے اپنے

گھروں میں آباد ہیں اور ہمیں آبادی رہنا چاہیے۔“

اس نے گہری سانس لی۔ ”میں بھی یہی سوچ کر تم

سے ملنے آئی ہوں۔“

”تو یہ طے ہے کہ ہم آخری بار مل رہے ہیں اور آئندہ

جب بھی ہمارا سامنا ہوگا اتفاق سے اور اجنبی کی حیثیت سے

ہوگا؟“

”ڈن۔“ اس نے اپنا گلابی ہاتھ میری طرف بڑھایا

جو میں نے کسی قدر ہچکچاہٹ کے ساتھ تمام لیا۔

”وہ سب کیا تھا؟“

اس نے حیرت سے مجھے دیکھا۔ ”میرا خیال تھا تم

سمجھ گئے ہو گے؟“

”ہاں بعد میں ایک خیال آیا تھا لیکن تعیناتی تم کرو گی۔“

اس نے گہری سانس لی۔ ”ایک جھگڑے میں ظہیر

نے مجھے طلاق دے دی تھی۔ مجھے اس سے کوئی دلچسپی

نہیں ہے لیکن میں اپنے بچے کی صورت نہیں چھوڑ سکتی تھی

اور ظہیر سے بچے لے بھی نہیں سکتی تھی۔ اس لیے میرے پاس

ایک ہی صورت تھی۔ میں کسی سے شادی کروں اور پھر اس

سے طلاق لوں اور دوبارہ ظہیر سے نکاح کر لوں۔“

”لیکن میں ہی کیوں؟“

”میں نے اتفاق سے تمہیں دیکھا تھا۔ میں کراچی

چلی آئی تھی۔ کیونکہ میں سب سے چھپ کر یہ کام کرنا چاہتی

تھی۔ میں نے تمہارا گھر دیکھا اور پھر مظلوم بن کر وہاں پہنچ

گئی۔ اب یہ اتفاق ہے کہ تم بھی فیصل آباد کے رہنے والے

نکلے۔ اس سے آگے تم جانتے ہو۔“

”گو یا تم سب طے کر کے وہاں آئی تھیں؟“

”ہاں لیکن سب ویسا نہیں ہوا جیسا میں نے سوچا تھا۔

میرا خیال تھا کہ تم فوراً مجھ پر فریفتہ ہو جاؤ گے اور میں شادی

کی شرط رکھوں گی لیکن جب تم بس سے مس نہیں ہوئے تو

مجھے وہ سب کرنا پڑا۔“

”تمہارے لیے شاید نہ ہو لیکن میرے لیے یہ بہت

بڑی بات تھی۔ اسی بوجھ تلے دب کر میں تم سے شادی پر

راضی ہوا تھا۔“

وہ ہنسی۔ ”میں نے سنا ہے تم اپنی بیوی سے بہت

ڈرتے ہو؟“

”میں اس سے بہت محبت کرتا ہوں۔“ میں نے تھج

کی۔ ”وہ بھی مجھ سے جنون کی حد تک محبت کرتی ہے۔“

اس کا چہرہ پیکا پڑ گیا تھا۔ ”تم واقعی خوش قسمت ہو کہ

محبت کرتے ہو اور تمہاری بیوی تم سے محبت کرتی ہے۔ میاں

بیوی کی زندگی میں محبت نہ ہو تو یہ رشتہ بے معنی ہو کر رہ جاتا

ہے۔“ وہ کہتے ہوئے کھڑی ہو گئی اور عیاں پسینہ لگی۔ میں نے

اسے روکا نہیں کیونکہ وہ پہلے ہی میری زندگی سے نکل چکی تھی۔

وہی ہوتا ہے

محترم مدیر اعلیٰ

آداب عرض!

لوگ اپنے مفاد کی خاطر کس طرح دوسروں کی زندگی سے کھیلتے ہیں اس کا ثبوت خود میری زندگی ہے۔ میں نے جو کچھ لکھا ہے اسے صرف وقت گزاری کے لیے نہ پڑھا جائے یہ انسانوں کی بند آنکھیں کھولنے کے لیے کافی ہے۔ اگر خداوند تعالیٰ میرا ساتھ نہ دیتا تو میری زندگی جہنم بن گئی ہوتی۔

ارجمند

(سرگودھا)

جب وہ لوگ میرے گھر اپنے بیٹے کا رشتہ لے کر آئے تو ہم حیران رہ گئے تھے۔

کہاں تو ان کا یہ حال تھا کہ وہ ہماری طرف دیکھتے

بھی نہیں تھے۔ کسی تقریب میں ملاقات ہوتی تو سلام کا

جواب بھی گردن کے اشارے سے دیا کرتے۔ پھر دو چار

باتیں کر کے ادھر اُدھر ہو جاتے۔

ریاض نام تھا خاندان کے سربراہ کا۔ اور ان کی بیگم

تھیں شہزادی۔ میری سگی چھوٹی۔ اور ریاض میرے سگے



پھوپا تھے۔ ان کا ایک ہی بیٹا تھا کمال۔

نہ جانے یہ چسپا کیا ہوتا ہے۔ یہ رشتوں کو تو ذکر رکھ دیتا ہے۔ اس کے آگے ساری مروت ساری مہربانیاں ختم ہو جاتی ہیں۔

ہم غریب لوگ تھے (کم از کم ان لوگوں کے مقابلے میں تو بہت غریب ہی تھے) جبکہ ریاض صاحب بہت بڑے کاروباری تھے۔

بہت بڑی فرم تھی ان کی۔ شاندار کوٹھی، گاڑیاں، بینک بیلنس، سب کچھ تھا ان کے پاس۔ اس لیے پہلے تو ان لوگوں نے آنا جانا کم کیا پھر آہستہ آہستہ ہمارے لیے اجنبی ہوتے چلے گئے۔

بس کبھی کبھی کسی تقریب میں ملاقات ہو جاتی۔ اس سے زیادہ اور کوئی رسم و رواج نہیں تھی۔ ہاں عید بقرعید کے دن بھی رسماً ہمارے یہاں آ جایا کرتے۔

ان کا بیٹا کمال بھی ایک اکڑی ہوئی گردن والا نوجوان تھا۔ اس نے تو شاید ہمارے یہاں کبھی قدم بھی نہیں رکھا ہوگا۔

مجھ سے ملاقات ہوتی تو سرسری انداز سے خیریت وغیرہ معلوم کر کے ادھر ادھر ہو جاتا یا اپنے موبائل پر کسی سے بات کرنے لگتا۔

اس لیے جب پھوپا اور پھوپا ہمارے یہاں کمال کا رشتہ لے کر آئے تو ہم سب ہی حیران رہ گئے تھے۔

”بھائی صاحب“ لاجھی مارنے سے پانی جدا نہیں ہوتا۔ پھوپا نے کہا۔ ”آپ یہ نہ سمجھیں کہ ہم آپ کو بھول گئے ہیں یا آپ لوگوں کو چھوڑ دیا ہے۔ بس کم بخت فرصت ہی نہیں ملتی۔ دن رات کی مصروفیات میں۔ آپ تو جانتے ہیں کہ ریاض پاکستان میں کہاں ہوتے ہیں۔ آج یہاں ہیں تو کل وہاں۔“

”ہاں شہزادی۔“ ابانے ایک گہری سانس لی۔ ”ہم سب جانتے ہیں۔“

”انور بھائی، اب ہم اپنے پچھلے رویے کی تلافی کرنے آئے ہیں۔“ پھوپا ریاض نے کہا۔ ”مجھے امید ہے کہ ہمیں مایوس ہو کر نہیں جانا پڑے گا۔“

”میں نہیں سمجھا۔“ اب حیرت زدہ سے تھے۔ ”کس بات کی تلافی۔ کیسی مایوسی۔“

”ہم ارجمند کے لیے کمال کا رشتہ لے کر آئے ہیں۔“ پھوپا نے اچانک یہ بات کہہ دی۔

ہم سب کچھ دیر کے لیے سناٹے میں رہ گئے تھے۔ یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ ہم نے کیا سن لیا ہے۔ کمال کے لیے اور میرا رشتہ (اتفاق سے اس گفتگو کے دوران میں میں وہیں بیٹھی تھی)

”بھائی۔“ پھوپا نے میری امی کی طرف دیکھا۔ ”ہمیں ارجمند تو شروع ہی سے پسند تھی۔“

”لیکن آپ لوگوں کی طرف سے تو بھی اظہار بھی نہیں ہوا۔“

”کیا ضرورت تھی رسی اظہار کی۔ ہم نے سوچا کہ جب وقت آئے گا تو ایک ساتھ ہی سوالی بن کر پہنچ جائیں گے۔“

”ریاض میاں، اپنے صاحب زادے سے تو معلوم کر لیا ہوتا۔“ ابونے پھوپا سے کہا۔

”معلوم کر کے آئے ہیں انور بھائی“ بلکہ یہ اسی کی خواہش ہے۔“

اس انکشاف نے دوسروں پر جو بھی اثر ڈالا ہو، لیکن میں تو ان لوگوں کی طرف دیکھتی رہی تھی۔

اگر میرے ساتھ کسی اور کے نام کا سلسلہ ہوتا تو شاید میں پریشان بھی ہو جاتی۔ لیکن میرے ساتھ تو ابھی تک ایسی کوئی بات نہیں تھی۔

اتنا موقع ہی نہیں ملا تھا کہ کسی کے لیے سوچتی... یا کسی کی طرف توجہ دیتی۔ براہ راست شادی کے لیے رشتہ ہی آ گیا تھا اور وہ بھی کمال کے لیے۔

خدا جانے یہ کیا سلسلہ تھا۔

”بھائی صاحب کیا سوچنے لگے؟“ پھوپا نے ابو کی طرف دیکھا۔

”سمجھ میں نہیں آتا کیا جواب دوں۔“

”کمال آپ کے سامنے کا بچہ ہے۔ اولاد ہے آپ کی۔ اس کے لیے کیا سوچنا۔ پھر اپنا خون ہے۔“

”دیکھیں، یہ معاملہ چونکہ دو زندگیوں کا ہے۔ چلیں ایک طرف تو معلوم ہو گیا کہ کمال میاں اس رشتے کے لیے تیار ہیں۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ ارجمند کیا کہتی ہے۔ ہم اس پر کوئی دباؤ نہیں ڈال سکتے۔“

اب میں بول پڑی۔ ”چونکہ یہ معاملہ میری زندگی کا ہے۔ اس لیے میں یہ چاہتی ہوں کہ ایک بار کمال سے ملاقات کر لوں۔ تاکہ پتا چل جائے کہ انہوں نے میرا انتخاب کیوں کیا ہے۔“

”ہاں ہاں بیٹی کیوں نہیں۔“ پھوپا بول پڑیں۔ ”تم دونوں جب چاہے ایک دوسرے سے مل سکتے ہو۔ بلکہ کمال خود یہاں آ جائے گا۔“

میں پھر کچھ نہیں کہہ سکی۔ اٹھ کر دوسرے کمرے میں آ گئی۔

طے یہ پایا تھا کہ کمال دوسری شام کو ہمارے گھر آئے گا اور میں اس سے براہ راست بات کر سکوں گی۔ ویسے بھی وہ ہمارے لیے اجنبی تو نہیں تھا۔

پورا گھر اس رشتے پر حیران بھی تھا اور خوش بھی تھا۔ خاص طور پر ابو کو اس بات کی خوشی تھی کہ ان کی بہن نے انہیں بھلایا نہیں تھا۔

دوسری شام جب کمال آیا تو مجھے اس سے تنہائی میں بات کرنے کا موقع دے دیا گیا۔

”جی کمال صاحب۔“ میں نے براہ راست بات کی۔ ”یہ آپ کو اچانک ہم غریبوں کا خیال کیسے آ گیا۔ اور وہ بھی اس قدر کہ اپنا رشتہ تک بیچ دیا۔“

”ارجمند میری تو شروع سے یہی خواہش تھی۔“ کمال نے کہا۔ ”اور تم ہمارے لیے اجنبی تو نہیں ہو۔“

”اگر شروع سے خواہش تھی تو اس کا پتا کیوں نہیں چلا؟“

”یہ سب چھوڑو، تم یہ بتاؤ تم اس رشتے پر خوش ہو یا نہیں؟“

”یہ تو بہت ڈائریکٹ سوال کیا ہے آپ نے۔“

”اس لیے جواب بھی ڈائریکٹ ہی چاہتا ہوں۔“

”چلیں، اگر آپ کہہ ہی رہے ہیں تو مان لیتی ہوں۔“

کمال ہنس پڑا تھا۔

قصہ مختصر دو مہینوں کے اندر ہی میری شادی کمال سے ہو گئی۔ اور میں اپنے عام سے گھر سے اٹھ کر پھوپا کے شاندار گھر میں آ گئی۔

یہاں دنیا بھر کی آسانیاں اور نعمتیں حاصل تھیں۔ گھر والوں کا رویہ بھی بہت مناسب تھا۔ کم از کم انہوں نے کسی شکایت کا موقع نہیں دیا تھا۔

کمال کا رویہ بھی بہت اچھا تھا۔

سب کچھ ٹھیک تھا۔ ابو اور امی بھی اس بات پر خوش تھے کہ ارجمند کی قسمت بدل گئی ہے۔ زندگی نے اس کے دامن میں دھیرے دھیرے خوشیاں بھردی ہیں۔

سب کچھ ویسا ہی تھا جیسا ہوا کرتا ہے کہ ایک دن اچانک ایک ایسی خبر سننے کو مل گئی جس نے مجھے بدحواس کر کے رکھ دیا۔

اس دن میری ایک دوست انجم مجھ سے ملنے آئی تھی۔ کالج میں ہم ساتھ ہی ہوا کرتے تھے۔ میری شادی کے وقت وہ ملک سے باہر گئی ہوئی تھی۔ اس لیے شادی میں اس کی شرکت نہیں ہو سکی تھی۔

واپس آتے ہی اس نے میرے گھر پر فون کیا اور وہاں سے میرا نیا نمبر لے کر مجھ سے رابطہ کیا تھا۔ وہ فوری طور پر مجھ سے ملنا چاہتی تھی۔

میں نے اس کو اپنے گھر کا ایڈریس سمجھا دیا۔ کچھ دیر بعد وہ میرے اور کمال کے لیے بہت سے تحفے وغیرہ لے کر آ گئی۔ اس وقت کمال گھر پر نہیں تھے۔

ہم دونوں بہت دنوں کے بعد ملے تھے۔

میں اسے اپنے کمرے میں لے آئی۔ ”انجم، شادی میں تیری کمی بہت محسوس ہوئی۔“ میں نے کہا۔

”چل، اب تو آ گئی ہوں نا۔“ وہ مسکرا دی۔ ”اپنے میاں صاحب کی تصویریں تو دکھاؤ۔“

میں نے شادی اور ولیمہ کے البم اس کے سامنے کر دیے۔ پھر نہ جانے کیا ہوا کہ کمال کی تصویر دیکھتے ہی وہ چوکنی گئی۔ ”یہ یہ تمہارا شوہر ہے۔“

”ہاں، یہی تو ہیں کمال۔ پہلے میرے پھوپا زاد تھے اور اب میرے شوہر ہیں۔ لیکن بات کیا ہے؟“

”ارجمند، کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔“ انجم پریشان ہو گئی تھی۔

”بتاؤ تو سہی، کیا معاملہ ہے؟“

وہ کچھ بتانے سے گریز کرتی رہی۔ میرے بہت اصرار پر اس نے کہا۔ ”ارجمند، تجھے اس سے شادی نہیں کرنی تھی۔“

”آخر کیوں؟“

”بہت عجیب صورت حال ہے۔ تم نے کسی وقار حسین کا نام سنا ہے۔“

”نہیں تو۔“ میں نے انکار میں گردن ہلا دی۔ ”کون ہے یہ وقار حسین؟“

”ایک بہت بڑا صنعت کار۔“ اس نے بتایا۔ ”اس کی ٹیکسٹائل مل بہت مشہور ہے۔“

”چلو مان لیا تو پھر۔“ مجھ سے اس کا کیا تعلق۔

”تم سے نہیں، تمہارے شوہر کمال سے اس کی بیٹی

سارہ کا تعلق ہے۔“ اس نے بتایا۔ ”اور میں سارہ کو جانتی ہوں۔ دوست ہے میری۔۔۔ کمال اور سارہ کی شادی بھی ہونے والی تھی۔ اس کے بعد میں ملک سے باہر چلی گئی۔۔۔ اب جب واپس آئی تو کمال تمہارا شوہر بن چکا ہے، سمجھ میں نہیں آیا۔“

”یہ تو ایک عام سی بات ہے یار۔“ میں نے بے پردائی ظاہر کی۔ ”مردوں کا کیا ہے، وہ تو دس لڑکیوں سے دوستیاں کر لیتے ہیں۔“

”نہیں یار، یہ معاملہ کچھ اور ہی ہے۔“ اس نے کہا۔ ”دیکھ یار، تو ایسا کر، میرے ساتھ چل۔“

”سارہ کے گھر۔“ اس نے بتایا۔ ”واپس آکر میں نے ابھی اس سے ملاقات بھی نہیں کی ہے۔ تو اس پر ظاہر مت کرنا کہ کمال سے تیری شادی ہو چکی ہے۔ پھر خاموش رہ کر ہم دونوں کی باتیں سنی رہنا۔“

”کیا بے وقوفی ہے۔ اس سے کیا فرق پڑے گا۔“ ”تو یقین کر، میں اس وقت بہت اگلی تھی ہوں۔“ اس نے کہا۔ ”چونکہ مجھے یہ کہانی معلوم ہے۔ اس لیے میں اتنا پریشان ہو رہی ہوں۔ میں جو بھی بتاؤں گی، شاید تو اس پر یقین نہیں کرے گی۔ اس لیے میں چاہتی ہوں کہ میرے ساتھ سارہ کے پاس چل۔“

”کیا کمال نے سارہ سے شادی کر رکھی ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”نہیں۔ یہ بات کچھ اور ہی ہے۔“ اس نے کہا۔ ”میرے ساتھ چلے گی تو سب جان جائے گی۔“

”کیا وہ مجھے پہچان نہیں جائے گی۔ کیا کمال نے اس کو میری تصویریں نہیں دکھائی ہوں گی۔“

”ہاں یہ بات تو ہے۔“ وہ سوچنے لگی تھی۔ ”اچھا۔ تو پھر ایک اور ترکیب ذہن میں آ رہی ہے۔“ اس نے کہا۔ ”میں سارہ کو اپنے گھر بلاتی ہوں۔ تو بھی آجائے۔ میں تجھے ایسی جگہ چھپا دوں گی، جہاں سے تو ہماری باتیں سن سکے گی۔ اس کے بعد سب کچھ تجھ پر واضح ہو جائے گا۔“

”تو نے تو ایسا سا لاندہ دیا ہے جیسے یہ کوئی پراسرار معاملہ ہو۔“

”ہاں یار، ایسا ہی سمجھ لے۔“ اس نے ایک گہری سانس لی۔ ”بس تیار رہنا۔ میرا فون سننے ہی آجائے میرے گھر۔ لیکن خدا کے لیے اس کا ذکر کسی سے بھی نہیں کرنا۔“

ورنہ سارا کام خراب ہو جائے گا۔“

☆☆☆

سارہ ایک خوبصورت لڑکی تھی۔

اس کا انداز، اس کا لہجہ، اس کا لباس، یہ سب کچھ ظاہر کر رہا تھا کہ وہ ایک دولت مند گھرانے کی دولت مند لڑکی ہے۔

انجمن نے اپنے ڈرائنگ روم ہی میں مجھے ایک ایسی جگہ چھپا دیا تھا جہاں سے میں دونوں کے درمیان ہونے والی باتیں سن سکتی تھی۔

سارہ اور انجمن کے درمیان کچھ دیر تک اور دھڑکی باتیں ہوتی ہیں۔ پھر انجمن نے سارہ سے پوچھا۔ ”ہاں یار اب بتا، تیرے کمال کا کیا حال ہے۔“

”بالکل ٹھیک۔ اس نے تو آدھا کام کر دکھایا ہے۔“ سارہ نے بتایا۔

”کیا مطلب؟“

”ارے بھائی، اس نے شادی کر لی ہے۔“ سارہ نے کہا۔

”کس سے شادی ہو گئی اس کی۔“

”اپنی ماموں زاد سے شادی کر لی ہے۔“ اس نے بتایا۔ ”جلدی میں وہی اس کے ہاتھ کی تھی۔“

اتنا کہہ کر وہ ہنس پڑی۔ اور میرا یہ حال تھا جیسے کسی نے میرے بدن سے خون نچوڑ لیا ہو۔ یہ میں کیا سن رہی تھی۔ کیا مطلب تھا کہ میں جلدی میں ہاتھ کی تھی۔

کس بات کی جلدی۔ میرے خدا! یہ کیا معاملہ تھا؟

”میری جان، میرے ڈیڈ اور کمال کے ابو ریاض صاحب دونوں ہی شیخ صاحب کے مرید ہیں۔ اور شیخ صاحب پرو دونوں خاندانوں کا بہت اعتماد ہے۔ تم تو جانتی ہو کہ میری اور کمال کی شادی کی بات طے ہو چکی تھی کہ شیخ صاحب نے استعارہ نکال کر بتایا کہ کمال کی پہلی بیوی کچھ دنوں کے بعد مر جائے گی۔“

میرے خدا! میں نے یہ کیا سن لیا تھا۔ میرا ذہن سائیں سائیں کر رہا تھا۔ اتنے خود غرض، اتنے بے رحم لوگ۔ ”جانتی ہو اس کے بعد ہم دونوں کے خاندانوں کے لیے یہ پرائلیم کھڑی ہو گئی کہ اب کیا ہو۔ شیخ صاحب پر تو دونوں کو اعتماد تھا۔ سب سر جوڑ کر بیٹھ گئے۔ پھر یہ فیصلہ کر لیا گیا کہ فوری طور پر کمال کی شادی کسی اور لڑکی سے کرادی جائے۔ تاکہ جو بلا نازل ہوئی ہو وہ اسی پر ہو جائے۔“

”اس کے بعد تمہارے لیے میدان صاف ہو جائے گا۔“ انجمن نے کہا۔

”ہاں یار، اس کے بعد تو کوئی اندیشہ نہیں رہے گا۔“ ”یار، تم لوگ اتنے پڑھے لکھے اور روشن خیال ہو کر اپنی باتوں پر یقین رکھتے ہو، کیا یہ انتہائی درجے کی خود غرضی اور بے رحمی نہیں ہے۔“

”ہاں یار ہے تو۔“ سارہ نے کہا۔ ”لیکن جنگ اور محبت میں سب جائز ہوتا ہے۔“

فرض کرو، اگر ایسا نہیں ہوا تو پھر کیا کرو گی؟ انجمن نے پوچھا۔

”سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ ہمارے شیخ صاحب کی ابھی تک کوئی بات غلط نہیں ہوئی۔ اور اگر ایسا نہ بھی ہوا تو کمال کوئی نہ کوئی راستہ نکال ہی لے گا۔ وہ کسی بھی حال میں مجھے نہیں چھوڑ سکتا۔“

پھر وہ دونوں اور دھڑکی باتوں میں مصروف ہو گئیں۔ مجھے جو کچھ معلوم نہیں تھا وہ معلوم ہو چکا تھا۔ انسانی خود غرضی اور بے رحمی کی اعلیٰ ترین مثال میرے سامنے آ گئی تھی۔

اب اس بات پر کوئی حیرت نہیں ہو رہی تھی کہ پھوپھی اور پچھو یا اچانک اتنے مہربان کیوں ہو گئے تھے۔ کمال نے مجھے بھی غریب لڑکی سے کیوں شادی کی تھی۔ میں تو قربانی کا بکرا تھی۔ مجھے تو قربان ہونے کے لیے رکھا گیا تھا۔ کیونکہ انہیں یقین تھا کہ شیخ صاحب کے کہنے کے مطابق میری زندگی صرف چند دنوں کی ہے۔

سارہ کے جانے کے بعد جب انجمن نے مجھے آواز دے کر پردے سے باہر آنے کے لیے کہا تو میں صرف سکتے میں تھی۔ میری آنکھیں پتھریاں ہوئی تھیں۔

”سن لیا تو نے۔“ انجمن نے میرے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔ ”میں کچھ نہیں بول سکی۔ اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔“

اس وقت میرے ذہن میں سوائے سنانوں کے اور کچھ بھی نہیں تھا۔

☆☆☆

ان لوگوں پر ایک قیامت ٹوٹ پڑی تھی جب میں نے کمال سے طلاق کا مطالبہ کر دیا تھا۔

ایک ہنگامہ مچ گیا تھا۔ آخر کیوں؟ کیوں طلاق چاہتی ہو؟ کیا کسی نے اس گھر میں؟ کیوں اپنی زندگی خراب کرنے پر تیار ہو؟ وغیرہ وغیرہ۔

دنیا کے کسی بھی گوشے میں اور ملک گھر میں

گھر بیٹھے

رسالے حاصل کیجیے

جاسوسی ڈائجسٹ سسٹمز ڈائجسٹ
ماہنامہ پاکیزہ ماہنامہ سرگزشت

باقاعدگی سے براہ حاصل کریں، اپنے دروازے پر
ایک رسالے کے لیے 12 ماہ کا زر سالانہ
(بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ)

پاکستان کے کسی بھی شہر یا گاؤں کے لیے 700 روپے

امریکا، کینیڈا، آسٹریلیا، انڈونیشیا، لینڈ کے لیے 7,000 روپے

بقیہ ممالک کے لیے 6,000 روپے

آپ ایک وقت میں کئی سال کے لیے ایک سے زائد رسائل کے خریدار بن سکتے ہیں۔ رقم اسی حساب سے ارسال کریں۔ ہم فوراً آپ کے دیے ہوئے پتے پر رجسٹرڈ ڈاک سے رسائل بھیجنا شروع کر دیں گے۔

یہ آپ کی طرف سے اپنے پیلوں کے لیے بہترین تحفہ بھی ہو سکتا ہے۔ بیرون ملک سے قارئین صرف ویسٹرن یونین یا منی گرام کے ذریعے رقم ارسال کریں۔ کسی اور ذریعے سے رقم بھیجنے پر ہماری بینک فیس عاید ہوتی ہے۔ اس سے گریز فرمائیں۔

رابطہ: شرمیاس (فون نمبر: 0301-2454188)

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

63-C، فیز 111، پبلیکیشنز اینڈ ڈسٹریبیوٹرز، کراچی

فون: 35895313، فیکس: 35802551

نہیں چاہیے

محترم ایڈیٹر
السلام علیکم!

آپ یقین کریں یا نہ کریں یہ سب کچھ میں نے جاگتی آنکھوں سے دیکھا ہے اور اس تحریر کا ہر لفظ سچ پر مبنی ہے۔ لیکن آج تک میں اپنے دل کو مطمئن نہیں کر سکا ہوں کہ وہ آخر کیا تھا؟ خواب یا ذہنی اختراع مگر یہ سچ ہے اسی لیے میں اسے قارئین کے سامنے پیش کرنا چاہتا ہوں۔

منظر امام
(کراچی)

وہ ایک خوبصورت سا بچہ تھا۔ تین یا چار برس کا (بظاہر)۔
یاد رہے کہ اس کی عمر ہزاروں برس کی ہو۔

اس کے دو خوبصورت پر تھے۔ اس کی آنکھوں پر ایک سنہری پٹی بندھی ہوئی تھی۔ اس کے ہاتھ میں ایک کمان تھی۔ اس کی پشت پر ایک ترش بھی تھا۔ جس میں بہت سے تیر بھرے ہوئے تھے۔

وہ ایک چاندنی رات تھی۔ میں اپنے فلیٹ کی کشاہہ بالکونی میں بیٹھا ہوا چاند کو دیکھ رہا تھا۔ یہ میرا بہت پرانا

اور ایک دن وہی ہوا۔ جس کے لیے یہ پورا ناکہ رچایا گیا تھا۔ کمال اور سارہ کی شادی ہو گئی۔

کیونکہ ہونا بھی تو یہی تھا۔ یہ سارا کھیل ان دونوں کی شادی ہی کے لیے تو کھلیا گیا تھا۔ شیخ صاحب بھی بہت خوش ہو رہے ہوں گے کہ ان کی بات پوری ہو رہی ہے۔

اس شادی میں ہماری طرف سے کوئی نہیں گیا تھا۔ اور نہ ہی انہوں نے ہمیں مدعو کرنے کی زحمت کی تھی۔ ہمارا ایک طرح سے تو ان سے رشتہ ہی ختم ہو چکا تھا۔

پھر یہ پتا چلا کہ کمال اور سارہ جی مون کے لیے یورپ چلے گئے ہیں۔

اس وقت فطری طور پر مجھے بہت دکھ ہوا تھا۔ میں اپنے کمرے میں بند ہو کر بہت دیر تک روتی رہی تھی۔ انسان کی خود غرضی اور بے رحمی پر افسوس ہو رہا تھا۔

پھر ان دونوں کی شادی کے ایک مہینے کے بعد امی نے ایک خبر شادی۔ ”ارجمند، کمال نے جس لڑکی سے شادی کی تھی نا، کل رات اس کا انتقال ہو گیا۔“

”کیا!“ میں یہ خبر سن کر سناٹے میں رہ گئی تھی۔ ”انتقال ہو گیا؟ وہ کیسے؟“

”اچانک ہی رات کو اس کے دل میں درد اٹھا اور وہ ہسپتال جاتے جاتے مر گئی۔“

یا خدا! میں تو اس خبر کو سن کر لرز اٹھی تھی۔ تیری ہر بات میں صحت ہوتی ہے۔ تو کس طرح ارادوں کو ناکام یا کامیاب بناتا ہے۔ کیا ہوئی شیخ صاحب کی پیش گوئی۔ کہاں گئی سارہ کے ماں باپ کی سازش۔

کہاں گئے کمال کے ارادے۔ پھوپھی اور پھوپا کے گھناؤنے منصوبے سب خاک میں مل کر رہ گئے۔ خدا نے کمال کی اس پہلی بیوی کو سلامت رکھا جس کو قربانی کا جانور بنایا گیا تھا۔ اور اس کو موت دے دی جس کے لیے یہ سب کچھ کیا گیا تھا۔

واقعی اس کے فیصلے الگ ہی ہوتے ہیں۔ انسان اپنی مکارانہ سازشیں کرتا رہتا ہے اور تقدیر اس کے ارادوں پر ہنسی رہتی ہے۔

سنائے کہ اس کے بعد کمال اپنا ذہنی توازن تقریباً کھو چکا ہے، جبکہ خدا نے ایک بہت اچھے انسان سے میری شادی کروادی ہے۔ اور میں ایک خوش و خرم زندگی گزار رہی ہوں۔

میں نے انہیں کچھ نہیں بتایا کہ میں ایسا کیوں چاہتی ہوں۔

بس میری یہی ضد تھی کہ مجھے اس گھر میں رہنا۔ خیال یہ بھی تھا کہ اگر میں نے ابو اور امی کو یہ سب کچھ بتادیا تو رشتوں پر سے ان کا اعتبار ہمیشہ کے لیے اٹھ جائے گا۔

پھر کون کی پرہیزگار کرے گا۔ اسی لیے میں نے کچھ نہیں بتایا۔ صرف ضد کرتی رہی کہ مجھے ان کے ساتھ نہیں رہنا۔ میری دوست انجم کو جب اس بات کا پتا چلا وہ بھی میرے پاس آ گئی۔

”ارجمند کیا تو واقعی شیخ صاحب کی پیش گوئی سے گھبرا کر طلاق کا مطالبہ کر رہی ہے؟“ اس نے پوچھا۔

”بالکل بھی نہیں۔ مجھے ایسی باتوں پر کوئی یقین نہیں ہے۔“ ”تو پھر۔“

”بات صرف یہ ہے کہ میں ایسے خود غرض اور بے رحم لوگوں کے ساتھ زندگی نہیں گزار سکتی۔“ میں نے کہا۔ ”فرض کرو اگر مجھے کچھ نہیں ہوا۔ میں بیمار نہیں پڑی۔ مجھے موت نہیں آئی تو کیا کمال سارہ کو حاصل کرنے کے لیے کسی اور انداز سے مجھے راستے سے ہٹانے کی کوشش نہیں کرے گا۔“

”ہاں یہ تو ہوگا۔“ انجم نے کہا۔

”تو پھر بہتر یہی ہے تاکہ میں ایسے لوگوں سے دور ہو جاؤں۔“

بہر حال اس کے بعد خا خا جھگڑا ہوتا رہا۔ لیکن حیرت انگیز طور پر یہ ہوا کہ کمال نے مجھے طلاق دینے میں دیر نہیں لگائی تھی۔ اس کی وجہ بھی انجم سے پتا چلی تھی۔

”اس نے اس لیے تمہیں طلاق دے دی ہے کہ تم اس کی زندگی سے دور ہو رہی ہو۔“ اس نے بتایا۔ ”پہلی بیوی چاہے مر جائے یا طلاق کے کرا لگ ہو جائے۔ بات ایک ہی ہے۔“

میں نے گہروالوں کو اس کے بعد بھی کچھ نہیں بتایا۔ سارا الزام میں نے اپنے سر پر لے لیا۔ سب کا یہی کہنا تھا کہ ضرور میری ہی غلطی ہوگی۔ ورنہ کمال ایسا نہیں تھا۔ پھوپھی ایسی نہیں ہیں۔ پھوپا ایسے نہیں تھے۔

اب میں کیا بتاتی کہ وہ کیسے تھے؟ اور میرے لیے انہوں نے کیا سوچا ہوا تھا۔

میرا اندازہ تھا کہ اس گھر میں میرے نکل جانے کے بعد خوشیاں منائی جا رہی ہوں گی۔ کیونکہ ایک طرح سے میری قربانی تو ہو ہی چکی تھی۔



مشغلہ ہے۔ چاند مجھے ہمیشہ سے اپنی طرف کھینچتا چلا آیا ہے۔
تو وہ ایک چاندنی رات تھی۔ جب میں نے کسی چیز کو
فضا میں پرواز کرتے ہوئے دیکھا۔ چاندنی میں وہ چیز
چاندی کی طرح بگلا رہی تھی۔ نہ جانے کیا چیز تھی۔
ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ چاند سے نکل کر سیدھا زمین کی
طرف آ رہی ہو۔

میں اسے حیرت سے دیکھتا رہا۔ وہ قریب آ رہا
تھا۔ قریب، بہت قریب، پھر وہ براہ راست اسی بالکونی میں
اتر آیا جہاں میں بیٹھا تھا۔

یہ ایک غیر معمولی بات تھی۔ لیکن حیرت اس بات کی
تھی کہ مجھے اس کے کوئی خوف محسوس نہیں ہو رہا تھا بلکہ اس
پر پیارا رہا تھا۔ میں اسے بہت دیکھی سے دیکھے جا رہا تھا۔
وہ میرے قریب آ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کی آنکھیں
بہت خوبصورت اور روشن تھیں۔

”تم نے پہچانا مجھے؟“ اس نے میری طرف دیکھتے
ہوئے پوچھا۔

”مجھ یاد آ رہا ہے۔ تم بہت جلد پہچانے لگ رہے
ہو۔“ میں نے کہا۔

”میں کیو پڈ ہوں۔“ اس نے بتایا۔

اور ایک دم سے یاد آ گیا کہ یہ مشہور و معروف یونانی
دیوتا کیو پڈ ہے۔ عشق اور محبت کا بانی۔ میں نے جس کے
مجھے دیکھے تھے۔ جس کی ہزاروں تصویریں دیکھی تھیں۔ جو
اپنا تیر چلا کر دو انجان دلوں کو ایک دوسرے کی محبت میں
باندھ دیا کرتا ہے۔

”ہاں یاد آ گیا تم کون ہو۔“ میں نے کہا۔ ”لیکن تم تو
افسانوی اور خیالی کردار ہو کر تھے۔“

”نہیں، میں افسانوی کردار نہیں ہوں۔“ وہ جلدی
سے بولا۔ پھر دریافت کیا۔ ”اگر میں بیٹھ جاؤں تو تمہیں کوئی
اعتراض تو نہیں ہوگا۔“

”نہیں، بیٹھ جاؤ۔ میں تو خود کہنے والا تھا۔“

وہ میرا شکر یہ ادا کر کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا۔

وہ واقعی بہت مہذب تھا اور خوبصورت اتنا کہ اس کے
چہرے سے نگاہ نہیں ہٹتی تھی۔

”پہلے یہ بتاؤ، تمہارے لیے چائے یا شربت
لاؤں۔“ میں نے پوچھا۔

”نہیں، مجھے ان چیزوں کی ضرورت نہیں ہے۔“

اس نے کہا۔

”کیو پڈ یہ بتاؤ تم میرے پاس کیوں آئے ہو؟“
مجھے یہ بتایا گیا تھا کہ تم کہانیاں لکھا کرتے ہو۔
بہت سوچنے اور محسوس کرنے والا احساس دل رکھتے ہو۔
اس نے کہا۔ ”اسی لیے مجھے تمہارے پاس بھیجا گیا ہے کہ
تم ان کرداروں کی کہانیاں لکھو جن کو میں محبت میں جلا
کر دوں گا۔“

”لیکن میرے لیے یہ کوئی نئی بات نہیں ہوگی۔ میں
نے محبت کی بے شمار کہانیاں لکھی ہیں۔“ میں نے بتایا۔

”وہ تم نے اپنے حساب سے لکھی ہوں گی۔ اب
میرے بتائے ہوئے کرداروں پر لکھو۔“ اس نے کہا۔

”چلو ٹھیک ہے، میرے لیے بھی یہ ایک نیا اور
دلچسپ تجربہ ہوگا۔“

”ٹھیک ہے۔“ اس نے ایک گہری سانس لی۔ ”میں
کل صبح ہی سے اپنا کام شروع کر رہا ہوں۔“

☆☆☆

پھول وقتی نے کئی انکھوں سے اس نوجوان کی طرف
دیکھا اور ہوئے سے مسکرا دی اور صفائی کرنے میں مشغول
ہو گئی۔ وہ ایک بیگن تھی۔

بہت خوبصورت۔ بہت تازہ جسم تھا اس کا۔ بید کی
طرح لہراتی ہوئی۔ نہ جانے کتنے اسے دیکھ کر آہیں بھرا
کرتے لیکن وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ ان کا مقصد کیا ہے۔

اس کے لیے تو پوری دنیا میں صرف ایک ہی تھا۔
گوپال۔ جو اس کی برادری ہی سے تعلق رکھتا تھا۔ وہ
خاکرواہوں کا ہیڈ تھا۔ میونسپل والوں نے بہت سے
خاکرواہوں کو اس کے انڈر میں کر دیا تھا۔

وہ صبح سویرے ہر ایک کی ڈیوٹی مختلف مقامات پر
لگایا کرتا۔ پھول وقتی کو وہ اس علاقے میں رکھتا تھا جہاں
وہ خود ہوا کرتا۔ کیونکہ دونوں ہی ایک دوسرے کو بہت
پسند کرتے تھے۔

آج کچھ عجیب بات ہوئی تھی۔ ایک نوجوان اپنی
شاندار گاڑی سے اتر کر پھول وقتی کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا
تھا۔ وہ پھول وقتی کو دیکھے جا رہا تھا۔

اس کی نگاہیں پھول وقتی کو اپنے وجود میں اترتی ہوئی
محسوس ہو رہی تھیں۔ لیکن یہ عجیب بات تھی کہ پھول وقتی کو
اس برعکس نہیں آ رہا تھا۔ اس کے برعکس اسے جیسا محسوس
ہو رہی تھی۔

اسے اس نوجوان کی نگاہیں۔ دوسروں کی نگاہیں

سے الگ دکھائی دے رہی تھیں۔ جیسے وہ پھول وقتی سے کچھ
کہنا چاہتا ہو۔ اس نے دیکھا کہ اس کے ساتھ کام کرنے
والی دوسری بیگنیں کچھ فاصلے پر چھاؤ دے رہی تھیں۔ کسی
کی توجہ پھول وقتی اور اس نوجوان کی طرف نہیں تھی۔
اچانک وہ نوجوان پھول وقتی کے پاس آ کر کھڑا
ہو گیا۔ وہ پھول وقتی سے کچھ کہنا چاہتا تھا۔

”کیا بات ہے بالو جی۔“ پھول وقتی نے شرماتے
ہوئے پوچھا۔ ”کیا مجھے سے کوئی کام ہے؟“

”ہاں،“ اس نوجوان نے ایک گہری سانس
لی، ”تمہارا نام ہے؟“

”پھول وقتی۔“

”تم واقعی پھول ہی کی طرح ہو۔“ نوجوان نے
کہا۔ ”تازہ اور خوبصورت۔ سنو، میرا نام امجد ہے۔ میرا
بہت بڑا کاروبار ہے۔“

”تو پھر۔“ پھول وقتی نے اس کی طرف دیکھا۔ ”کیا
کہنا ہے تمہیں۔“

”میں تو سمجھ میں نہیں آ رہا کہ میں تم سے کیا کہوں۔ نہ
جانے کیوں یہ دل چاہا کہ تم سے بات کروں۔ اسی لیے
تمہارے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔“

”بابا اب تم جاؤ۔“ پھول وقتی نے کہا۔ ”تم ایک بابو
ہو۔ میں ایک بیگن ہوں۔ تمہارا ہم سے اس طرح باتیں کرنا
اچھا نہیں ہے۔ دیکھنے والے کیا سوچیں گے۔“

”ہاں پھول وقتی، میں شاید پاگل ہی ہو گیا ہوں۔
ویسے تم مجھ سے ایک وعدہ کرو۔“

”کیسا وعدہ۔“

”میں کہ تم مجھ سے باتیں کیا کرو گی۔ میں جب بھی
تمہارے پاس آؤں، تم کچھ دیر کے لیے اپنے کام پھول کر
میری طرف توجہ دو گی۔“

پھول وقتی کا دل چاہا کہ وہ اس نوجوان سے کہہ
دے کہ تم جب بھی آؤ گے میں تمہیں اپنے دل میں بٹھا
لوں گی۔

لیکن وہ کچھ نہیں کہہ سکی۔ اسی دوران گوپال ان کے
پاس آ کر کھڑا ہو گیا تھا۔ گوپال کو دیکھ کر وہ نوجوان... اپنی
گاڑی کی طرف بڑھ گیا۔

”کیا بات ہے پھول وقتی۔“ گوپال نے پھول وقتی
سے پوچھا۔ ”یہ آدمی تم سے کیا باتیں کر رہا تھا؟“

”یہ مجھ سے پوچھ رہا تھا کہ کیا میں اس کے یہاں کام

کروں گی۔“ پھول وقتی نے بہانہ بنایا۔ ”اس کی کوئی یہاں
سے قریب ہی ہے۔“

”یہ حرازادے اسی قسم کی باتیں کرتے ہیں۔“
گوپال نے برا سامنے بنایا۔ ”پچھلی چہری باتیں کر کے تم
جیسوں کو چھانٹ لیتے ہیں۔ آئندہ تم سے بات کرے تو
گالیاں دے کر بھگا دینا۔“

پھول وقتی اس سے کیا کہتی کہ وہ نوجوان اس کے لیے
کتنا اہم ہو گیا ہے۔ وہ کس طرح ذرا سی دیر میں آنکھوں کے
راستے اس کے دل کے کسی کونے میں جا کر بیٹھ چکا ہے۔

امجد اپنی گاڑی میں آ کر بیٹھ گیا۔

اس کی نگاہیں ابھی تک پھول وقتی کا طواف کر رہی
تھیں۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آخر اسے ہوا کیا
ہے۔ وہ ایک اسمارٹ نوجوان تھا۔ بزنس میں تھا۔ بڑھا لکھا
تھا۔ بہت سی لڑکیوں سے اس کی دوستی بھی تھی۔ لیکن جو

کیفیت پھول وقتی کو دیکھ کر ہوئی تھی ایسی پہلے تو کبھی نہیں
ہوئی تھی۔

اس کی دوست لڑکیاں اس کے لیے تفریح کا ذریعہ
تھیں۔ ان کے ساتھ اچھی کمپنی ہوا کرتی تھی۔ لیکن اس
بیگن کے ساتھ تو معاملات ہی کچھ اور ہونے لگے تھے۔

وہ اس کے وجود کو اپنے دل میں اترتا ہوا محسوس
کرنے لگا تھا۔

☆☆☆

کیو پڈ نے جب مجھے ان دونوں کی یہ کہانی سنائی تو
میں بھڑک اٹھا۔ ”یہ کیا کیا تم نے؟“ خواخوہ ان دونوں کی
زندگی برباد ہو جائے گی۔“

”محبت میں تو ایسا ہی ہوتا ہے۔“

”لیکن یہ کیسی محبت ہونے لگی ہے۔“ میں نے
کہا۔ ”تم ذرا ان دونوں کے Status کو تو دیکھو۔
آسمان زمین کا فرق ہے۔“

”محبت تو اسی کا نام ہے۔ پوری دنیا ہزاروں برسوں
سے یہ جانتی ہے کہ محبت اندھی ہو کر پڑتی ہے۔“

”لیکن اب اتنی بھی تو اندھی نہیں ہوتی۔“

”ایسا ہی ہوتا ہے۔ تم ان دونوں کی داستان محبت کو
پروان چڑھو نہ پھر دیکھنا کیا کیا ہوتا ہے۔“

”ایسا نہ ہو کہ تمہارے چکر میں دونوں ہی پاگل
ہو جائیں۔“

”جو بھی ہوگا، وہ تمہارے سامنے آ ہی جائے

گا۔“ کیونکہ پڑنے کہا۔ ”کیا تمہیں اس بات کی خوشی نہیں ہے کہ میں تمہیں کہانی کے لیے ایک لاجواب جھجکت دے رہا ہوں۔ ایک انوکھی داستان کی ابتدا ہونے والی ہے۔“

☆☆☆

انوکھی داستان کی ابتدا ہو چکی تھی۔ رات بھر تارے گنگنا محاورہ ہی کہی لیکن امجد اس وقت تارے ہی گن رہا تھا۔ اس کا کمر اوپر ہی منزل پر تھا۔ کمرے کے ساتھ ہی دروازہ چھت کی طرف کھلتا تھا۔ وہ چھت پر کرسی ڈال کر بیٹھ گیا تھا۔

اس کی نگاہیں ستاروں کی طرف تھیں۔ ایسی بے چینی اس کی سمجھ سے باہر تھی۔ وہ نہیں پاگل تو نہیں ہو گیا تھا۔ وہ جھجکت اس کے معیار اور رتبے کی کہاں تھی تو پھر وہ کیوں یاد آ رہی تھی۔ اس کے لیے ایسی بے چینی کیوں ہونے لگی تھی۔ اس نے کسی کے آنے کی آہستہ سی اور گردن کھٹا کر دروازے کی طرف دیکھا۔ آنے والے کو دیکھ کر اس نے اطمینان کی سانس لی تھی۔ وہ اس کا دوست تھا پرویز۔

پرویز آتے ہی شروع ہو گیا تھا۔ ”یار، کیا ہو گیا ہے تمہیں! میں آیا تو آئی نے بتایا کہ تم بہت دیر سے چھت ہی پر بیٹھے ہو۔ اسی لیے میں تمہیں دیکھنے اوپر آ گیا۔ خیریت تو ہے نا۔“

”ہاں یار، بظاہر تو خیریت ہے لیکن خیریت نہیں ہے۔“ امجد نے کہا۔

”کیا مطلب؟ کیا ہو گیا ہے؟“

”بیٹھ جاؤ۔“ امجد نے کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ ”اطمینان سے بتاتا ہوں۔“

پرویز سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا تھا۔ ”ہاں اب بتاؤ۔“

”یار، مجھے عشق ہو گیا ہے۔“

”یہ تو کوئی نئی بات نہیں ہے۔“ پرویز ہنس پڑا۔ ”تم تو نہ جانے کتنی لڑکیوں سے فلٹ کر چکے ہو۔“

”میری جان یہ فلٹ نہیں ہے۔ عشق ہے عشق۔“ امجد نے بتایا۔ ”ویسا عشق تم نے جس کی کہانیاں سنیں ہوں گی۔ جس پر فلمیں دیکھیں ہوں گی۔“

”ارے جاؤ یار، تم کو اس قسم کی بیماری ہو ہی نہیں سکتی۔“

”ہوگئی ہے دوست۔“

”تو پھر وہ کسی عالی شان گھرانے کی چشم و چراغ کوئی

خوبصورت اسارٹ سی لڑکی ہوگی۔“

”نہیں، یہ بھی نہیں ہے۔ بلکہ میں نے اگر بتا دیا تو تم مجھے پاگل سمجھو گے۔ مجھے گالیاں دو گے۔“

”میرے بار، اب بتا بھی دے۔ کون ہے وہ؟“

”وہ ایک جھجکت ہے۔“ امجد نے بتایا۔

”کیا؟“ پرویز اپنی کرسی سے اچھل ہی پڑا تھا۔

”جھجکت!“

”ہاں یار، وہ ایک خاکروب ہے۔ سڑکوں پر چھاڑو لگاتی ہے۔ پھول وٹی نام ہے اس کا۔“

”کیا پاگل ہو گئے ہو؟“ پرویز نے کہا۔ ”یہ کیسی بات سنا رہے ہو۔“

”پاگل ایسا ہی ہے یار۔ میں صرف ایک جھجکت دیکھ کر اپنے ہوش کھو بیٹھا ہوں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا ہو گیا تھا مجھے۔ بس میں اس کی طرف کھینچ چلا گیا۔ اور حیرت کی بات یہ ہے کہ جو حال میرا تھا وہی حال اس کا بھی تھا۔ ہم دونوں ایک دوسرے کو سکتے کی سی کیفیت میں دیکھتے رہ گئے تھے۔“

”میرا خیال ہے کہ تم اپنے دماغ کا علاج کروالو۔“ پرویز نے کہا۔

”ہاں یار، اب تو ایسا ہی لگ رہا ہے۔“ امجد نے کہا۔ ”اب تم ہی مشورہ دو کہ میں کیا کروں۔“

”بہتر یہی ہے کہ اپنے دماغ کا علاج کروالو۔“ پرویز چڑ کر بولا۔ ”میں اس سے اچھا مشورہ نہیں دے سکتا۔“

”اب تم جو بھی کہتے رہو۔ میں عشق میں مبتلا ہو چکا ہوں۔“

”ایک بات بتاؤ۔ کیا تم اس سے شادی کر سکو گے؟“

”ہاں۔“ امجد کا لہجہ پریقین تھا۔ ”اگر اس نے بھی میری محبت کا جواب بھر پور انداز سے دیا۔ اگر اس کے دل میں بھی ایسی تڑپ رہی تو میں اس کو حاصل کرنے کے لیے سب کچھ کر زوروں گا۔“

”تو پھر خدا تمہاری حالت پر رحم کرے۔“

☆☆☆

رام گوپال بہت حیرت اور دکھ بھری نگاہوں سے پھول وٹی کو دیکھ رہا تھا۔

پھول وٹی اس کے سامنے بیٹھ کر روئے جاری تھی۔ ”میں نہیں جانتی۔۔۔ گوپال کہ مجھے کیا ہو گیا ہے۔ میں شاید پاگل ہو گئی ہوں۔ میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔ تو میرا سب سے اچھا دوست ہے۔ میرا ہمدرد ہے، اسی لیے اپنے

دل کی بات کھل کر کر رہی ہوں۔ میں جانتی ہوں کہ تیرے علاوہ میرا دکھ کوئی نہیں جان سکتا۔“

”لیکن بھئی یہ تو سوچ کہ یہ سب کیسے ہو سکتا ہے۔“

رام گوپال نے کہا۔ ”ہمارے دھرم الگ، ہماری برادری الگ، ہم سڑکوں پر چھاڑو دینے والے، وہ گاڑیوں میں گھومنے والا۔ پھر تو نے یہ کون سا روگ اپنے آپ کو لگایا ہے۔“

”یہی تو نہیں معلوم کہ یہ کون سا روگ ہے۔“ پھول وٹی کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ ”بس دل ہے کہ اس کی طرف کھینچا چلا جا رہا ہے۔ تن میں اس کا آگ کی لگی ہوئی ہے۔ ہر وقت اسی کا دھیان رہتا ہے۔ جب سے اس کو دیکھا ہے، ایک بل کے لیے بھی جھین نہیں ہے۔“

”پاگل مت بن پھول وٹی۔ چاند کو دیکھ کر راستے پر سفر نہیں کرتے، ٹھوکر لگ جاتی ہے۔ راستے میں گڑھے بھی ہوتے ہیں۔“

”میں یہ سب جانتی ہوں۔“ پھول وٹی نے کہا۔ ”میں کوئی پاگل نا سمجھ یا بے وقوف نہیں ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ میرے اور اس پاپو کے درمیان بہت فرق ہے۔ اس کے باوجود میں اسے بھول نہیں سکتی۔ ایسا لگتا ہے جیسے کسی نے مجھ پر چادو کر دیا ہو۔“

”بے وقوف، تو بہت سوں سے زیادہ خوبصورت اور حسین ہے۔“ گوپال نے کہا۔ ”اس قسم کے لوگ عیاش ہوتے ہیں۔ وہ تجھ سے کھیل کر بھول جائے گا تجھے۔“

”نہیں، ایسا نہیں ہو سکتا۔“ پھول وٹی پورے یقین کے ساتھ بولی۔ ”وہ بھی میرے لیے اتنا ہی بے چین اور پاگل ہو رہا ہوگا جس طرح میں ہو رہی ہوں۔ یہ میرا دل کہہ رہا ہے۔ میں نے۔۔۔ پہلی بار ہی اس کی آنکھوں میں پریم کی جوت چلتے ہوئے دیکھ لی تھی۔“

”اچھا ایک بات بتا، کیا تو اس سے بیاہ کر سکتی ہے۔“ گوپال نے پوچھا۔

”نہیں۔“ پھول وٹی نے اپنی گردن ہلا دی۔ ”کبھی نہیں۔ میں اس کو کسی امتحان میں نہیں ڈالنا چاہتی۔ میں تو صرف اور صرف اس سے محبت کرنا چاہتی ہوں، صرف محبت۔ اس کے علاوہ اور کچھ نہیں۔“

”کمال کی بات ہے۔“ گوپال کی حیرت بڑھتی جا رہی تھی۔ ”نہ جانے اس طرح کی محبت کے ذریعے تو کیا حاصل کر لگی۔“

”یہی تو اصل بات ہے گوپال۔ محبت کچھ حاصل کرنے کا نام نہیں ہوتا۔“ پھول وٹی نے کہا۔ ”میں تو صرف اور صرف اس سے محبت کرنا چاہتی ہوں۔“

☆☆☆

کچھ دیر بعد تمہیں ایک وعدہ کرنا ہوگا۔

”کیا وعدہ۔“

”میں جانتا ہوں کہ تم ابھی تک صرف کہانیاں لکھتے رہے ہو۔ محبت کی کہانیاں۔ لیکن تم نے خود بھی کسی سے محبت نہیں کی، اس تجربے کے بعد تمہیں محبت کرنی ہوگی۔“

”یہ کیا بات ہوئی۔“ میں غصے میں بولا۔ ”محبت میں جلا کرنا تو تمہارے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ میری طرف بھی ایک تیر چلا دینا۔“

”نہیں، تمہاری طرف نہیں۔“

”یہی تو اصل بات ہے گوپال۔ محبت کچھ حاصل کرنے کا نام نہیں ہوتا۔“ پھول وٹی نے کہا۔ ”میں تو صرف اور صرف اس سے محبت کرنا چاہتی ہوں۔“

☆☆☆

کچھ دیر بعد تمہیں ایک وعدہ کرنا ہوگا۔

”کیا وعدہ۔“

”میں جانتا ہوں کہ تم ابھی تک صرف کہانیاں لکھتے رہے ہو۔ محبت کی کہانیاں۔ لیکن تم نے خود بھی کسی سے محبت نہیں کی، اس تجربے کے بعد تمہیں محبت کرنی ہوگی۔“

”یہ کیا بات ہوئی۔“ میں غصے میں بولا۔ ”محبت میں جلا کرنا تو تمہارے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ میری طرف بھی ایک تیر چلا دینا۔“

”نہیں، تمہاری طرف نہیں۔“

”یہی تو اصل بات ہے گوپال۔ محبت کچھ حاصل کرنے کا نام نہیں ہوتا۔“ پھول وٹی نے کہا۔ ”میں تو صرف اور صرف اس سے محبت کرنا چاہتی ہوں۔“

☆☆☆

کچھ دیر بعد تمہیں ایک وعدہ کرنا ہوگا۔

”کیا وعدہ۔“

”میں جانتا ہوں کہ تم ابھی تک صرف کہانیاں لکھتے رہے ہو۔ محبت کی کہانیاں۔ لیکن تم نے خود بھی کسی سے محبت نہیں کی، اس تجربے کے بعد تمہیں محبت کرنی ہوگی۔“

”یہ کیا بات ہوئی۔“ میں غصے میں بولا۔ ”محبت میں جلا کرنا تو تمہارے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ میری طرف بھی ایک تیر چلا دینا۔“

”نہیں، تمہاری طرف نہیں۔“

”یہی تو اصل بات ہے گوپال۔ محبت کچھ حاصل کرنے کا نام نہیں ہوتا۔“ پھول وٹی نے کہا۔ ”میں تو صرف اور صرف اس سے محبت کرنا چاہتی ہوں۔“

☆☆☆

کچھ دیر بعد تمہیں ایک وعدہ کرنا ہوگا۔

”کیا وعدہ۔“

”میں جانتا ہوں کہ تم ابھی تک صرف کہانیاں لکھتے رہے ہو۔ محبت کی کہانیاں۔ لیکن تم نے خود بھی کسی سے محبت نہیں کی، اس تجربے کے بعد تمہیں محبت کرنی ہوگی۔“

”یہ کیا بات ہوئی۔“ میں غصے میں بولا۔ ”محبت میں جلا کرنا تو تمہارے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ میری طرف بھی ایک تیر چلا دینا۔“

”نہیں، تمہاری طرف نہیں۔“

”وہ کیوں۔“

”میں چاہتا ہوں کہ تم اپنی مرضی سے محبت کرو۔ اپنی محبت کے لیے میرے محتاج نہ رہو۔“ اس نے کہا۔ ”خود ہی کسی کو منتخب کرو اور خود ہی ابتدا کرو۔“

☆☆☆

پھول وتی اور امجد کی محبت نے ایک ہنگامہ برپا کر رکھا تھا۔

امجد کے باپ کو مجبوراً یہ بات امجد کے ہونے والے سرکوبتانی پڑی تھی۔

اس کہانی کا چرچا اس طرح ہوا کہ امجد کے دوست پرویز نے امجد کے باپ کو سب کچھ بتا دیا تھا۔ امجد کا باپ بہت سوچ سمجھ کر قدم اٹھانے والا انسان تھا۔

اس نے اسے طور پر جب تفتیش کی تو پتا چلا کہ امجد واقعی ایک جھٹکن کے عشق میں مبتلا ہو چکا ہے۔ وہ دونوں کئی بار ایک دوسرے کے ساتھ دیکھے گئے تھے۔

امجد کے باپ نے امجد کی عقلی ایک دولت مند طاقتور قسم کے آدمی کی بیٹی سے سرکوبتانی کی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ اس شادی کے بعد خود امجد کے باپ کے Status میں اضافہ ہو جائے گا۔

لیکن اب امجد نے ایک جھٹکن کے عشق میں مبتلا ہو کر سارا کھیل بگاڑ دیا تھا۔ اس طرف امجد کے ہونے والے سرکوبتانی اس صورت حال کا علم ہو چکا تھا۔

اس نے امجد کے باپ سے ملاقات کی۔ ”خلیل صاحب! یہ کیا تماشا ہے۔“ اس نے غصے سے پوچھا۔ ”تمہارے بیٹے نے یہ کیا لگا رکھا ہے۔“

”میں تو خود آپ کے پاس آکر یہ سب کچھ بتانے والا تھا۔“ امجد کے باپ نے کہا۔ ”ایسا لگتا ہے جیسے وہ یا تو پاگل ہو گیا ہو یا اس پر کالا جادو کر دیا گیا ہو۔“

”جادو؟“ امجد کے ہونے والے سرکی آنکھوں میں چمک سی آگئی۔ ”ہاں، یہ ٹھیک کہا آپ نے، کالا جادو۔“ اس قسم کے لوگ کالا جادو میں بہت مہارت رکھتے ہیں۔ میں نے ان کے بارے میں بہت کچھ سن رکھا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس کم بخت جھٹکن نے امجد پر جادو ہی کر دیا ہو۔ ورنہ وہ تو بہت معقول نوجوان ہے۔“

”تو پھر بتائیں، اس کا کیا علاج کیا جائے۔ وہ تو پاگل ہو رہا ہے۔“

”اس کا ایک ہی علاج ہے۔“ اس نے کہا۔ ”خلیل

صاحب، آپ مطمئن ہو جائیں، یہ کہانی ختم ہونے والی ہے۔“

☆☆☆

کہانی بہت ہی بھیاں گانڈ میں ختم ہوئی تھی۔ دو موٹر سائیکل سوار پھول وتی پر گولیاں برساتے ہوئے گزر گئے تھے۔ اخبار اور چینل والوں نے بھی صرف اتنا ہی بتایا تھا کہ شہر میں ایک اور دہشت گردی کی واردات ہو گئی۔ ایک خاکروب لڑکی پھول وتی کو صبح سویرے دہشت گردوں نے گولیوں کا نشانہ بنا دیا۔

☆☆☆

میرے لیے کہانی کا یہ انجام بہت تکلیف دہ تھا۔ کیوینڈ کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ وہ میرے سامنے گردن جھکائے بیٹھا تھا۔

”دیکھ لیا تم نے۔ تمہارے اس احمقانہ تجربے نے ایک غریب کی جان لے لی۔“

”مجھے میں نہیں آتا کہ اسے کیوں مار دیا گیا۔“ کیوینڈ دھیرے سے بولا۔ ”اس کا قصور ہی کیا تھا۔ یہی تا کہ اس نے محبت کی تھی۔ اور محبت کی اتنی بڑی سزا۔“

”میرے بھولے کیوینڈ! تم بہت غلط معاشرے میں محبت کا پرچار کرنے چلے آئے ہو؟“ میں نے کہا۔ ”ہیں اب محبت کی نہیں نفرت کی ضرورت ہے۔ ہم مرنا چاہتے ہیں۔ زبان کے نام پر، مذہب کے نام پر۔ امیری اور غربی کے نام پر۔ سیاست کے نام پر، موت اور نفرت ہماری فطرت کا حصہ بن چکی ہے۔ ہمیں جینے سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ اسی لیے میں محبت کی صرف کہانیاں لکھتا ہوں، خود محبت نہیں کرتا۔ اب ہمیں محبت کی ضرورت نہیں ہے۔ سمجھ گئے۔“

”ہاں میرے کہانی کار، میں سمجھ گیا ہوں۔ میں نے محبت کا بیج بونے کے لیے غلط زمین کا انتخاب کر لیا تھا۔“ کیوینڈ نے کہا۔ ”اب میرا یہاں کوئی کام نہیں ہے۔ میں جارہا ہوں یہاں سے۔“

وہ خوبصورت بچہ اپنی آنکھوں میں آنسو لیے فضا میں بلند ہوا اور دور دور اور دور ہوتا چلا گیا۔

میں اب تک فیصلہ نہیں کر سکا ہوں کہ یہ کیا تھا کیا واقعی کیوینڈ کا وجود ہے یا میں نے خواب دیکھا تھا مگر ج کے اخبار میں یہ خبر جلی حرفوں میں موجود ہے کہ سڑک پر جھاڑو دے رہی ایک جھٹکن کو دہشت گردوں نے مار گٹ کیا ہے۔

جولائی 2013

زندہ درگزر

جناب ایڈیٹر ماہنامہ سرگزشت

السلام علیکم

میں اپنے ہی گناہوں کی ایک انوکھی سرگزشت کے ساتھ حاضر ہوا ہوں۔ یہ صرف ایک سچی کہانی نہیں سبق بھی ہے اس لیے گزارش ہے کہ اسے ضرور شائع کریں۔

بارون احمد

(اسلام آباد)

میں آج آپ کو ایک کہانی سنانے والا ہوں جو ہمارے ہی گاؤں کی بیٹے ہمارے اس گاؤں میں پاکستان بننے سے کئی برس پہلے کی بات ہے۔ بستی میں آہ و بکا بچی ہوئی تھی کیونکہ اس گھر کا واحد نفل کرم دین اچانک مر گیا تھا۔ وہ چنگ بھلا اپنی دکان سے آیا تھا۔ اس نے آکر بیٹی سے پانی مانگا اور خود صحن میں پڑی ہوئی چار پانی پر بیٹھ گیا۔ بیٹی صغرا پانی لے کر آئی تو کرم دین نیچے سے ٹیک لگائے نیم دراز تھا۔ صغراں نے اسے کئی آوازیں دیں۔ پھر بلند آواز میں بولی ”ابا!“



اس کی آواز سن کر کرم دین کی بیوی رحمت بی بی اور چھوٹی بیٹی زینت بھی وہاں آگئیں۔
”کیا ہوا صفراں؟ کیوں چیخ رہی ہے، اور یہ تیرا ابا کب آیا؟“
”ابا ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی آیا ہے۔ اس نے صحن میں سائیکل کھڑی کر کے مجھ سے پانی مانگا اور خود پینک پر لیٹ گیا۔ اب میں آوازیں دے رہی ہوں مگر ابا بولتا ہی نہیں۔“

”افضل کے ابا!“ رحمت بی بی نے اسے زور سے آواز دی۔ افضل اس کا سب سے چھوٹا بیٹھا تھا۔ اس کی پیدائش کے بعد رحمت بی بی اسے اسی طرح مخاطب کرتی تھی۔
کرم دین نے کوئی جواب نہیں دیا۔ رحمت بی بی نے اس کا شانہ پکڑ کر ہلایا تو وہ ایک طرف لڑھک گیا۔
رحمت بی بی کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ اس کی چیخ سن کر صفراں اور زینت بھی بری طرح چیخنے لگیں۔ اچانک کرم دین کے گھر میں کھرام مچ گیا۔ پڑوسیوں نے چیخ و نکار اور رونے دھونے کی آوازیں سنیں تو وہ سب کرم دین کے گھر کی طرف دوڑ پڑے۔

ان کا پڑوسی اہمل خان سب سے پہلے وہاں پہنچا۔ اہمل خان اور کرم دین کی بہت دوستی تھی۔ دونوں کے گھر تو برابر برابر تھے ہی، دکانیں بھی برابر برابر تھیں۔ اہمل خان ویلڈنگ کا کام کرتا تھا اور کرم دین کباڑی تھا۔ وہ پھیری لگانے والے کباڑیوں سے مختلف چیزیں انتہائی سستے داموں خریدتا پھر ان کی مرمت کروا کر انہیں صاف ستھرا کر کے اچھے داموں بیچ دیتا۔ وہ گاؤں کے ساتھ بھی دھوکے بازی نہیں کرتا تھا۔ کسی چیز میں کوئی خرابی ہوتی تو وہ اسے بتا دیتا تھا کہ اس کی فلاں چیز خراب ہے۔ اس پر گاؤں کی مرضی ہوتی تھی کہ وہ چیز خریدے یا نہ خریدے۔
ایک طرح سے کرم دین کی یہ صاف گوئی فائدہ مند تھی۔ گاؤں کی بات پر آٹھ بند کر کے یقین کر لیتے تھے اور چیز خرید کر لے جاتے تھے۔ ایسا بہت کم بلکہ دوچار مہینے میں ایک دفعہ ہوتا تھا جب کوئی گاؤں خریدی ہوئی چیز واپس لاتا تھا اور بتاتا تھا کہ کرم دین، تو یہ بالکل کام ہی نہیں کر رہی۔

کرم دین فوراً وہ چیز واپس لے کر اس کو رقم لوٹا دیتا تھا۔ گاؤں تک تم رقم لے کر واپس جاتے تھے۔ عموماً وہ وہاں

سے کچھ اور خرید لیتے تھے۔

اہمل خان بھی کرم دین کی طرح کھرا آدمی تھا۔ وہ بھی اپنا کام انتہائی محنت اور دیانت داری سے کرتا تھا۔ فارغ اوقات میں دونوں دوست آپس میں گپ شپ لگاتے، اکثر وہ کسی پیا کرتے تھے۔ اس دور میں چائے کا اتار دیا نہیں تھا۔ چائے کا رواج بڑے شہروں میں تھا۔ راولپنڈی تو اس زمانے میں بہت چھوٹا شہر تھا۔

اہمل خان نے رحمت بی بی کو اندر جانے کو کہا اور خود کرم دین کا جائزہ لیا۔ اس کی بغض بالکل ساکن تھی۔ دل کی دھڑکن بھی خاموش تھی۔ اس نے مایوسی سے سر ہلایا اور رحمت بی بی سے بولا۔ ”بھابی! پریشان مت ہو میں ڈاکٹر کو بلا کر لاتا ہوں۔“

وہ ڈاکٹر صاحب، کسی زمانے میں لاہور کے کسی اسپتال میں کچاؤنڈر ٹائپ کی کوئی چیز تھے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد انہوں نے اپنے آبائی شہر راولپنڈی آکر یہاں اپنا کلینک کھول لیا تھا۔

پاکستان کے قیام کو چار پانچ سال سے زیادہ کا عرصہ نہیں گزرا تھا۔ اس دور میں ڈاکٹر تو نہ ہونے کے برابر تھے اس لیے اس قسم کے نیم حکیم اور عطائی بھی ڈاکٹر بن بیٹھے تھے اور خوب کمار ہے تھے۔

اہمل خان کے جاتے ہی محلے کی عورتیں گھر میں آگئیں۔ ایک بڑی بی بی نے رحمت بی بی سے کہا۔ ”ارے، اس کے ہاتھ پیر سیدھے کر کے پیروں کے انگوٹھے تو باندھ دو اور منہ پر چادر ڈال دو۔“

”نہیں..... یہ کیا کہہ رہی ہو خالہ؟ ابا کو کچھ نہیں ہوا۔“ صفراں چیخ کر بولی۔ ”تم تو جیتے جی میرے ابا کو مارے ڈال رہی ہو۔“

”بیٹا! میں نے دنیا دیکھی ہے۔ خیر اہمل خان ڈاکٹر صاحب کو لینے گیا ہے، تم لوگوں کی تلی بھی ہو جائے گی۔“
یہ بات سن کر رحمت بی بی اور زینت نے پھر رونا شروع کر دیا۔

اسی وقت کرم دین کا پانچ سالہ بیٹا افضل گھر میں داخل ہوا۔ پہلے اس نے اپنی بیویوں میں بھرے ہوئے کچے چھائے کیونکہ ابا کو کچے تخت ناپسند تھے، پھر اس نے حیرانی سے گھر میں جمع عورتوں کو دیکھا۔

اچانک اس کی نظر ابا پر پڑی جو صحن میں چارپائی پر لیٹا تھا اور اماں اس کی پٹی پکڑے زمین پر بیٹھی تھی اور ہلک ہلک

کر رہی تھی۔

وہ دوڑ کر اماں کے پاس پہنچا اور بولا۔ ”کیا ہوا اماں! تھوڑی دیر رہی ہو۔ دیکھ نہیں رہی ہو کہ ابا سو رہا ہے، اس کی آنکھ کھل جائے گی تو بہت غصہ کرے گا۔“

افضل کو یاد تھا کہ ایک مرتبہ اس کے شور کرنے پر ابا کی آنکھ کھل گئی تھی اور اس نے افضل کو بہت بری طرح ڈانٹا تھا۔

اس کی بات سن کر رحمت بی بی مزید ہلک ہلک کر رونے لگی۔ اسی وقت باہر سے اہمل خان کی آواز آئی ”بھابی جی، پردہ کرلو، ڈاکٹر صاحب آئے ہیں۔“

ڈاکٹر صاحب یوں گھر میں داخل ہوئے جیسے کوئی بہت بڑا سرجن آپریشن ٹیم میں داخل ہوتا ہے۔ انہوں نے سفید لٹھے کی شلوار پوش کی قمیض اور سیاہ چمک دار پیپ شوز پہن رکھے تھے۔ ان کے سر پر انتہائی قیمتی قرآنی ٹوپی تھی اور ہاتھ میں گھڑی بھی تھی۔ گھڑی بھی اس دور میں بلند معیار زندگی کی علامت تھی۔ اپنی گھڑی کو نمایاں کرنے کے لیے انہوں نے کرتے کی آستینیں الٹ رکھی تھیں۔

ان کے پیچھے پیچھے اہمل خان ان کا دواؤں کا بکس اٹھائے چلا آ رہا تھا۔

ڈاکٹر صاحب کے لیے فوراً محلے سے ایک کرسی منگائی گئی۔ کرسی پر بیٹھ کر انہوں نے کرم دین کی بغض دیکھی، پھر اپنے بیک سے اٹیکھو اسکوپ نکال کر اس سے کرم دین کے دل کی دھڑکن سننے کی کوشش کی۔ اس کی ناک کے آگے ہاتھ لگا کر دیکھا، پھر مایوسی سے سر ہلا کر بولے۔ ”اللہ کی امانت تھی، اس نے واپس لے لی۔“ یہ کہہ کر انہوں نے کرم دین کا منہ چادر سے ڈھانپ دیا۔

ڈاکٹر صاحب کے الفاظ سننے ہی گھر میں گویا نئے سرے سے کھرام مچا ہو گیا۔ رحمت بی بی، صفراں اور زینت کے ساتھ ساتھ محلے کی عورتیں بھی رو رہی تھیں، تین کر رہی تھیں۔ ایسے موقعوں پر کرم دین اکثر فحش کرکھتا تھا۔ ”یہ باہر کی عورتیں مرنے والے کے لیے نہیں روتیں بلکہ اپنے مرے ہوئے عزیز رشتے داروں کو یاد کر کے روتی ہیں۔“

اہمل خان ڈاکٹر صاحب کے ساتھ باہر آیا اور ان سے بولا۔ ”ڈاکٹر صاحب! آپ اپنی فیس تو لے لیں۔“
”میں نے کیا کیا ہے بھابی؟“ میرا تو صرف آنے جانے کا وقت ہی لگا ہے نا! تم فیس کی فکر چھوڑو اور کرم دین

کی بیوی اور بچوں کو تسلی دو۔ اس بیچارے کا تو بیٹا بھی اتنا بڑا نہیں ہے کہ گھر کو سنبھال سکے۔“

اہمل خان ڈاکٹر صاحب کے پیچھے پیچھے وہاں تک آیا جہاں انہوں نے اپنی غمی ریلے سائیکل پارک کر رکھی تھی۔ اس دور میں سائیکل اور وہ بھی ریلے اچھے خاصے کھاتے پیتے لوگوں کے پاس ہوتی تھی۔ اہمل خان نے ڈاکٹر صاحب کا بیک ان کی سائیکل کے کیریز پر رکھ کر باندھا اور انہیں سلام کر کے پیچھے ہٹ گیا۔ ڈاکٹر صاحب سائیکل پر سوار ہو کر وہاں سے چلے گئے۔ وہ عطائی ضرور تھے لیکن ان میں ابھی اتنی انسانیت باقی تھی کہ انہوں نے اہمل خان سے فیس نہیں لی تھی۔ آج کے دور میں تو ڈاکٹر میت کو اس وقت تک ریغمال بنا کر رکھتے ہیں جب تک لو اچھین ڈاکٹر کی فیس اور اسپتال کے پورے اخراجات ادا نہیں کر دیتا۔

اہمل خان واپس آیا اور گھر کے باہر کھڑے ہو کر عورتوں کی آہ و بکا سنتا رہا۔ محلے کے چند لوگ مزید وہاں کھڑے تھے۔ ان میں سے ایک بزرگ نے اہمل خان سے پوچھا۔ ”میاں! ڈاکٹر صاحب نے کیا بتایا۔ مرحوم کو کیا بیماری تھی؟“

”کوئی بیماری نہیں تھی میاں جی!“ اہمل خان نے جواب دیا۔ ”ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی تو وہ دکان بند کر کے میرے ساتھ ہی اپنی سائیکل پر کھرا تھا، اسے تو کوئی بیماری تھی ہی نہیں، بھی بخار بھی نہیں آتا، بھت بھی بہت اچھی تھی۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا ہے کہ کرم دین کا ہارٹ فیل ہو گیا ہے۔“

”کیا فیل ہو گیا ہے؟ بڑے میاں نے پوچھا۔
”میرا مطلب ہے جی کہ کرم دین کے دل کی حرکت اچانک بند ہو گئی تھی۔“

”اللہ رحم کرے۔“ بڑے میاں نے کہا۔ ”یہ سب قیامت کی نشانی ہیں، ایسی ناگہانی موت قیامت کی نشانی ہی تو ہے۔ بندہ نہ اپنے بیوی بچوں سے کوئی بات کر سکے، نہ کلمہ پڑھ سکے۔ بس بیٹھے بیٹھے مرجائے۔“

اہمل خان کو بڑے میاں کی باتوں سے زیادہ کرم دین کی موت کا غم کھا رہا تھا۔ وہ برسوں سے ایک دوسرے کے پڑوسی تھے۔ دکان بھی برابر برابر تھیں اس لیے ان میں دوستی کچھ زیادہ ہی تھی کرم دین کا کوئی رشتے دار اس وقت موجود نہیں تھا۔ اس کا ایک چچا اور اس کے بیٹے قریب کے ایک گاؤں میں رہتے تھے۔ انہیں اطلاع کرنا ضروری تھی۔

پھر کرم دین کی تدفین کا بھی مسئلہ تھا۔ یہ سب کچھ اجمل خان ہی کو کرنا تھا۔ اس نے محلے کے ایک لڑکے سے کہا۔ ”پچو! تو نے کرم دین کے چاچا احمد خان کا چنڈ دیکھا ہے نا؟“

”ہاں چاچا اجمل دیکھا تو ہے۔“ پچو نے جواب دیا۔

اس کی عمر مشکل سے سولہ سترہ برس رہی ہوگی۔

”پتر! تو میری سائیکل لے جا اور کرم دین کے چاچے کو خبر کر دے اور ان سے کہہ دینا کہ کرم دین کے دوسرے رشتے داروں کو بھی خبر پہنچا دیں۔“

پچو اسی وقت سائیکل لے کر وہاں سے چلا گیا۔ اجمل خان نے ایک لڑکے کو آواز دی۔ ”شیرے پتر! تو ذرا قبرستان تک چلا جا اور گورکن سے قبر تیار کرالے۔ اس سے کہنا کہ کرم دین فوت ہو گیا ہے اس کی قبر بنانا ہے۔ وہ کرم دین کو جانتا تھا۔ اسی لحاظ سے قبر بنادے گا۔“ اس نے جب سے اٹھنی نکالی اور شیرے کے حوالے کر دی۔ ”یہ بابا غوثی کو دے دینا۔“ بابا غوثی اس علاقے کا واحد گورکن تھا۔ وہ اس چھوٹی سی آبادی میں رہنے والے ہر شخص کو جانتا تھا۔

اس طرف سے فارغ ہو کر اجمل خان نے محلے کے ہر ایک شخص کو تدفین کا سامان لینے بھیج دیا اور اس سے کہا کہ اگر ستار چاچا کی دکان بند ہو تو کھلو لیتا۔“

پھر وہ اپنے گھر میں گیا اور بیوی کو کرم دین کے گھر سے بلوا کر کہا کہ ”مرنے والے کے گھر کھانا بھیجا جاتا ہے۔ تجھے اتنا بھی ہوش نہیں ہے۔ چل جلدی سے کھانا بنالے، رات ہونے والی ہے۔“

صبح تک سارے انتظامات مکمل ہو گئے۔ کرم دین کے رشتے دار بھی وہاں پہنچ گئے اور فجر کی نماز کے بعد مولوی صاحب نے اس کی نماز جنازہ بھی پڑھادی۔ پھر کرم دین کو وہاں سے کچھ دور قبرستان میں سپرد خاک کر دیا گیا۔

واپسی پر کرم دین کے ایک اور پڑوسی نے ناشتے کا انتظام کیا تھا۔ حورتوں نے ناشتا کیا، رحمت بی بی کو تسلیاں اور دلا سے دیے اور اپنے اپنے گھروں کو چل گئیں۔

اب صرف کرم دین کا چاچا احمد خان، اس کے دونوں بیٹے، رحمت بی بی کا ایک ماموں زاد اور دو بہنیں رہ گئیں۔ کرم دین کی موت کے تم سے زیادہ احمد خان کو اس کی دکان کی فکر تھی۔ اس نے کئی مرتبہ باتوں باتوں میں کہا۔ ”میں تو سوچ رہا ہوں کہ اب رحمت بی بی اور بچوں کا گزارہ کیسے ہوگا؟ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ میں کرم دین کی دکان پر بیٹھ جاؤں؟“

”آپ کیوں تکلیف کریں گے چاچا!“ رحمت بی بی نے جلدی سے کہا، وہ چاچا کے عزائم کو سمجھ رہی تھی۔ اجمل خان ہے نا! ویسے بھی مرنے والے نے اپنی زندگی میں ہی یہ کہہ دیا تھا کہ افضل کو بھائی اجمل ہی کام سکھائے گا۔ اب اس کا لڑکے کا رو بہار میں تو کچھ رکھنا نہیں ہے۔ بھائی اجمل، افضل کو اپنا کام سکھائے گا۔“

”بھئی تیری مرضی رخصت! چاچا نے سرد لہجے میں کہا۔ ”افضل تو ابھی بہت چھوٹا ہے۔ میں نے تو تیرے بھیلے ہی کو کہا تھا۔ تیری مرضی نہیں ہے تو نہ کہی۔“

دوسرے دن چاچا اور اس کے گھر والے بھی رخصت ہو گئے۔

اسی دن محلے میں ایک اور موت ہو گئی۔ محلے کے ایک راج مستری کی بیوی فوت ہو گئی۔ وہ کافی دنوں سے بیمار تھی۔ بیمار بھی ایسی کہ اس کی بیماری ڈاکٹر صاحب کی دوا سے بھی نہیں گئی۔

رات تک اس کا جنازہ بھی تیار تھا اور لوگ اسے قبرستان کی طرف لے جا رہے تھے۔ محلے داری کے ناتے اجمل خان بھی جنازے میں شریک تھا۔ عشا کی نماز کے بعد اس کی نماز جنازہ پڑھائی گئی تھی اور اب محلے کا ایک لڑکا کیس لیپ سر پر رکھے آگے آگے چل رہا تھا کیونکہ ہر طرف... گھپ اندھیرا تھا۔

ایسے موقع پر مسجد کے مولوی صاحب بھی میت کے ساتھ ہوتے تھے، کیونکہ انہیں قبر پر جا کر بھی فاتحہ وغیرہ پڑھنی ہوتی تھی۔ اس کے غم مرنے والے کے لواحقین مولوی صاحب کو دو چار آنے دے دیا کرتے تھے۔

مرنے والی کو سپرد خاک کرنے کے بعد مولوی صاحب فاتحہ پڑھ رہے تھے کہ اچانک لوگوں نے ایک دل خراش چیخ مٹی۔ ایسا لگتا جیسے کوئی بہت دور سے چیخاؤ۔ لوگوں نے اسے وہم سمجھا، اور پھر فاتحہ پڑھنے میں مصروف ہو گئے۔ اچانک چیخ کی آواز پھر آئی اور اس مرتبہ اجمل خان نے واضح طور پر محسوس کر لیا کہ یہ آواز کرم دین کی قبر سے آئی ہے۔

اس کے ساتھ ساتھ کچھ اور لوگوں نے بھی چیخ کی آواز سنی تھی۔ وہ سب کرم دین کی قبر کی طرف بڑھے جو مرنے والی کی قبر سے ایک قبر چھوڑ کر تھی۔

وہ لوگ قبر کے نزدیک پہنچے ہی تھے کہ اس مرتبہ کرم دین کی قبر سے پہلے سے بھی زیادہ فلک شکاف چیخ برآمد

ہوئی۔ اس چیخ نے قبرستان میں موجود ہر شخص کو اس طرف متوجہ کر دیا۔

پھر وہاں مختلف آوازیں گونجیں۔ کرم دین زندہ ہے، آواز تو اس کی قبر ہی سے آ رہی ہے، ہاں وہ زندہ ہے۔ ”میں کرم دین کی آواز اچھی طرح پہچانتا ہوں۔“

اجمل خان نے کہا۔ ”وہ زندہ ہے۔“

اب ہر شخص کا متفقہ فیصلہ یہ تھا کہ کرم دین کی قبر کھولی جائے۔ کچھ لوگ اس طرف بڑھے بھی لیکن ایک سرکاری دفتر میں کام کرنے والے بابو سرفراز نے انہیں روک دیا اور بولا۔ ”ہم لوگ اپنے طور پر ایسا نہیں کر سکتے، یہ خلاف قانون ہے۔“

”تو پھر..... کیا کریں باؤ جی؟“ اجمل خان نے کہا۔

”اس کے لیے علاقے کے تحصیل دسرکاری اجازت نامہ ضروری ہے۔ چلو ہم سب ابھی تحصیل دار صاحب کے گھر چلتے ہیں۔“

”وہ تو سو گئے ہوں گے۔“ ایک شخص بولا۔

”مگر انہیں جگایا جاسکتا ہے۔“ باؤ سرفراز نے کہا۔ ”آخر یہ ایک آدمی کی زندگی کا معاملہ ہے۔“

قبرستان سے قافلہ تحصیل دار صاحب کے گھر کی طرف چلا۔ ان کا گھر کافی دور تھا۔ بہت سے لوگ سائیکلوں پر تھے۔ باؤ سرفراز کے پاس بھی سائیکل تھی۔ اس نے گواہ کے طور پر مولوی صاحب کو بھی اپنے ساتھ سائیکل پر بٹھالیا اور یوں وہ لوگ تحصیل دار صاحب کے گھر پہنچ گئے۔ تحصیل دار صاحب واقعی سوچتے تھے۔ ان کے نوکر نے پہلے تو صاف انکار کر دیا لیکن جب مولوی صاحب نے کہا کہ یہ ایک انسانی جان کا معاملہ ہے۔ تم صاحب کو فوراً اٹھا دو۔

اس وقت تک قبرستان سے بقیہ لوگ پیدل وہاں تک پہنچ چکے تھے۔

تحصیل دار صاحب باہر نکلے تو مجمع دیکھ کر حیران رہ گئے۔

باؤ سرفراز نے انہیں بتایا کہ معاملہ کیا ہے؟

”مولوی صاحب! تحصیل دار نے پوچھا۔“

آپ نے بھی اپنے کانوں سے کرم دین کی قبر سے آئی ہوئی آوازیں سنی ہیں؟“

”جی ہاں سرکار!“ مولوی صاحب نے کہا۔ ”میں

نے خود اپنے ان گناہ گارکانوں سے آوازیں سنی ہیں۔“

اسنے لوگوں کی گواہی کے بعد تحصیل دار کیسے انکار کر سکتا تھا۔ اس نے اسی وقت قبر کھولنے کا اجازت نامہ لکھا اور اس پر دستخط کر کے اپنے ملازم سے مہر بھی لگوا دی۔

اب لوگ دوبارہ قبرستان کی طرف چلے اور بابا غوثی سے قبر کھولنے کو کہا۔

بابا غوثی نے منٹوں میں قبر کی مٹی پیٹنے سے ہٹا دی۔ قبر ابھی دو روز پہلے ہی مٹی کی سی تھی اس لیے اس کی مٹی ابھی نرم تھی۔ مٹی ہٹانے کے بعد قبر پر رکھے ہوئے لکڑی کے تختے ہٹانے کا مرحلہ تھا۔ بابا غوثی نے تختے بھی ہٹا دیے۔ پھر لوگوں نے لالٹینوں کی روشنی میں دیکھا کہ کرم دین کے دونوں ہاتھ اوپر اٹھے ہوئے ہیں اور وہ اندر جھانکنے والوں کو رحم طلب نظروں سے دیکھ رہا ہے۔ اس نے یہ مشکل تمام اپنے ہاتھ پھر ہٹائے اور گرا لیے۔ شاید وہ قبر کھولنے والوں کو یہ بتانا چاہ رہا تھا کہ وہ زندہ ہے۔

”کوئی نوجوان قبر میں اترے اور کرم دین کو باہر نکالے۔“ کسی نے کہا مگر کوئی بھی قبر میں اترنے کو تیار نہیں تھا۔

باؤ سرفراز نے کہا۔ ”مولوی صاحب آپ تو اللہ والے ہو، آپ کے سینے میں تو کام اٹھ محفوظ ہے۔ آپ ہی قبر میں اتر جائیں۔“

دوسرے لوگوں نے بھی باؤ سرفراز کی بات کی تائید کی اور مولوی صاحب سے اصرار کیا تو وہ قبر میں اترنے پر آمادہ ہو گئے لیکن ان کے چہرے پر بھی خوف کے آثار تھے۔

وہ آیت الکرسی پڑھتے ہوئے قبر میں اترے اور جھک کر کرم دین کا چہرہ دیکھنے کی کوشش کی۔

کرم دین نے اچانک دونوں ہاتھیں ان کے گلے میں ڈال دیں۔ مولوی صاحب کے حلق سے ایک دہی دہی چیخ نکل گئی۔ وہ بوکھلا کر اٹھ تو اٹھ نہ سکے۔ کرم دین نے ان کی گردن کے گرد بہت مضبوطی سے ہاتھوں کا حلقہ ڈال رکھا تھا۔

مولوی صاحب کا چہرہ پسینے میں شرابور ہو گیا۔ سفید بے داغ کپڑوں پر مٹی لگی تھی اور ان کی بڑی گھڑی اس کوشش میں قبر ہی میں گر گئی۔

انہوں نے دوبارہ زور لگا کر اٹھنے کی کوشش کی تو وہاں موجود لوگوں نے ایک عجیب منظر دیکھا۔ مولوی صاحب کے ساتھ ساتھ کرم دین بھی ان کی گردن میں جھومتا ہوا کھڑا

ہو گیا۔

وہ نکل کر ہلتی ہوئی آنکھوں سے مولوی صاحب کو گھور رہا تھا۔ مولوی صاحب کے چہرے پر گویا موت کی زردی کھنڈی ہوئی تھی۔ انہوں نے با آواز بلند تلاوت کلام پاک شروع کر دی اور کرم دین کے چہرے پر پچھوئیں مارنے لگے لیکن کرم دین ان کی گردن میں جھولتا رہا۔

مولوی صاحب جھنجھلا کر بولے۔ ”ارے چھوڑ مردود، غیبت!“

کرم دین نے جواب میں کچھ نہ کہا بلکہ اپنی ہانہوں کا حلقہ ان کی گردن کے گرد مزید تنگ کر دیا۔

”ارے کوئی مجھے اس قبر سے باہر تو نکالو۔“ مولوی صاحب نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔

دو تین نوجوانوں نے ہمت کی۔ ان کے ساتھ اجمل خان بھی شامل ہو گیا۔ ان سب نے مولوی صاحب کے ہاتھ پکڑ کر انہیں باہر کھینچا تو کرم دین بھی ان کے گلے کا ہار بنا ہوا باہر نکل آیا۔

”ارے، یہ تم لوگوں نے کس مصیبت میں پھنسا دیا؟“ مولوی صاحب نے بھی ہوئی آواز میں کہا۔

اجمل خان نے مولوی صاحب کو چھڑانے کی کوشش کی اور کرم دین سے کہا۔ ”کرم دین! مولوی صاحب کو چھوڑ دو۔“

کرم دین نے انہیں مزید مضبوطی سے جکڑ لیا۔

باؤ سر فرزانے آگے بڑھ کر کرم دین کی بخش محسوس کی، اس کی سانس کی آمد و رفت بھی جاری تھی۔ اس کا معائنہ کر کے وہ بولا۔ ”کرم دین زندہ ہے۔ اسے گھر لے جانا پڑے گا۔“

اس وقت وہاں کوئی ٹانگا وغیرہ تو موجود نہیں تھا۔

سائیکل پر مولوی صاحب کرم دین سمیت بیٹھ نہیں سکتے تھے۔

لوگوں نے یہ مشورہ دیا کہ پیدل ہی کرم دین کے گھر کی طرف چلیں۔

چنانچہ لوگوں کا وہ قافلہ پیدل ہی کرم دین کے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ کرم دین پہلے مولوی صاحب کے ساتھ کھینٹا رہا، پھر لوگوں نے محسوس کیا کہ وہ ان کے ساتھ چلنے کی کوشش بھی کر رہا ہے۔ اب اس کے رخ میں بھی تبدیلی آگئی تھی۔ پہلے وہ مولوی صاحب کے مقابل تھا۔ اب وہ اس حالت میں ان کی گردن جکڑے ہوئے مولوی صاحب کے پہلو میں آ گیا تھا۔

یہ قافلہ جب کرم دین کے محلے میں پہنچا تو اس وقت رات کے بارہ بج رہے تھے۔ چھوٹے علاقوں میں لوگ اس وقت تک اپنی آدھی نیند لے چکے ہوتے ہیں۔ یہاں بھی ہر طرف خاموشی اور سناٹا تھا۔

اجمل خان نے کرم دین کے گھر کے دروازے پر دستک دی لیکن کوئی جواب نہ آیا۔ اجمل خان نے دوبارہ زیادہ زور سے دروازہ بجایا تو اندر سے رحمت بی بی کی کبھی ہوئی آواز آئی۔ ”کون ہے؟“

”بھائی جی، میں ہوں اجمل خان۔“

”بھائی اجمل!“ رحمت بی بی نے کہا۔ ”خیر تو ہے، آپ اس وقت کیسے آئے؟“

”بھائی جی آپ دروازہ تو کھولیں۔“

اس دوران میں کرم دین مسلسل مولوی صاحب کی گردن میں انہیں ڈالے رہا تھا اور حیرت کی بات یہ تھی کہ اب وہ مولوی صاحب پر اپنے جسم کا بوجھ ڈالنے کے بجائے اپنے پیروں پر کھڑا ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔

اجمل خان کی جگہ کوئی اور ہوتا تو شاید رحمت بی بی دروازہ نہ کھولتی لیکن اسے اجمل خان پر اعتماد تھا اس لیے اس نے دروازہ کھول دیا۔

”بھائی جی، پردہ کر لیں؟“ اجمل خان نے کہا۔

اس سے پہلے کہ رحمت بی بی ایک طرف ہوئی، مولوی صاحب بے تابی سے کرم دین کے گھر میں داخل ہو گئے۔

کرم دین ان کے ساتھ ساتھ تھا۔

رحمت بی بی کی دونوں ہتھیلیں ابھی تک وہاں ٹھہری ہوئی تھیں۔ باہر لوگوں کی آوازیں سنیں تو وہ دونوں، صغراں اور زینت بھی بڑ بڑا کے کھڑی ہو گئیں۔

مولوی صاحب کرم دین کو ایک دوسرے کمرے میں لے گئے۔ چچاں ایک چار پائی پر بستر تھا۔ اس پر شاید رحمت بی بی سو رہی تھی۔ اس چار پائی پر کرم دین کا بیٹا فضل بھی سو رہا تھا۔ اجمل خان نے بڑھ کر فضل کو کود میں اٹھالیا۔ مولوی صاحب نے کرم دین کو چار پائی پر رکھا تو اس نے ان کی گردن چھوڑ دی اور چار پائی پر ڈھس گیا۔

مولوی صاحب اپنے کپڑے بھاڑتے ہوئے وہاں سے فوراً نکل گئے کہ نہیں کرم دین دوبارہ ان کی گردن نہ دبوج لے۔ پھر اجمل خان کے علاوہ ایک ایک کر کے تمام لوگ وہاں سے رخصت ہو گئے۔

رحمت بی بی نے بھی ہوئی آواز میں پوچھا۔ ”بھائی

نفل! معاملہ کیا ہے اور یہ مولوی صاحب کے لائے ہیں؟“

”بھائی جی، کرم دین ہے۔“

”کرم دین؟“ رحمت بی بی کے حلق سے عجیب سی آواز نکلی۔ ”جی، وہ تو فوت ہو چکے ہیں۔“

”وہ فوت نہیں ہوئے تھے بلکہ انہیں شاید سکتہ ہو گیا تھا اور ہم لوگوں نے انہیں زندہ فن کر دیا۔ اب آپ جا کر ان کی دیکھ بھال کریں۔“

”میں؟“ رحمت بی بی نے سہم کر کہا۔ ”نہ بابا نہ مجھے مردوں سے بہت ڈر لگتا ہے۔“

”وہ زندہ ہے بھائی جی۔“ اجمل خان نے کہا۔

”تو پھر اجمل بھائی، ایسا کرو، تم بھی تو کرم دین کے دوست ہو۔ تم ہی اس کی دیکھ بھال کرلو۔ میں بچوں کو لے کر تمہارے گھر جا رہی ہوں۔“

اجمل خان نے تاسف سے سر ہلایا اور رحمت بی بی کو جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ رحمت بی بی اپنی دونوں ہتھیلیوں اور پیٹ کو لے کر اجمل خان کے گھر چلی گئی۔ اسے ابھی تک یقین نہیں آیا تھا کہ کرم دین زندہ بھی ہو سکتا ہے۔ وہ اسے کرم دین کا بھوت سمجھ رہی تھی۔

اجمل خان نے باورچی خانے میں جا کر دیکھا۔ پتلی میں تھوڑا سا دودھ موجود تھا۔ اس نے وہ دودھ پیالے میں اٹھایا اور کرم دین کے کمرے میں چلا گیا۔ کرم دین اسے دیکھتا رہا لیکن بولا کچھ نہیں۔

اجمل خان نے کہا۔ ”کرم دین! میں تمہارے لیے دودھ لایا ہوں۔ یہ پی لو۔“

کرم دین کے ہونٹ کپکپاتے اور اس کے حلق سے عجیب سی آواز نکلتی۔ ”بابا... نی...“

اجمل خان نے تجھن میں آ کر سنبھلے سے پانی لیا پھر کرم دین کے پاس پہنچا اور اسے سہارا دے کر اٹھانے کی کوشش کی۔ پھر پانی کا کٹورا اس کے منہ سے لگا دیا۔

کرم دین غناغت پانی پی گیا۔ پانی پی کر اجمل خان کو اس کی ویران آنکھوں میں زندگی کی جھلک نظر آئی۔

اس نے دوبارہ دودھ کا پیالہ اس کی طرف بڑھایا تو کرم دین نے کوئی اعتراض نہ کیا۔ اجمل خان نے اسے سہارا دے کر اٹھایا اور دودھ بھی پلا دیا۔ دودھ پینے کے بعد کرم دین کی آنکھوں کی چمک بڑھ گئی۔

”اب تم مونے کی کوشش کرو، ابھی میں تمہیں کھانے کو کچھ نہیں دوں گا۔“ اجمل خان نے کہا۔ وہ اس معاملے

میں خاصا سمجھدار تھا۔

دودھ پینے کے بعد کرم دین غنودگی میں چلا گیا۔ اجمل خان دوسرے کمرے سے ایک چار پائی اٹھالایا اور اسے کرم دین کے ساتھ ڈال کر خود بھی اس پر لیٹ گیا۔

تھوڑی دیر بعد اس کی آنکھ لگ گئی۔

دوسری صبح رحمت بی بی اور دونوں بیٹیوں کو یقین آیا کہ کرم دین مرا نہیں بلکہ زندہ ہے۔ اسے زندہ فن کر دیا گیا تھا۔

رحمت بی بی اس کی تیمارداری میں لگ گئی۔ اس مرتبہ ڈاکٹر کے بجائے اجمل خان حکیم جی کو لے آیا۔ انہوں نے کرم دین کا معائنہ کیا، پھر بولے۔ ”کرم دین مرا نہیں بلکہ اس پر سکتہ طاری ہو گیا تھا۔ تم لوگوں نے اسے زندہ فن کر دیا۔ ابھی اسے ہلکی پھلکی غذا دو، مرغی کی پیٹنی اور کچھ دوسرے علاوہ۔“

دو دن بعد میں پھر آکر اسے دیکھ جائوں گا۔“

مرغی کی پیٹنی اور ریش حلوہ کچھڑی اور دودھ سے کرم دین دوسرے ہی دن بولنے کے قابل ہو گیا۔ اجمل خان کے پوچھنے پر اس نے بتایا۔

”میں جب تیرے ساتھ دکان سے گھر آیا تو بالکل ٹھیک تھا۔ پھر میں نے صغراں سے پانی مانگا۔ اس کے بعد مجھے ہوش نہیں کہہ پایا، دوبارہ میری آنکھ کھلی تو وہاں بہت اندھیرا تھا۔ میں سمجھا کہ رات ہے۔ میں نے ہاتھ ہلانے کی کوشش کی تو ہلانہ نہ سکا۔ میں نے کوشش کر کے اس کپڑے میں سے اپنے ہاتھ باہر نکالے اور اٹھنے کی کوشش کی تو میرے دونوں ہاتھ دیوار سے ٹکرائے۔ میں بولھل گیا کہ یہ کون سا کمرہ ہے جس کی دیواریں اتنی تنگ ہیں۔ میں نے پوری قوت سے رحمت بی بی کو آواز دی۔“

”رحمت!“

جواب میں مجھے عجیب سی گونج سنائی دی جیسے کوئی منکے میں منہ ڈال کر بولتا ہے۔ میں نے گھبرا کر کھڑا ہونے کی کوشش کی تو میرا سر کسی چیز سے ٹکرایا اور میں تکلیف کی شدت سے پھر لیٹ گیا۔

اجانک مجھ پر یہ ہولناک انکشاف ہوا کہ شاید مجھے زندہ فن کر دیا گیا ہے، میں نے ٹٹول کر اپنا جسم دیکھا تو مجھے معلوم ہوا کہ میرے جسم پر کپڑے نہیں ہیں بلکہ ایک بغیر سلا کپڑا لپٹا ہوا ہے۔ میں نے خوف زدہ ہو کر ایک دل دوزخ ماری کیونکہ وہ کفن تھا اور اس میں سے ابھی تک کافور اور عرق گلاب کی بو آرہی تھی۔

میں ایک مرتبہ پھر اٹھا اور پاگوں کی طرح قبر کے



گولڈ میڈل

محترمہ عذرا رسول صاحبہ

السلام علیکم !

میں کئی ایک ڈائجسٹ میں افسانے کہانیاں لکھتی ہوں، اس بار ایک سوچ بیٹی لے کر سرگزشت کی محفل میں حاضر ہوئی ہوں۔ یہ روداد مجھے ایک صاحب نے سنائی جو اس کہانی کے مرکزی کردار کے ساتھ دبئی میں خاصا وقت گزار چکا ہے۔ امید ہے آپ کو بھی پسند آئے گی۔

گیتی آرا

آپ یقین کریں یا نہ کریں لیکن ایسا ہوا ہے جسے میں قلمبند کر رہا ہوں۔ میرا نام آپ کچھ بھی سوچ لیں کیونکہ میں ایک خطرے کی وجہ سے ملک سے باہر بھاگ آیا ہوں۔ اس سے پہلے میں ریلوے میں پچھلے چالیس برس سے ملازم تھا۔ ریلوے میں بطور ڈرائیور ملازم ہوا تھا اور اپنی اس چالیس سالہ ملازمت میں نے جس محنت اور فرض شناسی سے کام کیا تھا اس سے مجھے کامیاب اور کارکن بنوئی واقف تھا۔ لیکن اس چالیس سالہ محنت اور فرض

میرے جسم پر چوبھیاں رہ گئیں گی تھیں اور انہوں نے میرا جسم کاٹنا شروع کر دیا تھا۔ پہلے تو میں انہیں ہاتھ سے جھٹک دیتا تھا، پھر مجھ میں ہاتھ ہلانے تک کی سکت نہ رہی، میں خاموشی سے قبر میں لیٹ کر اپنی موت کا انتظار کرنے لگا۔

ایک دفعہ اچانک مجھے اور کئی لوگوں کے قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ میں نے سوچا کہ یہ ایک دو نہیں بلکہ کئی آدمی ہیں۔ شاید ان میں سے کوئی میری آواز سن لے۔ میں پوری قوت سے چیخا۔ ”مجھے بچاؤ“، لیکن مجھے ایسا لگا جیسے میرے حلق سے کچھ عجیب سے الفاظ نکلے ہوں جب کوئی ادھر متوجہ نہ ہوا تو میں اپنے جسم کی رہی کسی قوت جمع کر کے چیخا ”بچاؤ“

اسی وقت مجھے قبر پہ دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز سنائی دیں۔ میں امید کی کیفیت میں ایک مرتبہ پھر پہلے سے بھی زیادہ زور سے چیخا۔ ”بچاؤ..... کوئی ہے.....“ تھوڑی دیر بعد مجھے قبر کے تختے ہٹنے کی آواز سنائی دی اور مولوی صاحب آیت الکرسی پڑھتے قبر میں اترے۔ وہ جوں ہی مجھ پر بیٹھے، میں نے ہمت کر کے اپنی دونوں ہاتھیں ان کی گردن میں ڈال دیں، مجھے خبر نہ تھی کہ اگر مولوی صاحب قبر سے نکل گئے تو لوگ مجھے دوبارہ دفن کر دیں گے، اس سے آگے کا حال تو تم لوگوں کو معلوم ہی ہے۔

”بس یار زندگی ہو تو اللہ زندہ رہنے کے سوا بھانے پیدا کر دیتا ہے اور اگر موت ہو تو دنیا کی کوئی طاقت بھی اسے نہیں ٹال سکتی۔“ کرم دین نے کہا۔

☆☆☆

میری عمر اس وقت صرف پانچ سال تھی۔ کئی برس ہوئے کرم دین کا انتقال ہو چکا ہے۔ میں خود بھی اب چھیاٹھ سال کا ہو چکا ہوں۔ اب میں اسلام آباد میں رہتا ہوں۔ سرکاری ملازمت ہے ریٹائرڈ ہو چکا ہوں۔ اب میرے دو بیٹے ملازمت کرتے ہیں۔ دونوں نے سی ایس ایس کا امتحان امتیازی نمبروں سے پاس کیا تھا۔ میں اکثر انہیں تاکید کرتا ہوں کہ اگر کبھی تم لوگوں کو ایسا محسوس ہو کہ میں مرجھا ہوں اور بے شک کوئی ڈاکٹر تصدیق بھی کر دے تو تم لوگ مجھے پوری طرح تصدیق کے بعد دفن مت کرنا۔ مجھے کرم دین کی وہ موت یاد ہے جب اسے زندہ درگور کر دیا گیا تھا اور وہ موت بھی یاد ہے جب وہ واقعی مر گیا تھا۔

بھگت

تختے ہٹانے کی کوشش کرنے لگا۔ وہ تختے بھلا مجھ سے کیسے ہٹے۔ میں لاکھ طاقت ور بھی لیکن ان تختوں پر منوں مٹی کا ڈھیر تھا۔ میں نے ارد گرد دیکھا کہ مجھے کوئی ایسی چیز مل جائے جس سے میں قبر کو دھوکوں مگر مجھے وہاں سوائے مٹی کے کچھ بھی نہیں ملا۔

اب میری آنکھیں اندھیرے سے کسی حد تک مانوس ہو چکی تھیں اور مجھے انتہائی دھندلا دھندلا سا نظریہ بھی آرہا تھا۔ شاید گورنر نے قبر کے تختوں پر اچھی طرح مٹی نہیں لگائی تھی۔ وہیں سے روشنی کی ایک رقع اندر آرہی تھی یا پھر میرا وہم تھا۔ بھلا منوں مٹی کے اندر روشنی کیسے آسکتی ہے۔

میں نے ایک مرتبہ پھر تختے اٹھانے کی کوشش کی لیکن وہ اپنی جگہ سے ہلے تک نہیں۔ الٹا میرے ہاتھ اس کوشش میں زخمی ہو گئے۔

اچانک مجھے ایسا لگا جیسے کوئی اوپر چل پھر رہا ہو۔ میں پوری قوت سے چیخا۔ ”ارے کوئی ہے۔ مجھے بچاؤ، لوگوں نے مجھے زندہ دفن کر دیا ہے۔“

لیکن کسی نے بھی میری آواز نہ سنی اور بیروں کی آہٹ دور دور ہوتی چلی گئی۔ چیخ چیخ کر میرا گلا بیٹھ گیا لیکن کسی کو میری آواز سنائی نہیں دی۔ وہاں میری آواز سننا بھی کون۔ قبرستان میں مردوں کے علاوہ اور ہوتا ہی کون ہے۔ مجھے یہ اندازہ بھی نہیں تھا کہ میں جس قبر میں ہوں، وہ بابا غفور کی کوٹھڑی سے کتنے فاصلے پر ہے۔

اسی حالت میں مجھے غئی گھٹنے گزر گئے۔ میں کبھی چیخا کبھی ہانکوں کی طرح قبر کے تختے ہٹانے کی کوشش کرتا۔ پھر تھک کر گر جاتا۔

مجھے شدید پیاس کا احساس ہو رہا تھا، حلق میں کانٹے سے پڑے تھے لیکن وہاں پینے کو پانی کہاں سے آتا۔ اسی حالت میں شاید مجھے دو دن گزرے تھے یا تین دن، قبر کے اندھیرے میں دن رات کی تیز بھلا کے ہو سکتی تھی۔ ہاں اتنا ضرور تھا کہ میں غر حال ہو گیا تھا اور اب مجھے پیاس کے ساتھ ساتھ شدید بھوک کا احساس بھی ہو رہا تھا۔ اوپر کوئی آہٹ سنائی دیتی تو میں حلق پھاڑ کر چیخا، پھر وہ آہٹ آہستہ آہستہ دور دور ہو جاتی۔

رفتہ رفتہ میری یہ حالت ہو گئی کہ نقاہت کی وجہ سے اب میرے حلق سے آواز بھی نہیں نکلی تھی۔ قبر کے تختوں کی مٹی ابھی تک گیلی تھی۔ اس میں سے مٹی کا کوئی ٹکڑا مجھ پر آگرتا تو میں اسے بھی اپنے جسم سے ہٹانے کی کوشش نہ کرتا۔

شہابی کے نتیجے میں مجھے کیا ملا؟ ریٹائر ہونے کے بعد صرف ہزار روپے کی پنشن اور بس..... یہ سوچ کر ہی میرے چہرے پر افسردگی چھا جاتی تھی۔ جب سے میں نے حکومت کے موجودہ اعلان کے متعلق اخبار میں یہ سرفی دیکھی تھی کہ حالیہ حکومت نے محکمہ آمدورفت سے متعلق ریلوے کے ڈرائیوروں کو ان کی اعلیٰ کارکردگی اور محنت کی بنیاد پر "گولڈ میڈل" دینے کا فیصلہ کیا ہے، تب سے میرے دل میں گولڈ میڈل کو حاصل کرنے کی خواہش بھل چل چارہی تھی، گوکہ مجھے اس ملازمت سے ریٹائر ہوئے دس سال سے زیادہ کا عرصہ گزر چکا تھا اور یہ اعلان ریلوے کے صرف حالیہ ملازمین اور ڈرائیوروں کے لیے تھا جس میں سابق ملازمین اور ڈرائیوروں کا دور دور تک کہیں کوئی تذکرہ نہ تھا۔ اس کے باوجود میرے دل میں اس گولڈ میڈل کو حاصل کرنے کی خواہش بار بار کروٹیں لے رہی تھیں، مجھے یقین تھا کہ آج اگر میں ریلوے میں ملازم ہوتا تو یہ قیمتی گولڈ میڈل اور ایوارڈ میرے ہی حصے میں آتا۔ میں پہلا ضمنی شخص قرار پاتا جسے گولڈ میڈل کا حق وارادہ دیا جاتا۔

میں نے دسیوں بار اخبار اٹھا کر ایک حسرت کی نظر اس شے سرفی پر ڈالی اور ایک لمبی ٹھنڈی آہ بھر کر مایوسی کے بھرپور احساس کے ساتھ اخبار ایک طرف رکھ دیا۔ بھی ایک خیال بجلی کی طرح میرے دماغ میں کوندا اور جلدی سے کاغذ قلم سنبھال کر بیٹھ گیا۔

”جناب عزت مآب“

”امید ہے مزاج بخیر ہوں گے۔ آپ نے حالیہ ریلوے ملازمین کی اعلیٰ کارکردگی پر گولڈ میڈل دینے کا جو اعلان کیا ہے وہ ایک قابل ستائش عمل ہے۔ جناب عالی! ریلوے کے ملازمت پیشہ ڈرائیور حضرات کے لیے یہ ایک حوصلہ افزا اقدام ہوگا۔ آپ کے اس فیصلے اور اقدام سے ملازمت پیشہ افراد کی کارکردگی میں پہلے سے کئی گنا زیادہ اضافہ ہوگا اور آپ کے اس اقدام کی بنا پر محکمہ کے ہر دوسرے ملازم میں محنت اور محنت سے کام کرنے کا جذبہ جاگے گا۔ وہ آپ کے اس اقدام کی بنا پر، اب کام کو ایک بوجھ نہیں بلکہ انعام سمجھ کر بڑی خوش اسلوبی سے نمٹائیں گے، ہر سال ان کی اعلیٰ کارکردگی پر گولڈ میڈل ملنے کی امنگ اور خواہش انہیں بہتر سے بہتر اعلیٰ کارکردگی پر اکسائے گی، وہ اب پہلے سے زیادہ محنت اور لگن سے کام

کریں گے۔ جناب عالی! حکومت کا یہ عمل ایک قابل تعریف اور قابل ستائش عمل ہے لیکن شوخی قسمت اگر میری سب سے بڑی بد نصیبی ہے کہ میرے دور ملازمت میں آپ جیسے ذمہ دار ذی عقل لوگ موجود نہیں تھے اور نہ ہی اس دور میں ایسا کوئی ذمہ دارانہ اقدام عمل میں آیا۔ لیکن جناب عالی! میں نے اپنی چالیس سالہ ملازمت میں جس طرح خون پیمنا ایک کر کے اپنی ذمہ داریاں نبھائی اس نتیجے میں کوئی بھی حکومت ہوتی تو میری اس محنت لگن اور اعلیٰ کارکردگی پر مجھے اس ایوارڈ سے ضرور نوازیں لیکن سر! یہ اب میری بد نصیبی ہے کہ اس دور میں آپ جیسے ذی عقل ذمہ دار لوگ نہیں تھے، جو اسے اندر سمجھ بوجھ اور شعور رکھتے ہوں۔ اگر آپ جیسے ذی عقل اور باشعور لوگ اس دور میں ہوتے تو ضرور مجھے اس ایوارڈ سے نوازتے۔ جناب! عزت مآب مجھے یقین ہے کہ آج بھی اگر آپ میری خدمت کا پچھلا چالیس سالہ ریکارڈ دیکھیں تو آپ بھی میری خدمت اور اعلیٰ کارکردگی سے متاثر ہوئے ہانہ رہ سکیں گے۔ جناب عالی! میں نے اپنی چالیس سالہ ملازمت میں جہاں میں بطور ٹرین ڈرائیور ملازم ہوا تھا۔ میں نے اپنی ملازمت کے ان طویل سالوں میں ڈرائیوگ جیسے مشکل پٹے کو بڑی خوش اسلوبی سے انجام دیا ہے۔ جناب عالی میری ملازمت کے دوران اگر آپ ایک نظر ڈالیں تو کہیں بھی میری ٹرین کسی حادثے کا شکار نہیں ہوئی۔ میری ملازمت کے دوران مسافروں کو کبھی سفر کے دوران کسی بھی تکلیف یا طویل انتظار کی زحمت نہیں اٹھانی پڑی، میری ٹرین ہمیشہ وقت سے پہلے منزل مقصود پر پہنچ گئی۔ جناب عالی! ایک اور اہم بات وہ یہ کہ میرے دور ملازمت میں میری ٹرین کے علاوہ دوسرے ملازمین کی زیر نگرانی چلنے والی ٹرینیں آئے دن حادثے کا شکار ہو رہی تھیں، جس بنا پر لوگوں نے مارے دہشت و خوف کے ٹرین سے سفر کرنے کا خیال ترک کر دیا تھا۔ وہ اسے ایک موت کا کنواں تصور کرنے لگے تھے۔ یہ سفر خود کشی کی ایک علامت سمجھا جانے لگا تھا اور محکمہ آمدورفت خسارے میں جانے لگا تھا۔ لوگ ٹرین کے بجائے جہاز سے سفر کرنے کو ترجیح دینے لگے تھے، اس دور میں میں وہ واحد ڈرائیور تھا جس کی ٹرین جو کہ میرے زیر نگرانی چلتی تھی کبھی حادثے کا شکار نہیں ہوئی، تب ہی لوگوں نے مجھے جہاز کے بجائے ریل سے سفر کرنے کو ترجیح دینا شروع کر دیا

اور اس طرح میرے زیر نگرانی چلنے والی ٹرین لوگوں کے دلوں سے خوف دور کرنے میں کامیاب ہو گئی۔

جناب عالی! میری چالیس سالہ اعلیٰ کارکردگی کے نتیجے میں کسی سابقہ حکومت نے مجھے کسی گولڈ میڈل سے تو کیا کسی تحریری اعزاز، ایوارڈ سے بھی نہیں نوازا، جس کا نام مجھے ملا ہی رہے گا لیکن سر مجھے امید ہے کہ اگر آپ آج بھی میرا پرانا ریکارڈ چیک کریں، تو میری اس حسن کارکردگی کے پیش نظر میری اس ریٹائرمنٹ کے باوجود، آپ مجھے ہی اس گولڈ میڈل کا آج بھی صحیح حقدار قرار دیں گے۔ جناب عالی! میں اس دن کا بے چینی سے انتظار کروں گا۔ جب آپ کی حکومت ریلوے کے ملازمین کو ان کی اعلیٰ کارکردگی پر، اس گولڈ میڈل سے نوازے گی۔ اور گولڈ میڈل حاصل کرنے والوں میں میرا نام سر فہرست ہوگا۔

آپ کے جواب کا منتظر

آج پورے دو مہینے ہو چکے تھے مجھے خط پوسٹ کیے لیکن حکومت کی طرف سے اب تک تسلی بخش جواب تو کیا کوئی انکار یہ لیز بھی موصول نہیں ہوا تھا اور نہ ہی مجھے اب کوئی امید رہی تھی۔ میں اب حکومت کی طرف سے تقریباً پانچ سو سا چھلچھلا اس بات کا تو اسے پہلے ہی علم تھا کہ یہ اعلان مجھے جیسے ریٹائر شخص کے لیے قطعی نہیں تھا۔ یہ اعلان تو صرف حالیہ ریلوے ملازمین کے لیے کیا گیا تھا صرف ان کی کارکردگی کو بڑھانے کی غرض سے اور بس۔ لیکن نہ جانے کیوں اس میڈل کو حاصل نہ کر سکتے کا دکھ اسے اندر ہی اندر مارے دے رہا تھا۔ تب میں نے ایک ناکام سی کوشش کے ساتھ گولڈ میڈل کے لیے کاغذ قلم اٹھایا تھا۔ مجھے قوی نہ سبھی پراتی اُمدت تھی کہ میری درخواست پر محکمہ پرانا ریکارڈ چیک کر کے مجھے اور کسی نہ کسی انعام سے نوازے گا۔ اب با تو خط پہنچا نہیں..... لیکن یہ کیسے ممکن ہے، میں نے تو خط کی رجسٹری کرائی تھی۔ تو پھر اس کا مطلب ہے خط ردی کی نوکری کی نذر ہو گیا یا پھر حکام نے ایک دیوانے کی بکواس سمجھ کر میری اعلیٰ کارکردگی کا چالیس سالہ ریکارڈ چیک کیے بنارہی کی نوکری میں ڈال دیا۔ میں یونہی آنکھیں بند کیے صوفے پر لیٹا سوچے ہی جا رہا تھا کچھ بھی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے کیا نہ کرے۔ کربت ہی تمام بہت یکجا کر کے اٹھ بیٹھا اور پھر ایک بار کاغذ قلم سنبھال لیا۔

حیرتوں کا شہر

تدمر شہر حضرت نوح کی اولاد سے ایک لڑکی تدمر بنت حسان کے نام سے موسوم ہے۔ یہاں بڑی بڑی اور عجیب و غریب عمارتیں بلند ستونوں پر کھڑی ہیں۔ روایت ہے کہ یہ عمارتیں حضرت سلیمان نے جنات سے تعمیر کرائی تھیں۔ اس شہر کے اندر ایک بہت قدیم قلعہ ہے جسے حضرت سلیمان نے تعمیر کرایا تھا۔ جس کے اندر تدمر بنت حسان کی قبر ہوا کرتی تھی جو اب بند ہو چکی ہے۔ مشہور راوی السکلی بن محمد سے روایت ہے اموی خاندان کے آخری خلیفہ مروان ثانی کے دور میں اہل تدمر نے بغاوت کردی۔ مروان ثانی خود ایک بھاری لشکر کے ساتھ اس بغاوت کو فرو کرنے کے لیے آیا۔ شہر کے باغیوں سے ٹھٹھنے کے بعد جب اس نے شہر میں قیام کیا تو اسے بتایا گیا کہ شہر سے صرف ایک فرلانگ باہر ایک عجیب و غریب غار ہے۔ مروان ثانی کو یہ غار دیکھنے کا شوق ہوا۔ وہ اپنے مصاحبوں کے ہمراہ ہزاروں برس پرانے کھنڈرات میں گیا۔ وہاں ایک غار تھی۔ جب وہ اس غار میں داخل ہوا تو اس نے دیکھا کہ ایک چبوترے پر ایک عورت کی لاش اوندھے منہ پڑی تھی اور اس کے اوپر ستر لبادے پڑے ہوئے تھے۔ اس کے بال لمبے لمبے تھے جن میں پھلے پروئے ہوئے تھے۔ راوی السکلی بن محمد بھی مروان کے ساتھ تھا۔ وہ کہتا ہے میں نے خود اس عورت کے پاؤں کو ناپا وہ ایک ذرع (گز) لپٹا تھا اور اس حسین عورت کے ایک گال پر سونے کی تختی تھی جس پر تحریر تھا۔

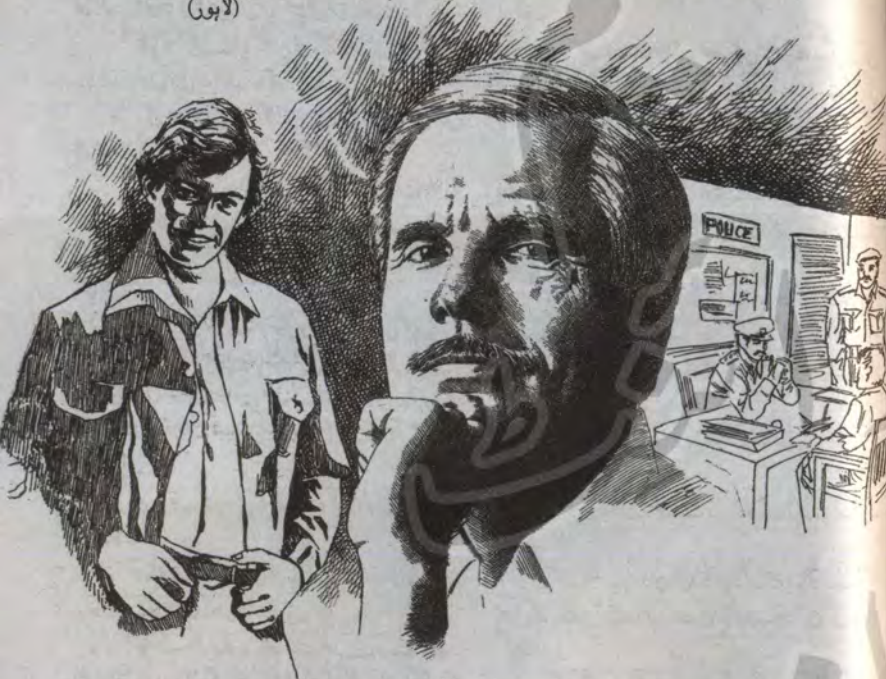
”بسمہ الحمد۔ میں تدمر بنت حسان ہوں جو میرے اس حجرے میں داخل ہو خدا اسے ذلیل کرے۔“

تب مروان ثانی نے اس غار کو بند کرنے کا حکم دیا اور اس کے مصاحبوں نے فوراً غار کا منہ بند کر دیا۔ یہ غار ابھی تک موجود ہے اور لوگ کہتے ہیں کہ تدمر بنت حسان کی لاش اب بھی تروتازہ حالت میں ہے۔

بہ جوالہ: تاریخ بلاد و فلسطین، شام

یہ زندگی کیسے کیسے گل کھلاتی ہے اس کی عکاس خود میری زندگی ہے۔ میں کوئی تجربہ کار لکھاری نہیں ہوں لیکن پڑھنے پڑھانے کا شوق ہے۔ جیل میں رہ کر بھی میں آپ کا ڈائجسٹ منگوا کر پڑھتا ہوں۔ اگر آپ سہارا دے دیں تو میں خالی وقت لکھنے لکھانے میں گزار سکتا ہوں۔ میری یہ تحریر ابتدا ہے اور خود میری آپ بیٹی ہے۔ امید ہے انداز تحریر آپ کو بھی پسند آئے گا۔

شکیل
(لاہور)



بڑی شرمناک اور الم ناک قسم کی کہانی ہے میری۔ ایک دن میرے دوست کنکڑے منان نے بتایا ”اے تیرے ابا تو آج کل بہت اونچے جارہے ہیں۔“ ”کیوں“ کیا وہ کسی بلڈنگ کی چھت پر چڑھ گئے ہیں؟

”بیٹے، باپ کے عیوں کومت چھپا۔“
”اے بتا تو سہی کیا کیا ہے ابا نے؟“ میں نے غصے سے پوچھا۔

اجنبی صحیح طور سے کاغذ قلم سنبھال بھی نہیں پایا تھا کہ ڈاکے کی آواز پر دوڑ کر گریٹ پر پہنچا۔

”محکمہ آمدورفت حکومت پاکستان“

لفافے پر مونا مونا حکومت پاکستان کا لیبل دیکھ کر میرا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ میں نے تقریباً جھپٹ کر پوسٹ مین کے ہاتھ سے لفافہ چھینا اور اپنے کمرے میں چلا آیا۔ تب ہی میری نظریں تیزی سے کاغذ پر بکھری سطروں پر دوڑنے لگی۔

”جناب رحیم احمد!“

2 ستمبر کو آپ کا خط ملا۔ جس میں آپ نے ریلوے ملازمین سے متعلق اقدام کو سراہتے ہوئے اپنی پچھلی اعلیٰ ترین خدمات کا حوالہ دیتے ہوئے ہم سے اپنا پچھلا ریکارڈ چیک کرنے کی درخواست کی ہے، جس پر ہم نے بڑی دیانت داری کا ثبوت دیتے ہوئے آپ کا پچھلا ریکارڈ چیک کیا ہے جس کے مطابق آپ نے واقعی ٹرین کو کبھی حادثے کا شکار نہیں ہونے دیا جو کہ واقعی آپ کے ایک اعلیٰ ڈرائیور ہونے کا ثبوت ہے اور ایک محنتی انسان ہونے کی نشانی بھی۔ لیکن جناب عالی! آپ کو آپ کی اس اعلیٰ کارکردگی اور ڈرائیونگ کا محکمہ ایک بھاری معاوضہ دیتا رہا ہے۔ ہاں البتہ آپ کے پرانے ریکارڈ کی چیکنگ کے دوران کچھ باتیں ہمارے علم میں آئی ہیں جس کی بنا پر محکمہ آمدورفت کو آپ کی اعلیٰ کارکردگی کے ساتھ ساتھ ہمیں کچھ عظیم خساروں اور نقصان کا بھی سامنا کرنا پڑا، جن کا ذکر یہاں ضروری ہے۔ نمبر ایک آپ کی ملازمت کے دوران آپ کی رہبری میں چلنے والی انیسپریس میں لوگوں کو بھیڑ بکریوں کی طرح ٹھونسنا گیا، جو کہ ریلوے کے ڈپلن کے خلاف تھا اور ریلوے ڈرائیور کی ذمہ داری بھی، جس کا قطعی خیال نہیں کیا گیا۔

نمبر 2۔ سیکنڈ کلاس کی ایمر جنسی چین جو کہ برسوں سے خراب پڑی تھی، جسے صحیح کرانے کی طرف بھی توجہ نہیں دی گئی جبکہ یہ کام بھی ایک ذمہ دار ٹرین ڈرائیور کی ذمہ داری میں شامل تھا۔

نمبر 3۔ مسافروں کی برتھ سیٹ، جو کہ جا بجا خستہ حالت میں تھی۔ جس کی طرف بھی توجہ نہیں دی گئی جس کی

بنیاد ٹرین کے مسافروں کو تکلیف کا سامنا کرنا پڑا جو کہ ایک ڈرائیور کی عظیم غلطی اور کابلی کا ثبوت ہے۔ 13 دسمبر 1960ء کو آپ کی ٹرین کے نیچے آکر ایک نوجوان بچہ لگا گیا جو کہ ٹرین کے پانچ منٹ پہلے پہنچ جانے کی بناء پر ہوا، اگر اس روز آپ نے مقررہ وقت پر ٹرین پہنچتی تو ایک قیمتی جان جس کا کوئی نعم البدل نہیں، بچ سکتی تھی لیکن آپ سے اس عظیم جرم کا ارتکاب ہوا، لہذا حکومت ان تمام غلطیوں کی بناء پر اور اتنے بڑے بڑے جرم سرزد ہونے کی بناء پر آپ پر بھاری جرمانہ عائد کرنے کا پورا پورا حق رکھتی ہے لیکن آپ کی پچھلی اعلیٰ کارکردگی اور عمدہ ڈرائیونگ کو دیکھتے ہوئے آپ کی سزائیں کچھ نرمی کرتے ہوئے آپ پر صرف تین لاکھ روپے کا جرمانہ عائد کرتی ہے اور ساتھ ہی آپ کی پچھلی کارکردگی کو دیکھتے ہوئے حکومت آپ کی سزائیں مزید نرمی کرتے ہوئے آپ کو اس رقم کی ادائیگی کے لیے پورے تین ماہ کی مہلت اور نوٹس دیتی ہے ورنہ دوسری صورت میں ادائیگی نہ ہونے کی صورت میں حکومت اور محکمہ آپ کی مقتول اور غیر منقولہ جائیداد کو فروخت کر کے یہ رقم با آسانی وصول کرنے کا حق رکھتی ہے۔

شکریہ!

خط پڑھنے کے بعد میں نے افراتفری میں پاسپورٹ بنوایا تھا اور یو اے ای آگیا تھا۔ عرصہ دو سال تک یہاں رہا پھر ایک دن فراز نامی نوجوان سے ملاقات ہوگئی۔ باتوں باتوں میں پتا چلا کہ وہ بھی ریلوے میں ملازم تھا۔ اور اسی زون میں تھا جس میں، میں، فرق اتنا تھا کہ وہ دفتر میں تھا اور میں فیلڈ میں۔ ہماری شاخیں ساتھ گزرتی تھیں لیکن میں نے اسے یہ نہیں بتایا تھا کہ میں بھی ریلوے کا ریٹائرڈ ملازم ہوں۔ ایک دن اس نے باتوں باتوں میں بتایا کہ دفتر میں کسی پائل بڈھے کا خط آیا جو ریٹائرمنٹ کے بعد بھی گولڈ میڈل مانگ رہا تھا۔ میں نے اسے ایسا جواب لکھا کہ وہ خاموش ہی ہو گیا ورنہ خط لکھ کر جان بلیک کر دیتا۔

اتنا سننا تھا کہ میرے غصے کی انتہا نہ رہی اور میں غصے میں اٹھ کر آگیا۔ آپ اگر میری جگہ ہوتے تو کیا کرتے؟



”تیرے ابا آج کل نیلم پری کے چکر میں ہیں۔“ اس نے بتایا۔

”کون نیلم پری؟“ میں نے چونک کر پوچھا۔

”اے وہی جس کو دیکھ کر تو بھی آہیں بھرتا رہتا ہے لیکن اسے تیرے ابا لے آئے۔“

”دیکھ، میرے ابا کی شان میں کچھ مت کہنا، میں یہ برداشت نہیں کر سکتا۔“

”تو ایسا ابا کیوں پال رکھا ہے۔“

”میں نے نہیں پالا۔ قدرت نے نصیب میں لکھ دیا تھا۔ تو یہ بتا تو ابا کی شان میں کیا گستاخی کر رہا تھا۔“

”بتایا تو، تیرے ابا نیلم پری کے چکر میں ہیں۔ میں نے خود دونوں کو کئی بار ایک ساتھ دیکھا ہے۔“

”کسی اور کو دیکھا ہوگا۔ میرے ابا ایسے آدمی نہیں ہیں۔ نمازی پر ہیزگار ہیں۔“

”یہ تو میں بھی جانتا ہوں کہ تو کس دل سے ان کو نمازی پر ہیزگار کہہ رہا ہے۔“ اس نے کہا۔ ”میرے سامنے کی بات ہے۔ عید کی نماز کے لیے بھی تو کجا انہیں زبردستی لے گیا تھا۔“

”اچھا یہ بتا، تو نے نیلم پری والی کیا بات کی تھی۔“

”بتا تو دیا، تیرے ابا نیلم پری کے چکر میں ہیں۔“ اس نے کہا۔ ”تو تو جانتا ہے، وہ اور اس کی ماں دونوں ہی کتنی بد معاش ہیں۔ اے تیرے ابا تو ان کے چکر میں تباہ ہو جائیں گے۔“

”جب تک میں اپنی آنکھ سے دیکھ نہ لوں یقین نہیں آئے گا۔“

”وہ دوسرے محلے میں جو پارک ہے، رانی پارک۔ یہ بتا تیرے ابا وہاں کیوں جاتے ہیں؟“

”جاہنگ کرنے۔ مجھ سے کہہ رہے تھے بلڈ پریشر ہائی رہنے لگا ہے۔ اس لیے ڈاکٹر نے جاہنگ کا مشورہ دیا ہے۔“

”اے یہ سب غلط ہے۔ وہ بلڈ پریشر گھٹانے کے لیے نہیں بڑھانے کے لیے جاتے ہیں۔ وہ لڑی ان سے وہیں پارک میں آکر ملتی ہے۔ تیری اماں کی موت کے بعد تیرے ابا بدست تیل کی طرح بجھتے پھر رہے ہیں۔“

”ابا کے بارے میں اس کی یہ رائے بہت شرمناک تھی۔ میں بھٹا کر رہ گیا تھا۔ لیکن مجبور اس لیے تھا کہ ابا کا مزاج ہی کچھ ایسا تھا۔ وہ اسی قسم کی حرکتیں کیا کرتے تھے۔“

لنگڑے منان کی اطلاع کا میں نے یقین کر لیا تھا۔ لیکن اپنی شرمندگی چھپانے کے لیے اس سے بحث کیے جا رہا تھا۔ رانی پارک جا کر دیکھنے کی نوبت نہیں آئی۔ بلکہ اس سے پہلے میں نے ابا کو نیلم پری کے گھر سے باہر آتے ہوئے دیکھ لیا۔

میں اس وقت ایک دکان کی آڑ میں تھا۔ اس لیے ابا مجھے نہیں دیکھ سکے تھے۔

نیلم پری اور اس کی ماں دونوں ہی بہت بدنام تھیں۔ نہ جانے کیسے انہوں نے اس محلے میں کرائے کا مکان لے لیا تھا۔

پورا محلہ ان کے خلاف تھا۔ لیکن مصیبت یہ تھی کہ ان کے یہاں بااثر لوگوں کا آنا جانا لگا رہا تھا۔ اسی لیے کسی کی ہمت نہیں ہوتی تھی کہ ان کے خلاف کچھ بول سکے۔

عام طور پر یہ خیال تھا کہ ان کے یہاں صرف بااثر اور دولت مند لوگوں کا آنا جانا ہوتا ہے۔ لیکن یہ ابا کی خوشی میں وہاں آنے جانے لگے تھے، یہ میری سمجھ سے باہر تھا۔ ابا کے پاس تو کچھ بھی نہیں تھا۔

میں نے شام کے وقت ابا سے بات کر لی۔ ابا اس وقت گنا چھیل رہے تھے۔ ”ابا، ایک زمانہ تھا کہ اولاد نافرمان ہوا کرتی تھی۔ اب والدین نافرمان ہونے لگے ہیں۔ انہیں سمجھانے کی ضرورت ہے۔“

”اے فلسفہ مت بول۔ صاف صاف بتا کیا پرائیلم ہو گئی ہے۔“

”ابا، ہارون رشید کے زمانے میں ایک دفعہ ایک باپ۔۔۔“

”اے، یہ ہارون رشید کا کیا ذکر چھیڑ دیا تو نے۔“ ابا بھٹا گئے تھے۔ ”مجھے اس سے کیا دلچسپی۔ تو آج کی بات کر۔“

”ابا، میں نے تم کو ایک غلط جگہ دیکھا ہے۔“

”اے پورے محلے میں صرف ایک ہی غلط جگہ ہے۔ درخت کے نیچے پورے محلے کا پتھر اوپن پھینکا جاتا ہے۔ توفیق ہی نہیں ہوتی سالوں کو کہ پتھر اسی صاف کروادیں۔“

”ابا، میں درخت کے نیچے والے پتھر کی بات نہیں کر رہا ہوں۔ کسی اور پتھر کی بات کر رہا ہوں۔“

”صاف صاف کیوں نہیں بتاتا۔“

”ابا۔ میں نے تم کو نیلم پری کے گھر سے نکلے ہوئے دیکھا ہے۔“ میں نے صاف صاف بتا دیا۔

ابا کچھ دیر کے لیے خاموش ہو گئے۔ پھر دیر سے بولے۔ ”ہاں بھئی، میں اسے نماز کی تلقین کرنے گیا تھا۔“

”نماز کی تلقین۔“ میں نے حیران ہو کر ابا کی طرف دیکھا۔ ”تم نماز کی تلقین کرنے چلے گئے۔“

”اے یہ تو ہر مسلمان کا فرض ہے کہ ایک دوسرے کو تلقین کرتا رہے۔“

”لیکن تم نے تو آج تک خود نماز نہیں پڑھی ہوگی۔“

”وہ بات اور ہے۔ خدا معاف کرنے والا ہے۔ کم از کم نماز کی تلقین تو کر سکتا ہوں نا، یا اس پر بھی پابندی ہے۔ بتا۔“

اب ایسے ابا سے بحث کیا کرتا۔ اس لیے خاموش ہو گیا۔

میرا خیال تھا کہ شاید ابا کو کچھ لحاظ آجائے اور وہ اس مذکرے کے بعد نیلم پری کے یہاں جانا چھوڑ دیں۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔ ابا وہاں جاتے رہے اور منان لنگڑا مجھے رپورٹ پہنچاتا رہا۔

ایک دن میں منان لنگڑے ہی سے الجھ گیا۔ ”ایک بات بتا، باپ کس کا ہے، تیرا میرا۔“

”ظاہر ہے تیرا ہے۔“

”تو پھر تجھے کس بات کی تکلیف ہو رہی ہے۔“ میں نے کہا۔ ”وہ جا رہا ہے تو جانے دے۔“

”یار، یہ تو سوچ تیرے ابا بدنام ہو رہے ہیں۔ کم از کم یہ تو پوچھ کہ وہ وہاں جاتے کیوں ہیں۔“

میں نے اس بار ذرا ناراض لہجے میں ابا سے دریافت کیا۔ ”ابا، آخر تم وہاں جاتے کیوں ہو۔ کیا لالچ ہے چھپیں۔“

ابا کچھ دیر کے لیے خاموش ہو گئے۔ پھر دیر سے بولے۔ ”بیٹا، میرا خیال ہے کہ اب میں تجھے حج بتاتی دوں۔“

”تو بتا دونا۔“

”میں اسے کلاسیکل کھانے کے لیے جاتا ہوں۔“

ابا نے بتایا۔

میرے لیے یہ اطلاع نماز کی تلقین والی اطلاع سے زیادہ حیرت انگیز تھی۔ ”کیا کہہ رہے ہو ابا۔ تم اسے کلاسیکل کھانے جاتے ہو۔ تمہیں کیا معلوم کلاسیکل کیا چیز ہوتی ہے۔“

”اے معلوم کیوں نہیں ہے۔ خیال گانے والے گھرانے سے تعلق ہے میرا۔“ ابا نے بتایا۔ ”میں ایک

زمانے میں محفلوں میں گایا کرتا تھا۔“

”اور یہ کون سا زمانہ تھا؟“

”شادی سے پہلے کا۔“

”لیکن یہ بات تو میں پہلی بار سن رہا ہوں۔“

”اے کیا کیا سنے گا۔“

”خدا کے لیے ابا! کیوں تمنا سن رہے ہو۔“ میں نے کہا۔

”اے تجھے اپنے باپ کی صلاحیتوں کا اندازہ ہی نہیں ہے۔ باہر والے جانتے ہیں۔ اس لیے ان لوگوں نے مجھے استاد رکھ لیا ہے۔ استاد جی کہتے کہتے ان کی زبانیں سوکھ جاتی ہیں۔“

”بس کرو ابا، بس کرو۔“ میں بھٹا کر رہ گیا۔ ”اب تمہارا کوئی علاج نہیں ہے۔“

بہت غصہ آ رہا تھا مجھے۔ لیکن میں اپنے ابا کے سامنے بے بس ہو کر رہ جاتا تھا۔ لیکن یہ نیلم پری والا معاملہ ایسا تھا کہ ابا کو یوں ہی چھوڑ بھی نہیں سکتا تھا۔

میں نے سوچ لیا تھا کہ ایک دن زبردستی نیلم پری کے گھر میں گھر کر ابا کو وہاں سے اٹھاؤں گا۔ کیونکہ اب معاملہ برداشت سے باہر ہونے لگا تھا۔ منان لنگڑے نے زندگی اور عذاب کر دی تھی۔ وہ کم بخت اب ہر وقت ابا کے حوالے سے طنز کرتا رہتا تھا۔

ایک شام میں نیلم پری کے گھر میں داخل ہو ہی گیا۔ میری قسمت نے اس طرح ساتھ دیا تھا کہ کئی والا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ اس لیے میں بے جھجک داخل ہو گیا تھا۔ مجھے یہ پتا چل گیا تھا کہ ابا اس وقت بھی اندر ہی بیٹھے ہیں۔

پہلا کرا خالی تھا۔ البتہ دوسرے کمرے سے کسی عورت کے چیخنے چلانے کی آوازیں آرہی تھیں۔ میں نے وہ آواز پہچان لی۔ وہ نیلم پری کی ماں کی آواز تھی۔ ”شرم کر بڑھے، تو نے میری بے بی کا وقت برباد کیا۔“ مجھے تو کلاسیکل کی ہوا بھی نہیں لگی ہے اور دعویٰ کرتا تھا کہ تو بہت بڑا استاد ہے۔“

”دیکھو، کچھ موقع اور دے دو۔ میں نیلم کو خیال اور شمیری دونوں سکھا دوں گا۔“ یہ ابا کی آواز تھی۔

”اے تو یہاں سے جاتا ہے یا کچھ کھا کے جائے گا۔“ اس کی ماں دھاڑ رہی تھی۔

”اب میرا اندر جانا ہے کرا تھا۔ میں جس کام سے آیا تھا وہ کام تو خود بخود ہی ہو رہا تھا۔ اس لیے میں جس خاموشی

سے اندر گیا تھا، اسی خاموشی سے باہر آ گیا۔
شام کے وقت ابا کا چہرہ لٹکا ہوا تھا۔ ”کیا ہوا ابا، خبر تو ہے۔“ کچھ اداس اداس دکھائی دے رہے ہو۔“
”آج تیری ماں بہت یاد آ رہی ہے۔“ ابا نے ایک گہری سانس لی۔

”کون سی والی ماں۔“
”ابے کیا پاگل ہو گیا ہے۔“ ابا غصے سے بولے۔ ”کتنی مائیں تھیں تیری۔ ساری زندگی ایک ہی پر گزارہ کر لیا تو اب طعنے دے رہا ہے کون سی والی ماں۔“
”اچھا ابا، میں تو مذاق کر رہا تھا۔ تم یہ بتاؤ تم وہاں تو نہیں جاتے۔“

”کہاں۔“
”ارے وہی نیلم پری کے یہاں۔ جس کو کلاسیکل کھانے جاتے تھے۔“
”ابے تو بکر۔ وہ تو بہت ہی کند ذہن لگی۔ اسے تو معلوم ہی نہیں ہے کہ کلاسیکل کیا ہوتا ہے۔ کم بخت نے خواجہ میرا وقت ضائع کیا۔“
میں خاموش ہو گیا۔ ابا نے اپنے نکالے جانے کا سارا لمبا ان ہی لوگوں پر ڈال دیا تھا۔

میرا خیال تھا کہ اس حادثے کے بعد ابا سدرہ جانیں گے۔ لیکن ایک دن منان لنگڑے نے ایک اور خبر سنائی۔ ”ابے، تیرے ابا کس بار کسی اور کے چکر میں پڑ گئے ہیں۔“
”ایک بات بتا، کیا تو نے میرے ابا کا ٹھیکہ لے رکھا ہے کہ ہر وقت ان کی جاسوسی کرتا رہتا ہے۔“ میں نے غصے سے پوچھا۔

”یار، جب ایسی انوکھی چیزیں دیکھنے کو ملیں گی تو حیرت تو ہو گی نا۔“
”چل بتا، اس بار کیا ہوا ہے؟“
”ابے، تیرے ابا نے ایک اور جوان لڑکی کا گھر دیکھ لیا ہے۔“ اس نے بتایا۔

”کون ہے وہ لڑکی؟“
”ٹھیک ٹھیک چلتی ہے۔“ اس نے بتایا۔
”ابے ٹھیکے کو چھوڑ، یہ بتا وہ ہے کون؟“
”یکل پتا کر کے بتا دوں گا۔“

دوسرے ہی دن اس نے اس لڑکی کا پورا جغرافیہ اور تاریخ میرے سامنے لائے لاکر رکھ دی تھی۔ ”یار، اس لڑکی کا نام

شاہدہ ہے۔ وہ ایک دھوبی کی بیٹی ہے۔ بہت زبردست چہرہ ہے۔ جوان اور خوبصورت۔ یار، تیرے ابا لڑکیاں کہاں سے پکڑ لیتے ہیں۔“
”اچھا بس خاموش ہو جا۔ ابا کی شان میں کچھ مت کہنا۔“
”حالانکہ تو خود دل ہی دل میں اپنے ابا کو برا بھلا کہتا ہو گا۔“ وہ مسکرا کر بولا۔

اب میں ایسی بے ہودہ بات کا کیا جواب دے سکتا تھا۔ حالانکہ یہ سچ تھا۔ ایک دن میں نے خود ابا کو اس شاہدہ سے باتیں کرتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔
میں ابا کے گلے پڑ گیا۔ ”ابا، یہ کیا چکر ہے۔ تم اب تھو دھوبی کے یہاں جانے لگے ہو۔“

ابا کچھ دیر کے لیے سنائے میں رہ گئے۔ پھر بھراکی ہوئی آواز میں بولے۔ ”ابے، کیا تو یہ نہیں جانتا کہ ماں کے قدموں تلے جنت ہوتی ہے۔“
”تو کیا تم اس کو اپنی ماں سمجھ کر ملے ہو۔“
”ابے کیا پاگل ہو گیا ہے۔“ ابا ناراض ہو گئے تھے۔ ”یہ تو میں تیرے لیے جنت کے راستے ڈھونڈ رہا ہوں۔“
”کیا مطلب ہے تمہارا؟“

”ابے، میں اس سے شادی کرنے والا ہوں۔“ ابا نے بتایا۔
”ابا، کیا ہو گیا ہے۔ وہ ایک جوان لڑکی ہے۔ اگر شادی ہی کرنی ہے تو کسی بیوہ سے کیوں نہیں کر لیتے۔“
”ابے، یہ کس کتاب میں لکھا ہے کہ جس کی بیوی مر جائے وہ صرف بیوہ ہی سے شادی کرے۔ اگر اتفاق سے کوئی کنواری مل جاتی ہے تو اس میں کیا برائی ہے۔“
”ابا ایک بات بتاؤ، اس سے تمہاری جان بچکان کیسے ہو گی؟“

”بیٹے، میں نے تو اس سے شادی کا فیصلہ اسی دن کر لیا تھا جس دن اس نے میری فیص کے سارے بن توڑ دیے تھے۔ یہ ادا مجھے اچھی لگی تھی۔“
ابا، اگر یہ کسی قسم کی کوئی ادا ہے تو پھر میں تمہاری شادی ایسی عورت سے کروا دوں گا جو رات دن تمہاری فیصوں کے بن توڑتی رہے گی۔“
”بیٹے، وہ بن تو توڑ دے گی۔ لیکن بن توڑنے والے ایسے نازک ہاتھ کہاں سے لائے گی۔“ ابا نے ایک گہری سانس لی۔

”ابا، تمہاری بیماری کا اب کوئی علاج نہیں ہے۔“

”تو پھر چھوڑ دے میرے حال پر۔“ ابا نے کہا۔
لیکن میں ابا کو ان کے حال پر کیسے چھوڑ دیتا۔ میں نے اس لڑکی کی جاسوسی شروع کرادی۔ یہ جاسوسی منان لنگڑا ہی کر رہا تھا۔ اس میں چاہے اور ہزار برائیاں ہوں لیکن ایک بات یہ سچی کہ خبریں بہت گہری لایا کرتا۔ اس نے مجھے بتایا۔ ”یار، وہ لڑکی ایک نمبر کی بدعاش ہے۔ اس نے تیرے ابا جیسے کوئی بدھوں کو پھانس رکھا ہے۔ اور ہر ایک سے شادی کے وعدے کر رہے ہیں۔“

”سوال یہ ہے کہ آخر میرے ابا سے وہ کیوں شادی کی بات کر رہی ہے۔ کیونکہ ابا کے پاس تو کچھ بھی نہیں ہے۔“
”ابے، میں اس سوال کا جواب بھی لے آیا ہوں۔“
وہ مسکرا کر بولا۔
”بتا جلدی۔“

”تیرے ابا نے ان لوگوں سے یہ کہہ رکھا ہے کہ میرا پر خاص میں ان کے دو آدموں کے اور ایک امرو کا باغ ہے۔“
میں چلپا کر رہ گیا۔ ابا نے تو کبھی آموں کا باغ دیکھا ہی نہیں ہو گا اور اب باغات کے مالک بھی ہو گئے تھے۔ میں نے جب ابا سے پوچھا تو ان کا جواب سن کر چکر سا آ گیا۔ ”ابے ہاں، بتایا تھا۔ لڑکے کو اپنا رشتہ پکا کرنے کے لیے تھوڑا بہت تو جھوٹ بولنا ہی پڑتا ہے۔“

میں اپنا سر پیٹ کر رہ گیا۔ ابا کسی پرانی فلم کا کوئی رومانس بھرا گا نا گاتے ہوئے اپنے کمرے میں چلے گئے۔ ایک دن ابا نے خود بتایا۔ ”بیٹا، بات یہ ہے کہ اب میری زندگی کا کوئی بھر وسا نہیں رہا۔ اس لیے میں نے سوچا ہے کہ شادی کر ہی لوں۔“

”یہ کیا بات ہوئی ابا، جب زندگی کا بھر وسا نہیں رہا تو اللہ اللہ کرو۔ یہ شادی کیوں کر رہے ہو۔“
”ابے، یہ معرفت کی باتیں ہیں جس کو تو نہیں سمجھے گا۔“
انہوں نے کہا۔ ”اب دیکھ لیتا۔ میں اسی ہفتے اسے تیری ماں بنا کر لے آؤں گا۔ پھر تو اس کی خدمت کرتے رہنا۔“
چار دنوں کے بعد منان لنگڑا پھر میرے پاس آ گیا۔ وہ اس بار بھی ایک خبر لے کر آیا تھا۔ ”پیارے، اب میں تیرے لیے بہت خطرناک خبریں لے کر آیا ہوں۔“
”اس میں کون سی نئی بات ہے۔ تو ہمیشہ ایسی ہی خبریں لے کر آتا ہے۔“
”لیکن اس بار جو خبریں ہیں، وہ بہت خطرناک ہیں۔“
اس نے کہا۔ ”جلی خبر تو یہ ہے کہ شاہدہ کا خون ہو گیا ہے۔“

”کیا...؟ میں اچھل پڑا تھا۔“ خون ہو گیا ہے، کیا مطلب ہے تیرا۔ کسی نے اس کا مڑ کر دیا ہے۔“
”ہاں پیارے، کسی نے نہیں بلکہ تیرے باپ نے۔ پولیس انہیں گرفتار کر کے اپنے ساتھ لے گئی ہے۔“
میرے خدا! میرے تو ہوش اُڑ گئے تھے۔ منان لنگڑا واقعی خطرناک خبریں لایا تھا۔
”منان، میرے ساتھ ذرا تھانے چل۔“ میں باقاعدہ کاٹنے لگا تھا۔ ”ابا سے ملنا ہے مجھے۔“
”چل یار، دوست ایسے ہی موقعوں پر کام آتے ہیں۔“
ہم دونوں تھانے پہنچ گئے۔ تھانے دار بہت ہی خوفناک قسم کا انسان تھا۔ ”ہاں بھئی، کون ہے تو، کس سے ملنے آیا ہے؟“
”میرا نام کھیل ہے میں ابا سے ملنے آیا ہوں۔“ میں نے بتایا۔

”کون ابا، وہ بوڑھا عاشق۔“
”تھانے دار صاحب، آپ تو خود سمجھنا آ رہی ہیں۔“ میں نے کہنا شروع کیا۔ ”آپ تو بندے کو دیکھتے ہی سب جان لیتے ہیں۔ میرا باپ عاشق تو ہو سکتا ہے، قاتل نہیں ہو سکتا۔“

”اوئے ہوئے، کس طرح باپ کی طرف داری کر رہا ہے۔ تیرا باپ موقع سے گرفتار ہوا ہے۔ جوان لڑکی کے چکر میں پڑا ہوا تھا۔“
”تھانے دار صاحب، پلیز ذرا ابا سے ملو ادیں۔ بڑی مہربانی ہوگی۔“
”جالا قاتل کر لے اپنے انوکھے باپ سے۔“
ابا دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے بیٹھے تھے۔ مجھے دیکھ کر

شمارہ جون 2013ء کی منتخب کتاب میانیاں

ہماری پیشکش..... آپ کا انتخاب

☆ اول: لے پالک... شہلا عارف (کراچی)

☆ دوم: آشیانہ ابدی... مکر شاہ (کراچی)

☆ سوم: قاتل جذبے... مہر نالک (سیالکوٹ)

پہلے دوسرے اور تیسرے انعام کے لیے آپ جیتی منتخب کیجئے

ہم آپ کی رائے کا احترام کریں گے

جلدی سے میرے پاس آگئے۔ ان سے چلا بھی نہیں جا رہا تھا۔
”بیٹا، بہت مارا ہے کم بختوں نے۔“ ابا فریاد کرنے لگے۔
”میرے بڑھاپے کا بھی خیال نہیں کیا۔ جب میں نے دوہائی دی تو کہنے لگے شش کے وقت بڑھاپا کہاں چلا گیا تھا۔“
”ٹھیک ہی تو کہہ رہے تھے ابا۔“

”اب تو آگ مت لگا۔ ویسے ہی پورے بدن سے جل رہا ہوں۔“

”بتاؤ تو سہی، ہوا کیا۔ تم نے کیوں مار دیا اس کو؟“
”بیٹے، میں نے اسے نہیں مارا ہے۔“ ابا بکھنے لگے تھے۔
”چنانچہ کون کم بخت اسے مار کر چلا گیا اور ان لوگوں نے سارا الزام میرے سر دھر دیا۔“

”تفصیل سے بتاؤ، کیا ہوا تھا؟“
”بیٹا، میں تجھے بتا چکا ہوں کہ میرے دل میں کوئی برائی نہیں تھی۔ میں تو بس اس سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ اس لیے میں مٹھائی لے کر ان کے گھر پہنچ گیا۔“
”تم یقیناً شادی کی بات کرنے گئے ہو گے۔“
”یہ بتا یہ کہانی کس کی ہے، تیری یا میری؟“
”ظاہر ہے ابا، تمہاری ہے۔“

”تو پھر مجھے بتانے دے۔“ ابا نے کہا۔ ”پھر یہ ہوا کہ اس کے گھر والے بھی میرے پاس آکر بیٹھ گئے اور وہ لڑکی بھی آگئی۔ ادھر ادھر کی باتوں کے بعد میں نے رشتے کی بات چھیڑ دی جس پر وہ بہت ناراض ہو گئے۔ وہ لڑکی بھی اپنی سیدھی باتیں کرنے لگی۔“

”اور انہوں نے رشتے سے انکار کر دیا ہو گا۔“

”پھر وہی بات، اے یہ کہانی تیری ہے یا میری۔“

”ابا، تمہاری کہانی ہے۔“

”تو پھر اچھی طرح بتانے دے۔ سچ میں کیوں بولنے لگتا ہے۔“

”چلو اب نہیں بولوں گا۔ تم اپنی کہانی پوری کر لو۔“

”تو پھر بیٹا ہوا یہ کہ مجھے نیند آگئی اور میں ذرا سی دیر کے لیے سو گیا۔“

”کہاں سو گئے۔ اسی گھر میں۔“

”ہاں، اسی گھر میں۔“ ابا نے بتایا۔ ”وہ لوگ بک بک کر کے چلے گئے تھے اور جاتے جاتے مجھے بول گئے تھے کہ میں ان کے گھر سے چلا جاؤں۔ پھر بجائے جانے کے مجھے نیند آگئی اور میں سو گیا۔ پھر ان ہی لوگوں کی چیخ و پکار سے آنکھیں کھلی تھیں۔ وہ لڑکی شاہدہ میرے پاس ہی

مری پڑی تھی۔ کسی نے اس کی گردن کاٹ دی تھی بیٹا۔۔۔ ایک بڑا سا خنجر میرے ہاتھ میں تھا۔ نہ جانے کہاں سے آیا تھا کم بخت۔“

”پھر اس کے بعد تم نے کیا کیا۔“

”اے پھر مجھے کیا کرنا تھا۔ جو کچھ کرنا تھا خود انہوں نے کیا۔ پہلے تو سب نے مل کر میری ٹھکانی کی۔ پھر پولیس کے حوالے کر دیا اور پولیس نے بھی ٹھکانی کی۔ بیٹا، میں تو بس ٹھکانی کا ہو کر رہ گیا ہوں۔“

ابا واقعی رنگے ہاتھوں گرفتار ہوئے تھے۔ بہت ہی پکا کیس تھا ان کا۔ کون ان کی بات پر یقین کرتا۔ وہ لڑکی کے پاس سے پکڑے گئے تھے۔ خنجر ان کے ہاتھ میں تھا اور لڑکی کا قتل ہو چکا تھا۔ پولیس کو اور کیا چاہئے تھا۔ سارے ثبوت سامنے تھے۔

”بیٹے، یہاں سے نکالنے کی کوئی ترکیب کر۔“ ابا نے کہا۔ ”ورنہ بے موت مارا جاؤں گا۔“

”بتاؤ ابا کیا کروں۔“

کوئی ٹکڑا سا وکیل کر لے۔ ورنہ تیرا باپ بھائی جڑھ جائے گا اور تو یتیم ہو کر در در ٹھیک ہانگتا پھرے گا۔ کیونکہ

ہمارے ملک کے یتیم صرف بھیک ہی مانگتے ہیں۔“

”ابا وکیل کے لیے پیسے کہاں سے آئیں گے۔“

”اس کی فکر تم کر۔ اتنے پیسے ہیں میرے پاس۔“

پھر ابا نے بتا دیا کہ انہوں نے برے وقتوں کے لیے گھر کے فلاں کونے میں پچاس ہزار روپے رکھے ہوئے ہیں۔

میں نے ایک وکیل سے رابطہ کیا۔ وکیل ایماندار اور محنتی آدمی تھا۔

”لگتا ہے تمہارے بے وقوف باپ کو باقاعدہ سازش کر کے پھانسا گیا ہے۔“ اس نے کیس کا جائزہ لینے کے بعد کہا۔ ”کیس مکمل اور مضبوط ہے۔ خنجر پر تمہارے باپ کی اگھیلوں کے نشانات ہیں۔ خود وہ لاش کے پاس ہی پڑا ہوا دکھائی دیا ہے۔“

”لیکن وکیل صاحب، خود سوچیں، کوئی شخص کسی کا مرڈر کرنے کے بعد لاش کے پاس کیوں سو جائے گا۔“

”یہ ایک نفیاتی مرض بھی ہوتا ہے۔“ وکیل نے بتایا۔ ”دنیا میں ایسے بے شمار قاتل ہیں، جنہیں مقتول کے پاس ہی سے نیند کی حالت میں پکڑا گیا ہے۔ اسی لیے عدالت کے لیے کوئی جواز نہیں ہے۔“

”اس کا مطلب یہ ہوا کہ ابا بری طرح پھنس گئے۔“

”ہاں۔ ابھی تو ایسا ہی ہے لیکن نہ جانے کیوں تمہارے ابا مجھے قاتل نہیں لگتے۔“ وکیل نے کہا۔ ”وہ ٹھیک تو ہو سکتے ہیں، بک بک کرنے والے بھی ہو سکتے ہیں، لیکن قاتل نہیں ہو سکتے۔“

”تو پھر بتائیں وکیل صاحب، ان کو چھڑانے کے لیے کیا کیا جائے۔“

”ثبوت۔ ان کے حق میں ثبوت کی ضرورت ہے۔ اور یہ ثبوت تم مہیا کرو گے۔ کیس میں لڑوں گا لیکن ثبوت تم لاؤ گے۔“

”میں کہاں سے لاؤں گا ثبوت۔“

”تم تھو دھوئی کے گھر کی نگرانی کرو۔“ وکیل نے بتایا۔ ”دیکھو کہ وہاں کون آتا جاتا ہے۔ ان کے پچھلے ریکارڈ معلوم کرو۔“

”کیا یہ کام پولیس نہیں کرے گی۔“

”نہیں۔ پولیس نہیں کرے گی۔“ وکیل نے کہا۔ ”کیونکہ پولیس نے تو اپنے طور پر تمہارے ابا کا قاتل قرار دے ہی دیا ہے۔ وہ اب کیوں کوشش کرے گی۔“

”آپ کی بات سمجھ میں آگئی وکیل صاحب۔“

”تو بس جاؤ، شروع ہو جاؤ۔“

میں گھر آیا۔ ابا کو پولیس والوں نے دو دنوں کے ریمائنڈر پر رکھ لیا تھا۔ میں جانتا تھا کہ ریمائنڈر میں کیا ہیورت حال ہوتی ہے۔ بے چارے ابا کا تو پچھو مہی ہو گیا ہو گا۔

منان لنگڑ اس وقت بھی میرے کام آ رہا تھا۔ ”یار، تم فکر مت کرو۔ باپ جیسا بھی ہو۔ وہ پھنس جائے تو دکھ ہوتا ہی ہے۔ میں اس کم بخت دھوئی کے پورے خاندان کو کھنڈیر کر رکھ دوں گا۔“

چار دنوں کے بعد اس نے بتایا۔ ”یار، ایک بندہ لگا ہوں میں تو آ گیا ہے۔ اس کا اس گھر میں آنا جانا ہے۔ وہ صورت سے بھی مشکوک ہی لگتا ہے۔“

”کون ہے وہ؟“

”فرقان نام ہے اس کا۔ موٹر مکینک ہے۔“ اس نے بتایا۔ ”ان لوگوں سے کیا تعلق ہے۔ اور اگر وہی شاہدہ کا قاتل ہے تو اس نے شاہدہ کو قتل کیوں کیا؟“

”میں بات تو سمجھ میں نہیں آ رہی ہے۔ لیکن خیر اس کا بھی پتا چل جائے گا۔“

اس دوران میں ابا کو دلا سے دیتا رہا تھا۔ تین دنوں کے بعد منان لنگڑ نے بہت زبردست خبر سنا دی۔ ”یار،

میں نہیں جانتا کہ جو کچھ میں بتانے والا ہوں اس کا کوئی تعلق شاہدہ کے قتل سے ہے یا نہیں۔“

”تو اس کی فکر مت کر۔ یہ دیکھنا وکیل کا کام ہے۔ تو تو اپنی جاسوسی بتا۔“

”یار، تو نے شاہدہ کی ماں یعنی تنوکی بیوی کو دیکھا ہے۔“

”نہیں تو، میں نے تو نہیں دیکھا۔“

”ایک نظر دیکھ لے۔ کیا زبردست چیز ہے۔“ منان لنگڑ نے بتایا۔ ”مرنے والی شاہدہ تو اس کے سامنے کچھ بھی نہیں تھی اور وہ شاہدہ کی سوتیلی ماں ہے۔“

”اوہ۔۔۔ پس نے ایک گہری سانس لی۔“ اور شاہدہ کی اپنی ماں کہاں ہے؟“

حضرت ثابت بن قیسؒ جلیل القدر صحابی تھے۔ ابو محمد کنیت اور خطیب رسول اللہ لقب تھا۔ قبیلہ خزرج سے تھے۔ آپ نے ہجرت سے پہلے اسلام قبول کیا۔ کئی غزوات میں آنحضرتؐ کی معیت میں لڑے۔ حضرت جویریہؓ غزوہ مہربہ میں اسیر ہو کر ثابت بن قیسؒ کے حصے میں آئیں جنہیں آنحضرتؐ نے رقم دے کر ثابت بن قیسؒ سے آزاد کر لیا اور عقد میں لے لیا۔ 9ھ میں بنو تمیم کے وفد کے سامنے آپؐ نے آنحضرتؐ کے حکم سے جو جوانی خطبہ دیا اسے سن کر بنو تمیم دنگ رہ گئے اور آپؐ کی فصاحت کے معترف ہوئے۔ 11ھ میں جب طحیہؓ پر فوج کشی کی گئی تو انصار آپؐ ہی کی قیادت میں تھے۔ جب وہ آیت جس میں مسلمانوں کو رسول اللہؐ کے سامنے اونچی آواز میں بولنے سے منع کیا گیا نازل ہوئی، تو حضرت ثابت بن قیسؒ کو فکر و استغیر ہوئی اور اپنے گھر میں سر جھکائے بیٹھے رہے۔ صحابہؓ نے دریافت کیا تو کہنے لگے۔ میں اکبرؓ آنحضرتؐ کے سامنے اونچی آواز سے بولتا رہا اس باعث مجھے ضرور جہنم میں جانا پڑے گا۔ جب آنحضرتؐ کو اس بات کا علم ہوا تو فرمایا ”خدا کی قسم ثابت جہنمی نہیں۔ بلکہ میں اسے جنت کی بشارت دیتا ہوں۔“ آیت 12ھ میں مسلیہ کذاب سے مقابلہ کے دوران شہید ہوئے۔

مرسلہ: زاہد ہدائی، لاہور

میں نہیں جانتا کہ جو کچھ میں بتانے والا ہوں اس کا کوئی تعلق شاہدہ کے قتل سے ہے یا نہیں۔“

”تو اس کی فکر مت کر۔ یہ دیکھنا وکیل کا کام ہے۔ تو تو اپنی جاسوسی بتا۔“

”یار، تو نے شاہدہ کی ماں یعنی تنوکی بیوی کو دیکھا ہے۔“

”نہیں تو، میں نے تو نہیں دیکھا۔“

”ایک نظر دیکھ لے۔ کیا زبردست چیز ہے۔“ منان لنگڑ نے بتایا۔ ”مرنے والی شاہدہ تو اس کے سامنے کچھ بھی نہیں تھی اور وہ شاہدہ کی سوتیلی ماں ہے۔“

”اوہ۔۔۔ پس نے ایک گہری سانس لی۔“ اور شاہدہ کی اپنی ماں کہاں ہے؟“

”کل ہی لو استاد! اس کا پورا جغرافیہ تمہارے سامنے رکھ دوں گا۔“

منان انگڑے نے جو جغرافیہ میرے سامنے لا کر رکھا وہ کچھ یوں ہے۔ ”کیلا آدی ہے۔ ایک چھوٹی سی ورکشاپ ہے اس کی۔ وہی اس کا گھر بھی ہے۔ وہیں سویا کرتا ہے۔ سامنے کے ہوٹل سے کھانا کھاتا ہے۔ یا تو اپنی ورکشاپ میں رہتا ہے یا قہودھوئی کے یہاں جاتا ہے۔“

”اس کا مطلب یہ ہوا کہ رات میں اکیلا ہی رہتا ہوگا۔“

”اور کیا۔ جب چاہو چھاپ لو اس کو۔“

اور میں نے اس رات اسے چھاپ لیا۔ منان انگڑے نے ایک بار پھر میری مدد کی۔ وہ نہ جانے کہاں سے کسی پولیس انسپکٹر کی وردی لے آیا۔ ”بس استاد! یہ پہن کر چلے جاؤ اس کے سامنے اور ڈائریکٹ اس پر الزام لگا دو۔ پھر دیکھو کیا ہوتا ہے۔“

”نہیں یار، وردی ٹھیک نہیں ہے۔“ میں نے کہا۔

”پولیس والا سادہ لباس میں بھی ہوتا ہے نا۔ تو میں خود کو یہی ظاہر کروں گا۔“

”ایک بات اور سن لو، وہ ہاتھ بیروں کا مضبوط ہے۔“ منان نے بتایا۔ ”ذرا سنبھل کر ہاتھ ڈالتا۔“

”اے ہم دوہوں گے۔ وہ اکیلا ہوگا۔“

”دوسرا کون ہوگا۔“

”تو... اور کون۔“ میں نے کہا۔

”نہیں بھائی... مجھے تو معاف رکھ۔ میں ایسے معاملات سے بہت دور رہتا ہوں۔ ویسے زبانی جج خرچ چاہے جتنا کر لو۔ اس کے علاوہ مجھے جتنی مدد کرنی تھی، وہ میں کر ہی چکا ہوں۔“

”ٹھیک ہے دوست، تم نے واقعی میرا بہت ساتھ دے دیا ہے۔ اب تم مجھے اس کی ورکشاپ دکھا دو۔“

منان نے دوسرے اس کی ورکشاپ دکھادی تھی۔ میں نے اس قسم کی حرکت پہلے کبھی نہیں کی ہوگی۔ لیکن یہ معاملہ اب کا تھا۔ اسی لیے اپنی جان پر کھیل کر یہ حرکت کرنے جا رہا تھا۔

رات بارہ بجے کے بعد میں نے اس کی ورکشاپ کے دروازے پر دستک دے دی۔ اس وقت تک میرے ذہن میں کوئی واضح اسکیم نہیں تھی۔ میں نے دوبارہ دستک دی تو فرقان کی آواز سنائی دی۔ ”کون ہے۔“

”پولیس۔“ میں نے اپنی آواز میں بھاری پن پیدا

”وہ بے چاری تو بہت پہلے ہی مر چکی ہے۔ اس کی موت کے بعد ہی قہودھوئی نے اس عورت سے شادی کی ہے۔ اور کام کی بات یہ ہے کہ اس موٹرملینک اور اس عورت میں بہت دوستی ہے۔ وہ ملینک اس وقت قہودھوئی کے گھر آتا ہے جب وہ عورت اکیلی ہو اور قہودھوئی کام پر گیا ہو۔“

”میرے یار، یہ تو نے بہت زبردست بات معلوم کر لی ہے۔ میں آج ہی ویل کو جا کر بتاتا ہوں۔“

ویل بھی یہ سن کر خوش ہو گیا تھا۔ ”ہاں، یہ بات ہوئی نا۔ یہ اس کیس کا نیا ایٹگل سامنے آیا ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ اگر اس آدمی نے مرڈر کیا ہے تو اس کی وجہ کیا ہوگی۔“

میں ایک بار پھر اباسے جیل میں جا کر ملا۔ ابابا کو جیل منتقل کر دیا گیا تھا۔ میں نے اباسے پوچھا۔ ”ابا، یہ بتاؤ تم فرقان کو جانتے ہو۔“

”کون فرقان؟“

”موٹرملینک۔ جو قہودھوئی کے یہاں آتا جاتا تھا۔“ میں نے پوچھا۔

”ہاں، ہاں جانتا ہوں اس کو۔“ ابانے کہا۔ ”لیکن وہ تو میرا بڑا اہم درد ہے۔ مجھ سے کہتا تھا کہ بڑے میاں تم فکر مت کرو۔ میں شاہدہ سے تمہاری شادی کرا کے رہوں گا۔“

”تم یہ بتاؤ، جس وقت یہ کہانی ہوئی، کیا اس وقت وہ بھی موجود تھا؟ میں نے پوچھا۔

”اے، وہ کیوں نہیں ہوگا۔ اسی کی شہ پر تو میں نے رشتے کی بات ڈالی تھی۔“ ابانے بتایا۔

یہاں تک بات آگئی تھی۔ لیکن سوال پھر وہی تھا کہ شاہدہ کے مرڈر میں اس کا ہاتھ کیسے تلاش کیا جائے۔ اس کے خلاف تو کوئی ثبوت ہی نہیں تھا۔

میں نے اپنے منان انگڑے ہی سے مشورہ کیا۔ اس نے کہا۔ ”دیکھ بھائی، میں تو ایک بات جانتا ہوں۔ تو اگر قانونی چکروں میں پڑا رہے گا تو وہ شخص زندگی بھر قبول نہیں کرے گا۔“

”تو پھر کیا کیا جائے۔“

”اس سالے چلتی کرو۔ ڈراؤ دھمکاؤ۔ زبردستی بیان لو اس سے۔ اس کے علاوہ اور کچھ نہیں ہو سکتا۔“

منان انگڑے کی یہ بات دل کو لگی تھی... میں نے اسی سے کہا۔ ”یار، ذرا تو ہی اس کا پورا جغرافیہ معلوم کر کے بتا دو۔ کہاں رہتا ہے، اس کے ساتھ اور کتنے لوگ رہتے ہیں۔ کس وقت گھر سے نکلتا ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔“

کر لیا تھا۔

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد اس نے دروازہ کھول دیا۔ وہ چھوٹے قد اور مضبوط جسم کا آدمی تھا۔ جو بڑی حیرت سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ ”کہاں ہے پولیس؟“ اس نے غراتے ہوئے پوچھا۔

”میں سی آئی اے سینٹر سے آیا ہوں۔ تمہیں میرے ساتھ چلنا ہوگا۔“ میں نے کہا۔

”وہ کیوں؟“

”تم نے تھوڑی سی لڑکی کا خون کیا ہے۔“ میں نے ڈائریکٹ یہ بات کہہ دی تھی۔

اتنا سنتے ہی اس نے اپنا کچھ مجھے دکھا دیا اور باہر بھاگ نکلنے کی کوشش کی۔ میری قسمت اچھی تھی کہ میں کچھ اس طرح گرا کہ اس کے راسے میں حائل ہو گیا۔ اور جب اس نے مجھے بھلائیگ کر بھاگنے کی کوشش کی تو میں نے اپنی ٹانگ اڑا دی۔

وہ اچھ کر بہت زور سے گرا تھا۔ وہ ایک مضبوط آدمی تھا اور مجھے اندازہ تھا کہ وہ اگر اچھ گیا تو پھر میری خیر نہیں ہے۔ اس لیے میں نے اسے اٹھنے کا موقع ہی نہیں دیا۔

قریب ہی لوہے کی ایک راڈ پڑی ہوئی تھی میں نے وہ راڈ اٹھا کر اس کی کمر پر رسید کر دی۔ وہ ہلکا کر ڈکرانے لگا۔

میں نے دوسرا وار کیا۔ مجھ پر ایک جنونی کیفیت طاری ہو گئی تھی۔ ”بول، تو نے اس لڑکی کا خون کیا ہے۔ بول؟“

”ہاں، میں نے مارا تھا اس کو۔“ اس نے بالآخر اعتراف کر ہی لیا۔

میں نے راڈ مار مار کر اسے چلنے پھرنے کے قابل نہیں رہنے دیا تھا۔ اسے وہیں پھوڑ کر میں سیدھے وکیل صاحب کے پاس پہنچ گیا۔ ”جناب، جلدی جلیں میرے ساتھ۔“

میں نے کہا۔ ”میں نے اس لڑکی کے قاتل کو پکڑ لیا ہے۔“

”وہ کس طرح؟“

میں نے پوری کہانی سنادی۔ وکیل نے متعلقہ تھانے کے افراد کو بھی اپنے ساتھ لے لیا تھا۔ وہ شخص اسی طرح فرش پر گرا ہوا ڈکر رہا تھا۔

اس کے بیان کے مطابق اس کے تعلقات شاہدہ کی سوتیلی ماں سے تھے، جبکہ میرے ابا شاہدہ کے چکر میں وہاں جایا کرتے تھے۔

جس دن اپنی شادی کا پیغام لے کر وہاں گئے تھے۔ اس دن شاہدہ نے فرقان اور اپنی سوتیلی ماں کو ایک

ساتھ عجیب حالت میں دیکھ لیا تھا۔ لیکن اسے داویلا کرنے اور اپنے باپ کو بتانے کا موقع ہی نہیں مل سکا۔ کیونکہ اسی وقت ابا اپنا رشتہ لے کر پہنچ گئے تھے اور سب ابا کے ساتھ اچھ گئے تھے۔

اور اسی وقت فرقان اور شاہدہ کی سوتیلی ماں کے ذہن میں یہ سازش آگئی کہ شاہدہ کو فوری طور پر راستے سے ہٹا دیا جائے۔ کیونکہ دونوں ہی جانتے تھے کہ شاہدہ موقع ملے ہی اپنے باپ کو سب کچھ بتا دے گی۔ اسی لیے ان کے سازش ذہنوں میں یہ اسکیم آگئی کہ شاہدہ کا قفسہ بھی صاف ہو جائے اور اس کا الزام میرے ابا پر آ جائے۔

ان دونوں نے ضد کر کے ابا کو چائے پلا دی تھی۔ انہوں نے ابا سے کہا تھا کہ رشتے کی ناراضی اپنی جگہ اور خاطر داری اپنی جگہ۔ ابا بھی جوش میں آ کر وہیں بیٹھ گئے۔ شاید ان کے دل میں یہ بات بھی ہو کہ ممکن ہے کچھ دنوں کے بعد شاہدہ کی ماں اس رشتے کے لیے راضی ہو جائے۔

دونوں کو چائے پلائی گئی تھی۔ یعنی شاہدہ کو اور ابا کو۔ نھو معاملہ ختم کر کے اپنے کام پر واپس چلا گیا تھا۔ چائے میں بے ہوشی کی دوہلی ہوئی تھی۔

چائے پی کر دونوں ہی انا غفلت ہو گئے تھے پھر شاہدہ کا خون کر کے بچر ابا کے ہاتھ میں دے دیا گیا تھا۔ اس کے بعد کی کہانی سب کو معلوم ہے کہ کس طرح دونوں نے داویلا کیا اور ابا بھر مقرر پا گئے۔

فرقان مکینک تو صاف نکل گیا تھا۔ خون کا الزام ابا پر آ چکا تھا۔ لیکن منان لنگڑے کی محنت اور اس کی ترکیب کام آگئی تھی۔ میں نے اپنے ابا کو بچانے کے لیے ہمت کر ڈالی تھی اور اصل قاتل کو پکڑ لیا تھا۔

لیکن اس پوری کہانی کا ایک دوسرا پہلو بھی ہے۔ وہ پہلو بہت اذیت ناک اور دردناک ہے۔ میں نے لوہے کی راڈ سے اس آدمی کی جو ٹھکانی کی تھی اس کے نتیجے میں وہ جاں نہیں ہو سکا تھا۔

نہ جانے ایسی کون سی ضرب لگ گئی تھی کہ ایک ہفتے بعد اس کا انتقال ہو گیا..... آپ کو معلوم ہے کہ اس کا نتیجہ کیا نکلا۔

جی ہاں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ابا تو باہر آ گئے ہیں اور میں اندر ہو گیا ہوں۔ اور اب مجھ پر قتل کا مقدمہ چل رہا ہے۔

اشکِ ندامت

جناب اعلیٰ

سلام تہنیت!

میں صرف چند جماعتیں پڑھی ہوئی ہوں اس لیے ہوسکتا ہے اردو اتنی اچھی نہ ہو لیکن دل کے باتوں مجبور ہوں کہ میری داستان بھی قارئین تک پہنچے، امید ہے میری اس خواہش کو پورا کر دیں گے۔

حیاتاں یار محمد

(چیکب آباد)

مجھے اپنے شوہر سے بہت محبت تھی اور میں اسے پوجنے کی حد تک چاہتی تھی۔ اس کا نام یار محمد لاشاری تھا۔ جبکہ میں اسے یارو کہہ کر پکارتی تھی۔ اس کی محبت نے مجھے انتہائی ضدی، خود سر، اور قلع و قلعان کے احساسات سے بے پروا بنادیا تھا اور یہی میری بچ بیانی کی بنیاد ہے۔

ہمارا گوتھ ڈیرا سبانی..... چیکب آباد کے شمال مغرب میں واقع ہے۔ ہمارا گوتھ بہ مشکل ڈیرہ سونفوس پر مشتمل ہے جہاں ایک پرائمری اسکول کے علاوہ ایک ہائی اسکول اور



بنیادی مرکز صحت کا ایک یونٹ بھی اپنے پیشروانہ کاموں میں مصروف رہتا ہے۔ گوشت کے کینوں میں زیادہ تر افراد وڈیروں کی زمینوں پر بھینکی یاڑی کا کام کرتے ہیں۔ یہاں تعلیم کار جان کم تھا اس وجہ سے مجھے فخر تھا کہ میرا شوہر یار محمد پورے گوشت میں چند ہی گئے تھے پڑھے لکھے لوگوں میں سے ایک تھا۔ اس نے بارہ جماعتیں پڑھی تھیں۔ ہمارا گوشت چونکہ برسرِ اقتدار پارٹی کا ووٹ بینک تھا لہذا ایک دن اس پارٹی کا ایم پی اے دورے پر وہاں آیا تو یار محمد نے پرائمری پچھری کو فکری کے لیے ایک عرضی لکھ کر وڈیے حاجی خدا بخش کے ذریعے پیش کی تو وہ فوراً سفارش کے لیے منظور کر لی گئی، اس طرح میرا شوہر ایک استاد کی حیثیت سے گاؤں کے اکوڑے پرائمری اسکول میں پڑھانے لگا تھا۔

وہ جولائی کی چھٹی سکتی دو پہر تھی۔ کچے مگر کشادہ گھروں کی منڈیروں پر چڑیاں اپنی چوچیں کھولے باپ رہی تھیں۔ یارو کے آنے کا وقت ہو چلا تھا اس لیے میں اس کے آنے سے پہلے ہی سارا کام نمٹا کر روٹیاں پکائے بیٹھ جاتی تھی تاکہ اسے آتے ہی گرم گرم کھانا ملے۔

تھوڑی دیر میں یار محمد آ گیا۔ اس کا چہرہ خلاف معمول بدلا بدلا سا دکھائی دے رہا تھا۔ وہ اسکول سے آ کر چپ چاپ اندر جا کر چار پارٹی پر نیم دراز ہو گیا۔

وہ خاصا الجھا الجھا نظر آ رہا تھا۔ جب میں اس کے لیے ساگ پٹی اور دیسی گھی میں چھڑی روٹیاں لے کر گئی تو اس نے وہ بڑی بے دلی کے ساتھ کھائیں۔ حالانکہ میں نے اس کی پسند کا کھانا بنایا تھا۔

مجھے کچھ تعجب تو ہوا مگر میں نے اس وقت اسے کریدنے کی کوشش نہیں کی۔

جب ہم گھر کے کشادہ محن میں تاروں بھرے آسمان تلے سونے کے لیے لیٹے تو میں اسے گوگولی کیفیت میں پاکر نرم لہجے میں بولی۔ ”سائیں! کیا بات ہے؟ کوئی فکر پریشانی ہے؟“

اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ بس خاموش اور چپ چاپ بہ دستور کہیں کھویا کھویا سا رہا۔ پھر جب میں نے اپنا سوال دہرایا تو وہ خلاف توقع کسی قدر بیزار سے بولا۔

”کوئی بات نہیں ہے..... حیاتاں.....! تو چپ کر کے سو جا..... تنگ نہ کر مجھے۔“

میں نے چپ سا دھلی، البتہ اس کے روکے روکے

لہجے سے میں اندر ہی اندر کھل کر رہ گئی تھی۔ یہی وہ لمحہ تھا جب میرے اندر کی عورت نے خطرے کی گھنٹی بجانا شروع کر دی تھی۔ قدرت نے شاید عورت کو یہ حس خصوصی طور پر بخشی ہے کہ وہ فوراً اپنے شوہر کے ڈھکے چھپے رویوں میں اچانک آنے والی تبدیلی کو بھانپ لیتی ہے۔ چند ثانیے بعد وہ خود ہی بولا۔ ”اڑی حیاتاں، ایک بات تو بتا۔“

”جی سائیں؟“ میں ایک دم بلیٹی اور اس کے چہرے کو غور سے دیکھتے ہوئے بولی۔

”یہ بتا..... تجھے بھلا مجھ سے کتنی محبت ہے؟“

”سائیں! تم تو میرے سر کا سائیں، میرے دل دار ہو، محبت تو بڑی شے ہے۔ مجھے تو تمہارے پیروں کی خاک بھی مل جائے تو میں اس کا سرمہ بنا کر اپنی آنکھوں میں لگاؤں.....“

پہلے پہل تو وہ میرے اس جواب پر لہک لہک اٹھا تھا مگر آج جانے کیوں وہ قدرے ہنسی سے بولا۔ ”دیکھ حیاتاں!.....! سیدھی بات کر.....“ اتنا کہہ کر وہ زار کا پیر کچھ سوچ کر دوبارہ بولا۔ ”میں..... میں..... تجھے ایک بات بتانا چاہتا ہوں۔“

میں ہمدرد گوش بر آواز ہو گئی۔

”وہ..... میں..... وراصل..... دوسری شادی کرنا چاہتا ہوں۔“ اس کی بات سن کر میں دھک سے رہ گئی تھی۔

میرے منہ سے ایک لفظ تک برآمد نہ ہو سکا۔ میرے پورے وجود میں جیسے کسی نے چنگاریاں بھریں۔

”..... مگر حیاتاں!.....! میں تم سے اسی طرح محبت کرتا رہوں گا۔ تم یقین کر دو دوسری شادی محض میری مجبوری ہے۔“ وہ میرے اندر کے جوار بھائے کا اندازہ لگاتے ہوئے بڑی رسان سے بولا۔

”کیسی مجبوری سائیں؟ کیا مجھ سے کوئی کوتاہی..... یا میری محبت میں کوئی کمی تم نے محسوس کی ہے؟“ میں نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔ مجھے اس کی بات سن کر بہت دکھ ہوا تھا اور میں ہنکا ہنکا رہ گئی تھی۔ میں حیران بھی تھی کہ آخر یہ بیٹھے بیٹھے یار محمد کو دوسری شادی کا شوق کیوں پڑھ گیا تھا۔ مجھ میں کسی بات کی کمی نہ تھی۔ گوشت کی حسین لڑکیوں میں میرا شمار ہوتا تھا۔

اللہ تعالیٰ نے تین پیارے پیارے بچے بھی دیے تھے۔ غصہ تو مجھے اس ”چنڈال“ پر آ رہا تھا، جس نے بڑی مکاری سے میرے محبوب شوہر کے دل کو اپنی گھٹی میں جکڑ لیا تھا اور ہنسی بستی زندگی پر شب خون مارا تھا۔

”دیکھ حیاتاں!.....! وہ کہنے لگا۔“

”مول..... میری خالہ زاد ہے جس سے بچپن میں منگنی ملے ہو چکی تھی لیکن پھر بعض خاندانی وجوہ کی بنا پر میری اس سے شادی نہ ہو سکی اور مجھ سے ہو گئی مگر بعد میں معلوم ہوا کہ مول بے چاری بیٹھی رہ گئی ہے۔ تجھے پتا ہی ہے کہ اگر گوشت میں کسی لڑکی کی ایک بار منگنی ٹوٹ جائے تو اسے کوئی نہیں بیٹھتا۔ اب چونکہ مجھے بچا چلا کہ قصور تو خود ہمارے بڑوں کا ہی تھا لہذا میرا ضمیر اب یہ گوارا نہیں کرتا کہ اس کی سزا بے قصور مول بھگتے۔“

وہ اتنا بتا کر خاموش ہو گیا۔

میں عورت ذات تھی۔ رقابت کا جذبہ کبھی تھی۔ مگر کیا کہتی، لب س کر رہ گئی۔

پھر یوں ہوا..... مول..... میرے شوہر یار محمد کی دلہن بن کر آ گئی۔

مجھے میری سہیلیاں اکثر کہتی تھیں۔ ”اڑی حیاتاں، دیکھ ذرا، اب بھی اگر تو سیدھی سادی بن کر رہ گئی تو ایک دن یار محمد..... مجھے اللہ حافظ کہہ دے گا، اپنی اہمیت منوا.....“

پھر ایسا ہوا کہ میرے محروم اور زخمی جذباتوں نے اس بات کو میرے دل و دماغ پر نقش کرنا شروع کر دیا۔

میں اپنی سوت، مول کا چہرہ دیکھتے ہی ناک بھوں چڑھا کر بیٹھ جاتی، اس پر حکم چلائی رہتی مگر وہ سر جھکائے میری کونجی کو نظر انداز کرتی ہوئی میرا برہم خنداں پیشانی سے بجالاتی تھی۔

”اڑی مول، چل جا..... روٹیاں اتار لے..... یار محمد آتا ہوگا۔“ حسب معمول ایک روز میں نے اسے آڑے ہاتھوں لیا۔ ”اور ہاں، روٹیاں اتارنے کے بعد کپڑوں کا ڈھیر رکھا ہے، اس کو بھی نمنائا ہے۔ سب کے سب دھونے ہوں گے۔“ میری بات پر وہ خاموش رہی اور سر جھکائے روتی کی طرف بڑھ گئی۔

مگر روز بروز میرے لیے مول کا وجود ناقابل برداشت ہوتا جا رہا تھا۔ وہ جب یارو کے ساتھ بیٹھی مسکرا مسکرا کر باتیں کر رہی ہوتی تو میرے تن بدن میں آگ سی لگ جاتی تھی۔ وہ سوکن کے روپ میں مجھے ایک ناگن کی طرح محسوس ہوتی تھی جو میرے اور یارو کے درمیان پھنکا کاڑھے کھڑی تھی لیکن ان سب باتوں کے باوجود یہ حقیقت تھی کہ یارو کے پیار میں میرے لیے ابھی تک کوئی کمی نہ آئی تھی۔ بلکہ میں نے تو یہ تک محسوس کیا تھا

اسلامی ثقافت

کیا مسلمانوں کی جداگانہ ثقافت، تہذیب یا تمدن ہے یا کبھی رہا؟ کیا اسلام نے کسی قسم کی ثقافت کا آغاز کیا؟ اس کا جواب صرف مسلمانوں ہی نے نہیں بلکہ خود مفکرین یورپ نے بھی دیا ہے۔ تشکیل انسانیت میں رابرٹ بریفلٹ لکھتا ہے۔

”یہ صرف سائنس ہی نہیں جس سے یورپ کے اندر زندگی کی ایک نئی لہر دوڑ گئی، بلکہ اسلامی تہذیب و تمدن کے اور بھی متعدد گونا گوں اثرات ہیں۔ جن سے یورپ میں پہلے پہل زندگی نے آب و تاب حاصل کی۔ پھر اگرچہ مغربی تہذیب کا کوئی پہاڑ نہیں جس سے اسلامی تہذیب و ثقافت کے فیصلہ کن اثرات کا پتا نہ ملے۔ لیکن اس کا سب سے بڑا اور روشن ثبوت اس طاقت کے تلبور سے ملتا ہے۔ جو عصر حاضر کی مستقل اور نمایاں ترین قوت اور اس کے غلبے اور کارفرمائی کا سب سے بڑا سرچشمہ ہے۔ ہمارا مطلب ہے علوم طبعہ اور روح علم کے تلبور سے.....“

بریفلٹ کی طرح دیگر مستشرقین کو بھی اس امر کا بخوبی یقین ہے کہ اگر کوئی تہذیب یا ثقافت مغربی تہذیب و تمدن کو نبھا سکتی ہے تو وہ صرف اسلامی تہذیب ہے۔ جو علم و اخلاق سے آراستہ اور عشق جیسی توانائی سے مالا مال باطل کا تمدن ختم ہو گیا، ان کی تہذیب تمدن اجڑ گئی اور ثقافت برباد ہو گئی۔ چین کی ثقافت عصر رواں کا ساتھ نہیں دے سکی۔ ہندو تہذیب و تمدن ادھام اور خرافات کا مجموعہ ہے اور یورپی تہذیب یکایک کی ایلیسی سیاست پر مبنی ہے۔

مرسلہ: حامد خان، لاہور



الکاحی

جناب معراج رسول صاحب
السلام علیکم!

میرے ہاتھوں میں سرگزشت کا ایک پرانا شمارہ ہے۔ اس کی ایک سچ بیانی ”حلالہ“ پڑھ کر میں ہنس پڑا ہوں۔ حلالہ ایک قابل نفرت فعل ہے۔ یہ فعل میاں بیوی کو تا عمر اندر ہی اندر کھوکھلا کرتا رہتا ہے مگر کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو حلالہ کو برسوں کی دبی کچلی خوابش قرار دیتے ہیں جن میں آپ میرا شمار بھی کر سکتے ہیں۔ میرے ساتھ کیا ہوا، کیوں میں ایسا کہہ رہا ہوں انہی واقعات کو میں نے الفاظ کا پیرین دیا ہے۔ اس میں وہ تمام لوازمات شامل ہیں جو ایک اچھی کہانی میں ہوتے لیکن سچ کڑوا ہوتا ہے میری خود بیٹی خود بتائے گی۔

عظیم
(کراچی)

تھے۔ بچا کے گھر میرا بے تکلف آنا جانا تھا۔ کالج سے آنے کے بعد پتا چلا کہ گھر میں ای نہیں ہیں اور کھانے کو بھی کچھ نہیں ہے۔ اس لیے میں بچا کے گھر چلا آیا۔ ریحانہ گھر میں واشنگ مشین لگائے کپڑے دھو رہی تھی۔ وہ اس وقت پندرہ

وہ کہاں گئی؟ وہ تو میرے سر کا سائیں تھا، کیا ہوا جو اس نے دوسری شادی رچائی۔ پیار تو پھر بھی وہ تجھ سے ہی کرتا ہے نا..... اپنی زبان کا بھی وہ دھنی ثابت ہوا۔ سوتن کو اس نے تجھ پر بھی فوجت نندی۔ پھر تو بھی تو اس کی بے لوث محبت کی دعویدار تھی۔“

میرے دل کو کچھ ایسی ہی بے چینی کھانے لگی کہ میں تین روز میسر رہنے کے بعد واپس گھر کی طرف لیٹ گئی۔ گھر پہنچی تو یہاں ایک روح فرسا خبر میری منتظر تھی۔ جب میں نے گھر میں قدم رکھا تو مجھے چاروں طرف موت کی سی خاموشی محسوس ہوئی۔ سامنے مول کا اٹھک بار چہرہ میرا منتظر تھا۔ اس کا چہرہ آنسوؤں سے چمک رہا تھا مجھے دیکھتے ہی وہ جذباتی انداز میں چلائی۔

”حیاتاں! ہمارا یارو..... ہم سے روٹھ کر ہمیشہ کے لیے چلا گیا۔“

یہ خبر میرے لیے ایک بڑا جھکا کتھی۔ پہلے تو میں کئی ٹائیپ سن ہو کر رہ گئی۔ اس کے بعد چکر اکر زمین پر آ رہی کہ مول کے نرم ہاتھوں نے مجھے تھام لیا۔ میں اس کی گود میں سر رکھ کے پھوٹ پھوٹ کر روتی رہی۔ مگر جانے والا وقت تو کب کا ہاتھ سے نکل چکا تھا۔ اور اب یارو بھی تو واپس نہیں آ سکتا تھا۔ دکھ اور پچھتاؤں کے یہ دن زندگی بھر کے لیے میری یادوں کا کھد بن گئے۔ آج مجھے اپنے شوہر یار محمد کو کھوئے کئی سال ہو گئے ہیں مگر جب بھی اس کا مروانہ وجاہت سے بھر پور مسکراتا چہرہ مجھے اپنے ساتھ ماضی کے درپچوں میں کھینچ لے جاتا ہے تو بے اختیار میری آنکھیں آنسوؤں سے بھر جاتی ہیں اور ساتھ ہی انا پرستی کی آگ میں جھلنے والا وہ روپ مجھے اپنی ہی نظروں میں بھرم بنا دیتا ہے۔ ہاں!..... میں!..... آج تک!..... اپنی سوتن مول کے ان الفاظ پر کہ.....

”ہمارا یارو ہم سے روٹھ گیا“ پر غور کرتی ہوں تو بے اختیار میرے دل میں اس کی عظمت بڑھ جاتی ہے کیوں کہ..... مجھ سے اچھی تو مول رہی تھی جس نے یارو کی ہمیشہ خدمت کی تھی اور آخری وقت تک اس کے ساتھ رہی تھی اور میں..... جو یارو سے محبت کی بڑی دعویدار تھی۔ اسے ”ملکیت“ سمجھ کر خود ہی اپنی نظروں میں گر بیچی تھی۔

قارئین! آپ ہی فیصلہ کریں، میں بری تھی یا..... میری سوتن.....



کہ مول کے آنے سے میری اہمیت میں کمی کے بجائے اضافہ ہی ہوا تھا۔ یہاں یہ سچائی بھی مجھے نظر آتی تھی کہ یارو نے واقعی کسی ”اخلاقی“ مجبوری کے تحت ہی دوسری شادی رچائی تھی مگر کچھ بھی تھا، میں اپنے شوہر یار محمد کو اپنی ہی ملکیت سمجھتی تھی۔ میں نے گھر کے کاموں کی ساری ذمہ داری مول پر ڈال رکھی تھی۔

ایک دن یہ ہوا کہ یارو اچانک بیمار پڑ گیا۔ مجھے یارو کے بیمار ہونے پر یقیناً فکر مند ہونا چاہیے تھا اور ایک خدمت گار بیوی کی طرح اس کی حصار داری میں مصروف ہو جانا چاہیے تھا۔ تاہم میں نے ایسا نہیں کیا کیونکہ مجھ پر وہی رقابت کا جذبہ بھوت کی طرح سوار تھا۔ اس دوران میں نہ جانے میری عقل کو کیا ہوا کہ میں نے اپنی اہمیت جتانے کی غرض سے اپنے سینے جانے کی ٹھان لی جو دریا کے پار واقع دوسرے گاؤں میں تھا۔

”حیاتاں!..... تو نہ جاتا تھا سے مجھے بڑا سہارا ملتا ہے۔“

یارو سبک کر میرا بازو تھامتے ہوئے بولا۔ دل تو میرا بھی لپیچا تھا مگر پھر سوتن سے دیرینہ رقابت اور اپنی حیثیت منوانے کے احساسات غالب آ گئے۔ میں بات بناتے ہوئے قدرے روکھے پن سے بولی۔ ”تھوڑے دنوں کی بات ہے، میں آ جاؤں گی، ویسے تمہیں کیسی پریشانی ہے۔ مول جو ہے تمہارے پاس۔“ میرے آخری الفاظ میں بڑی زہریلی کاٹ تھی۔

”حیاتاں! تمہارے ہونے سے ”سائیں“ کو بڑا آسرا ملتا ہے، تم ابھی نہ جاؤ۔“ قریب پریشان اور مغموم سی بیٹی مول نے بھی مجھے روکا۔ اس کے کچھ میں التجا بھی..... مجھے یوں لگا جیسے وہ محض دکھاوے کی خاطر یارو کے سامنے اپنے بھر بڑھانے کی کوشش کر رہی ہو۔ مگر میرے سر پر تو خط سوار تھا۔ میں نہ رکی اور اپنے بھائیوں کے ساتھ جو مجھے لینے کے لیے آئے تھے، چلی گئی۔

☆☆☆

میں ضد میں سیٹھ تو آ گئی تھی لیکن حقیقت یہ تھی کہ اندر سے مجھے یارو کی بھی فکر ستا رہی تھی۔ نہ جانے وہ کس حال میں ہوگا؟ اگرچہ مول وہاں موجود تھی مگر پھر بھی میرے دل کو جانے کیوں تپسی نہیں ہو رہی تھی۔ میرے اندر کی عورت بار بار مجھے جھنجھوڑ رہی تھی۔

”حیاتاں! تجھے تو اپنے یارو سے بہت محبت تھی۔ پھر

سال کی تھی۔ اس سے پہلے میں نے بھی غور ہی نہیں کیا تھا کہ وہ اب ایک نوجوان لڑکی ہے۔ کپڑوں کے ساتھ وہ خود بھی بھیک لگتی تھی اور اس کا لان کا سوٹ بدن سے چپک گیا تھا۔ میں نے اسے دیکھا تو دیکھتا ہی رہ گیا تھا۔ میری نظریں محسوس کر کے اس نے جلدی سے دوپٹا لے لیا اور کسی قدر رخصتی سے بولی۔ ”ایسے کیا دکھ رہے ہیں؟“

”کچھ نہیں۔“ میں صہیب گیا اور جلدی سے اندر چلا گیا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ ریحانہ مجھے اچھی لگی اور میرے اندر جاہت بیدار ہوئی تھی۔ پھر ہرگزرتے دن یہ جاہت بڑھتی چلی گئی اور اس نے جنون کی صورت اختیار کر لی تھی۔ ہم کراچی کے جس متوسط علاقے میں رہتے ہیں یہاں ایک زمانے میں دادا جان نے ایک ہی گلی میں گلی پلاٹ خرید لیے تھے۔ اس وقت آبادی نہ ہونے کے برابر تھی اور زمین کی قیمت بھی زیادہ نہیں تھی۔ دادا جان کے دو بیٹے اور دو بیٹیاں ہیں۔ انہوں نے سب کے نام پر الگ الگ پلاٹ لیے اور پانچواں پلاٹ اپنے لیے لے کر اس پر گھر بنوایا پھر جس اولاد کی شادی کرتے پلاٹ اس کے حوالے کر دیتے۔ یوں میرا سارا خاندان ایک ہی گلی میں رہنے لگا۔ البتہ امی کے رشتے دار دور دراز علاقوں میں رہتے تھے۔ میرے ابو حسین احمد سب سے بڑے تھے اور میں ان کی سب سے بڑی اولاد ہوں۔ اپنے کزنز میں بھی سب سے بڑا میں ہی ہوں۔ کزنز میں بمشور حسن جو بڑی پھیمو کا بیٹا ہے۔ شرجیل احمد جو چھوٹی پھیمو کا بیٹا ہے، ہم تقریباً ایک ہی عمر کے تھے۔ بمشور مجھ سے چھوٹا اور شرجیل اس سے چھوٹا تھا۔ ہماری عمروں میں چند مہینوں کا فرق تھا۔

میرے چھ بھائی اور ہیں۔ مجھ سے چھوٹا رحیم اور اس سے چھوٹی بہن حلقہ ہے۔ حسن چچا کی دو بیٹیاں ہیں۔ ریحانہ اور اس سے دو سال چھوٹی فرزانہ۔ بڑی پھیمو کے بمشور کے علاوہ دو بیٹے ہیں۔ بمشور سے چھوٹا عاشر اور سب سے چھوٹی رمل ہے۔ جب کہ چھوٹی پھیمو کی چار اولادیں ہیں۔ شرجیل سے چھوٹی دو بہنیں رفید اور صفیہ ہیں۔ سب سے چھوٹا راجیل ہے۔ سارے خاندان کا تعارف کرانے کا مقصد یہ ہے کہ زیر نظر بیانی ان ہی گھروں میں گھومتی ہے۔ بارہ کزنز کے ہوتے ہوئے لڑکے اور لڑکیوں کو خاندان سے باہر دوست بنانے کی ضرورت ہی نہیں پیش آتی تھی ہم سب آپس میں ہی کافی تھے۔ خاندان کا ماحول اچھا تھا سب مل جل کر رہتے اور ایک دوسرے سے تعلق بنا کر رکھتے

تھے۔ بڑوں کی دیکھا دیکھی ہم کزنز میں بھی ایسا اور محبت تھی۔ کسی ایک کا مسئلہ سب کا مسئلہ ہوتا تھا اور سب مل کر اسے حل کرنے کی کوشش کرتے تھے۔

ان دنوں میں گریجویٹ کر رہا تھا۔ ریحانہ میٹرک میں تھی۔ ابھی کچھ عرصے پہلے تک وہ کسی قدر موٹی اور پلیراوا علیے والی لڑکی ہوا کرتی تھی۔ میں اسے بچی سمجھتا تھا اور اس سے بچی سمجھ کر ہی پیش آتا تھا۔ مگر چند مہینوں میں کیا کیا کلپ ہوئی کہ اوروں کا تو نہیں پتا لیکن اس نے مجھے دنگ رہ جانے پر مجبور کر دیا۔ ریحانہ ایک دم چھریری ہو گئی۔ بدن نازک اندام ہو گیا۔ جلد جیسے گلاب و دودھ میں دھل کر مکمل جھسی ہو گئی۔ بالوں میں ریشم جیسی اور آنکھوں میں تاروں جیسی چمک آگئی تھی۔ گالوں پر گلاب اور ہونٹوں پر گلاب کی پتلیاں بکھل اٹھی تھیں۔ نازک اندام ہونے کے باوجود جسمانی بچ و خم اور خطوط نمایاں ہونے لگے تھے۔ جس دن میں نے پہلی بار اسے الگ انداز میں دیکھا اس دن کے بعد وہ میرے سامنے احتیاط کرنے لگی تھی۔ جب میں سامنے آتا تو وہ پلا ٹھیک کر لیتی تھی۔ یا پھر دوپٹے کے ہوتی تو سامنے سے ہٹ جاتی تھی۔ اس پہلی ٹھیک نے جو تاثر قائم کیا تھا میں اسے بار بار دیکھنا چاہتا تھا لیکن اب اسے ہی دیکھنے کا موقع کم ملتا تھا۔ ہمارے خاندان میں بچپن میں نسبت طے کرنے کا رواج نہیں تھا۔ جب سب صاحب اولاد دھو گئے تو دادا جان نے کہا کہ بچوں کی نسبت بچپن میں نہ طے کی جائے بلکہ بڑے ہونے پر ان سے پوچھ کر طے کیا جائے۔ اگر وہ خاندان میں شادی کرنے پر راضی ہوں تو ٹھیک ہے ورنہ خاندان سے باہر شادی کرنے میں بھی کوئی حرج نہیں ہے۔ یہ حکم صرف لڑکوں کے لیے نہیں تھا بلکہ لڑکیوں کے لیے بھی تھا۔ دادا جان علی گڑھ سے پڑھے ہوئے تھے اور صرف تعلیم یافتہ ہی نہیں روشن خیال بھی تھے۔ انہوں نے اپنے بچوں کی تربیت بھی اسی طرح کی تھی۔ وہ بھی دادا جان کی طرح اپنے بچوں پر اعتماد کرتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ بڑوں نے نہ تو ہمارے بچپن میں رشتے قائم کرنے کی اور نہ ہی ہم پر ملنے جلنے یا ملنے کودنے کی پابندی لگائی۔ جیسے جیسے لڑکیاں بڑی ہوتی گئیں انہوں نے اپنی گیدرنگ خود الگ کر لی۔ لڑکوں نے اپنا الگ حلقہ بنا لیا۔

لڑکوں میں میری بمشور اور شرجیل سے ہنسی تھی کیونکہ ہم ایک ہی ایچ گروپ کے تھے۔ اس طرح لڑکیوں میں حلقہ، ریحانہ اور رفید ایک ہی ایچ گروپ کی تھیں۔ لڑکوں میں

دوسرا گروپ رحیم، عاشر اور راجیل کا تھا اسی طرح لڑکیوں میں فرزانہ، رمل اور صفیہ۔ الگ گروپ کی تھیں۔ سب مل کر بھی انجوائے کرتے تھے لیکن گروپ کی حد زیادہ واسطہ رکھا جاتا تھا۔ میں بمشور اور شرجیل آپس میں اچھے دوست ہی نہیں بلکہ ایک ہی کالج میں اور ایک ہی گروپ میں تھے۔ سب نے کامرس کی تھی اور سب کا ارادہ ہی کام کے بعد ایم بی اے کرنے کا تھا۔ صبح سے دوپہر تک کالج اور پھر شام کو تفریح اور کوچنگ سینٹر میں بھی بیشتر وقت ساتھ گزارتا تھا۔ ہم میں ذہنی ہم آہنگی تھی اور ہم ہر بات آپس میں شیئر کر لیتے تھے لیکن میں نے شرجیل اور بمشور کی کوئی بات کیا کہ میں ریحانہ میں... دیکھی ہے۔ رہا ہوں بلکہ یہ بات شاید ہی سوائے ریحانہ کے اور کسی نے محسوس کی تھی۔ ریحانہ واقف تھی میرے سامنے لیے دیے رہنے کی کمی ورنہ باقی سب سے اس کا رویہ پہلے جیسا تھا۔

میرے پاس بائیک تھی۔ ابو کی اچھی جاب تھی اور وہ افورڈ کر سکتے تھے بلکہ بہن بھائیوں میں سب سے اچھی مالی حالت ابو کی تھی۔ انہوں نے انٹریڈیکل میں ڈپلوما کرنے کے بعد فوٹو کاپی مشین کی مرمت میں مہارت حاصل کی اور ایک فرم میں جاب کر رہے تھے لیکن انہیں اپنا کام بھی ملتا تھا اور اس سے انہیں خاصی آمدنی حاصل ہو جاتی تھی۔ حسن چچا گورنمنٹ جاب کرتے تھے اور ان کا گزارا ٹھیک ہو جاتا تھا۔ بمشور کے ابو خالد چھوٹا ریلوے میں ملازم تھے جب کہ دوسرے چھوٹا دانیال اسکول ٹیچر تھے۔ وہ بھی بس گزارا کر پاتے تھے اس لحاظ سے سب سے بہتر حالت ہماری تھی اور ابو نے مجھے بائیک دلادی تھی۔ اس زمانے میں ڈبل سواری کا مسئلہ نہیں تھا۔ اس لیے ہم مزے سے ایک ہی بائیک پر آتے جاتے تھے۔ جب میرے پاس بائیک نہیں تھی تو ہم بس سے جاتے تھے۔ البتہ جب حلقہ، ریحانہ اور رفید نے ایک ساتھ فرسٹ ایئر میں داخلہ لیا تو ان کے لیے وین کوئی گئی تھی۔ وہ وین میں آتی جاتی تھیں۔ ایک دن میں صبح کالج کے لیے تیار ہو رہا تھا کہ چچی آئیں۔ انہوں نے میرا پوچھا۔ ”عظیم کہاں ہے؟“

”تیار ہو رہا ہے۔“ امی نے بتایا۔
”آج بچوں کی وین نہیں آئے گی۔ لیکن ریحانہ کا ٹیٹ ہے وہ بس سے جانے کو کھڑی ہے لیکن میرا دل نہیں مان رہا۔ اس لیے عظیم سے کہنے کی ہوئی اسے آج کالج لے جانے اور واپسی میں لے آئے۔“

وین والے نے ایک دن پہلے بتا دیا تھا کہ وہ آج وین کا کچھ کام کرائے گا اس لیے نہیں آسکے گا اس لیے لڑکیاں گھر پر تھیں۔ حلقہ تو موقع سے فائدہ اٹھا کر سو رہی تھی۔ میں رمل اٹھا تھا یہ سوچ کر کہ ریحانہ میرے ساتھ بائیک پر جائے گی۔ میں جلدی سے باہر آیا۔ چچی کو سلام کیا اور انجان بن کر پوچھا۔ ”خیریت چچی آج صبح نظر آ رہی ہیں؟“
”ریحانہ کو کالج لے جانا اور واپس لانا ہے۔“ وہ بولیں۔ ”اس لیے آئی تھی۔“

”کیوں نہیں لے جائے گا۔“ امی نے کہا۔ ”آج بمشور اور شرجیل بس سے چلے جائیں گے۔“
”ٹھیک ہے۔“ میں نے سعادت مند بن کر کہا۔ ”میں ان کو بتا دیتا ہوں آپ ریحانہ سے کہیں کہ وہ تیار رہے۔“

میں تیار ہو کر باہر آیا۔ بمشور اور شرجیل کو بتا دیا کہ میں ریحانہ کو لے جا رہا ہوں اس لیے وہ بس سے جائیں۔ کچھ دیر میں ریحانہ آگئی۔ وہ پیچھے بیٹھی تو میں نے اس سے کہا۔ ”آج میں بہت خوش ہوں؟“
”کیوں؟“

”کیونکہ تم میرے ساتھ بائیک پر بیٹھی ہو۔“
وہ چپ ہو گئی لیکن جب میں نے اسے کالج کے سامنے اتارا تو اس نے کہا۔ ”اس میں خوشی کی کوئی بات نہیں ہے۔ میں بمشور بھائی اور شرجیل بھائی کے ساتھ بھی بائیک پر جا چکی ہوں لیکن ان میں سے کسی نے خوشی کا اظہار نہیں کیا۔“
وہ کہہ کر اندر چلی گئی اور میں اپنا سامنے لے کر رہ گیا۔ اس چکر میں مجھے پوچھنا یاد نہیں رہا کہ اسے لینے کب آنا تھا؟ کیونکہ اس کا صرف ٹیٹ تھا اور ممکن تھا کہ وہ اس کے بعد کالج میں میرا انتظار کرتی۔ اس لیے میں چھٹی کے مقررہ وقت سے پہلے پہنچ گیا اور اس لیے مجھے پورے دو گھنٹے انتظار کرنا پڑا تھا کیونکہ وہ چھٹی کے وقت ہی دوسری لڑکیوں کے ساتھ باہر لگتی تھی۔ اس بار بھی وہ خاموشی سے پیچھے بیٹھی اور بیٹھتے ہوئے اس نے میرے اور اپنے درمیان فاصلہ برقرار رکھا تھا۔ جب کہ میں چاہتا تھا کہ وہ قریب ہو کر بیٹھے۔ اسے دروازے پر اتارتے ہوئے میں نے صبح کی بات کا جواب دیا۔ ”تمہارے لیے شاید اس میں خوشی کی کوئی بات نہ ہو لیکن میرے لیے تو ہے اور میں بمشور یا شرجیل نہیں ہوں۔“
اس کے بعد بھی گلی بارافاق ہوا کہ ریحانہ کو کہیں لانے اور لے جانے کا لیکن اس کا مجھ سے لیے دیے رہنے کا انداز

برقرار رہا۔ اسی سال میں نے گریجویشن مکمل کر لیا۔ میرے ساتھ میشر اور شرنیل نے بھی پیڑھڑائی تھی اور جب رزلٹ آیا تو شرنیل آگے نکل گیا۔ اس کا اے ڈیجریڈ آیا تھا جب کہ میشر اور میں اے گریڈ لے سکے تھے۔ میرے نمبر سب سے کم تھے۔ ہم سب نے آئی بی اے میں اچائی کیا لیکن اتفاق سے مجھے نمبروں پر داخلہ بند ہوئے میرے پاس اس سے صرف دو نمبر کم تھے یوں میں رہ گیا اور وہ دونوں آئی بی اے میں چلے گئے۔ حالانکہ یہ میرا خواب تھا کہ میں کراچی یونیورسٹی سے ایم بی اے کروں۔ میشر اور شرنیل کی اپنی خواہش نہیں تھی وہ پڑھنے میں بھی مجھ سے زیادہ تیز نہیں تھے اس کے باوجود آگے نکل گئے اور کراچی یونیورسٹی میں داخلہ لینے میں بھی کامیاب رہے۔

نعمانہ کو ڈاکٹر کو کھلانے اس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔“
امی نے مجھے کہا تو میں چچی کو ڈاکٹر کے پاس لے گیا۔
وہاں سے واپسی پر چچی نے ریحانہ کو میرے لیے چائے
پینے کا کہا اور خود آرام کرتے کے لیے کمرے میں چلی
گئیں۔ میں نشست گاہ میں بیٹھ گیا تھا۔ کچھ دیر ریحانہ
چائے بنا کر لے آئی اور میرے سامنے رکھ کر جانے لگی تھی کہ
میں نے آہستہ سے کہا۔ ”رکاوڑ بنیو، مجھے تم سے کچھ بات
کرنی ہے۔“

تب مجھے یاد آیا اور میں نے شکوہ کیا۔ ”کیا بات ہے تم نے میرے ساتھ اٹنا جانا چھوڑ دیا ہے جب کہ تم بمشتر کے ساتھ آتی جاتی ہو۔“

مبشر اور دوسروں نے نوٹ نہیں کیا تھا یہ بات صرف میں نے نوٹ کی تھی۔ اگرچہ اسے روایتی پسند یا محبت نہیں کہا جاسکتا تھا۔ لیکن ریحانہ کا جھکاؤ واضح طور پر بمبشر کی طرف ہو رہا تھا اور یہ چیز مجھے بالکل پسند نہیں آتی تھی۔ مگر میں ریحانہ یا مبشر سے یہ بات کہہ نہیں سکتا اس لیے اندر غریب کرکٹر تارہا۔ میرا ایم بی اے کا تیسرا سمسٹر چل رہا تھا۔ ریحانہ بی اے کے پہلے سال میں تھی اور گریجویشن کے بعد یقیناً چچی اور چچا کو اس کی شادی کی فکر ہوتی۔ میرا ایم بی اے اس کے بعد مکمل ہوتا۔ اس لیے مجھے فکر لاحق ہونے لگی تھی کہ کہیں چچا چچی کے لیے کوئی فیصلہ نہ کر لیں۔ تقریباً سب بڑے ہو رہے تھے اور اب گھروں میں شادی کی بات ہونے لگی تھی۔ شگفتہ کی باراشی سے اصرار کر چکی تھی کہ بھائی کے لیے لڑکی دیکھی جائے اور ان کی متغنی کر دی جائے۔ جب میں انہیں ملازمت سے لگ جاؤں تو شادی بھی کر دی جائے مگر ای کا کہنا تھا کہ وہ لڑکی اس وقت دیکھیں گی جب میں ملازمت کرنے لگوں گا۔

بعض اوقات ایک ہی لڑکی کے کئی امیدوار بن جاتے ہیں۔ اس صورت میں بہت دیکھ بھال کر بات کرنی پڑتی ہے۔ خاندان میں تعلقات خراب نہیں کیے جاسکتے ہیں۔

”لیکن امی میں ریحانہ کو پسند کرتا ہوں۔“ میں نے بے بسی سے کہا۔

”میں جانتی ہوں اسی لیے تیرا رشتہ لے کر گئی تھی لیکن قسمت، دو دن پہلے ہی ایمن بشر کے لیے بات کر گئی۔“

”میں بچپن سے بات کروں گا۔“

”ہرگز نہیں۔“ امی جلدی سے بولیں۔ ”وہ غصے میں آگئے تو بات اور بگڑ جائے گی۔ مجھے موقع دے میں ایمن سے بھی بات کرتی ہوں۔ ممکن ہے وہ اس رشتے سے دست بردار ہو جائے۔“

”امی آپ بات کریں وہ ہر صورت اس رشتے سے دست بردار ہوں ورنہ۔۔۔“

امی نے عجیب نظروں سے مجھے دیکھا۔ ”عظیم بیٹا اس قسم کے معاملات غصے سے اور لڑائی جھگڑوں سے حل نہیں ہوتے ہیں۔“

میرا بس نہیں چل رہا تھا کہ میں ابھی پھیسو سے چاکر انکار کروادوں۔ لیکن امی ٹھیک کہہ رہی تھیں۔ کسی قسم کی ٹی یا زور زبردستی سے یہ معاملہ اور خراب ہو جاتا۔ امی پھیسو سے بات کرتیں اور شاید اس سے کوئی حل نکل آتا۔ ریحانہ بھل جاتی۔ مگر جب میں سوچتا کہ اگر ایسا نہ ہوا اور ریحانہ بشر کی ہو گئی تو میں یہ بات کیسے برداشت کروں گا۔ ایسا سوچنے سے میرا دماغ پھٹنے لگا تھا۔ اگر ایسا بچ ہو جاتا تو نہ جانے میرا کیا حال ہوتا۔ میں ہر روز امی کی طرف پرامید نظروں سے دیکھتا کہ شاید انہوں نے بات کی ہو۔ جب کہیں باہر سے آتا تو سب سے پہلے امی کے پاس جاتا اور جب وہ مجھ سے نظر پر چراتیں تو میں سمجھ جاتا کہ ابھی تک انہوں نے کوئی بات نہیں کی ہے۔ کئی بار میں نے دبے لفظوں میں امی سے کہا بھی کہ وہ بات کریں اس سے پہلے کہ پھیسو اپنا ارادہ پختہ کر لیں۔ یہ بات تو سبھی کے مشر کو اس بارے میں علم نہیں تھا یا اگر تھا بھی تو اسے اہمیت نہیں دے رہا تھا ورنہ وہ ہم کزن کو ضرور بتاتا۔ تقریباً ایک ہفتے بعد امی نے مجھے بتایا کہ انہوں نے پھیسو سے بات کی تھی براہ راست تو نہیں کی تھی لیکن کریدا تھا کہ کیا ہو رہا ہے تو ایمن پھیسو نے بتایا کہ انہوں نے چچی اور چچا سے ریحانہ کا رشتہ مانگا تھا لیکن ان کا کہنا تھا کہ وہ ریحانہ کے فائل امتحانات سے پہلے اس سلسلے میں کوئی بات

نہیں کرنا چاہتے تھے۔ جسے بھی رشتے کی بات کرنی ہے وہ اس کے بعد ہی کرے۔ میں نے کسی قدر سکون محسوس کیا تھا۔ مجھے مہلت مل گئی تھی اور اگر میں کوشش کرتا تو ریحانہ کو حاصل کر سکتا تھا میں سوچا اور ایک منصوبہ بنایا۔ میں اب چچا حسن کے گھر زیادہ جانے لگا تھا ان کے آگے پیچھے ہوتا۔ ان کے گھر کوئی لڑکا نہیں تھا اور چچا چچا کے کام پر گئے شام گئے آتے تھے۔ اس لیے باہر کے کاموں کے لیے چچی اور لڑکیوں کو دشواری ہوتی تھی۔ میں نے چچی سے کہا کہ وہ جب چاہیں مجھے کہہ دیا کریں۔ اگر کوئی کام صبح کا ہو تو مجھے بتائی دیا کریں میں یونیورسٹی سے آتے ہوئے یہ کام کر دیا کروں گا۔ چچی نعمانہ خوش ہو گئی تھیں مجھے دعا میں دیتی تھیں لیکن مجھے تو بچہ اور درکار تھا۔ ابوجہ کھلا خرچ دیتے تھے۔ مجھے کوئی شوق یا علت نہیں تھی۔ جیسے مگر بیٹ پان، یا آؤنگ اور باہر کھانے کی۔ اس لیے میرے پاس رقم ہوتی تھی۔ میں اکثر چچی کے گھر جاتے ہوئے کچھ نہ کچھ لے جاتا تھا اور یہ چیز ریحانہ کی پسند کی ہوتی تھی۔ جب میں اسے دیتا تو وہ خوش ہو جاتی۔ اس بار عید آئی تو میں ریحانہ کے لیے خاص طور سے ایک خوب صورت اور ہنگامہ سوٹ لے کر آیا۔ سوٹ کے ساتھ نیچنگ کی جیلری، چوڑیاں اور سینڈل بھی تھے۔ ریحانہ خوش ہوئی تھی اور میرا شکریہ ادا کیا لیکن جیسے ہی یہ خبر دوسری لڑکیوں تک پہنچی میرا ناظہ بند ہو گیا تھا۔ سب نے میرا کھراؤ کر لیا اور جملے کرنے لگیں۔

”اچھا جی ریحانہ خاص کزن ہے اور ہم عام کزن ہیں۔“

”کیا ریحانہ کا دل ہے۔“

”آپ کو ریحانہ ہی نظر آتی ہے۔“

”یہ دھاندلی ہے، میں بھی لا کر دیں۔“

میں نے سب کو ایک ہی جواب دیا۔ ”بھئی تم سب کو لا کر دیتا رہا ہوں ریحانہ کو کبھی کچھ نہیں دیا اس لیے اس بار اسے دیا ہے اور میں کوئی جاب کرتا ہوں جو تم سب کو بھروں۔“

بڑی مشکل سے میں نے پیچھا چھڑایا۔ لڑکیوں تک یہ بات پہنچی یا نہیں لیکن میں نے محسوس کیا کہ بشر چپ ہو گیا تھا اور وہ مجھ سمیت سب سے کم بات کر رہا تھا۔ بہر حال مجھے پرواہ نہیں تھی۔ میں نے اس سے دو مقاصد حاصل کیے تھے ایک تو ریحانہ کو تنہا دے کر اس کے اندر اپنے لیے جگہ پیدا کی تھی اور ساتھ ہی دوسروں کو پیغام دیا تھا کہ ریحانہ میرے

لیے خاص حیثیت رکھتی تھی۔ لڑکیوں کے توسط سے یہ بات یقیناً ان کی ماؤں تک پہنچ گئی ہوگی اور میں بھی یہی چاہتا تھا۔ اس طرح میں پھیسو کو پیغام دینا چاہتا تھا کہ ریحانہ میرے لیے عام کزن سے بہت کر ہے اور وہ بشر کے لیے اس کا رشتہ نہ لائیں۔ چنانچہ انہوں نے یہ بات محسوس کی یا نہیں۔ کیونکہ کسی طرف سے کوئی ایسی بات سامنے نہیں آئی۔ میں نے اس بارے میں امی سے پوچھا بھی لیکن انہوں نے بھی یہی کہا کہ ایمن پھیسو نے کوئی رد عمل ظاہر نہیں کیا ہے۔

عید پر سوٹ دینے کے بعد میری ہمت بڑھ گئی تھی۔ اب میں اکثر کھانے پینے کے علاوہ اور چیزیں بھی ریحانہ کو دینے لگا جیسے جیلری جو اسے پسند تھی اور۔۔۔ میں باکس مٹی کا بڑا حصہ ایسا پر خرچ ہوتا تھا۔ وہ حسین تھی مگر مزید حسین نظر آتا چاہتی تھی اس لیے میک اپ کرنی تھی اور اس کے پاس زیادہ سامان نہیں تھا۔ میں نے اسے انجلی بی میک اپ کٹ لا کر دی۔ وہ اس نے سب سے چھپا کر رکھی تھی۔ یہ اچھا ہوا کیونکہ دوسروں کو پتا چلنا تو ایک بار پھر سب لڑکیاں مل کر میرا جینا حرام کر تیں۔ آنے والے ایک سال میں میں نے اسے بہت کچھ دیا تھا۔ جسے وہ شکرے کے ساتھ وصول کرتی رہی تھی اور میں اس خوش فہمی میں تھا کہ میں اس کے دل میں جگہ بنانے میں کامیاب ہو رہا ہوں۔

میرے فائل سمسز قریب آگئے تھے اور مجھے زیادہ محنت کرنا پڑ رہی تھی۔ ابونے مجھے ایک اچھی ٹی یونیورسٹی میں داخل کرایا تھا یہاں فیس اچھی خاصی تھی اور اسی طرح تعلیم کا معیار بھی بلند تھا۔ مجھے نمایاں پوزیشن لینے کے لیے بہت محنت کرنا پڑ رہی تھی۔ شام تک میں یونیورسٹی میں ہوتا تھا وہاں سے واپسی پر بھی رات گئے تک پڑھتا تھا۔ میری خواہش تھی کہ میں بمبئی اور شریل دونوں سے بہتر نمبر حاصل کروں۔ کسی طرح ان سے پیچھے نہ رہ جاؤں۔ اس کے لیے میں نے تمام تفریحات چھوڑ دی تھیں حد یہ کہ جو کچھ دیگر کزنز کے ساتھ اٹھتا بیٹھتا تھا اس سے بھی دست بردار ہو گیا۔ تعلیم کے علاوہ اس کی ایک وجہ بشر بھی تھا۔ جیسے جیسے وقت گزر رہا تھا وہ کزن سے زیادہ میرے لیے رقیب بن جاتا تھا۔ مجھے اس سے چڑھوری تھی اور جب میں اس کے پاس ہوتا تو بڑی مشکل سے اپنے تاثرات پر قابو پاتا تھا۔ ورنہ میرا اس سے بات کرنے کو دل بھی نہیں چاہتا تھا۔ یوں تعلیمی مصروفیت کے بہانے میں اس سے دور رہتا تھا۔ میرا پانچواں سمسز شروع ہوا تو ریحانہ کے بی اے فائل کے پرچے ہونے لگے

تھے۔ مجھے خدشہ ہوا کہ کہیں ایمن پھیسو پھیلنے پہلے بات کر لیں۔ میں نے امی سے کہا۔ ”پلیز اب آپ چچی اور چچا سے پہلے بات کر لیں۔“

امی نے انکار کیا۔ ”بیٹے ایمن بات کر چکی ہے جب تک اس کا معاملہ ہے میں آگے بات نہیں کر سکتی۔“

میں مایوس ہوا۔ ”پلیز ایسی اس طرح تو بات وہیں کی وہیں رہے گی۔ اگر پھیسو دس سال تک بات نہیں کریں گی تو کیا ریحانہ کے رشتے کی بات نہیں کی جائے گی۔“

”میں نعمانہ سے پوچھ لیتی ہوں لیکن اگر اس نے پھر انکار کیا تو میری کیا عزت رہ جائے گی۔ میں بیٹے کی باں ہو کر بار بار اس کے دروازے پر جا رہی ہوں۔“

”امی یہ میری زندگی و موت کا مسئلہ ہے۔ آپ ابو سے بات نہیں کر سکتی ہیں، وہ پھیسو اور چچا دونوں سے بات کر سکتے ہیں۔“

”نہ عظیم۔“ امی نے کانوں کو ہاتھ لگایا۔ ”تم اپنے باپ کو جانتے ہو اگر ان کو پتا چل گیا تو وہ مجھے بھی بات کرنے سے روک دیں گے۔“

امی کی طرف سے مایوس ہو کر میں نے سوچا اور فیصلہ کیا کہ خود ریحانہ سے بات کروں گا۔ چچا چچی سے بات کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا اسی طرح پھیسو سے بھی نہیں کر سکتا تھا اب اس مسئلے کی واحد فرق ریحانہ بچتی تھی جس سے میں بات کر سکتا تھا۔ چچا حسن کے گھر میرا آنا جانا تھا لیکن کئی بار جانے کے باوجود مجھے موقع نہ مل سکا کہ ریحانہ سے اکیلے میں بات کر سکوں۔ جو بات میں اسے کہنا چاہتا تھا اس کے لیے تنہائی ضروری تھی۔ ایک شام یونیورسٹی سے آنے کے بعد میں وہاں گیا تو دروازہ ریحانہ نے کھولا اور کسی قدر ہچکچاتے ہوئے مجھے اطلاع دی۔ ”وہ امی اور فرزند مارکیٹ گئی ہیں۔“

یعنی وہ گھر میں اکیلی تھی میں نے کہا۔ ”تو کیا ہوا میں تمہارا کزن ہوں اور پھر تم سے اکیلے میں بات کرنا چاہ رہا تھا۔“

ریحانہ راضی نہیں تھی لیکن میری بات سن کر اس نے دروازہ کھول دیا اور ایک طرف ہو گئی۔ میں اندر آیا اور نشست گاہ کی طرف جانے کے بجائے صحن میں رکھی کرسیوں کی طرف آ گیا۔ ”ریحانہ بیٹھو مجھ سے بہت ضروری بات کرنی ہے۔“

وہ زبردستی مسکرائی۔ ”آپ کو ہر کچھ دن بعد مجھ سے

کوئی نہ کوئی ضروری بات کرنی ہوتی ہے۔ خیر کہیں اب کیا کہنا ہے۔

میں ہچکچایا۔ ”ریحانہ بات تم سے متعلق ہے۔ تم جانتی ہو گی کہ امین پھوپھو نے میسر کے لیے تمہارے رشتے کی بات کی ہے۔“

اس کا چہرہ جس طرح سرخ ہوا تھا اس سے ظاہر تھا کہ وہ جانتی ہے لیکن اس نے لٹی میں سر ہلایا۔ ”نہیں تو، آپ کو کیسے پتا چلا؟“

”کیونکہ میں نے امی کو تمہارے رشتے کے لیے پچھا اور چچی سے بات کرنے کو کہا تھا۔“

”جی۔“ وہ گھبرا کر بولی۔

”اس سے پتا چلا کہ پھوپھو پہلے ہی رشتے کی بات کر چکی ہیں لیکن چچا چچی تمہاری تعلیم مکمل ہونے تک کوئی حتیٰ فیصلہ نہیں کرنا چاہتے تھے اس لیے پھوپھو کو کوئی جواب نہیں دیا۔“

اس نے رکھائی سے کہا۔ ”ٹھیک ہے ایسا ہی ہوا ہو گا لیکن آپ یہ سب مجھے کیوں بتا رہے ہیں۔“

”ریحانہ میں چاہتا ہوں کہ تم چچا چچی کو بمشور کے رشتے کے لیے منع کر دو۔“

”کیوں منع کر دوں۔“ اس نے خفگی سے کہا۔

”میں نے یہ معاملہ امی ابو پر چھوڑا ہوا ہے وہ میرے لیے جو چاہیں کریں میں ان کی رضا میں راضی ہوں۔“ وہ کہتے ہوئے کھڑکی ہو گئی۔ ”اگر آپ یہی کہنے آئے تھے تو آپ جا سکتے ہیں اور آئندہ مجھ سے اس موضوع پر دوبارہ بات مت کیجئے گا۔“

”ریحانہ میری بات سنو۔“ میں نے عاجزی سے کہا۔

”میں کچھ نہیں سنتا چاہتی۔“ اس نے رخ پھیر لیا۔ ”آپ نے کیا سوچ کر مجھ سے بات کی ہے، کیا میں اس گھر کی بڑی ہوں؟“

میرے تن بدن میں آگ سے دھک جاتی ہے۔ لیکن اس وقت جب میرے اندر مسلسل آگ جل رہی تھی میں نے خود کو اوپر سے برف کی سل کر لیا تھا۔ سب سے پہلے میں نے امی کو مطمئن کیا کہ میں ریحانہ کو پسند کرتا ہوں لیکن یہ سبلی جیموں والی محبت نہیں ہے۔ پھر میں نے میسر اور دوسروں سے اپنا رویہ تاریل کر لیا کہ اگر کسی کو شک تھا تو وہ بھی نہ رہے۔ میں نے میسر کو مبارک دی تو وہ بھی خوش نظر آیا تھا۔ ان کی گفتگو کر دی گئی تھی اور طے پایا تھا کہ شادی بمشور کی جاب کے بعد ہو گی۔ میری طرح اس کا بھی ایم پی اے کا فاضل مسٹر تھا۔ فاضل کے دوران ہی مجھے ایک فرم میں اپنشن شپ مل گئی تھی۔ وہاں میرے کام سے مطمئن ہو کر فرم مالکان نے ملازمت کی پیشکش کر دی۔ یوں تعلیم مکمل کرتے ہی مجھے جابل مل گئی تھی۔

میسر اور شرجیل نے بھی ایم پی اے مکمل کیا لیکن انہیں کئی مہینے کی خواہی کے بعد جابل بھی گئی تھی۔ تنخواہ بھی میرے مقابلے میں کم تھی اس لحاظ سے میں ان سے آگے تھا لیکن میرے لیے ان کا مایہیوں کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ بمشور کی ایک کامیابی نے مجھ سے میرا سب کچھ لیٹا تھا۔ اس وقت میں یہی سمجھ رہا تھا کہ ریحانہ نے ماں باپ کی رضا کے سامنے سر جھکا دیا ہے۔ لیکن اتفاق سے ایک دن میں پچاسن کے گھر میں تھا۔ وہ اپنے آفس کی اکاؤنٹس کی کچھ فائیل لائے تھے اور ان پر میری مدد چاہتے تھے کیونکہ میں نے فنانس میں ایم پی اے کیا ہوا تھا۔ کام کے دوران چچا مجھے چھوڑ کر واش روم گئے۔ نشست گاہ کے ساتھ ہی ریحانہ کا کمر تھا۔ مجھے علم نہیں تھا کہ ریل اس سے ملے آئی ہے۔ جب سے میں نے اس سے بات کی تھی اس کا رویہ مجھ سے دوبارہ لا اعلق والا ہو گیا تھا۔ میں سر جھکائے فائل دیکھ رہا تھا کہ ریحانہ کے کمرے کا دروازہ خود کھل گیا اور میں نے ریل کی دھیمی آواز سنی۔ وہ ریحانہ سے کہہ رہی تھی۔ ”جب مامی نے آپ کے سامنے آپشن رکھا تو آپ نے بمشور بھائی کو چون لیا؟“

”ہاں میری تو جان پر مبنی ہوئی تھی کہ کہیں امی ابو عظیم بھائی کے لیے نہ ہاں کر دیں۔“ قسم سے میں نے بہت ہمت کر کے بمشور کا نام لیا تھا وہ بھی امی کے سامنے ورنہ ابو کے سامنے تو میری ہیبت بھی نہ ہوتی۔“

ریل نے جس سے پوچھا۔ ”کیا عظیم بھائی آپ کو پسند کرتے ہیں؟“

”نہیں یہ تو ماموں اور مامی کی خواہش تھی۔“ ریحانہ

نے جلدی سے تردید کی۔

”مجھے تو لگتا ہے کہ عظیم بھائی آپ کو پسند کرتے ہیں۔“

”وہ ہم سے تمہارا۔“ ریحانہ ایک بار پھر سرگرمی۔ میں سن سارہ گیا تھا۔ یہ انکشاف مجھے اندر سے مار گیا تھا کہ ریحانہ نے مجھے مسٹر دکر کے بمشور کو چنا تھا۔ وجہ تو صاف ظاہر تھی وہ میسر کو پسند کرتی تھی۔ شکل صورت میں میسر مجھ سے بہتر تھا۔ اسی لیے ریحانہ نے مجھے مسٹر دکر دیا تھا لیکن وہ میری محبت سے کیوں انکار کر رہی تھی جب کہ وہ جانتی تھی کہ میں اس سے محبت کرتا ہوں۔ مجھے بعد میں خیال آیا کہ وہ چالاکی سے کام لے رہی تھی اپنے ہونے والی نند کے سامنے وہ کیسے اقرار کر سکتی تھی کہ اسے کوئی اور بھی چاہتا ہے۔ ریحانہ اتنی چالاک و مکار لنگے گی میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا میرے سامنے اس نے کتنی برہمی کا اظہار کیا تھا کہ اس کے رشتے کے ذمے دار اس کے ماں باپ ہیں اور وہ اس میں کوئی فیصلہ نہیں کر سکتی ہے۔ لیکن جب ماں باپ نے اس کے سامنے میرا اور میسر کا آپشن رکھا تو اس نے میسر کو چون لیا۔

یہ کچھ دھمی میں نے اندر ہی اندر برداشت کر لیا تھا اور اسے ظاہر ہی رویتے میں کوئی فرق نہیں آنے دیا۔ جیسے جیسے میں متنبہل رہا تھا میرے اندر ریحانہ کی محبت نفرت میں بدلتی جا رہی تھی اور جب وہ شادی کر کے بمشور کی ہوئی تب میرے دل میں اس کے لیے سوائے نفرت کے اور کچھ باقی نہیں رہا تھا۔ اب تک میں سنتا آیا تھا کہ شدید نفرت ہمیشہ شدید محبت کے ختم ہونے سے پیدا ہوتی ہے۔ مجھے اس کا عملی تجربہ بھی ہو گیا تھا۔ میری محبت کا تو ریحانہ اور امی کو علم ہو گیا تھا لیکن ریحانہ کے لیے نفرت میں نے اپنی ذات تک محدود رکھی تھی۔ بمشور کے جاب پر لگنے کے ایک سال بعد ریحانہ اور اس کی شادی ہو گئی۔ اس کے دو مہینے بعد میری بھی شادی ہو گئی۔ اگرچہ مجھے جاب کرتے ڈیڑھ سال ہو گیا تھا۔ تنخواہ میں بھی اچھا خاصا اضافہ ہوا تھا لیکن میں ایک کورس کر رہا تھا۔ پھر میں اپنی شادی کے لیے ابو پر بوجھ نہیں ڈالنا چاہتا تھا۔ مجھے رقم جمع کرنے میں کچھ تاخیر ہوئی تھی۔ میسر اور ریحانہ کی گفتگو کے کچھ عرصے بعد ہی امی نے میرے لیے لڑکی دیکھ لی تھی۔

ایمان بہت اچھی بیوی ثابت ہوئی تھی۔ وہ خوب صورت اور سلیقہ شعار تھی۔ ساتھ ہی مجھ سے بے پناہ محبت کرنے لگی تھی۔ میرا کہا ایک لفظ بھی اس کے لیے حرف آخر

ہوتا تھا۔ شادی کے دوسرے دن سے اس نے میری تمام ذمے داریاں سنبھال لی تھیں۔ ہم بہتی مون منانے نادرین اریا گئے۔ بہت انجوائے کیا، میں اس کے ساتھ خوش تھا۔ کوئی کی نہیں تھی لیکن نہ جانے کیا بات تھی جب کبھی اکیلے بیٹھتا تو اندر ایک عجیب سی جھجھک محسوس ہوتی۔ جیسے کچھ باقی رہ گیا ہو۔ میری زندگی میں کوئی ادھورا پن تھا۔ میں سمجھتا تھا کہ یہ ادھورا پن اور جھجھک کا احساس شاید ریحانہ کے نہ ملنے کی وجہ سے تھا۔ وقت گزرتا رہا۔ یہ ادھورا پن اور جھجھک کم ضرور ہوئی لیکن ختم نہیں ہوئی تھی۔ پانچ سال میں ہمارے تین بیٹے ہوئے اس کے بعد قدرت کی طرف سے بس ہو گیا۔ اسی دوران میں ریحانہ اور میسر کے دو بیٹے ہوئے تھے۔ ایک لڑکا اور ایک لڑکی۔

بمشور کی جاب جاری تھی لیکن اسے مالی مسائل کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ اسے صرف اپنا ہی نہیں بلکہ گھر کے اخراجات کا خیال بھی رکھنا پڑتا تھا۔ پھوپھو کو کینسر ہو گیا تھا ان کے علاج پر بہت خرچہ ہوا تھا لیکن وہ جی نہیں کھیں۔ بمشور کی شادی کے چار سال بعد وہ بہت تکلیف اٹھانے کے بعد دنیا سے رخصت ہو گئیں۔ میری امی دو سال پہلے دنیا سے گئیں۔ انہیں پارٹ پرائم بھی اور پریز کرتی نہیں تھیں۔ اس دوران میں تقریباً تمام کزنز کی شادیاں ہو گئیں۔ کچھ کی خاندان میں ہوئیں اور کچھ کی باہر ہوئیں۔ اس معاملے میں کوئی لگا بندھا اصول نہیں تھا جس کی جہاں مناسب لگی وہاں شادی کر دی۔ یوں رفتہ رفتہ سب ٹھکانے لگ گئے تھے۔ میری شادی کے بعد ابو نے تھوڑی تھوڑی کر کے اوپری منزل بنانا شروع کر دی تھی۔ یہ ڈیڑھ سو گز کا پلاٹ تھا اور نیچے کا حصہ پورا بنا ہوا تھا جس میں دو بڑے بیڑ رومز، وسیع لاؤنج اور بڑے سے ڈرائنگ روم کے ساتھ کھلا کھن بھی تھا۔ ابو نے اوپر دو بیڑ رومز بنوائے۔ پھر جب میرے پاس رقم آئی تو میں نے لاؤنج اور ڈرائنگ روم بھی بنوا لیا اور اوپر منتقل ہو گیا۔ کیونکہ رجم کی شادی طے ہو گئی تھی۔ ابو نے فیصلہ کیا تھا کہ رجم ان کے ساتھ رہے گا۔ شگفتہ کی شادی دو سال پہلے ہی کر دی تھی۔

شادی کے کچھ عرصے بعد میسر اور ریحانہ کی زندگی صرف مالی مشکلات ہی نہیں بلکہ دوسرے مسائل کا شکار بھی ہونے لگی تھی۔ ان کی آپس میں لڑائی ہوتی تھی اور کبھی کبھی جھگڑا اتنا شدید ہوتا تھا کہ ریحانہ ناراض ہو کر ماں باپ کے گھر آ جاتی تھی۔ چچا چچی اسے سمجھاتے بھجھاتے اور میسر کو بلا کر دونوں کی صلح کراتے تھے۔ لیکن کچھ دن بعد دونوں میں پھر

جنگل اہوتا تھا۔ مسئلہ یہ تھا کہ میشر ڈراپرانے خیالات رکھتا تھا۔ اس کے خیال میں عورت کو غیر مردوں کے سامنے ڈھک چھپ کر جانا چاہیے۔ جب کہ ریحانہ آزاد خیال تھی۔ وہ جدید فیشن کے کپڑے پہنتی تھی۔ جو عام طور سے فنگ والے ہوتے تھے پھر وہ کپڑے آتے جاتے عبا یا جا رہی تھی لیکن تھی بلکہ نادل وہ چٹائی تھی۔ یہ بات میشر کو اچھی نہیں لگتی تھی۔ وہ اسے نوکنا تو دونوں میں جھگڑا شروع ہو جاتا۔ اس کے اصرار پر میشرنی وی لایا تھا لیکن جب وہ ڈراے اور فلین دیکھتی تب بھی میشر اسے منع کرتا۔ وہ اسے باہر کم لے کر جاتا تھا اسے اپنی بیوی کو ایسی جگہوں پر لے جاتا اچھا نہیں لگتا جہاں دوسرے مرد ہوں اور وہ ریحانہ کو دیکھیں۔ وہ اسے مخلوط شادیوں اور مخلوط میں بھی نہیں لے جاتا تھا۔ ریحانہ شروع سے سیر و تفریح اور گھومنے پھرنے کی شوقین تھی۔ جدید فیشن اسل لباس اور میک اپ اس کی کمزوری تھی۔

چنگی بات ہے کہ مجھے خود بھی یہ چیز اچھی نہیں لگتی تھی۔ دوسرے شادی کے بعد ریحانہ کی دلکشی مزید بڑھ گئی تھی۔ پہلے وہ کلی تھی تو اب پھر پور کھلا ہوا گلاب بن گئی۔ چہرے کے نقوش تو پہلے ہی دل آویز تھے اب جسمانی خطوط بھی قاتل بن گئے تھے۔ اوپر سے وہ لباس ایسے پہنتی تھی جو اس کی جسمانی دلکشی کو مزید نمایاں کرتے تھے۔ ایمان بھی حسن و دلکشی میں اس سے کم نہیں تھی لیکن وہ خود کو ڈھک چھپ کر رکھتی تھی۔ اگر وہ اس طرح سے خود کو نمایاں کرتی تو یقیناً مجھے بھی برا لگتا۔ میشر اس لحاظ سے حق ہے۔ جب تھکا۔ میرے اور میشر کے ایک مشترک دوست کی بہن کی شادی میں ہم سب گئے تھے۔ اس شادی میں ریحانہ نے غرارہ سوٹ پہنا تھا بہت تنگ کرتی جو اس کی کمر سے لے کر اوپر تک جیسے چپاں ہو رہی تھی اور گر بیان بھی معمول سے بڑا تھا۔ جس سے اس کا گداز لگا ہی بدن چھلکا پڑا تھا۔ اوپر سے اس نے نہ بونے کے برابر دوپٹا لیا ہوا تھا۔ مزید یہ کہ گید رنگ کس تھی اور ریحانہ ایک جگہ بیٹھنے کے بجائے پورے ہال میں تلی کی طرح چکراتی پھر رہی تھی۔ ایسے میں مردوں کی نگاہ عورت پر کس طرح پڑتی ہے اس سے تمام مرد حضرات اچھی طرح واقف ہیں۔ ہال میں موجود تقریباً تمام مردوں کی نگاہیں ریحانہ پر مرکوز تھیں اور میشر شدید بیچ و تاب کھا رہا تھا۔ مگر ریحانہ کو کوئی پروا نہیں تھی۔ ایمان نے مجھ سے دے لفظوں میں کہا۔ ”یہ ریحانہ کو کیا ہو گیا ہے۔ آج اس نے کسی ڈریسنگ کی ہے اور کیا اسے اندازہ نہیں ہے کہ میشر بھائی کتنے غصے

میں ہیں۔“

”یہ ان کا معاملہ ہے۔“ میں نے بھی دہی زبان میں کہا۔ ”ہم کیا کر سکتے ہیں۔“

چنگی بات تو یہ ہے کہ میں بھی ریحانہ کے حسن سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ میں اس طرح بیٹھا تھا کہ ایمان یا میشر نہیں دیکھ سکتے تھے کہ میں ریحانہ کو دیکھ رہا تھا اور بہت عرصے بعد میں نے اسے اس طرح دیکھا تھا۔ تب مجھے ایک انوکھا خیال آیا۔ میرے اندر جو ایک خلش اور ادھورے پن کی کیفیت تھی وہ اصل میں ریحانہ سے محرومی کی تھی۔ میں شروع سے اس کی خوب صورتی کا دیوانہ تھا۔ اس کے وجود کو حاصل کرنا چاہتا تھا اور میں اس میں ناکام رہا تھا۔ اس ناکامی سے مجھے ریحانہ سے نفرت ضرور ہوئی تھی لیکن اب بھی میں اس کا طلب گار تھا۔ یہ خیال کی تیز سنسنائے خیال کی طرح میرے پورے جسم میں تیر گیا۔ میں کانپ اٹھا تھا۔ شکر ہے ایمان اور میشر دونوں کی توجہ ریحانہ کی طرف تھی۔ ورنہ وہ میری حالت میں تغیر محسوس کر لیتے۔

ریحانہ دھن کی طرف سے اس کے سسرالی رشتے داروں کو جوتا چرائی کے موقع پر تری کی جواب دے رہی تھی۔ ان میں اکثریت جو ان لڑکے لڑکیوں کی تھی۔ وہ اتنی شوخ و چٹیل ہو رہی تھی کہ اسے تن سے بدن کا ہوش نہیں تھا اور وہاں موجود مرد اور لڑکے اسے جس طرح دیکھ رہے تھے صاف لگ رہا تھا یہ میشر کی برداشت سے باہر تھا اور پھر وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کر ریحانہ کی طرف بڑھا۔ پاس جا کر اس نے ریحانہ کا بازو پکڑا اور اسے تقریباً کھینچتا ہوا لڑکھانے کی برائی میں لگ گیا۔ ریحانہ گری اور سنپٹتے ہوئے بھی مجھ سے ٹکرائی تھی۔ اس کا نرم گرم اور پھر پورے جسم مجھ سے ٹکرایا تو ایک بار پھر وہی سنسنائی کی لہر پیدا ہوئی تھی۔ میں نے سہارا دینے کے بہانے اس کا بازو پکڑا اور میشر سے کہا۔ ”ابڑی یار۔۔۔“

”آپ دیکھ رہے ہیں انہیں۔“ ریحانہ روہانے لہجے میں بولی۔ ”انہوں نے سب کے سامنے میری تنگی افسانہ کی ہے۔“

”افسانہ۔“ میشر نے زہریلے لہجے میں کہا۔ ”تمہیں عزت دے غزنی کا احساس بھی ہے۔“

ریحانہ روئے لگی اور ایمان اسے چپ کر رہی تھی۔ تقریباً سب ہی نے اس بات کو محسوس کیا اور میں نے میشر سے کہا۔ ”میرا خیال ہے گھر چلو اب یہاں بیٹھنا مناسب

نہیں ہے۔“

خود میشر بھی یہی چاہتا تھا۔ ہم سب کار میں آئے تھے۔ میں نے شادی کے کچھ عرصے بعد ہی کار لے لی تھی۔ جب کہ میشر کے پاس وہی بائیک تھی۔ وہاں ہی میں بھی ریحانہ روٹی رہی اور میشر خاموش بیٹھا ہونٹ کا تار مارا۔ میرا اندازہ تھا کہ آج رات میشر اور ریحانہ میں شدید جھگڑا ہوگا۔ اس بارے میں سوچتے ہوئے انوکھا خیال آیا کہ اگر میشر بے قابو ہو جائے اور ریحانہ کو طلاق دے دے تو کیا ہوگا؟ مگر یہ لگاتی خیال تھا جو بس ایک لمحے کے لیے آیا تھا۔ مگر جب ہم گھر آئے اور میں پیچھے کر کے آیا تو ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے بال برش کرتی ایمان نے کہا۔ ”ج کبوں تو مجھے ڈر لگ رہا ہے کہیں میشر بھائی کو کوئی انتہائی قدم نہ اٹھائیں۔ آج ریحانہ نے بھی حد کر دی ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ جان بوجھ کر میشر بھائی کو چڑا رہی ہو۔“

”میرا خیال ہے اس معاملے میں دونوں قصور وار ہیں۔ میشر اسے آزادی دینے کے لیے تیار نہیں ہے اور وہ اس معاملے میں سمجھوتا کرنے کے لیے تیار نہیں ہے۔“

”ویسے عورت کو کرنا تو وہی چاہیے جو اس کے شوہر کو پسند ہو۔“

”میں تم سے اتفاق کرتا ہوں کیونکہ میں بھی ایک شوہر ہوں۔“ میں نے مسکرا کر کہا۔ اگلی صبح چٹائی تھی اور چٹائی والے دن میں دیر سے اٹھا تھا۔ لیکن ایمان جلدی اٹھتی تھی کیونکہ اس نے بچوں کو جلدی اٹھنے کی عادت ڈالی تھی اس لیے انہیں صبح صبح ناشا اور کار ہوتا تھا وہ عام طور سے بچوں سے سخت کر مجھے اٹھاتی تھی اور ہم ساتھ ہی ناشا کرتے تھے۔ لیکن اس صبح ایمان نے جس طرح مجھے بیدار کیا تو اس کے انداز اور چہرے پر بدحواسی دیکھ کر میں سمجھ گیا کہ کچھ ہو گیا ہے۔

میں نے اٹھتے ہوئے پوچھا۔ ”خیریت؟“

”میشر بھائی ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہیں۔“ اس نے خشک لبوں پر زبان پھیر کر کہا۔ ”بہت برا ہوا ہے۔ وہی جس بارے میں ہم رات کو بات کر رہے تھے۔“

میں چونک گیا۔ ”کیا مطلب؟ میشر نے کوئی حماقت کی ہے؟“

ایمان نے سر ہلایا۔ ”وہ کہہ رہے ہیں کہ انہوں نے رات جھگڑے کے بعد غصے میں آکر ریحانہ کو طلاق دے دی ہے۔“

میں تیزی سے ڈرائنگ روم کی طرف لپکا جہاں میشر

زرد چہرہ لیے بیٹھا تھا۔ میں نے جاتے ہی پوچھا۔ ”میشر یہ کیا کیا؟“

”بس یار۔۔۔ پتا نہیں مجھے کیا ہو گیا تھا شاید میری برداشت جواب دے گئی تھی اور میں نے۔۔۔“ اس نے جملہ ادھورا چھوڑ کر رونا شروع کر دیا۔ میں نے ڈرائنگ روم کا دروازہ اندر سے بند کر لیا کیونکہ بچے جاگ گئے تھے۔ میں میشر کے پاس آ بیٹھا۔

”تم نے تین دفعہ طلاق دے دی ہے؟“

اس نے سر ہلایا۔ ”ہاں میں نے تین بار یہ مفحوس لفظ اپنی زبان سے ادا کر دیا تھا۔“

میں نے گہری سانس لی۔ ”تب تم جانتے ہو اب کچھ نہیں ہو سکتا۔ ریحانہ تمہاری بیوی نہیں رہی ہے۔“

”میں جانتا ہوں۔“ وہ بولا۔ اس نے خود پر قابو پا لیا۔ ”میں نے حماقت کی ہے اور ریحانہ نے ضد کی تھی ہم دونوں کو اب اس کا نتیجہ بھگتنا پڑے گا۔“

”لیکن تمہارے بچے ان کا کیا قصور ہے؟“ میں نے اسے یاد دلایا۔

”میں بھی ان کے لیے پریشان ہوں۔“ وہ بولا۔ ”ان مصموں کو اس قیامت کی خبر نہیں ہے جو ان کے ماں باپ پر گزر رہی ہے۔“

”تم نے ابھی تک کسی اور کو نہیں بتایا ہے؟“

”نہیں میری ہمت نہیں ہو رہی ہے اپنے گھر میں بھی کسی کو نہیں بتایا ہے۔ اسی لیے تمہارے پاس آیا ہوں کہ تم میری مدد کرو اور بڑوں تک یہ بات پہنچاؤ۔“

”میں حسن بچا سے بات کرتا ہوں تم بھوپا کو بتاؤ۔“

”نہیں یار ان سے بھی تم ہی بات کرنا۔“ اس نے انکار کر دیا۔

”بھائی وہ تمہارے باپ ہیں ان سے کیسے بات کر سکتا ہوں بہتر ہوگا تم ان سے خود بات کرو۔“ میں نے انکار کیا۔ ”میری تو سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ چچا کوئی بے خبر کیسے سناؤں۔ ان پر تو قیامت گزر جائے گی۔“

”یار عظیم میرا قصور بھی ہے لیکن تم جانتے ہو ریحانہ حد سے گزر گئی تھی اگر وہ تمہاری بیوی ہوتی تو کیا تم یہ بات برداشت کر سکتے تھے؟“

میشر کی اس بات سے میرے جسم میں پھر وہی سنسنائٹ ہوئی تھی۔ میں نے جلدی سے رخ پھیر لیا۔ ”اب مفروضات پر بات کرنے سے کیا حاصل ہوگا۔ جو ہونا تھا وہ

جولائی 2013

ہو گیا ہے۔ میں چچا حسن کی طرف جاتا ہوں۔ ریحانہ کہاں ہے؟“

”اس نے خود کو بچوں والے کمرے میں قید کر لیا ہے۔“

”میرا خیال ہے چچا چچی اسے گھر لے جائیں گے۔“

میں نے اندر جاتے ہوئے کہا۔

ایمان نے بچوں کو ناشا کرا دیا تھا میں نے اسے ریحانہ کے پاس جانے کو کہا اور خود نیچے آیا۔ میٹر جا چکا تھا۔ نیچے ابوجن میں اخبار پڑھتے ہوئے دھوپ سینک رہے تھے انہوں نے مجھ سے پوچھا۔ ”کیا بات ہے یہ میٹر صبح کیوں آیا تھا؟“

میں نے سوچا اور ابو کو مختصر الفاظ میں میٹر اور ریحانہ کے بارے میں بتایا۔ وہ بھی حیران رہ گئے تھے۔ ”میرے خدا اس لڑکے نے کیا عاقبت کی ہے۔“

”میں چچا کی طرف جا رہا ہوں۔ میٹر نے کہا ہے کہ میں ان کو یہ خبر دوں۔“

”ایک منٹ روک میں بھی چلتا ہوں حسن جلدی غصے میں آ جاتا ہے۔“ ابو نے کہا تو میں نے سکون کا سانس لیا۔ اب ابو معاملہ دیکھ لیتے۔

پچھلے دو بعد ہم چچا حسن کے گھر میں تھے اور ابو نے ان کو بتا دیا تھا۔ وہ اور چچی کتنے ہی حواس باختہ ہو گئے تھے پھر چچی نے رونا دھونا شروع کر دیا۔ چچانے ان کو ڈانٹا۔ ”مجھے پہلے ہی خبر تھی اس لڑکی کی دوسری بیوی گل کھلائے گی۔“

”میں نے سمجھا یا تو تھا۔“

”حاک سمجھایا ہوگا۔“ چچا کا غصہ بڑھتا جا رہا تھا۔ ”اگر وہ سمجھتی تو یہاں تک نہ بتاتی۔“

”مجھ سے کیا کہہ رہے ہیں اپنی مرضی سے بہن کو بیٹی دی تھی۔“ اس بار چچی نے بھی تنگ کر کہا۔

ابو نے دونوں کو خاموش کر لیا اور چچی سے کہا۔ ”آپس میں لڑنے کے بجائے تم جا کر ریحانہ کو دیکھو اور ہو سکے تو اسے یہاں لے آؤ۔“

”تا کہ جن لوگوں کو پتا نہیں ہے ان کو بھی پتا چل جائے۔“ چچا حسن جی سے بولے۔

”لوگوں کو ویسے بھی پتا چلے گا۔ ریحانہ عورت ہے وہ زیادہ متاثر ہوئی ہے اسے تم لوگوں کی ہمدردی کی ضرورت ہے۔“

”اس گھر میں اس دوسری کوئی جگہ نہیں ہے۔“

”خدا کے لیے حسن....“ ابو بولے۔ وہ انہیں سمجھانے میں لگ گئے اور میں چچی کو لے کر میٹر کے گھر آیا۔ میٹر نیچے والے حصے میں پھوپھو کے ساتھ رہتا تھا جب کہ عاشر اور پردو کمرے بنا کر بیوی بچوں سمیت وہاں منتقل ہو گیا تھا۔ پھوپھا ابھی تک بے خبر تھے لیکن جب چچی وہاں پہنچیں اور رونا دھونا شروع کیا تو ان کو بھی معلوم ہو گیا۔ ایک بجی تھی جو اس گھر پر گری تھی اور اس نے سب جلا کر خاکستر کر دیا تھا۔ چچی نے اسی وقت ریحانہ کا ذاتی سامان لیا اور اسے لے کر پہلی گئیں۔ پھوپھا اور میٹر نے بچوں کو ساتھ لے جانے کی اجازت نہیں دی تھی۔ میٹر کی بیوی آئینہ سال کی ہو رہی تھی اور کھنڈر تھی۔ اس نے بھی رو رو کر آنکھیں سچائی ہوئی تھیں البتہ دس سال کا بیٹا ابھی صورت حال کو اتنا نہیں سمجھ پا رہا تھا۔ وہ سہا ہوا ایک ایک کی صورت دیکھ رہا تھا۔ میٹر غم سے مڑھا تھا۔ وہ ریحانہ سے محبت کرتا تھا مگر ریحانہ نے اس کی محبت کی قدر نہیں کی حالانکہ اس نے خود میٹر کو پسند کیا تھا۔ ابو نے پھوپھا سے کہا۔ ”خالد اس مسئلے کا کوئی حل نکالنا ہوگا ورنہ پتہ چل جائیں گے۔“

”اس کا ایک ہی حل ہے۔“ پھوپھا نے کہا۔ ”تم بھی جانتے ہو وار میں بھی۔“

”حلالہ۔“ ابو نے کہا۔

”لیکن سوال یہ ہے کیا ریحانہ اور میٹر اس کے لیے تیار ہوں گی اسی طرح حسن اور نعمانہ مائیں گے؟“

میٹر وہاں موجود تھا اور یہ سن کر اپنی اس کا چہرہ زرد پڑ گیا تھا۔ جو شخص اپنی بیوی پر کسی غیر مرد کی نظر برداشت نہیں کر سکتا تھا اس کے لیے یہ بہت بڑی بات تھی۔ ویسے تو ہر مرد کے لیے یہ تصور ہی ناقابل برداشت ہوتا کہ اس کی بیوی جسے اس نے طلاق دے دی ہو وہ کسی اور مرد کے تصرف میں رہ کر اس کے پاس واپس آئے۔ میٹر اس کے معاملے میں زیادہ ہی حساس تھا اور اسی وجہ سے طلاق کی نوبت آئی تھی۔ کچھ دیر میں چچا حسن اور ایمین پھوپھو بھی واپس آئے۔ ساتھ آئیں۔ میں نے مناسب سمجھا کہ وہاں سے اٹھ جاؤں کیونکہ اب سب ہی بڑے تھے۔ میٹر کی وہاں موجودگی لازمی تھی کیونکہ مسئلہ اسی کا تھا۔ میں گھر آیا تو ایمان بھی آگئی تھی اس کا کہنا تھا کہ ریحانہ کا رورو کر برا حال تھا۔ اسے اپنے بچوں کی فکر بھی تھی کہ اب ان کا کیا ہوگا۔ میں نے چچی کا روتل پوچھا۔ ایمان بولی۔ ”وہ بہت غصے میں ہیں اور کہہ رہی ہیں کہ اچھا ہو اور ریحانہ کی ایسے شخص سے جان چھوٹ گئی۔“

میں نے کہا۔ ”چچی جان غلط کہہ رہی ہیں۔ میٹر نے ریحانہ کے ساتھ ایسا کوئی ظلم نہیں کیا ہے۔ اگر طلاق بشرنے دی ہے تو اسے لینے میں ریحانہ کا بھی پورا ہاتھ ہے۔“

”یہ تو ہے۔“ ایمان نے ٹھنڈی سانس لی۔ ”کاش ریحانہ یہ بات سمجھ سکتی۔“

”وہ شروع سے خود پسند رہی ہے اور اسے اپنے سوا کسی کی پروا نہیں تھی۔“ میں نے اس وقت کو یاد کیا جب میں نے اسے چاہا تھا۔

”لیکن ریحانہ نے شادی تو پسند سے کی تھی؟“ ایمان بولی۔

”ہاں، لیکن یہ محبت نہیں تھی بلکہ ریحانہ کی خواہش تھی۔ وہ شروع سے بشر کی طرف مقلقت تھی۔“

”سنا ہے آپ کا رشتہ بھی گیا تھا اس کے لیے؟“ ایمان نے ترجیحی نظروں سے مجھے دیکھا۔ لیکن انداز چھپڑنے والا تھا۔

”ہاں امی کی خواہش تھی۔“ میں نے بے پروائی سے کہا۔

”واقعی؟“

میں نے اسے گھورا تو اس نے جلدی سے دونوں ہاتھ جوڑ دیے تو میں بھی مسکرا دیا تھا۔ پھر مجھے چوہنشن یاد آئی تو میں سنجیدہ ہو گیا۔ شام تک بزرگوں کا اجلاس جاری رہا تھا۔ میٹر کے ہاں اجلاس میں ذرا گرمائی ہو گئی تھی۔ چچا حسن نے میٹر کو سنا میں۔ جواب میں اس نے بھی کہا کہ وہ اپنی بیٹی کو بھی دیکھیں۔ دوسرا اجلاس ہمارے ہاں ہوا تھا۔ اس میں سب سے پہلے طے ہوا کہ یہ خبر ان چار گھروں سے آگے نہیں جانی چاہیے۔ اس کے بعد ابو اور چچا حسن کسی عالم کے پاس فتویٰ لینے چلے گئے۔ وہاں سے واپس آئے تو ان کے چہرے ستے ہوئے تھے۔ ابو نے بتایا کہ عالم نے قطعی طلاق کا بتاتے ہوئے اس کا حل حلالہ قرار دیا ہے۔

”یہ دونوں مائیں گے؟“ دانیال پھوپھا نے پوچھا۔ ان کا اشارہ ریحانہ اور میٹر کی طرف تھا۔ جب ان سے پوچھا گیا تو پہلے دونوں نے ہی انکار کر دیا۔ وہ ایک دوسرے کی صورت دیکھنے کے روادار نہیں تھے۔ مگر جب بچوں کا مسئلہ سامنے آیا تو دونوں کے دلوں میں بھی برف پکھننے لگی تھی۔ ریحانہ ابھی پچیس برس کی تھی لیکن دیکھنے میں تیس سے زیادہ کی نہیں لگتی تھی۔ حسین اور دلکش تھی کہ اس کی جانی تو اس کی دوسری شادی ممکن تھی۔ مگر سچ پھر کہاں جاتے، اس کی

بیٹی بڑی ہو رہی تھی اور اسے ماں کی ضرورت تھی پھر ریحانہ کو اپنے بیٹے سے والہانہ پیار تھا وہ اسے نہیں چھوڑ سکتی تھی۔ ایسے میں واحد حل حلالہ رہ جاتا تھا۔ مگر ریحانہ اور میٹر دونوں اسے ماننے ہوئے بچکا رہے تھے۔ ساتھ ہی وہ جانتے تھے کہ اگر انہیں دوبارہ ایک ہوتا ہے تو اس کا راستہ اصل میں یہی ہے۔ جس دن میٹر نے یہ حل تسلیم کیا وہ میرے سامنے پھوٹ کر رو دیا تھا۔

”یاد میں کیا کروں میرا دل چاہ رہا ہے کہ خود کشی کر لوں۔“

”دوست انسان کو زندگی میں ایسی مشکلات سے گزرنا پڑتا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”تمہارے اور ریحانہ کے مسئلے کا ایک یہی حل باقی رہ جاتا ہے۔“

ریحانہ نہیں مان رہی تھی لیکن پھر وہ بھی راضی ہو گئی۔ جب ایک بار فیصلہ ہو گیا تو اب یہ سوچا جانے لگا کہ اس کام کے لیے کیا تیار ہوگا؟ کیونکہ بات ان چار گھرانوں سے باہر نہیں لگنی تھی اس لیے ابو نے فرد کو بھی یہیں تلاش کرنے کا کہا۔ یہ ان دونوں کو راضی کرنے سے بھی زیادہ مشکل کام تھا کیونکہ سب سے پہلے شریل کا نام نکلا اور اس نے سنتے ہی انکار کر دیا۔ اس کی بیوی غزل شوہر کے معاملے میں بہت حساس تھی۔ اس نے شریل سے کہا کہ وہ اگر راضی ہوا تو پہلے اسے طلاق دے اور اس کے بعد جو چاہے کرے۔ شریل نے معذرت کر لی تھی وہ ویسے بھی راضی نہیں تھا۔ اب رہ گئے تھے میں، رحیم، عاشر اور رحیل۔ یہ تینوں عمر میں اور رشتے میں ریحانہ سے چھوٹے تھے اس لیے جب انہوں نے بھی انکار کیا تو کسی نے زیادہ زور نہیں دیا۔ آخر میں میں بچا تھا۔ ابھی تک کسی نے مجھ سے کہا نہیں تھا لیکن ایمان کے ذہن میں یہ خیال پہلے آ گیا۔

”سین اگر انہوں نے اس کام کے لیے آپ سے کہا تو آپ کیا کریں گے؟“

”تمہارا اشارہ اگر ریحانہ سے شادی کرنے کا ہے تو میرا جواب نفی میں ہوگا۔“

”لیکن آپ پر زور دیا گیا خاص طور سے بڑوں کی طرف سے تو....“ ایمان کا لہجہ دھیمہ ہو گیا تھا۔

”تب بھی میرا جواب انکار میں ہوگا۔“ میں نے دو ٹوک انداز میں کہا تو ایمان نے سکون کا سانس لیا تھا۔ ظاہر ہے کون عورت پسند کرے گی کہ اس کا شوہر عارضی طور پر سبکی لیکن کسی دوسری عورت کا ہو۔ لیکن خاندان کے بڑوں

میں اس بارے میں کچھ پوری پک رہی تھی۔ سب کے انکار کے بعد میں ہی بچتا تھا۔ جس دن ایمان نے خدشہ ظاہر کیا اس سے اگلے دن ابو نے مجھے الگ بلا کر اس بارے میں بات کی۔ میں نے انکار کر دیا۔ ”ابو میں یہ نہیں کر سکتا۔“

”میں جانتا ہوں بیٹے یہ بہت مشکل ہے لیکن کسی کو تو کرنا ہے ورنہ ریحانہ اور بشر کا گھر اجڑ جائے گا۔ ان کے بچے رل جائیں گے۔ اگر ریحانہ کی دوسری شادی کی تو بشر کو بھی شادی کرنا پڑے گی۔ پتا نہیں آنے والی عورت اس کے بچوں کو پیار دے یا نہ دے۔“

”ابو میں سمجھتا ہوں لیکن میں یہ قربانی نہیں دے سکتا۔“

ابو نے بہت اصرار کیا اور میرا انکار برقرار رہا تو ابو چپ ہو گئے لیکن دو دن بعد ابو، چچا اور چچو پاؤں مجھے بچا کے گھر بلالیا۔ اس سے پہلے ایمان کو پتا چل گیا تھا اور وہ روہا کی ہو رہی تھی۔ ”عظیم مجھے لگتا ہے یہ آپ سے سوا کر چھوڑیں گے۔“

”تم فکر نہ کرو جہاں تک میرے بس میں ہوا میں انکار پر قائم رہوں گا۔“

”بس سے کیا مراد ہے؟“ ایمان بولی۔

”میں نہیں جانتا۔“ میں نے بے بسی سے کہا۔ ”تم نہیں جانتیں کہ ابو نے مجھ پر کتنا دباؤ ڈالا ہے اور میں نے کیسے برداشت کیا ہے۔“

جب ابو، چچا اور چچو نے مل کر گھیرا تو میں اپنے انکار پر قائم نہ رہ سکا تھا۔ میں مان گیا لیکن ساتھ ہی شرط رکھ دی کہ اگر ایمان اجازت دے گی تو میں ریحانہ سے نکاح کروں گا۔ یہ ضروری بھی تھا کہ دوسری شادی کے لیے پہلی بیوی کی اجازت درکار ہوتی ہے۔ بات ایمان تک پہنچی تو بزرگوں نے اس سے بات کی۔ اس کا خیال تھا کہ بات اس تک نہیں آئے گی لیکن جب آئی تو وہ کمزور پڑ گئی اور اس سے انکار نہیں ہو سکا۔ وہ اس شرط پر مان گئی کہ جو ہوگا وہ فوری ہو گا اور یہ شادی زیادہ دیر برقرار نہیں رہے گی۔ وہ مجھ سے ناراض تھی کہ میں نے گیند اس کے کورٹ میں کیوں پھینک دی تو میں نے کہا۔ ”جیسے تمہارے لیے انکار کرنا مشکل تھا اسی طرح میرے لیے بھی مشکل تھا۔ مجھے خاندان کی عزت کے واسطے دیے گئے تھے۔“

”لیکن اب تو آپ خوش ہیں۔“

”یہ تمہاری غلط فہمی ہے۔ مجھے کوئی خوشی نہیں ہے بلکہ

کوفت ہے۔“

میں نے سچ کہا تھا لیکن پورا سچ نہیں تھا۔ درحقیقت مجھے خوشی بھی ہو رہی تھی کیونکہ میری برسوں پرانی آرزو پوری ہونے والی گئی۔ میری اور ایمان کی طرف سے رضامندی پا کر سب نے سکون کا سانس لیا تھا کہ سب سے مشکل مرحلہ ختم ہو گیا تھا۔ بشر میرا شکر گزار تھا کہ میں اس کی خاطر قربانی دے رہا تھا۔ حالانکہ ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ طے پایا کہ جیسے ہی ریحانہ کی عدت پوری ہوگی میرا اور اس کا نکاح سادگی اور خاموشی سے کرا دیا جائے گا۔ میں اس کے ساتھ ایک رات گزاروں گا اور صبح اسے طلاق دے دوں گا۔ پھر عدت گزار کر وہ دوبارہ بشر کے نکاح میں آجائے گی۔ اس قسم کے حالات میں ایسا ہی طریقہ کار اپنا جاتا ہے۔ لیکن میں نے کچھ اور سوچا ہوا تھا۔ ابھی تو طلاق کو ایک مہینہ بھی نہیں ہوا تھا اور میرے ساتھ ریحانہ کے نکاح میں وقت تھا اس لیے سب آرام سے بیٹھ گئے۔ ریحانہ بشر کے گھر میں تھی لیکن وہ بچوں کے کمرے میں منتقل ہو گئی تھی اور جب بشر گھر میں ہوتا تو وہ کمرے سے نہیں نکلتی تھی۔ وہ صرف بچوں کا کام کرتی تھی۔ بشر کے لیے کھانا بھی نہیں بناتی تھی۔ ابھی اس سے کوئی ناخبر نہیں مل سکتا تھا اس لیے نکاح طے ہو جانے کے باوجود میں بھی اس سے نہیں مل سکتا تھا۔

ایمان سہمی سہمی رہنے لگی تھی۔ میں اسے پیار سے تسلی اور دلا سے دیتا کہ کچھ نہیں ہوگا بس ایک دو دن کی بات ہے۔ میں اس سے پہلے بھی اسی کا تھا اور آئندہ بھی اسی کا رہوں گا۔ ایک رات اس نے روتے ہوئے کہا۔ ”مجھے ڈر لگتا ہے آپ نہیں جانتے آپ میرے لیے کیا ہیں۔“

”میں جانتا ہوں۔“ میں نے سر دھام بھری۔ ”میں نے اس امید پر گیند تمہارے کورٹ میں پھینکی تھی کہ تم شریل کی بیوی کی طرح ڈٹ جاؤ گی لیکن تم نے فوراً ہتھیار ڈال دیے۔“

”اب چھتتا رہی ہوں کہ میں نے ان لوگوں کی بات کیوں مانی، کیا میرا ہی شوہر ہو گیا تھا۔ باہر سے کوئی پکڑ لاتے۔“ وہ غصے میں آگئی تھی۔

میں نے دل میں سوچا کہ باہر سے کسی کو پکڑ لاتے تو میرے ارمان کہاں سے پورے ہوتے۔ وقت تیزی سے گزرا اور ریحانہ کی عدت پوری ہو گئی۔ طے شدہ پروگرام کے مطابق عدت پوری ہونے کے اگلے دن میرا اور ریحانہ کا نکاح کرا دیا گیا تھا۔ شادی کی رات ہم چچا حسن کے گھر

رہے۔ نکاح بھی وہیں ہوا تھا۔ نکاح خواں کو چچا ہی لائے تھے۔ گواہ خاندان کے لوگ بنے۔ نکاح کے بعد میں گھر آ گیا۔ ایمان نے مجھے دیکھا۔ ”کیا بات ہے آپ اتنے پریشان کیوں ہو رہے ہیں؟“

”پتا نہیں ایمان میرا دل نہیں مان رہا۔“

وہ بھی افسردہ ہو گئی۔ ”لیکن اب کیا ہو سکتا ہے اب تو نکاح بھی ہو گیا ہے۔“

میں نے سر ہٹا لیا۔ ”یہ مجھ سے نہیں ہوگا میں وہاں نہیں جاؤں گا۔“

”کیا کہہ رہے ہیں؟ اب سب ہو چکا ہے تو آپ منع کر رہے ہیں۔“

جب میں نے زیادہ شدت سے انکار کیا تو ایمان نے پریشان ہو کر ابو کو بلالیا۔ ”دیکھیں، یہ کیا کہہ رہے ہیں؟“

ابو نے پوچھا تو میں نے ان کو بھی یہی جواب دیا کہ میرا دل نہیں مان رہا اور میں چچا کے ہاں نہیں جاؤں گا۔ ابو بھی پریشان ہو گئے۔ ”کیا کہہ رہے ہو تم؟ اب تو نکاح بھی ہو گیا ہے اور کل تک معاملہ ٹھنسا ہوگا۔“

”بس ابو میں نے کہہ دیا ہے یہ مجھ سے نہیں ہوگا۔“

میں نے دو ٹوک انداز میں کہا اور اٹھ کر اپنے کمرے میں چلا آیا۔ ایک گھنٹے کے اندر چچا، چچو اور بشر بھی آ گئے تھے۔ وہ سب مجھ پر چڑھ کر دوڑے تھے کہ جب سب ہو گیا تو میں پیچھے ہٹ رہا تھا۔ میں خاموشی سے سب کی سنتا رہا اور پھر کہا۔ ”میرا دل اس کام کے لیے آمادہ نہیں ہے۔ میں ریحانہ کو طلاق دینے کو تیار ہوں۔“

”تمہارا دماغ درست ہے۔“ بشر نے سخت لہجے میں کہا۔ ”تم ریحانہ کو طلاق دینے دو گے تب بھی بات وہیں رہے گی اس کی اور سے شادی کرنا پڑے گی۔“

چچا حسن بھی غصے میں آ گئے۔ ”تم میری بیٹی کو تمنا شایا رہے ہو اگر ایسی بات تھی تو نکاح کر کیوں مانے؟“

”اس وقت میری کیفیت ایسی نہیں تھی لیکن اب میں بتا نہیں سکتا کہ میری اندر سے کیا حالت ہو رہی ہے۔“

وہ سب زور دے رہے تھے اور میں انکار کر رہا تھا۔ ابو دیکھ رہے تھے کہ بات بگڑ رہی ہے۔ انہوں نے چچا اور بشر کو ششٹا کیا۔ ”آج کے لیے اس بات کو نہیں چھوڑ دو۔ کل بات کریں گے۔“

چچا اور بشر فیصلہ کرا کے جانا چاہتے تھے لیکن ابو اور پھر چچو کے کہنے پر وہ خاموش ہو گئے۔ میں اپنے کمرے میں

آیا تو کچھ دیر بعد میرے موبائل پر ریحانہ کی کال آئی میں نے ریسپونڈ نہیں کی تو اس نے ایمان کے نمبر پر کال کی۔ اس نے موبائل میری طرف بڑھایا میں نے انکار کیا۔ ”تم ہی بات کرلو۔“

”میرا کیا تعلق ہے۔“ وہ تلخی سے بولی۔ ”وہ بات آپ سے کرنا چاہ رہی ہے۔ تعلق تو آپ سے ہے۔“

ایک بار کال خود کوٹ گئی تو ریحانہ نے دوبارہ کال کی۔ میں موبائل لے کر نشست گاہ میں آ گیا اور کال ریسپونڈ کی۔ ”کیا بات ہے کیوں کال کر رہی ہو؟“

”اس لیے کہ آپ سے پوچھوں مجھے سب کی نظروں میں نمائش کیوں کرنا ہے ہیں۔“

”یہ میں خود بھی نہیں جانتا لیکن ریحانہ میرا دل اس کام کے لیے بالکل راضی نہیں ہے۔“

”تو میرا کون سا راضی تھا۔“ اس کا لہجہ زہریلا ہو گیا۔ ”جیسے میں مجبور اسی طرح آپ مجبور۔“

”میں مجبور نہیں ہوں، میں نے چچا جان اور بشر سے بھی کہہ دیا ہے کہ میں تمہیں طلاق دینے کو تیار ہوں وہ کوئی دوسرا کاٹھ کا الو تلاش کر لیں۔“

یہ سن کر ریحانہ کے ہوش اڑ گئے تھے۔ ”عظیم کیا کہہ رہے ہیں۔ پلیز یہ میری اور میرے بچوں کی زندگی کا سوال ہے۔“

”تم شاید بشر کا ذکر کرنا بھول گئیں۔“ میں نے طنز کیا۔ ”کبھی وہ تمہاری زندگی اور چلائے گا۔“

وہ کچھ دیر خاموش رہی پھر آہستہ سے بولی۔ ”اس شخص کے لیے میرے دل میں اب کوئی جگہ نہیں رہی ہے۔ میں صرف بچوں کی وجہ سے راضی ہوئی ہوں۔“

میں نے دروازے پر کسی کو محسوس کیا تو لہجہ بدل کر بولا۔ ”یہ تمہارا اور بشر کا مسئلہ ہے تم لوگ خود نمٹو۔“

میں نے کہتے ہی کال کاٹ دی اور پھر موبائل بھی بند کر دیا۔ باہر آنے پر میں نے ایمان کی جھلک دیکھی جو تیزی سے بیڈروم میں داخل جاری تھی وہ جھٹس میں پیچھے آئی تھی کہ میں ریحانہ سے کیا بات کر رہا ہوں۔ میں دل ہی دل میں سکرا دیا تھا۔ ابھی تک سب میری پلاننگ کے مطابق جاری تھا۔ مجھے امید تھی کہ آگے بھی ایسا ہی ہوگا۔ آنے والے دو دن تک ابو اور دوسرے لوگ مجھ سے بات کرتے رہے اور میں اپنے انکار پر قائم رہا۔ تیسرے دن ابو نے مجھ سے کہا۔ ”بیٹے یہ مسئلہ اس طرح حل نہیں ہوگا۔ میرا ایک

مشورہ ہے۔ میں نے حسن اور بشر سے بات کی ہے وہ بھی اس پر راضی ہیں۔“
”کیسا مشورہ ایو؟“

”تم ریحانہ کو لے کر چند دن کے لیے شہر سے باہر چلے جاؤ۔ میرا خیال ہے نادورن ایریا چلے جاؤ اور وہاں چند دن ہوٹل میں قیام کرو۔ پھر واپس آ جانا۔“
میں ہنسی بھری نگاہ سے اس پر دیکھ رہی تھی۔ ”یہ مناسب ہے؟“
”دیکھو اس مسئلے کو حل کرتا ہے۔ حسن اور بشر تمہاری طرف سے طلاق پر آمادہ نہیں ہیں۔“ ایو نے ڈھکے چھپے انداز میں کہا۔ ”وہ چاہتے ہیں تم اپنا طے شدہ کردار ادا کرو۔“

”میں سوچوں گا ایو۔“
”نہیں سوچنے کا وقت نہیں ہے میں تمہاری اور ریحانہ کی سبک دہی کر رہا ہوں۔“ ایو نے کہا۔ پھر انہوں نے مجھے قائل کر لیا کہ یہی طریقہ مناسب ہے۔ دوسرے دن ہم نائٹ کوچ سے اسلام آباد کے لیے روانہ ہو گئے وہاں سے شوگراں پہنچے اور آنے والے ایک ہفتے تک ہم وہیں مقیم رہے تھے۔ آخر کار میں اپنے مقصد میں کامیاب رہا تھا۔ اس ایک ہفتے کے دوران ہم زیادہ تر وقت اپنے کمرے میں رہے۔ ایک ہفتے بعد جب ہم واپسی کی تیاری کر رہے تھے تو ریحانہ کا حسین چہرہ سنا ہوا تھا اور اس کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔ اس نے کہا۔ ”عظیم کیا یہ سب ختم ہو جائے گا؟“

”ظاہر ہے۔“ میں نے شانے اچکائے۔
وہ رو ہنسی ہو گئی۔ ”اگر آپ نے یہ تعلق ختم کرنے کے لیے جوڑا تھا تو اس سلسلے کو اتار دیا کیوں کیا؟“
”کیا مطلب؟“ میں نے بیگ میں کپڑے رکھتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔

اس نے خشک لبوں پر زبان پھیری۔ ”مطلب یہ کہ اس کے لیے صرف ایک بار کا ملاپ کافی تھا۔ یہ کام آپ وہاں بھی کر سکتے تھے۔ یہاں لانے اور پورے ہفتے مجھے ساتھ رکھنے کا مقصد۔۔۔؟“

”حیرت ہے تم اب بھی نہیں سمجھیں۔“ میں نے کہا اور اس کے پاس آیا۔ اس کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں لیا اور بولا۔ ”میں اس حسین وجود سے دل بھر کر خوشی چاہتی کرنا چاہتا تھا، ایک آدھ بار سے میرا دل کہاں بھرتا اسی لیے تمہیں یہاں لایا۔“

وہ دنگ رہ گئی تھی پھر سنبھل کر بولی۔ ”ٹھیک ہے آپ کا حق بنتا ہے میں قانونی لحاظ سے آپ کی بیوی ہوں لیکن پہلے تو آپ ایک بار بھی میرے پاس آنے پر تیار نہیں تھے۔“
میں نے سر ہلایا۔ ”وہ سب ڈراما تھا۔ اگر میں وہاں تمہارے پاس آ جاتا تو اس کے فوراً مجھے تم کو طلاق دینا پڑتی۔ جب کہ میں چاہتا تھا کہ طلاق دینے سے پہلے میں اپنے سارے ارمان نکال لوں۔“
اس نے مشتعل ہو کر کہا۔ ”آپ... آپ نے مجھے استعمال کیا؟“

”تم نے بھی مجھے ہمیشہ استعمال کیا۔“ میرا لہجہ سرد ہو گیا۔ ”شادی سے پہلے بھی اور اب بھی استعمال ہی کر رہی ہو تو کیا مجھے حق نہیں ہے کہ میں تمہیں استعمال کروں۔“
”آپ مجھ سے محبت کرتے تھے اس لیے...“

میں نے اس کی بات کاٹی۔ ”نہیں اب میں صرف ایک عورت سے محبت کرتا ہوں اور وہ میری بیوی ایمان ہے۔“

”تب یہ سب...؟“
”میرا نفرت ہے جو اب میں تم سے کرتا ہوں۔“
میں نے اطمینان سے جواب دیا۔ ”کیونکہ میرا مقصد پورا ہو گیا ہے اس لیے میں صاف صاف بتا رہا ہوں۔ میں نے کبھی تم سے محبت کی تھی لیکن جب تم نے مجھے بیوقوف بنایا اور بشر کا انتخاب کیا تو یہ محبت نفرت میں بدل گئی۔ اس کے باوجود میں نے تمہارا برا نہیں چاہا مگر دیکھو قدرت نے مجھے موقع دیا کہ میں بدلہ چکا سکوں۔“

”تب وہ پیارا اور محبت جو ان سات دنوں میں جتنا ہے رہے...؟“

”وہ صرف ایک دھوکا تھا تاکہ تم راضی خوشی خود کو میرے حوالے کرتی رہو۔ سچ کہو تو تم نے ایسا ہی نہیں کیا؟“

اس کا سر ٹھکست خوردہ انداز میں جھک گیا تھا۔ میں نے بیگ بند کیا۔ ”ریحانہ بیگم میرا خیال ہے حساب برابر ہو گیا۔ تم نے پہلے بھی مجھ سے بہت کچھ حاصل کیا تھا اور اب بھی میں تمہیں کچھ دے رہا ہوں۔“ میں نے ایک لفافہ اس کی طرف بڑھا دیا۔ ”اس میں طلاق نامہ ہے۔“

وہ ساکت رہی تو میں نے لفافہ اس کی گود میں ڈال دیا اور بیگ اٹھا کر کمرے سے نکل گیا۔

